[illegible] اردو کا مصور ماہوار رسالہ — اگست و ستمبر [illegible]

# العصر

مدیر

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

معاونین: (۱) [illegible] (۲) سید [illegible] (میرٹھی) (۳) پنڈت [illegible] (۴) [illegible] (۵) ڈاکٹر [illegible] (۶) مسٹر [illegible]

## فہرست مضامین



شاکر میرٹھی نے دفتر العصر لکھنؤ سے شائع کیا

# مشترکہ کوشش

## اور باہمی امداد سے بڑے بڑے نتیجے نکلتے ہیں!

35976

قدردانِ العصر واقف ہیں کہ اُسکی ظاہری خوبیاں، طباعت وغیرہ کے لیے ہم کس قدر مصارف، محنت اور صَرفِ وقت سے کام لے رہے ہیں۔ مگر ہم موجودہ حالت پر قانع نہیں۔ ہمارے خیالات کی جولان گاہ نہایت وسیع ہے ہم العصر کو زیادہ دلکش اور مفید بنانا چاہتے ہیں، اور یہ بھی تجویز ہے کہ اُسکی موجودہ ضخامت (۹۶ صفحہ) میں کم از کم آٹھ صفحہ کا اور اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن ان تجاویز کے عمل میں آنے سے پیشتر ہمیں اسکے اخراجات کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہو جانا چاہیے۔ ایسا ہونا کچھ ناممکن نہیں ہے۔ اگر معاونین العصر چاہیں تو بہت جلد ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرما سکتے ہیں۔ یاد رکھیے، توسیع اشاعت ہی پر رسالہ کی ترقی منحصر ہے۔ اور جبکہ آپ بغیر کسی قسم کی تکلیف اور نقصان کے ہمیں اپنا ممنون بنا سکتے ہیں تو کیوں نہیں "مفت کرم داشتن" والے زریں اصول سے فائدہ اُٹھاتے؟ ہماری درخواست ہے کہ اس جانب کافی توجہ ہو، اور ہماری ادنیٰ خدمات کا صلہ العصر کی بقا و ترقی کی صورت میں عطا کیا جائے۔ اور ایسی وقت ممکن ہے جب تمام حضرات اپنے علم دوست احباب سے خریداری کی سفارش فرمائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ العصر کی خوبیوں میں روز افزوں ترقی کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔ ملک کی مزید قدردانی کا بالضرور اسکی موجودہ حیثیت پر نہایت خاطر خواہ اثر ہوگا۔ اگر توسیع اشاعت کی غرض سے العصر کے نمونہ کی کاپیاں درکار ہوں تو اطلاع آنے پر خوشی سے گذشتہ جلد کے چند متفرق پرچے ارسال کر دیے جائیں گے۔ کوشش فرمائیے کہ توسیع اشاعت کے سلسلہ میں سب سے پہلا نام آپ ہی کا ہو۔ جو کہ باعثِ افتخار ہے۔

الملتمس: شاکر (میرٹھی) مالک و ایڈیٹر رسالہ العصر، لکھنؤ


N. Saha

# العصر

## زمین کی حرکت محوری کے بعض اہم نتائج

سائنس نے مدت ہائے دراز تک "قدرت" کے حضور مین جبین نیاز رگڑنے کے بعد آخر یہ حق حاصل کر لیا کہ اب اس کے نام نہاد "قدرت" کے عالیشان مظاہر کے قدیم اور سربستہ راز ایک محو حیرت عالم کے سامنے وثوق کے ساتھ بیان کر سکتے ہین۔ سائنس کی دوربینی واقعات ماضی کے علل اور اسباب کی گتھی سلجھانے مین جس حد تک کامیاب ہو چکی ہے ہم امید کرتے ہین کہ ہمارے ناظرین اس کا کسی قدر اندازہ موجودہ مضمون کے مطالعے سے فرما سکین گے ؎

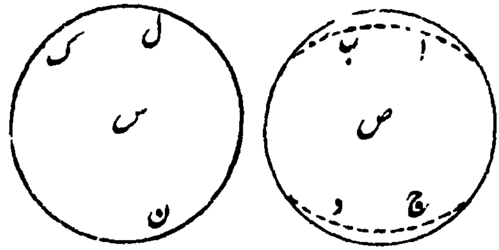
خدا دے دوربینی اور اس چشم تصور کو
کہ لاکھون کام اس سے دور کے بے دوربین نکلے

زمین کی محوری حرکت کے متعلق ہم اپنے گذشتہ دو مضامین مین شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہین۔ پہلے مضمون مین ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ زمین کی حرکت اور دیگر تمام اجرام فلکی کی حرکت صرف ایک عالمگیر قانون کے تابع ہے اور دوسرے مضمون مین ہم نے زمین کی محوری حرکت کے درست ہونے کو تین مختلف دلائل سے ثابت کیا تھا۔ موجودہ مضمون اس سلسلہ کا آخری اور سب سے ضروری حصہ ہے پہلے دو مضمون ایک حد تک اس کا دیباچہ تھے۔

اگر ہم زمین کی محوری حرکت کے جملہ نتائج محض ایک فہرست کی شکل مین یہان درج کر دین تو شاید بعض سطحی نگاہ والے اس طرز عمل سے بہت محظوظ ہون گے لیکن علمی نقطۂ خیال سے یہ کوئی احسن طریقہ نہ ہوگا۔ سائنس سے واقفیت پیدا کرنا صرف معلومات مین اضافہ کرنے کا نام نہین ہے بلکہ اصلی اور حقیقی مقصد سائنس کی تعلیم کا دلون مین ایک علمی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ سائنس کا اولین خاصہ یہ ہے کہ اس مین کوئی بات تحکم سے نہین قبول کرائی جاتی بلکہ ہر بیان کے لیے ایسی معقول اور قابل پذیرائی دلائل پیش کی جاتی ہین جن کے حسن و قبح پر بحث کرنا ہر سمجھدار کا فرض ہونا چاہیے۔ علمی تحقیقات کا کوئی شعبہ کسی خاص جماعت کے لیے مختص نہین ہے بلکہ جو کوئی اپنے آپ کو انہی حالات مین رکھ سکے جن مین دوسرے سائنس دانون نے اپنے تئین رکھا ہے اس پر وہی حقائق منکشف ہو سکتے ہین جو دوسرون پر منکشف ہو چکے ہین۔ اگر ایک خاص تجربہ یا مشاہدہ

ایک آدمی کرسکتا ہے تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی اس کے کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ سائنس میں استثنائی حالتیں شاذ کا حکم رکھتی ہیں۔

مختلف دلائل اور مشاہدات کی بنا پر یہ بات یقینی طور پر مانی جاتی ہے کہ مرکز سے زمین کی سطح کا فاصلہ مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ ہمارا اشارہ یہاں سمندروں اور پہاڑوں کے نشیب و فراز کی طرف نہیں بلکہ اس ایک اختلاف کی طرف ہے جس کی بدولت زمین کا نصف قطر خط استوا سے شروع ہو کر قطبین کی طرف کم ہوتا جاتا ہے[۵۱]۔ دوسرے الفاظ میں اس اختلاف کو یوں بیان کرسکتے ہیں کہ زمین کی شکل ایک کرہ (Sphere) کی سی نہیں ہے جس کی سطح کا فاصلہ مرکز سے ہر جگہ برابر ہوتا ہے بلکہ اس کی شکل "شبہ کرہ" یعنی سفیرائڈ (Spheroid) کی سی ہے جو کرہ کو کسی قطر کے سروں پر نیچے کی طرف دبا دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ زمین قطبین پر چپٹی ہے اور خط استوا پر سے اُبھری ہوئی ہے قطبین کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت خط استوا کے تقریباً ۱۴ میل کم ہے۔ استوائی قطر ۷۹۲۶ میل لمبا ہے اور قطبی قطر اس سے ۲۷ میل کم یعنی ۷۸۹۹ میل ہے۔ اگر آپ ایک دائرہ کو ایک قطر کے گرد گھمائیں تو آپ کو




آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے ایک کرہ دکھائی دیگی۔ اگر دائرہ کو اب اور ج د کیطرح ذرا سا دبا کر دیں اور پھر گھمائیں تو شبہ کرہ کی سی شکل دکھائی دے گی۔ یہ ثابت کرنا کہ فی الاصل قطبی اور استوائی قطر میں ۲۷ میل کا فرق ہے ہمارے مبحث سے خارج ہے لیکن ہم یہاں چند امور کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جن سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ قطبی قطر استوائی قطر سے کم لمبا ہے یا یہ کہ زمین سنگترے کیطرح وسط میں اُبھری ہوئی ہے اور شمالی جنوبی سروں پر چپٹی ہے۔ قانون تجاذب مادی کے مطابق زمین کی کشش کسی مقام پر اسی تناسب سے کم ہوتی ہے جس تناسب سے اس مقام کے مرکزی بعد کا فاصلہ بڑھتا ہے۔ لہذا اگر اس کشش کا اندازہ سطح زمین کے ہر جگہ بہ جگہ خط استوا سے لیکر قطبین تک کیا جائے تو زمین کی شکل کے متعلق مفید مطلب معلومات ہم پہنچ سکتے ہیں۔ اس کشش کا اندازہ ہم تین طریقوں سے کرسکتے ہیں

(۱) زمین کی کشش ایک گرنے والے جسم میں تقریباً ۳۲ فٹ یا ۹۸۱ سنٹی میٹر[۵۲] فی ثانیہ فی ثانیہ کا اسراع[۵۳] پیدا کرتی ہے۔ اس اسراع کا معیار کئی طریق سے ہوسکتا ہے۔ متعدد مقامات پر تجربات کا نتیجہ یہ ہے کہ اسراع کی مقدار سب جگہ یکساں نہیں ہے بلکہ خط استوا پر ۹۷۸ اور قطبین کے قریب ۹۸۳ سنٹی میٹر فی ثانیہ فی ثانیہ ہے۔

(۲) اسراع کا اندازہ پنڈولم[۵۴] (Pendulum) کے ذریعے سے بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ایک پنڈولم کی لمبائی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے تو اِدھر سے اُدھر تک ایک دفعہ حرکت کرنے کا وقت اسی تناسب سے گھٹتا بڑھتا ہے جس تناسب سے زمین کی کشش کے اسراع کا وقت بڑھتا گھٹتا ہے۔ اگر کسی مقام پر ایک خاص لمبائی کے پنڈولم کا نوبتی وقت
Period of Vibration یا Periodic Time)

---

[۵۱] ہم کسی دوسری جگہ ذکر کر آئے ہیں کہ زمین کے محور کے شمالی اور جنوبی سروں کو قطبین کہتے ہیں اور ان کے عین وسط میں زمین کے گرد ایک محیط خط کا نام خط استوا ہے۔

[۵۲] فرانس اور یورپ میں لمبائی کا پیمانہ میٹر (Metre) ہے۔ ایک میٹر میں سو سنٹی میٹر (Centimetre) ہوتے ہیں۔ ایک انچ ۲½ سنٹی میٹر یا زیادہ صحیح طور پر ۲.۵۴ سنٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ [۵۳] اسراع کے متعلق "حرکت کا پہلا قانون" دیکھئے جو العصر بابت جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ہے۔ [۵۴] اگر ایک بھاری جسم کو ایک تار دھاگے کے کنارہ پر باندھ کر کسی مضبوط جگہ لٹکا دیں تو رسی اور بھاری جسم کے مجموعہ کو پنڈولم کہتے ہیں۔ پنڈولم کی لمبائی بھاری جسم کے مرکز ثقل سے لیکر اس نقطہ تک ہوتی ہے جہاں رسی باندھی جاتی ہے۔

فرض کیجیئے کہ دو ثانیہ ہی تو کسی دوسرے مقام پر جہان زمینی کشش کا اسراع کم ہی وہان نوبتی وقت دو ثانیہ سے زائد ہوگا جس کا اندازہ دو نوبتی قائمات پر سویا ہزار نوبتی حرکتون کا وقت معلوم کرنیسے نہایت درستی کے ساتھ ہوسکتا ہی۔ سطح زمین کے اوپر استوا سے قطبین کے قریب تک پنڈولم کے ساتھ زمین کی پیمائش اب کی جا چکی ہی اور تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہی کہ تدریجی طور پر ع کی مقدار استوا سے قطبین تک بڑھتی چلی جاتی ہی۔ اب جیسا کہ ہم شق اول مین ذکر کر چکے ہین اس کا سبب مرکز سے سطح زمین کے بعد کا اختلاف ہی یعنی چونکہ پنڈولم پر مرکز کے قرب و بعد کا اثر بڑی گھڑیون کی حالت مین خوب نمایان ہی۔ اگر ایک گھڑی استوا پر ٹھیک وقت دیتی ہی تو قطبین کی طرف لیجانیسے وہ تیز ہو جائیگی یعنی اس گھڑی کے مطابق ایک ثانیہ دو دفعہ ٹک ٹک کی بجاے کم ہو جائیگی اور اس لیے ایک دن رات مین اس گھڑی کے مطابق ۲۴×۶۰×۶۰ ثانیہ سے زیادہ دفعہ ٹک ٹک ہو گی۔ اسطرح جو گھڑی استوا شمال یا جذب مین صحیح وقت دیتی ہی وہ استوا کی طرف لیجانیسے سست ہو جاتی ہی۔

(۳) مختلف اجسام مین مادہ کی مقدار ایک چیز ہی اور ان کا وزن دوسری چیز۔ مادہ کی مقدار مین سطح زمین سے مرکز کے قریب یا بعید ہونیکا کوئی اثر نہین پڑتا لیکن بوجھ پر اثر پڑتا ہی۔ بوجھ فی الاصل اس طاقت کا نام ہے جس طاقت سے زمین اس جسم کو اپنی طرف کھینچتی ہی۔ ہم دیکھ چکے ہین کہ زمین کی کشش پر فاصلہ کا اثر ہوتا ہی اس لیے اگر ہم ایک بھاری بوجھ کو ایک اسپرنگ بیلنس (Spring Balance) کے کانٹے سے لٹکا کر استوا سے قطبین کی طرف لیجائین تو چونکہ زمین کی کشش بڑھتی جائیگی اس لیے اس جسم کا وزن بھی بڑھتا جائیگا۔ بوجھ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے آپ فرض کیجیئے کہ وہ جسم چاند کی سطح پر واقع ہی۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا ہی اس لیے اس کی کشش بھی زمین سے بہت کم ہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ چاند کی سطح پر چیزون کا بوجھ زمین کی نسبت کئی درجہ کم ہی حالانکہ مقدار مادہ دونون جگہ ایک ہی ہی۔ زمین اور چاند کے درمیان فضا مین ایک ایسا مقام ہی جہان چاند کی کشش زمین کی کشش کے برابر ہی۔ اس مقام پر زمین کے بھاری سے بھاری جسم کا بوجھ کچھ نہین ہوگا۔ اگر ایک بچہ وہان پہنچ سکے تو وہ بھی اسے بآسانی اٹھا سکے گا۔ برعکس اس کے آفتاب کی سطح پر چیزون کا بوجھ اس کی کشش کی افزونی کی بدولت اس قدر زیادہ ہی کہ وہان ہماری طاقت کے انسانون سے بوجھ کے مارے اپنے اعضا بھی نہین ہلائے جاسکین گے۔

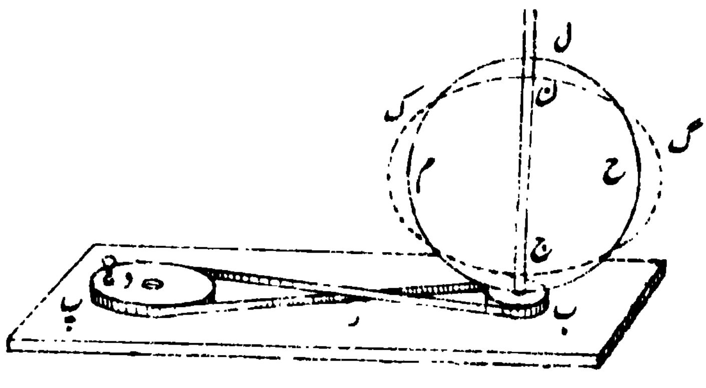
اس استدلال سے یہ امر بوضاحت ثابت ہوتا ہی کہ زمین کا استوائی محیط قطبی محیط کی بہ نسبت بڑا ہی یعنی زمین کی شکل سنگترے کی طرح ایک اپلیٹ سفرائیڈ[۱] کی سی ہی۔ زمین کی اس مخصوص شکل اور محوری حرکت کے درمیان کسی قسم کا واسطہ دریافت کرنے کے لیے دو آسان تجربے بہت مدد دینگے۔ اگر آپ ربڑ کے ایک باریک مجوف کرہ مثلاً ایک فٹ بال مین کوئی سیال مادہ مثلاً پانی بھر کر اسکے منھ کو لمبی رسی سے باندھ کر ہاتھ سے گھمائین تو وہ کرہ لیمون کی طرح لمبوترا سا ہو جائیگا جسے اصطلاح مین پرولیٹ سفرائیڈ[۲] کہتے ہین۔ بالفاظ دیگر اگر ایک نرم کرہ کا گردشی مرکز اس کے باہر واقع ہو تو وہ کرہ ایک ایسا شبہ کرہ بن جاتا ہی جس کی لمبائی لیمون کی طرح اس کی چوڑائی سے زیادہ ہوتی ہی۔ برعکس اسکے اگر گردشی مرکز اس جسم کے مرکز ثقل سے علیحدہ نہ ہو تو وہ جسم گردش کرتے ہوئے سنگترہ کی طرح طول مین چپٹا ہو جاتا ہی۔ تیل کے چند قطرے پانی مین ڈال کر انھین گردش دیجیئے۔ آپ دیکھین گے کہ وہ جس محور کے گرد گھوم رہے ہونگے اس کی سمت مین سکڑ جائین گے اور اس کے

---

[۱] پنڈولم کی حرکت کے کل قوانین الجبری طریقۂ تحریر کے مطابق اسطرح ظاہر کیئے جاسکتے ہین۔ اگر نوبتی وقت ت ثانیہ ہو لمبائی ل انچ ہو اور زمینی کشش کا اسراع ع انچ فی ثانیہ ہو تو نتیجہ ت = $2\pi\sqrt{ل/ع}$ ہوگا۔ اس مساوات مین π ایک یونانی لفظ پائی ہی دائرہ کے محیط اور قطر کے تناسب کے لیے اشارہ ہی۔ π کی مقدار بالکل صحیح طور پر معلوم کرلینا ناممکنات مین سے ہی لیکن تخمیناً ۲۲/۷ یا زیادہ صحیح طور پر ۳٫۱۴۱۶ کے برابر ہے۔

[۱] ایک ایسا شبہ کرہ جو لمبائی مین چوڑائی سے کم ہو۔ [۲] ایک ایسا شبہ کرہ جس کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہو۔

مقابل کی سمت مین زیادہ پتلے ہوجائین گے۔ تجربۃً ہم ایک سیدھے سادے آلہ کے ساتھ محوری حرکت اور قطبی کھنچاؤ کے تعلق کا مطالعہ بطرح دیکھ سکتے ہین کہ ایک زمین رکے زینے سے ایک چھوٹا سا پہیہ پ ایک بڑے پہیہ پ کے دستی کو پکڑ کر ہلانے سے نہایت تیزی کے ساتھ گھمایا جا سکتا ہے۔




ایک عمودی محور ل ن ج کے گرد تار دن کا بنا ہوا ایک کرہ ل م ح ہے۔ اب اگر بڑے پہیے کے ہلانے سے اس نرم کرہ کو گردش دیجائے تو کرہ کی شکل چپٹی یعنی شکل گ ن ک کیطرح ہوجاتی ہے جتنا تیز اس کرہ کو گھمایا جائیگا اتنا ہی زیادہ یہ کرہ چپٹا ہوتا جائیگا۔ لیکن یاد رہے کہ ہر ایک جسم ایک خاص مقدار سے زیادہ تیز حرکت کے ساتھ نہین گھمایا جا سکتا اگر ایسا کیا جاے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر کمہار اپنے مٹی کے چاک کو زیادہ تیزی سے گھمائے تو چاک ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ ان تجارب کی بنا پر یعنی زمین کے چپٹا ہونے اور نیز زمین کی حرکت محوری سے ہم ایک نئے نتیجے پر پہنچتے ہین کہ قدیم زمانے مین زمین نرم تھی یعنی زمانہ حال کیطرح ٹھوس اور سخت نہین تھی لیکن پیشتر اسکے کہ ہم گذشتہ زمانے مین زمین کے نرم ہونے کو دلائل سے ثابت کرین یہ دیکھنا چاہیے کہ موجودہ زمانے مین زمین کی محوری حرکت کا اثر سطح زمین کے اوپر کیا ہو رہا ہے۔

مذکورہ بالا تجربہ مین آپ نے دیکھا ہے کہ کرہ ل م ح کی شکل محوری گردش کی وجہ سے گ ن ک کی سی ہوگئی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ یہ کرہ چھوٹے پیمانہ پر زمین کے بالکل مشابہ ہے یعنی اسکی سطح پر کسی طرح سے پانی کی ایک گہری تہ ہے۔ حرکت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پانی قطبین سے دوڑ کر استوا کے قریب زیادہ مقدار مین جمع ہو جائیگا جبکہ تمام کرہ کے گرد پانی کی یکسان گہری ہوگی مگر اب قطبین کے اوپر کم پانی رہ گیا ہوگا پانی کا زیادہ حصہ شمال او جنوب کی سمت سے حرکت کی بدولت استوائی محیط پر جمع ہوگیا ہے۔ پانی کی حرکت زیادہ تیز ہوتی ہے لیکن اگر اس کرہ کے اوپر خاک مٹی بھی رکھی ہو تو وہ آہستہ آہستہ قطبین سے استوا کی طرف منتقل ہوجائیگی گویا کہ محوری حرکت کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ پانی اور مٹی قطبین سے استوا کی طرف منتقل ہوگئے ہین بعینہ یہی حال ہماری زمین کا ہے۔ اگر اس وقت کسی وجہ سے زمین کی محوری حرکت یکلخت بند ہوجائے تو ایک تحریک معکوس فوراً شروع ہوجائے گی۔ جس طرح پانی اور مٹی کے انبار قطبین سے استوا کی طرف منتقل ہوے تھے اسی طرح استوا سے قطبین کی طرف منتقل ہوجائین۔ کرہ زمین کے شمالی اور جنوبی حصون مین پانی کا ایک عظیم الشان سیلاب آمے۔ جنوبی امریکہ سائبیریا اور یورپ پانی کے نیچے غرق ہوجائین اور استوائی حصون مین سمندر کا بہت سا حصہ خشک زمین بن جائے۔ وسط امریکہ اور لنکا سمندر کی سطح سے میل اونچی سطح مرتفع کی طرح اوپر نکل آئین اور خلیج بنگال کا بہت سا حصہ بالکل خشک ہوجائے۔ لیکن اس انتہائی مثال کو چھوڑ کر ہم یہان محوری حرکت کی ذرا سی کمی بیشی کے نتائج پر غور کرتے ہین۔ ہم نے اپنے ایک مضمون مین یہ ثابت کیا ہے کہ زمین کی حرکت فی الواقع سست ہو رہی ہے گویا پہلے زمانون مین دن رات چوبیس گھنٹہ لمبا

ہونے کے بجائے ۲۴ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم لمبے ہونگے اور آیندہ زمانون مین ۲۵ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبے ہونگے۔

آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ مختلف پہاڑون مین کیا فرق ہے؟ زمین کی سطح پر کی جھریون کا نام پہاڑ ہے لیکن ان جھریون کا آغاز کیسے ہوا۔ دو وجوہ بیان کی جاتی ہین۔ پہلی وجہ کا بیان زمین کی اندرونی حرارت کے ذکر مین آجائیگا۔ لیکن اگر محوری حرکت کے سست ہونے کو مدنظر رکھا جائے تو دوسری وجہ سمجھ مین آسکتی ہے۔ عالمان ارضیات کا قیاس ہے کہ بندھیاچل پہاڑ کوہ ہمالیہ کے سلسلے سے زیادہ پرانا ہے۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ ان پہاڑون کی ساخت دو جداگانہ طریقون سے ہوئی ہے جن مین سے ایک کا عمل دوسرے سے بہت پیچھے شروع ہوا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آج سے تیس کروڑ برس پہلے زمین کی ایک گردش ۲۴ کے بجائے ۲۲ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی۔ آپ اوپر کے تجربون مین دیکھ چکے ہین کہ گردش کی تیزی کے ساتھ قطبی اور استوائی قطر کا فرق بڑھتا جاتا ہے جس کا مطلب زمین کی حالت مین یہ ہے کہ استوا کے گرد پانی کی تہ قطبین کی نسبت گہری ہوتی جاتی ہے جب زمین کی گردش ۲۲ گھنٹہ مین ہوتی تھی تو پانی کی سطح استوا کے گرد اتنی اونچی تھی کہ بندھیاچل کا بہت سا حصہ پانی کے نیچے غرق تھا۔ آج سے تیس کروڑ برس پہلے کوئی بندھیاچل نہین تھا۔ اس لیے بندھیاچل کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس کروڑ برس ہے اور ہمالیہ وغیرہ کی اس سے بھی کم ہے۔ زمین کی محوری حرکت مین نہ صرف ایک گھنٹہ کی کمی سے بلکہ ایک منٹ اور اس سے بھی کم مقدار کی کمی سے ایسے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوتے ہین کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آج سے تقریباً سو صدی پہلے زمین کی ایک گردش ۲۴ گھنٹہ ۹ منٹ مین ختم ہوتی تھی۔ اُس وقت کلکتہ سطح سمندر کے نیچے تھا اور اس سے پہلے جبکہ ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۰ منٹ مین ختم ہوتی تھی الہ آباد ساحل سمندر پر واقع تھا۔

دُنیا مین ہم دو قسم کی تبدیلیان دیکھتے ہین۔ ایک تو نوبتی جو ایک حصہ تک ایک سمت مین بڑھ کر پھر اتنے ہی عرصہ تک گھٹتی ہین اور جب پہلے کی سی حالت دوبارہ ہوتی ہے تو پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ موسمون کی تبدیلی ایک نوبتی تبدیلی ہے۔ اسی طرح زمین کے محور کی سمت بدلتی رہتی ہے لیکن یہ تبدیلی ہمیشہ ایک ہی سمت مین نہین ہوتی بلکہ ۲۶ ہزار برس کے بعد زمین کے محور کی سمت پھر وہی ہوجاتی ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی تبدیلیان وہ ہین جو ہمیشہ بغیر کسی قسم کے انقطاع کے قدیم سے لیکر آج تک ایک ہی سمت مین بڑھتی یا گھٹتی چلی آئی ہین اور وہ آئندہ بھی اسی نہج پر جاری رہین گی۔ ایسی تبدیلیون کے نتائج نہایت ہی اعلیٰ درجے کے اہم بالشان ہوتے ہین۔ ان کی دو مثالین ہمارے مضمون کی جان ہین جن مین سے ایک محوری حرکت کا سُست ہونا ہے۔ جہانتک آپ کا خیال زمانہ ماضی مین پیچھے کی طرف جا سکتا ہے اسے دوڑائیے اور چشم تصور سے دیکھئے کہ نہ صرف زمین کی ایک گردش آج سے ۳۰ کروڑ برس پہلے ۲۲ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی بلکہ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ ہوگا جب کہ زمین نہایت تیزی کے ساتھ چھ پانچ چار گھنٹون مین ایک گردش ختم کرتی ہوگی لیکن زمین اتنی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہے تو ہمین ایک دوسرے امر کی طرف متوجہ ہونا لازم ہے۔ زمین بے انتہا تیزی کے ساتھ نہین گھوم سکتی تھی اس لیے کہ اگر ایک مخصوص حد سے تجاوز کرتی تو یہ ریزہ ریزہ ہوجاتی یا کم از کم دو برابر حصون مین منقسم ہوجاتی لہذا ہم اپنے چشم تصور کی حد نگاہ وہ قدیم زمانہ[له] مقرر کرتے ہین جب کہ

---

[له] زمانہ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس مضمون مین کروڑون برس کا ذکر اس طرح کرتے رہے ہین جس طرح روزمرہ کی زندگی مین دنون اور مہینون کا شمار ہوتا ہے لیکن غور طلب یہ ہے کہ انسان جس کی عمر ساٹھ برس سے زائد نہین ہوتی اتنے لمبے عرصے کا اندازہ آسانی نہین لگا سکتا بلکہ شروع مین سرے سے ان کا انکار کردیتا ہے۔ میزان ہستی مین ادنیٰ تر جانور جن کی حیات ستعار گھنٹون اور دنون سے تجاوز نہین ہوتی ان کے لیے انسانی زندگی اسی تناسب سے بڑی ہے جس تناسب سے ارضیات کے طبقات انسان کے لیے بڑے ہین جس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ زمین کا بعد سورج سے ۹ کروڑ میل ہے تو انسانی عقل اس فاصلہ

زمین اپنی انتہائی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ اسوقت سطح زمین کی حالت کیا تھی؟ چاند کہاں تھا؟ ان سوالات کا جواب ہم تھوڑی دیر کے بعد دینگے۔ سردست ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرینگے۔

ہم ذکر کر رہے تھے کہ ان تبدیلیوں میں سے جن میں واقعات ہمیشہ ایک ہی طرح پر ہوتے چلے جاتے ہیں دو جو اس مضمون کی جان ہیں یعنی حرکت سست ہونے کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ دوسری تبدیلی گرم اجسام کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق ہے یعنی زمین کی ذاتی حرارت کا تدریجی لیکن غیر متناہی نقصان۔ آپ لوہے کا ایک گرم گولہ ہوا میں رکھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا درجہ حرارت اور گرد کی ہوا کے برابر ہوجاتا ہے تو گویا اسکی گرمی گرد و پیش کی چیزوں میں منتقل ہوگئی ہے۔ حرارت کے اس طریقۂ انتقال کو اصطلاح میں شعاع کہتے ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ گرمی کی شعاعیں گرم بدن سے نکلتے رہنے کی وجہ گرم بدن کی گرمی ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر آپ لوہے کے گرم گولے کے گرد فلالین کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز لپیٹ دیں جیسا عام طور پر چائے کی کیتلی پر لپیٹ دیا جاتا ہے تو اس کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ کم ہوگا۔ لیکن قابل غور صرف یہ بات ہے کہ نقصان آہستہ ہو یا جلدی آخر شعاع کا اثر ظاہر ہو کے رہتا ہے۔ بے شمار مشاہدات کی بناء پر یہ امر اب مسلمہ ہے کہ زمین بھی آہستہ آہستہ شعاع کے عمل سے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میرا مطلب اس گرمی کی طرف نہیں ہے جو ہمیں سورج ہر لحظہ پہنچاتا رہتا ہے بلکہ ہم یہاں زمین کی ذاتی گرمی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اگر آج سورج کی گرمی ہم سے چھین لیجائے تو سطح زمین کا درجہ حرارت وہی ہوگا جو فضائے بسیط کا ہے یعنی پانی کے درجۂ انجماد سے تقریباً تین سو درجہ نیچے۔ لیکن سطح زمین کے نیچے زمین کا درجہ حرارت جوں جوں دور چلے جائیں بڑھتا چلا جاتا ہے بعض مقامات پر سوا سو فٹ کی گہرائی کے لیے ایک درجہ فارن ہیٹ کی زیادتی ہوتی ہے لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ایک درجہ فارن ہیٹ کی زیادتی صرف ۳۰ یا ۴۰ فٹ کی گہرائی تک ہوجاتی ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ فی الحال جن جن مقامات پر جو مشاہدات زمینی حرارت کے متعلق کیئے گئے ہیں وہاں زیادہ سے زیادہ گہرائی تک حرارت کی زیادتی کا پتہ چلتا ہے۔ سطح کے نزدیک سورج کی گرمی زمین کی ذاتی گرمی کے اثر کو ایک حد تک چھپا دیتی ہے کیونکہ دن کے وقت گرمی کی ایک لہر سطح سے نیچے کی طرف جاتی ہے اور رات کو اس گرمی کا بہت سا حصہ شعاع کے عمل سے زائل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح روزانہ لہر کے علاوہ گرمی کی ایک سالانہ لہر زمین کے اندر سرایت کرتی ہے کیونکہ موسم گرما میں دن رات سے بڑے ہوتے ہیں اور سردیوں میں اس کے برعکس گرمی کی روزانہ لہر کا اثر ۳ یا ۴ فٹ سے زیادہ گہرائی تک نہیں ہوتا اسی طرح سالانہ لہر کا اثر تقریباً ۵۰ فٹ تک ہوتا ہے چنانچہ مقیاس الحرارت

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) اندازہ سے عاجز رہ جاتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ جسوقت ہم دریافت کرتے ہیں کہ نظام شمسی سے قریب ترین ستارہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ نور کی لہریں باوجود اتنی تیز رفتاری کے (نور کی رفتار فی ثانیہ تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار میل ہے) اس ستارے سے ہمارے پاس تین چار سال میں پہنچتی ہے تو یہ فاصلہ جس کے ظاہر کرنے سے ہماری گنتی بالکل قاصر ہے براہ راست کسی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ ایک ایسے انسان کا تصور کریں جس کا قد معمولی انسانوں کے قد سے اُتنا ہی بڑا ہو جتنا ہمارا قد ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے بڑا ہوتا ہے جن کے باعث مختلف بیماریاں شروع ہوتی ہیں اور جو ہمیں بمشکل خوردبین کی مدد سے دکھائی دیتے ہیں تو اس انسان کے لیے یہ فاصلہ چنداں تعجب کا موجب نہ ہوگا۔ نظام شمسی کے مختلف افراد کا دورہ اس کے لیے گھنٹوں اور دنوں کی سیر و سیاحت سے زیادہ وقعت نہ رکھے گا۔ ہمارا مطلب اس مثال کے بیان سے صرف یہ ہے کہ جب قدیم زمانے کے بہت ہی پہلے کے طبقات کا ذکر کیا جائے تو اُسے اپنی عمر سے مقابلہ کر کے ناممکن خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک اور بات جس کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا یہاں ضروری معلوم ہوتا وہ یہ ہے کہ جب اتنی طویل مدت کا ذکر ہوتا ہے جسکی اکائی کروڑوں برس ہو تو اس میں اندازہ ہمیشہ تخمینہ کے طور پر لگایا جاتا ہے۔

کے ذریعے سے دیکھا جاتا ہے کہ ۳-۴ فٹ تک زمین کے درجۂ حرارت میں روزانہ تبدیلی ہوتی ہے اور ۵۰-۶۰ فٹ تک سالانہ تبدیلی ہوتی ہے لیکن ۶۰ فٹ کے فاصلے سے پرے زمین کا درجۂ حرارت بالکل یکسان ہوتا ہے۔ ہم ان امور کا بیان اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ ان کے مقابلے سے زمین کے اندر سے باہر آنے والی گرمی کی لہرون کے متعلق کچھ رائے زنی کی جاسکے۔ سورج کی سخت سے سخت گرمی کو روکنے کے لیئے زمین کی ایک چھوٹی سی تہ کافی ہے۔ اسی طرح زمین کی اندرونی حرارت نہایت قلیل مقدار مین سطح پر پہنچتی ہے اور شعاع کے عمل سے فضائے بسیط مین شائع ہوجاتی ہے۔ لارڈ کیلون نے زمین کے موجودہ نقصان حرارت کے معیار سے زمین کی عمر کا اندازہ لگایا ہے۔ اس کا طریقہ عمل گہرائی کے ساتھ درجۂ حرارت کی زیادتی کو معلوم کرنے پر مبنی تھا۔ اگر ایک پتھر کی سل جسکی موٹائی اور رقبہ ہمین معلوم ہو کھولتے ہوئے پانی کے برتن کے منھ پر رکھدیجائے تو بیرونی ہوا کا درجۂ حرارت جاننے کے بعد ہم حرارت کی کل مقدار جو فی ثانیہ اس سل مین سے باہر کی طرف گذرتی ہے معلوم کرلین گے۔ اسی طرح سطح زمین سے حرارت کے مجموعی سالانہ نقصان کا اندازہ اندر اور باہر کے درجۂ حرارت کی تدریجی تبدیلی معلوم کرنے کے بعد لگایا گیا ہے اور اس اندازہ کی بنا پر اور دیگر معلومات کی مدد سے لارڈ کیلون نے یہ بات ثابت کی ہے کہ زمین کی عمر ۲۰ کروڑ سال سے زائد نہین ہے۔ زمین کی عمر سے مراد اس زمانہ کا بعد ہے جبکہ زمین کی سطح پر ایک ٹھوس تہ بننی شروع ہوگئی تھی۔ علمائ ارضیات کا اندازہ زمین کی عمر کے متعلق لارڈ کیلون کے اندازہ سے بہت بڑا ہے لیکن اس موضوع پر مفصل بحث کرنا ہمارے مضمون سے خارج ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انسان نے زمین کے اندر کی حالت کا وسیع مطالعہ نہین کیا۔ زیادہ سے زیادہ تین میل کی گہرائی تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور یہ گہرائی ۴۰۰۰ میل کے مقابلے مین صفر کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب قدرت خود دیتی ہے۔ زمین کے اندر سے آتش فشان مادہ کا اخراج خود اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ وہان سطح زمین پر کی متمرد ٹھوس چیزین بھی مائع اور سیال حالت مین ہین۔ سطح زمین کے تزلزل کا باعث زمین کی اندرونی حرارت ہے اور جون جون اندر کی گرمی کم ہوتی جاتی ہے زمین کی آتش فشانی بھی کم ہوتی جاتی ہے[1]۔ ۲۷ اگست ۱۸۸۳ء کو کراکٹو مین ایک غضبناک آتش فشانی ہوئی تھی جس سے ۳۶ ہزار نفوس سمندر مین بہ گئے تھے اور کئی دن تک سمندر مین اور کرۂ ہوائی مین تلاطم رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے زلزلے آئے دن آتے رہتے ہین۔ ان سب باتون سے ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہین یعنی یہ کہ زمین کے اندر شدت کی گرمی ہے۔

اب آپ عمل شعاع کے غیر متناہی نتائج پر غور کرین۔ یہ ہو نہین سکتا کہ زمین کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق وہ قوانین صحیح نہون جو باقی تمام ٹھنڈا ہونیوالے اجسام پر صادق آتے ہین۔ ہم مانتے ہین کہ فی زماننا زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ نہایت آہستہ آہستہ کم ہورہا ہے یعنی اتنا آہستہ کہ ہم ایک دو صدیون مین اس کا صحیح اندازہ بھی نہین لگا سکتے لیکن اس یقینی امر سے انکار بھی نہین ہوسکتا کہ سطح زمین سے متواتر زمین کی اندرونی حرارت ضائع ہورہی ہے۔ اگر آپ یہ امر مدنظر رکھین کہ سخت سے سخت گرم آگ کی بھٹی کی حرارت ایک دو فٹ موٹی دیوار روک لیتی ہے تو آپ کو زمین کی اندرونی حرارت اور اس کے نہایت آہستہ تدریجی نقصان کا اندازہ اس بات سے

---

[1] خیال کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے مین چاند کی سطح پر حد درجے کی شدید آتش فشانی ہوتی تھی اور اس قیاس کے ثبوت مین سطح چاند پر آتش فشان پہاڑون کے بڑے بڑے منھ (کریٹر Crater) پیش کیئے جاتے ہین لیکن چاند کی حرارت بوجہ زمین سے چھوٹا ہونے کے بہت جلدی ضائع ہوگئی ہے اور اب آتش فشانی بھی بند ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت کے کم ہونے کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ زمین کا اندرونی حجم کم ہوتا ہے (ایک عام قانون ہے کہ اجسام ٹھنڈا ہونے سے سکڑتے ہین) اور بیرونی سطح مین جھریان پڑجاتی ہین کیونکہ وہ پہلے سے کم حجم پر ڈھیلی رہجاتی ہے۔ بہت سے پہاڑون کی جھری دار بناوٹ اس قیاس کی مصدق ہے۔

جائیگا کہ زمین کی اندرونی حرارت کے روکنے کے لیے اس طبقہ میں ایک موٹی ٹھوس تہ مٹی اور چٹانوں کی ہو جسکی وجہ سے حرارت ضائع ہو رہی ہو گو ہم اسکا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں لیکن یہ یقینی ہو کہ آج حرارت کی مقدار پہلے سے کم ہو اور اس پر سوال ہے کہ تھی۔ فرض کیجیے کہ فی سال حرارت کا نقصان صرف اسقدر ہوتا ہو کہ زمین کا اندرونی درجہ حرارت ایک سال میں ایک سنٹی گریڈ کا دس ہزارواں حصہ کم ہو جاتا ہو۔ اگرچہ یہ نہایت خفیف فرق ہمارے ادراک سے نا ممکن آلات کا محتاج وارد کیا لیکن جب نقصان ہزارو لاکھوں برس اسی شرح پر ہوتا رہتا ہو تو اسکا اثر محسوس ہونے لگتا ہو۔ آج سے دس ہزار برس قبل زمین کا درجہ حرارت ایک درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا اور ایک کروڑ برس پہلے اسی حساب سے آج سے ہزار درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا اگر خیال کو وسعت دی جائے تو قدیم زمانہ میں زمین کا درجہ حرارت اسقدر زیادہ تھا کہ اس کی سطح پر کی چیزیں بھی سب پگھلی ہوئی حالت میں تھیں اسوقت سمندر کا نام و نشان بھی نہ تھا کیونکہ تمام پانی بخارات کی شکل میں تھا۔ پھر ہم ان طبقات کا خیال کر سکتے ہیں جب کہ زمین کے جسم کی تمام اشیا مائع اور سیال ہونے کے بجائے درجہ حرارت کی زیادتی کی وجہ سے بخارات اور گیس کی حالت میں تھیں۔ لیکن یہان ہمارے خیال کی وسعت کو روکنے والی ایک دوسری دلیل موجود ہو۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جون جون ہم وقت میں پیچھے ہٹتے جاتے ہیں زمین کی محوری حرکت تیز ہوتی جاتی ہو اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اگر اس کی رفتار ایک خاص مقدار سے متجاوز ہو جائے تو زمین کی کشش اپنے اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی کی حالت میں نہیں رکھ سکتی۔ لہذا ان دونوں استدلالات کی تطبیق سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات صرف ۴ یا ۵ گھنٹہ کے تھے تو زمین ایک سیال کرہ تھی جس کی سطح پر ابلتے ہوئے اور پگھلے ہوئے معدنیات و چٹانیں تھیں۔ ہمیں اس سوال کا حل مل گیا کہ زمین کا قطبی قطر استوائی قطر سے کیوں چھوٹا ہو۔ اگر زمین کسی قدیم زمانہ میں سیال نہ ہوتی بلکہ ہمیشہ سے آج کی طرح ٹھوس ہوتی تو اسکی شکل کروی ہوتی۔ نظام شمسی میں زمین کی شکل کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت مشتری (**Jupiter**) کو ہو جو زمین سے تیرہ سو گنا بڑا ہو لیکن تعجب کی بات ہو کہ اسکی محوری گردش صرف دس گھنٹہ میں پوری ہوتی ہو اگر بڑی دوربین میں دیکھا جائے تو مشتری صاف طور پر ایک شبہ کرہ کے مشابہ معلوم ہوتا ہو کیونکہ اسکے قطبی اور استوائی قطروں میں بہت نمایاں فرق ہو۔ مشتری کی سطح ابھی ٹھوس نہیں بلکہ سیال ہو اور یہ ایک مزید تصدیق اس امر کی ہو کہ زمین بھی کسی زمانے میں مشتری کی موجودہ حالت میں تھی۔ چونکہ مشتری بہت بڑا ہو اس لیے اسکی اندرونی حرارت ابھی ضائع نہیں ہوئی۔ گویا ہم زمین کی گذشتہ تاریخ مشتری کی سطح کے مطالعہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اس سے پہلے مضمون میں زمین کی حرکت کے سست ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے ہم نے مد و جزر پر تفصیلی بحث کی تھی۔ ہم نے بتایا تھا کہ نظام ارض و قمر میں مد و جزر کی کیا اہمیت ہو۔ مد و جزر کے وسیع مطالعہ سے ایک حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ زمین کے دن، رات اور مہینے بڑھ رہے ہیں۔ ہم اس موضوع پر مفصل بحث نہیں کر سکتے لیکن جن حضرات کو مزید معلومات بہم پہنچانے کی خواہش ہو اُن کے لیے سر رابرٹ بال کی چھوٹی سی کتاب ٹائم اینڈ ٹائیڈ (TIME & TIDE) بہتر معاون ہوگی۔ یہ کتاب اس قابل ہو کہ اس کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا جائے لیکن اگر ترجمہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے اوپر ایک بسیط تبصرہ لکھنے کی اشد ضرورت ہو۔ ہم نے مذکورہ بالا مضمون میں صرف دن رات بڑھنے کے متعلق بحث کی تھی اور مہینے کے بڑھنے کی بحث کو پس انداز کر دیا تھا۔ ہم اس مضمون میں بھی اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا نہیں چاہتے کہ اس طویل بحث کے لیے ایک جداگانہ مفصل مضمون درکار ہو اور اس لیے اب ہم زمین کی محوری حرکت کے رفتہ رفتہ کم ہونے کے نتائج پر غور کرتے ہیں۔



یمین السلطنة راجۂ راجایان راجہ سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر جی سی آئی ای

اگر دن رات کے ساتھ مہینہ بھی بڑھ رہا ہو تو اس سے چاند کے بُعد کے متعلق یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے کہ چاند رفتہ رفتہ زمین سے دور ہٹ رہا ہے یعنی اگر موجودہ زمانہ میں چاند کا فاصلہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل ہے تو کسی گزشتہ زمانہ میں اس سے کم ہوگا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ وہی مدوجزر کی طاقت جو زمین کی محوری حرکت سست کر رہی ہے چاند کی حرکت بھی سست کر رہی ہے۔ چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچتی تو حرکت کے قانون کے مطابق یہ ایک خط مستقیم میں حرکت کرتا چلا جاتا لیکن ہر لحظہ زمین کی کشش اسے اپنے مرکز کی طرف کھینچ رہی ہے اور اس لیے چاند ایک بیضوی راستے پر چل رہا ہے۔[1] اگر یہ اس راستے سے ہٹ کر زمین کے نزدیک آجائے تو اس کی دوری حرکت کی استقامت کے لیے لازمی ہے کہ اسکی رفتار تیز ہو جائے کیونکہ جتنا تیز یہ چلے گا اتنی ہی کم زمین کی کشش اس پر غالب آئیگی۔ جوں جوں چاند زمین سے دور ہوتا جاتا ہے مہینے کی لمبائی دو وجوہ سے بڑھتی ہے۔ ایک تو راستے کی زیادتی اور دوسرے رفتار کی سستی۔ مختصر نتیجہ یہ ہے کہ ہر بعد کے لیے چاند ایک خاص رفتار کے ساتھ زمین کے گرد گھومتا ہے۔ جب چاند زمین سے صرف اسّی ہزار میل کے فاصلے پر ہوگا تو اسوقت سمندر کا مدوجزر نہایت شدت سے ہوتا ہوگا۔ چڑھاؤ کے وقت سمندر کی سطح ۲۰۰ فٹ اونچی ہوتی ہوگی حالانکہ زمانۂ موجودہ میں اسکی بلندی ۲۰-۳۰ فٹ سے زیادہ نہیں۔ جزائر انگلستان سمندر سے صرف ۵۰ فٹ بلند ہیں۔ اس حالت میں یہ تمام خطۂ زمین پانی میں غرق رہتا ہوگا۔ اور پھر یہ خیال کیجیے کہ اس زمانے میں دن رات بھی چھوٹے تھے اسلیے پانی کا اتار چڑھاؤ اور بھی جلدی جلدی ہوتا ہوگا۔ ان تمام مقدمات کا موازنہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُسوقت مدوجزر کا اثر زمین کی محوری حرکت کے سست کرنے میں اب سے بہت زیادہ ہوگا۔

اب اگر اس دوربینی کو اور بھی زیادہ وسعت دیں تو اُس زمانہ میں جبکہ دن رات صرف ۳-۴ گھنٹہ کا ہوگا چاند زمین کے بہت ہی قریب ہوگا اور مہینہ تقریباً دن کے برابر ہوگا۔ جوں جوں ہم زمانۂ قدیم میں اور دور چلے جاتے ہیں تو مہینہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ صرف تین گھنٹہ کا رہ جاتا ہے یعنی چاند زمین کے گرد اتنی حرکت کرتا ہے کہ گردش ۳ گھنٹہ میں پوری ہو جاتی ہے۔ صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسی حالت میں چاند کی رفتار کیا ہوگی آخر میں ہم اس حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ چاند گویا کہ زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا اور دونوں ایک ہی رفتار کے ساتھ حرکت کرتے تھے یعنی چاند فی الاصل زمین کا ایک حصہ تھا اور جب کہ زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات تین گھنٹہ کے ہوتے تھے تو زمین کا ایک حصہ کسی حادثہ کی وجہ سے زمین سے علیحدہ ہو گیا اور ہمارا چاند کہلایا۔

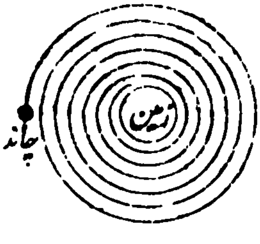
شروع میں جب چاند زمین سے علیحدہ ہوا تو چاند اور زمین دونوں سیال اور آگ سے زیادہ گرم تھے۔ چاند کی علیحدگی کے بعد فی الفور مدوجزر کا وہ لمبا سلسلہ شروع ہوا جس سے رفتہ رفتہ چاند زمین سے دور اور دن رات لمبے ہوتے گئے۔ جب چاند زمین سے بالکل قریب تھا اور زمین کی تمام سطح سیال اور ان کی تلاطم گاہ بنی ہوئی تھی اُسوقت مدوجزر نہایت شدومد سے ہوتے ہونگے اور ان کا اثر بھی اسی تناسب سے زیادہ ہوتا ہوگا۔ مدوجزر کا اثر چاند پر یہ ہوا کہ چاند کی محوری گردش کا نوبتی وقت یعنی چاند کا دن چاند کی دوری گردش کے نوبتی وقت کے برابر ہو گیا ہے اور اب ہم صرف چاند کا ایک رُخ دیکھتے ہیں لیکن چاند متواتر اپنی کشش سے زمین کی محوری حرکت سست کر رہا ہے۔ اور اگر ہم گذشتہ سے آئندہ کروڑوں برس گذرنے کے بعد کا منظر اپنی آنکھوں کے سامنے لاسکیں تو ہم زمین کا دن اور مہینہ برابر یکساں مدت کا پائیں گے۔ جب یہ دن آئیگا ہمارا دن ۱۴۰۰ گھنٹہ یعنی اسوقت کے ۵۸ دن کے برابر لمبا ہوگا اور مہینہ بھی اسی تناسب سے لمبا ہوگا۔ اسوقت چاند کی طرح زمین بھی چاند کی طرف ہمیشہ ایک ہی رُخ کرے گی اور دونوں

---

[1] اگر چاند کی خطِ مستقیم کی حرکت بند ہو جائے تو یہ فوراً زمین کی طرف گرنا شروع ہو جائیگا اور اپنے موجودہ فاصلہ سے ۴-۵ دن میں زمین سے ٹکرا جائے۔

اس طرح حرکت کرینگے جیسے دو جسم ایک لکڑی کے دونون سرون پر باندھ کر گھمائے جاتے ہین۔ لیکن یہ بھی آخری منزل نہ ہوگی۔

ہم ذکر کر چکے ہین کہ سورج کی کشش سے بھی مد و جزر پیدا ہوتے ہین لیکن ان کی مقدار چاند کے مد و جزر سے نصف سے قریب کم ہوتی ہے لیکن یہ شمسی مد و جزر خواہ کتنے ہی کم ہون ان کا اثر ہمیشہ ایک ہی سمت مین عمل کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دن بڑھتے بڑھتے سال کے برابر ہو جائیگا یعنی دن ہمیشہ کے لیے ہوجائیگا بالفاظ دیگر یا ایک دن رات مین ایک سے زیادہ دفعہ طلوع کیا کریگا اور ایک ہی دن رات مین ہلال سے بدر بنکر پھر ہلال کی شکل مین نمودار ہوگا۔ یہ طرفہ حالت نہایت خطرناک ہوگی۔ ہم ذرا فضا ... جس طرح زمین سے دور ہٹتا گیا تھا اسی طرح زمین کی طرف پھر کھنچتا ہوا آئے گا (دیکھو شکل) اور بالآخر نہایت زور کے ساتھ زمین کے اوپر گر پڑیگا اور اگر اس سے




پہلے کسی اور طریقہ سے زمین کا خاتمہ نہ ہوگیا ہو تو شاید دنیا کی موت اسی طریقے سے ہو گویا زمین کا بچہ جس سے اب زمین منتفع ہو رہی ہے انجام کار زمین کی تباہی کا باعث ہوگا۔

یہ مختصر سا خاکہ ہم نے زمین کی گذشتہ اور آئندہ تاریخ کا ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے وہ اس قدر نادر اور عجیب ہے کہ طبیعت اس کے ماننے سے گریزان ہوتی ہے لیکن نظام شمسی ہی مین یہ آخری نظارہ مریخ (Mars) کی حالت مین ہمارے پیش نظر ہے۔ مریخ کے پانچ چاند دریافت ہو چکے ہین لیکن اس کا ایک چاند اس قدر عجیب و غریب حرکتین کرتا ہے کہ اگر ہم کو وہ بالا نتائج ہمارے پیش نظر نہ ہون تو شاید ہم انکی تشریح نہ کر سکتے۔ مریخ کی محوری گردش تقریباً

۲۴ گھنٹہ مین ختم ہوتی ہے لیکن یہ چاند ایک دن رات مین مریخ کے گرد تین گردشین ختم کرتا ہے گویا مریخ کا مہینہ صرف ½ ۷ گھنٹہ کا ہے۔ چاند کا فاصلہ آہستہ آہستہ مریخ کی سطح سے کم ہو رہا ہے اور اب صرف ۴ ہزار میل باقی رہ گیا ہے۔ مریخ کا یہ چاند ہمارے چاند کے مقابلہ مین بالکل چھوٹا سا جسم ہے۔ قطر ۲۰-۳۰ میل ہے اور اس کا وزن صرف ۴۰ بلین ٹن ہے لیکن جب یہ مریخ کی سطح سے ٹکرائے گا تو اس کی رفتار ۹ ہزار میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اور جو عظیم الشان نتائج اس تصادم کا نتیجہ ہونگے وہ تشریح کے محتاج نہین ہین۔ فی الحال اس حادثہ کے وقت کی تعین نہین کی گئی۔

جو نظریہ ہم نے نظام ارض و قمر کی مثال لیکر یہان بیان کیا ہے وہ تمام کائنات کے متعلق صحیح ہے۔ اس کا مختصر اصطلاحی نام ارتقاء مد و جزری (Tidal Evolution) ہے۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج ایسے ہین جن کا ذکر ہم اس مضمون مین نہین کر سکتے۔ مثلاً خط استوائی کے گرد مادہ کی زائد مقدار جو تقدیم محور الارض (Precession & Notation of the Earth's axis) کی ذمہ دار ہے۔ چاند اور سورج کی کشش زمین کی اس بے قاعدہ مقدار مادہ کو کھینچ کر زمین کے محور کی سمت بدلتی ہے۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج جن پر ہم نے اس مضمون مین بحث کی ہے مختصر الفاظ مین یہ ہین:- محوری حرکت کا نتیجہ ہے کہ فی الحال دن اور مہینے دونون بڑھ رہے ہین۔ چاند زمین سے دور ہٹ رہا ہے اور زمین کا استوائی قطر قطبی قطر سے ۲۷ میل زیادہ لمبا ہے جب یہ محوری حرکت ایک منٹ فی دن بھی سست ہو جائے گی تو شمالی اور جنوبی حصہ زمین مین بہت سی خشک زمین پانی کے نیچے آجائیگی اور منطقہ حارہ مین خشکی کا حصہ بڑھ جائے گا۔

ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ کسی زمانے مین زمین سیال مادہ کا ایک کرہ تھی اور اسی زمانے مین چاند زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

**فیروز الدین مراد**

---

ا؎ شکل ہذا مین دکھایا گیا ہے کہ کس طرح چاند زمین سے دور ہٹ کر پھر نزدیک آتا جائے گا۔ ایسی حرکت کو حرکت منزلی یعنی اسپارل موشن Spiral Motion کہتے ہین۔

# فلسفۂ تربیت

## مصنفۂ اسپنسر پر ریویو

کسی ایسے موضوع پر، جو عملی و نظری دونوں حیثیات رکھتا ہو (مثلاً اخلاق یا سیاست) بحث کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اُس مسئلہ کی تھیوری، اُس مسئلہ کی ماہیت، اُس مسئلہ کا فلسفہ بیان کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسکو برتنے کے عملی اصول، اسکو عمل میں لانے کے وسائل و طریقے بتائے جائیں۔ فلسفی عموماً پہلی شق اختیار کرتے ہیں اور پیشہ ور دوسری۔ مثلاً اخلاق کے متعلق جب ایک فلسفی ایک رسالہ قلم اٹھاتا ہے تو اسکے پیش نظر صرف اس قسم کے مسائل ہوتے ہیں کہ اخلاق کی تعریف کیا ہے؟ افعال کے حسن و قبح کا کیا معیار ہے؟ انسان مجبور ہے یا مختار؟ انسان کے اوپر ذمہ داری نیت کی بنا پر ہوتی ہے یا نتائج افعال پر؟ بخلاف اسکے ایک واعظ ایک معلم، جب اسی موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہے، تو اسکو صرف ان عملی سوالات سے بحث ہوتی ہے کہ فلاں فلاں افعال نیک ہیں فلاں بد، افعال نیک کے اختیار کی یہ تدابیر ہیں اور افعال ذمیمہ کے ترک کے یہ طریقے وغیرہ۔ اسی قسم کے جامع الحیثیتین مسائل میں سے ایک مسئلہ تربیت کا بھی ہے۔ اور اس مسئلہ پر بھی دو جداگانہ حیثیات سے نظر کیجا سکتی ہے:-

اولاً یہ کہ تعلیم کی فلسفیانہ تھیوری کیا ہے؟ تعلیم کا مطمح نظر (آئیڈیل) کیا ہے؟ تعلیم کو انسان کی حیات انفرادی و اجتماعی سے کیا تعلق ہے۔ وغیرہ

ثانیاً یہ کہ حصول تعلیم کے عملی وسائل کیا ہیں؟ معلم کو کیا کیا طریقہ استعمال کرنا چاہیے؟ متعلم کے لیے کن کن شرائط کی پابندی ضروری ہے؟ وغیرہ

چنانچہ اسوقت تک فن تعلیم پر جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور ظاہر ہے کہ انکی تعداد سیکڑوں ہزاروں تک پہنچ چکی ہے، وہ اپنی حیثیت تحریر کے لحاظ سے تقریباً سب یک طرفہ ہیں، مثلاً فلاطون، لاک، وغیرہ حکما و فلاسفہ نے صرف اول الذکر نقطۂ خیال سے بحث کی ہے، اور اسکے مقابلہ میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر کالجوں کے معلمین و اساتذہ جو کچھ تحریر کرتے ہیں اسکا تعلق تمام تر آخر الذکر نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی قابل لحاظ تصنیف جس میں یہ دونوں خصوصیات جمع ہوں غالباً اب تک عالم وجود میں نہیں آئی۔ تاہم ایک کتاب ایک بڑی حد تک ان ہر دو حیثیات کی جامع ہے وہ اسپنسر کی "ایجوکیشن"[1] ہے، جس میں اس مسئلہ کی نظری و عملی دونوں پہلوؤں پر مساوی درجہ کی قوت، قابلیت و جامعیت سے بحث کی گئی ہے، اور جس کے اندر ایک فلسفی اور ایک معلم کے لیے تقریباً یکساں دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

"فلسفۂ تعلیم" یوں تو ایک خاصی ضخامت کی کتاب ہے، جسکے ذیل میں تربیت سے متعلق تقریباً تمام اصولی اور بہت سے فرعی مسائل آگئے ہیں لیکن ہم اُن میں سے یہاں خاص خاص اہم عنوانات کو انتخاب کر کے، انکی تلخیص مع اپنے جا بجا کے تبصرہ کے درج کرتے ہیں، ان مہات مباحث کو، منطقی ترتیب کے ساتھ، سوالات ذیل کی صورت میں رکھا جا سکتا ہے:-

(۱) تربیت کیا ہے؟

(۲) کسی تربیت کی خوبی کا معیار کیا ہے؟

(۳) اُس معیار پر کون سا نصاب پورا اترتا ہے؟

---

[1] ایجوکیشن کا اُردو ترجمہ کئی سال ہوئے انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام خواجہ غلام الحسنین بی۔ اے "فلسفۂ تعلیم" کے عنوان سے کر چکے ہیں۔ لائق مترجم کی محنت و کاوش کے پورے اعتراف کے ساتھ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، کہ ناظرین ترجمہ مذکور کے مطالعہ کے بعد بھی اگر مضمون بالا کو پڑھیں گے۔ تو بھی غالباً انکا وقت ضائع نہ ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ کچھ نئے اور اس سے مختلف نکات معلوم ہوں (فلسفۂ تعلیم" ایم اے او کالج ڈپوٹی شاپ علیگڈھ سے مل سکتی ہے)

(۴) ایک مکمل تربیت انسانی کے لیے عملی ہدایات:

(الف) عملی ہدایات، تربیت ذہنی سے متعلق۔

(ب) عملی ہدایات، تربیت اخلاقی سے متعلق۔

(ج) عملی ہدایات، تربیت جسمانی سے متعلق۔

**پہلا مسئلہ** یہ ظاہر ہے کہ انسان کا بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے، کتنا ضعیف و بے بس ہوتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اُسکے اندر مختلف اقسام کی بیشمار قوتوں کا ایک خزانہ ہوتا ہے جن کے صرف کا، نیز اچھی طرح بیٹھنا، چلنا، پھرنا، بولنا، کھانا، پینا، لوگوں سے میل جول رکھنا، کوئی نہ کوئی پیشہ یا شغل اختیار کرنا، زندگی و بقائے صحت کی فکر رکھنا، غرض اس طرح کے متعدد مراتب اُسے آگے چل کر لازمی طور پر طے کرنا ہونگے اور ان سب کے لیے استعداد و قوت اُس میں اُسی وقت سے موجود ہے۔ پس وہ ضابطہ جس سے ان تمام قوائے فطری کو نشوونما کا پورا موقع ملے، وہی تربیت ہے۔ کسی بچہ کو اگر بالغ ہو کر زندہ رہنا اور زندہ رہکر لطف حیات اُٹھانا ہے تو بجز اس کے چارہ نہیں ہے کہ وہ ابتداءً ان تمہیدی مراتب کو قائم کرلے: زندگی کیونکر قائم رکھنی چاہیے؟ کارزار ہستی و تنازع للبقا میں اپنے تئیں تحریکات مخالف سے کیونکر بچانا چاہیے؟ کسب معاش کے کیا وسائل اختیار کرنا چاہیے؟ سوسائٹی کے مختلف تعلقات کو کیونکر نباہنا چاہیے؟ دماغ کو کس طرف استعمال کرنا چاہیے؟ ہاتھ پیر سے کتنا کام لینا چاہیے؟ اور جو شے اس قسم کے تمام سوالات کا جواب دیتی ہے اسی کا نام تربیت ہے۔ اس بنا پر اگر تربیت کی منطقی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اُن ہدایات و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جن سے انسان ایک کامل و مکمل زندگی بسر کرسکتا ہے۔ یا، دوسرے الفاظ میں، وہ اُس دستور العمل کا نام ہے جس سے انسان کے تمام قوائے مخفیہ ایک صحیح و کامل نشوونما پاتے ہیں۔

فن تعلیم کے اکثر مصنفین اس نکتہ کو نظر انداز کرجاتے ہیں، اور تربیت کے نہایت محدود معنی لینے لگتے ہیں۔ لیکن اسپنسر کی دقیقہ رس نگاہ اس نکتہ سے نہ بچ سکی۔ اسنے تربیت کی ماہیت جو بیان کی ہے اُسے ہم اُسی کے الفاظ میں درج کرتے ہیں:-

ہمارے واسطے سب سے زیادہ ضروری سوال یہ ہے کہ زندگی کیونکر بسر کرنی چاہیے؟ یہاں زندگی بسر کرنے سے صرف جسمانی ضروریات کا پورا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ لفظ اپنے وسیع ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک عام سوال جو معاشرتی مسئلہ بنیادی ہے، یہ ہے کہ ہر ایک حالت اور ہر ایک معاملہ میں اپنی روش و طرز عمل کیونکر درست رکھا جائے۔ مثلاً جسم کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے؟ نفس کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے؟ اپنے معاملات کو کس طرح منتظم کرنا چاہیے؟ بال بچوں کی پرورش کس طرح کرنی چاہیے؟ معاشرتی حیثیت سے کس طرح برتاؤ کرنا چاہیے؟ حصول مسرت کے ذریعے جو قدرت نے مہیا کیے ہیں اُن سے کس طرح نفع اُٹھانا چاہیے؟ یعنی اپنی تمام قوتوں کو خود اپنے تئیں، اور نیز دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے میں کیونکر استعمال کرنا چاہیے؟ قصہ کوتاہ، کامل طور پر کیونکر زندگی بسر کرنا چاہیے؟ چونکہ ہم کو ایک مکمل معاشرت کے سیکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اس لیے جو بات تربیت سے حاصل ہونا چاہیے، وہ یہی ہے، اور تربیت کو جو فرض ادا کرنا پڑتا ہے، وہ یہی ہے کہ ہم کو کامل طور پر زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کرے۔

**دوسرا مسئلہ** تربیت کا مفہوم متعین ہو جانے کے بعد ہی دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بہترین نصاب تربیت میں کن شرائط کا وجود لازمی ہے؟ اس سوال کا مجمل جواب تو پہلے مسئلہ کے ضمن میں آچکا، یعنی وہی نصاب بہترین ہے جس سے منشائے تربیت بوجہ اکمل پورا ہو یا بقول اسپنسر

کسی نصاب تربیت کی نسبت، اسے قائم کرنے کا یہی ایک معقول طریقہ ہے کہ اِس امر کی تحقیق کیجائے کہ وہ فرائض تربیت کو کس حد تک پورا اُترتا ہے۔

گویا کسی نصاب تربیت کی خوبی کا معیار صرف یہ امر ہے کہ وہ ایک کامل زندگی کی طرف کس حد تک رہنمائی کرسکتا ہے؟ لیکن خود کامل زندگی کیا ہے؟ اسکے جاننے کے لیے ہمیں کُل افعال انسانی کی تحلیل کرنی چاہیے۔ اس تحلیل کے

وقت آتا تو ہر ادنیٰ نظر میں بھی ہر شخص کو علم ہو جاتا ہے کہ کل افعال انسانی کو دو بڑے عنوانات کی تحت میں رکھا جا سکتا ہے۔ (الف) ایک تو وہ جو لازمۂ حیات و شرط زندگانی ہیں اور (ب) دوسرے وہ جو زندگی کی مشین پر صرف رنگ روغن کا کام دیتے ہیں - اب ان میں سے اول الذکر یعنی افعال ضروری، کے پھر دو اقسام ہیں (۱) یعنی ایک وہ جو انسان کی حقیقی و فطری ضروریات میں داخل ہیں؛ اور (ب) دوسرے وہ جنھیں انسان کی ادعائی ضروریات کہنا چاہیے۔ یعنی وہ تمدن معاشرت کی وجہ سے انسان کی ضروریات میں ایسا داخل ہو گئے، کہ گویا وہ اسکی سرشت میں ہیں۔ لیکن افعال (۱) یعنی جو افعال حیات انسانی کے لیے لازمی ولابدی ہیں، ابھی انکی دو اور قسمیں ہو سکتی ہیں، اولاً وہ افعال جن سے براہ راست حفاظت نفس وابستہ ہے۔ ثانیاً وہ افعال جو بالواسطہ حفاظت نفس میں معین ہوتے ہیں۔ تو گویا سارے افعال انسانی ترتیب کے پانچ طبقات میں رکھے جا سکتے ہیں:-

- ضروریات
  - حقیقی ضروریات
    - (۱) وہ افعال جن سے حفاظت نفس براہ راست وابستہ ہے مثلاً آگ یا پانی میں کودنے سے باز رہنا، صدمہ سے اپنے تئیں بچانا، وغیرہ
    - (۲) وہ افعال جو حفاظت نفس میں بالواسطہ معین ہوتے ہیں مثلاً معاش کیلیے کوئی پیشہ اختیار کرنا۔ کھانا پکانا وغیرہ
  - ادعائی ضروریات
    - (۳) وہ افعال جن سے افزائش نسل نیز اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت مقصود ہے
    - (۴) وہ افعال جن کا مقصد ملکی معاشرتی تعلقات کو قائم رکھنا، دوسروں کی مدد کرنا، اور دوسروں کی مدد سے خود فائدہ اٹھانا ہے
- تکلفات
  - تفریحات
    - (۵) وہ افعال جن کے مخاطب صرف مذاق و جذبات ہیں، اور جن سے مقصد محض تفریح و تفنن ہوتا ہے

چنانچہ اسپنسر حیات انسانی کی ان افعال پنجگانہ میں تحلیل کر کے کہتا ہے کہ جس شے سے ان پانچوں طرح کے افعال میں انتہائی مدد ملے، وہی بہترین نصاب تربیت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے موجودہ علوم میں سے کون اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

**تیسرا مسئلہ** | اس ضمن میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مذکورۂ بالا تقسیم افعال ایک خاص ارتقائی ترتیب کے ساتھ کی گئی ہے، یعنی اس سلسلہ کی ہر کڑی اپنے بعد والی کڑی سے زمانہ اور اہمیت دونوں کے لحاظ سے مقدم ہے۔ مثلاً انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم، قسم اوّل کے افعال ہیں، کہ اگر انسان تدابیر حفظ نفس سے واقف نہ ہو تو ایک منٹ بھی زندہ رہنا ممکن نہیں، اور اسی لیے انسان کو سب سے پہلے ان ہی تدابیر کا علم ہوتا ہے، اسکے بعد ان افعال کا درجہ ہے، جن سے حصول رزق میں آسانی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ تاوقتیکہ انسان کسب معاش کے وسائل نہ رکھتا ہو، نہ خود تا دیر زندہ رہ سکتا ہے، اور نہ کسی قسم کے اجتماعی فرائض ادا کر سکتا ہے۔ پھر حصول معاش سے مطمئن ہو کر انسان پرورش اولاد پر متوجہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ قدامت زمانہ نیز اہمیت کے لحاظ سے خاندان حکومت و سلطنت پر مقدم ہوتا ہے۔ اسلیے اس قسم کے افعال کو تیسرے نمبر پر جگہ دی گئی - فرائض متعلق بہ ملک و سیاست کو چوتھے نمبر پر اس لیے جگہ دی گئی کہ انسان کے لیے مذکورۂ بالا افعال ثلاثہ سے فارغ ہونے کے پیشتر انکی جانب توجہ کرنا ممکن العمل نہیں۔ آخری درجہ تفریحی مشاغل کا ہے، اور انکو آخر میں جگہ دینا محتاج دلیل نہیں اسلیے کہ اتنی بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تکلفات و تفریحات کا نمبر ہمیشہ ضروریات کے بعد ہوتا ہے۔ اب ان فرائض خمسہ کو علٰحدہ علٰحدہ کر کے، ذیل میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے کون نصاب موزوں ہے۔

(۱) فرائض نمبر (۱) کے لیے ایک بڑی حد تک خوش قسمتی سے کسی انسانی معلم یا کسی خارجی تربیت کی ضرورت نہیں۔ جو چیزیں لازمۂ حیات ہیں، اُن میں سے اکثر ایسی ہیں جن کی تعلیم، بجائے انسانی مدارس و مکاتب کے، خود فطرت کی درسگاہ میں مل جاتی ہے۔ اسپنسر کہتا ہے:-

تعلیم کا جو حصہ سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی بذریعۂ حفاظتِ نفس خوش قسمتی سے اُسکے لیے پہلے ہی سامان کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تعلیم بے حد اہم و عظیم الشان ہے کہ اسے ہمارے [illegible] پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ ہم آئے دن ٹھوکریں کھایا کریں، اسلیے اسے فطرت نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ شیرخوار بچہ ابھی انّا کی گود ہی میں ہوتا ہے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن اجنبی شخص کی صورت دیکھ کر منہ چھپا لیتا اور رونے لگتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچہ کی فطرت ہی میں اس عقلِ حیوانی کا مادہ اور ابتدائی طور پر پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم ہر نامعلوم شئے سے، جسکے خطرناک ہونے کا احتمال ہوتا ہے، بچا کرتے ہیں..... اسکے علاوہ بچہ اس قسم کے علم کے حاصل کرنے میں از خود ہر لحظہ مصروف رہتا ہے۔ "اپنے جسم کو کس طرح سنبھالنا چاہیے؟" "اپنے اعضا کو کس طرح قابو میں رکھنا چاہیے تاکہ صدمہ سے محفوظ رہیں؟" "کون سی چیزیں سخت ہیں، جنکی ٹکر سے چوٹ لگتی ہے؟" "کون سی چیزیں بھاری ہیں جو ہاتھ یا پاؤں پر گرنے سے تکلیف دیتی ہیں؟" یہ سب باتیں اور اس قسم کی اور معلومات جو موت یا حادثہ سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، بچہ ہر وقت حاصل کرتا رہتا ہے۔

لیکن اگرچہ فطرت ایک بڑی حد تک اس معاملہ میں خود ہی ہماری اتالیق ہے تاہم اس باب میں بھی ہم انسانی تربیت سے بالکل بے نیاز نہیں رہ سکتے بلکہ بہت سی اُن چیزوں سے بچنے کے لیے جو رفتہ رفتہ ہمیں موت و ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں، ہمارے لیے خارجی تعلیم و تربیت ناگزیر ہے۔

کسی اوزار کے صدمہ یا ضرر سے بچنے کے علاوہ، دوسرے اسباب سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس سے بھی جسم کو محفوظ رکھنا لازم ہے، مثلاً بیماری و موت، جو قوانین فزیالوجی کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ معاشرت کامل کے لیے صرف اُن ہی افعال کو دفع کرنا ضروری نہیں جن سے یکایک زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بلکہ اُن بے عقلی کی حرکتوں اور نادانی کی عادتوں سے بھی بچنا لازمی ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کا کام تمام کرتی ہیں..... یہ سچ ہے کہ اس خصوص میں بھی فطرت نے ہماری ہدایت کا سامان کسی قدر پہلے ہی سے مہیا کر دیا ہے..... چنانچہ تھکن کا معلوم ہونا، سخت گرمی یا سردی کا محسوس ہونا، ایسی قوی تحریک ہمارے دل میں پیدا کرتا ہے کہ اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور اگر لوگ اس قسم کی تحریکات کا حکم، عادۃً اسی وقت بجا لائیں، جب کہ انکا عمل زیادہ قوی ہو، تو صحت و زندگی کے متعلق بہت کم خرابیاں پیدا ہوں۔ مثلاً جس وقت جسم یا دماغ کام کرتے کرتے تھک جائے، اگر ہمیشہ اسی وقت کام چھوڑ دیا جائے، یا اگر کبھی بغیر بھوک کے کھانا نہ کھائیں، اور بغیر پیاس کے پانی نہ پییں، تو ایسی صورت شاذ و نادر ہی پیش آئے گی کہ ہمارا نظامِ جسم، کام کرنے سے عاری ہو جائے۔ مگر زندگی کے قوانین سے لوگ اس قدر جاہل ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ احساسات (Sensations) اُنکے قدرتی رہنما ہیں، اور اگر ایک مدت دراز تک اُنکے احکام کی نافرمانی کر کے انھیں واماندہ اور بیکار نہیں بنا دیا ہے تو قابلِ اعتبار رہنما ہیں۔ پس اگرچہ فطرت نے آفرینشِ عالم کی غرض و غایت کو پیشِ نظر رکھ کر صحت کی حفاظت کے لیے ہمیں عمدہ رہنما دیدیے ہیں، تاہم ہماری لاعلمی و ناواقفیت انھیں بہت کچھ نکما و بیکار بنا دیتی ہے۔

اس بنا پر، حفاظتِ نفس کی غرض سے ہمارے لیے اس علم کا حاصل کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے، جس سے قوانینِ صحت اور اصول بقائے حیات معلوم ہوتے ہیں، پس بقول اسپنسر

علم فزیالوجی کا اس قدر حصہ جو اسکے عام اصول اور روزانہ زندگی سے اُن اصول کے تعلقات کو سمجھنے کے لیے درکار ہے، کسی معقول نصاب تربیت کا نہایت ضروری جزو ہے۔

(۲) دوسرے نمبر پر وہ افعال ہیں، جو بالواسطہ حفظِ نفس کا کام

دیتے ہیں، یعنی وسائل کسب معاش۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بجز ملازمت پیشہ افراد کی محدود جماعت کے، عموماً لوگ جس کام میں مشغول رہتے ہیں، وہ تجارتی کاروبار یا لین دین ہی، اور ظاہر ہی کہ اسکی قابلیت کا انحصار سائنس پر ہے۔

> بعض ادنیٰ ترین جماعات کو چھوڑ کر، غور تو کرو کہ تمام آدمی کس کام میں مصروف ہیں؟ وہ تجارتی مال کے پیدا کرنے، تیار کرنے اور تقسیم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور پھر تجارتی مال کے پیدا کرنے، تیار کرنے، اور تقسیم کرنے کی لیاقت کس شے پر منحصر ہے؟ یہ صرف اُن طریقوں کے استعمال پر منحصر ہے، جو مختلف قسم کے تجارتی مال کے لیے مناسب ہیں، یعنی یہ امر صرف اُس مال کے طبعی کیمیائی، یا حیاتی خواص سے واقفیت پر منحصر ہے، یا یوں کہو کہ سائنس پر منحصر ہی۔

چنانچہ یہ ایک واقعہ بدیہی ہی، کہ صنعت و حرفت یا لین دین کے کاموں میں ریاضی کی؛ فن تعمیر پیمایش، و نجاری میں علم ہندسہ کی؛ فن جہازرانی کے لیے، جسکے اوپر تمام بیرونی تجارت کا انحصار ہی، علم ہیئت کی؛ فن زراعت کاشتکاری و باغبانی کے لیے علم نباتات و کیمسٹری کی؛ فن آہنگری و انجنیری کے لیے علم جرثقیل (Mechanics) کی؛ رنگریزی اور قلعی، صابون، چینی و شیشہ وغیرہ کی مصنوعات کے لیے کیمسٹری کی؛ مویشیوں و دیگر جانوروں کے کاروبار کے لیے بیالوجی کی؛ اور تقریباً ہر قسم کی مشینری تیار کرنے کے لیے، حرارت، الکٹریسٹی و مقناطیس کے قوانین یعنی علم طبعیات کی تعلیم از بس ضروری ہی۔ اور اسپنسر کے اس دعوے پر، کہ ذرائع معاش کی افزونی کے لیے سائنس دانی لازمی ہی، تاریخ و تجربہ کی قوی شہادات موجود ہیں، چنانچہ زمانہ قدیم میں جس وقت یونان و روم کے باشندے اپنے تمول و مرفہ الحالی کے لیے ممتاز تھے، یہ وہی زمانہ تھا، جبکہ یہاں سائنٹفک تعلیم بھی عروج پر تھی۔ اور آج بھی جن ممالک کی دولت ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہی، جن ممالک کی سرزمین زر و جواہر اُگل رہی ہی جن ممالک کی مصنوعات سے ہمارے بازار اور منڈیاں لبریز ہیں، وہی مقامات ہیں جہاں سائنس کا آفتاب بوقت نصف النہار پر ہی۔

(۳) اسکے بعد فرائض والدین کا نمبر آتا ہی، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس خصوصیت میں بھی، یعنی جہاں تک تربیت اولاد کا تعلق ہی، ہم بعض اصناف سائنس کے سخت محتاج ہیں۔ جب یہ مسلم ہی کہ (بقول اسپنسر)

> بچوں کے نفس و جسم کا نشو و نما، خاص قوانین کے تابع ہے،
> جب تک اُن قوانین کی ایک خاص حد تک پابندی نکیجائے، بچوں کی موت یقینی ہے۔
> جب تک ان قوانین کی پوری پابندی نکیجائے سخت جسمانی و ذہنی امراض پیدا ہوجانا لازمی ہیں،
> جب اُن قوانین کی پوری پابندی کیجاتی ہے۔ تب ہی جاکر بچوں کو پورا کمال حاصل ہو سکتا ہے۔۔

تو ان مقدمات کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد یہ خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہی کہ جو لوگ ایک دن ماں باپ بننے والے ہیں، اُنکے لیے فن تربیت اولاد کا جاننا، یعنی اُن اصول سے واقفیت حاصل کرنا جن کے اوپر انکی اولاد کی موت و زندگی، صحت و بیماری کا دارمدار ہی، ناگزیر ہی۔ یہ اصول جہاں تک جسمانی صحت کا تعلق ہی، فزیالوجی کے، اور جہاں تک دماغی صحت کا تعلق ہی، سائیکالوجی کے، بعض قوانین ہیں۔ اسی بنا پر اسپنسر اس نتیجہ اور بالکل صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہی کہ

> انسانی زندگی کے تیسرے بڑے حصہ کے باقاعدہ انتظام کے لیے فزیالوجی کے اصول اولیہ، اور سائیکالوجی کے ابتدائی حقائق کی کسی قدر واقفیت لازمی ہی

(۴) چوتھا نمبر فرائض معاشری کا ہی، یعنی وہ تعلقات جو ہمیں بطور سوسائٹی کا ایک جزو ہونے کے، دوسرے افراد کے ساتھ رکھنا پڑتے ہیں، مگر ظاہر ہی کہ ان تعلقات کا، حسن اسلوب قائم رکھنا موقوف ہی، فطرت انسانی کی، انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیات کے سمجھنے پر، اور فطرت انسانی ہی کی رازشناسی کا دوسرا نام سائیکالوجی اور سوشیالوجی

کی تعلیم ہو۔ اس امر کو اسپنسر اپنے منطقی تسلسل کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے:
قوم [illegible] ہے [illegible] ہونے کے [illegible] افعال سے
ہوتا ہے۔ ایسے [illegible] افعال [illegible] سے حل
ہوتا ہے۔ لیکن اگر [illegible] افعال [illegible] ہیں [illegible]
ان قوانین کو سمجھ نہ لیا جائے۔ انکے افعال سمجھ میں نہیں آ سکتے [illegible]
یا تو [illegible] سے تعلق رکھتے ہیں یا نفس سے [illegible]
اور [illegible] کی [illegible] ترقی [illegible] کے لیے
لازمی ہے

یا بالفاظ دیگر

تمام [illegible] ترقی و [illegible] زندگی [illegible] زندگی [illegible] پیچیدہ [illegible]
وابستہ ہیں [illegible] ضروری ہے کہ [illegible] قوانین زندگی کے ماہر ہوں
اور [illegible] وقت [illegible] قوانین [illegible] سمجھ [illegible]

(۵) [illegible] ہم ان اشغال زندگی کو لیتے ہیں جن کی غرض تفنن و تفریح ہوتی ہے، اور جو [illegible] خود نفس کے حظ نفس کا کام دیتے ہیں۔ یہ افعال [illegible] اس [illegible] ہیں، کہ انسان کی حیات ان کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ورنہ عملاً ایسا کون شخص ہے، جو دن رات کام میں مشغول رہتا ہے، اور اپنے وقت کا کوئی حصہ مشاغل تفریح میں صرف نہیں کرتا؟ اسی لیے افعال انسانی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبہ کی تربیت بھی ناقابل لحاظ نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس استعداد کی نشوونما کس علم سے ہوتی ہے؟ اسپنسر جواب دیتا ہے کہ سائنس سے۔ یہ جواب بظاہر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن تامل و تعمق کی نظر سے دیکھو تو اسکی واقعیت ظاہر ہو جائیگی۔ یہ اشغال آخر بھی، جن کے لیے ایک خاص لفظ فنون لطیفہ کا ہے، چار بڑے عنوانات کے تحت میں رکھے جا سکتے ہیں۔ بت تراشی (Sculpture)، مصوری، موسیقی، اور شاعری۔ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ ان سب کی نشوونما کے لیے سائنس دانی لازمی ہے۔

پہلے بت تراشی کو لیجیے۔ کیا کوئی شخص ایک باکمال بت تراش ہو سکتا ہے تاوقتیکہ اسے انسانی ڈھانچے کے رگوں، پٹھوں، اور ہڈیوں کی مقامات، انکی تقسیم، انکے باہمی تعلقات، اور انکی حرکات سے واقفیت نہ ہو؟ اور پھر صرف فزیالوجی کا علم کافی نہیں بلکہ جر ثقیل (Mechanics) کے ابتدائی اصول بھی جاننا ضروری ہیں۔ اسے اسپنسر ایک مثال سے یوں سمجھاتا ہے:-

تصویر کے استحکام کے لیے ضرور ہے کہ مرکز ثقل (Centre of Gravity) سے جو عمود (Perpendicular) ڈالا جائے جسے خط سمت (Line of Direction) کہتے ہیں، عماد (Support) کے قاعدہ (Base) کے اندر واقع ہو۔ اور اسی لیے ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اس حالت میں کھڑا ہوتا ہے، جسے قیام الراحت (Standing at Ease) کہتے ہیں، جس میں ایک ٹانگ بالکل سیدھی تنی رہتی ہے، اور دوسری ذرا ڈھیلی اور خمیدہ رہتی ہے، تو خط سمت سیدھی تنی ہوئی ٹانگ کے پاؤں کے اندر ہوتا ہے، مگر بت تراش مسئلہ توازن (Principle of Equilibrium) سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ حالت قیام کی اس وضع کو عموماً اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ خط سمت دونوں پاؤں کے نیچے واقع ہوتا ہے۔

اسی طرح اعلی مصوری کے لیے علم مناظر (Optics) اور روشنی کے قوانین سے واقفیت لازمی ہے۔ اسپنسر لکھتا ہے:-

چینی تصویریں کیوں بے ڈول اور بھدی ہوتی ہیں؟ محض اس لیے کہ مصور صورتوں کے قوانین کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے، تصویر اتارتے وقت مختلف اشیا کے فاصلوں اور انکی جسامت کے چھوٹے بڑے ہونے کا کافی خیال نہیں کرتے، اور تصویر کے روشن اور تاریک حصہ کو باقاعدہ رنگ و روغن لگانے کے اصول سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ بچہ کی بنائی ہوئی تصویروں میں



مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا بانکی پور

جو لوہ دیبور کے مقدمہ میں ماخوذین کی جانب سے وکالت کر رہے ہیں

ہو، سکے کیا عیب ہوتا ہو۔ ان میں اصلیت نہیں ہوتی، اور تصویر میں اصلیت کا نہ ہونا اسی قاعدہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہو۔ جسکے مطابق اشیاکی صورتیں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی رہتی ہیں۔

یہی حال موسیقی کا ہو۔ اگر یہ سچ ہو کہ موسیقی نام ہو جذبات کی تصویر کا۔ تو یہ ماننا بداہتہً لازم آتا ہو، کہ راگ میں تاثیر اسی وقت پیدا ہو سکتی ہو، جب وہ جذبات موجودہ کے عین مطابق ہو، اور اس لیے اسپنسر کے نزدیک ماہر موسیقی کو سائیکالوجی کے ابتدائی اصول جاننا لازم ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک، ماہر موسیقی کے لیے فن سائیکالوجی کے معلومات کافی نہیں، تا وقتیکہ وہ علم اصوات (Aconstics) سے بھی واقف نہ ہو۔ اسلیے کہ راگ سنتے وقت جو تاثیر دل میں اثر اور جمعیت پیدا کرتی ہو، وہ صرف راگ کا مفہوم و مضمون نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں گونے کی آواز کے اتار چڑھاؤ، اور سروں کے اونچے نیچے ہونے کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہو۔ اور اس لیے گانے والے کو آواز کے قوانین سے بھی واقف ہونا ضروری ہو۔

اب رہی شاعری۔ تو اگرچہ عام خیال کے بموجب سائنس اور شاعری دو متناقض چیزیں ہیں، لیکن اسپنسر جیسے دقیق النظر کی تسکین اس عامیانہ خیال سے کیوں کر ہو سکتی تھی؟ وہ بیل کا ہم آہنگ ہو کر کہتا ہو کہ شاعری صرف اصلی جذبات کی تصویر کا نام ہو، جو الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی گئی ہو، اور اگر یہ صحیح ہو تو شاعری کے ڈانڈے سائیکالوجی سے ملجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ اسوقت تک دنیا میں جتنے بڑے سے بڑے حقیقی شاعر ہوے ہیں (مثلاً شکسپیر، گیٹے، حافظ، غالب) غالباً وہی سب سے بڑے سائیکالوجسٹ بھی ہوے ہیں، گو یہ بالکل ممکن ہو، کہ وہ اپنے مفہوم کا اظہار، سائیکالوجی کے خاص اصطلاحی الفاظ میں نہ کر سکتے ہوں۔ اسپنسر اس سے بڑھ کر اسکا بھی مدعی ہو کہ سائیکالوجی سے قطع نظر کرکے دیگر اصناف سائنس بھی شاعری کے منافی نہیں، بلکہ ایک بڑی حد تک اسکے معاون ہیں، اپنے دعوے اور دلیل کو وہ ذیل کے دلچسپ طریقہ سے پیش کرتا ہو:-

یہ خیال جو عام طور پر مشہور ہو کہ سائنس و شاعری باہم مخالف ہیں، ایک دھوکا ہو۔ یہ بات حقیقت میں سچ ہو کہ ادراک (Cognition) اور جذبہ (Emotion) جو معرفت طبعی (Conscionsness) کی مختلف حالتیں ہیں، ایک دوسری کو خارج کرنا چاہتی ہیں، اور یہ بھی سچ ہو کہ حد اعتدال سے بڑھ کر قوت مفکرہ کا عمل، جذبات کو مردہ کر دیتا ہو۔ علی ہذا القیاس جذبات کا عمل اگر حد اعتدال سے زائد ہو تو قواے مفکرہ کو مردہ کر دیتا ہو۔ اور اس معنی میں تو تمام ذہنی قوتیں ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ لیکن یہ دعوی کہ سائنس کی تحصیل، قوت متخیلہ کے خواہ مخواہ برخلاف واقع ہوئی ہو، ہرگز صحیح نہیں، بلکہ بخلاف اسکے سائنس، شاعری کی اس اقلیم کو جو سائنس سے ناواقف لوگوں کے لیے بالکل چٹیل میدان ہو، ہمارے سامنے بے پردہ آشکارا کر دیتا ہو۔ جو لوگ سائنس کی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں، کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اپنے مضامین کی شاعری کا لطف کم نہیں، بلکہ زیادہ خوبی و صفائی کے ساتھ اٹھاتے ہیں۔ جو شخص جیالوجی مصنف Hugh Miller پر غور کریگا، یا Lewis's "Sea Side" کا مطالعہ کریگا، اسکو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ شاعری کے جوش کو سائنس سرد نہیں کرتا۔ بلکہ اور زیادہ بھڑکاتا ہو، اور جو شخص Gœthe کی سوانح عمری پر غور کریگا، اسپر یہ حقیقت ضرور منکشف ہو جائیگی کہ شاعر اور ماہر سائنس ایک ہی وقت میں یکساں قابلیت سے کام کر سکتا ہو، کیا یہ عقیدہ بیہودہ نہیں، کہ جو شخص جس قدر زیادہ قدرت کا مطالعہ کریگا، اسیقدر اسکی توقیر کریگا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ پانی کا قطرہ، جو عام لوگوں کی نظر میں صرف پانی کا قطرہ ہو، اسکی وقعت ایک عالم طبعیات کی نظر میں کچھ کم ہو جائیگی، جو اس بات کو جانتا ہو، کہ اس قطرہ کے عناصر ایک قوت کے ذریعہ سے وابستہ ہیں، اور اگر وہ قوت یکایک زائل ہو جائے، تو اس سے بجلی کی چمک پیدا

ہوگی؟ کیا تم سمجھتے ہو، کہ ایک گول چٹان کا پتھر، جسپر متوازی خطوط کے نشانات کھدے ہوے ہیں، جاہل آدمی کے دل میں اُسی قدر شاعرانہ خیالات پیدا کرتا ہی جتنے کہ عالم طبقات الارض کے دل میں، جو اس بات کو جانتا ہی کہ دس لاکھ سال پیشتر ایک برف کا ٹیلا اس چٹان پر بہتا ہوا گزرتا تھا؟ اصل یہ ہی کہ جو لوگ سائنس کے مشاغل میں کبھی مصروف نہیں رہے، وہ شاعری کے بہت بڑے حصہ سے جو اُنکے گرد و پیش ہی، اندھے اور محروم ہیں۔ جس شخص نے اپنی نو عمری میں پودوں اور کیڑوں کو تلاش کرکے نہ جمع کیا ہو، وہ اُس دلچسپی کی آدھی قدر بھی نہیں جانتا، جو گلی کوچوں اور خاردار جھاڑی کی قطاروں سے حاصل ہو سکتی ہی۔ جس شخص نے معدنی اشیاے متحجرہ کی تلاش نہ کی ہو اسکو اُن شاعرانہ جذبات کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، جو اُن مقامات پر جانے سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں یہ خزانے زیر زمین پائے جاتے ہیں..... پس اگر صحیح طور پر خیال کیا جائے تو سائنس (ضد شاعری ہونا تو کجا) بجاے خود ایک شاعری ہے:

پس مشاغل زندگی کی جو تحلیل ابتدا میں کی گئی تھی، تحقیق سے معلوم ہوا کہ اُن میں سے ہر جزو کی نشو و نما کے لیے بہترین تیاری سائنس کی تحصیل ہی۔ اسپنسر ایک فخر آمیز اطمینان کے ساتھ اپنی تحقیقات کا اِن الفاظ میں لُبِّ لُباب درج کرتا ہی:-

جو سوال بجنے آغاز مضمون میں کیا تھا، یعنی: کون علم سب سے زیادہ قیمتی ہی؟ اور جو پہلے نہایت پریشان کُن معلوم ہوتا تھا، اب وہ نسبتہً آسان ہو گیا۔ اسکا صرف ایک جواب ہی، کہ "سائنس"۔ تمام بیانات پر عدالت کا حکم ناطق یہی ہی۔ براہ راست حفاظت نفس یعنی زندگی و صحت قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہی۔ بالواسطہ حفاظت نفس کے لیے بھی جسکو ہم حصول معاش کہتے ہیں، سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہی۔ فرائض والدین کے باقاعدہ ادا کرنے کے لیے مناسب ہدایت صرف سائنس سے حاصل ہو سکتی ہی۔ گذشتہ و موجودہ قومی زندگی جسکے بغیر کوئی شہری، صحیح طور پر اپنے کردار کا انتظام نہیں کر سکتا، اسکا دروازہ کھولنے کے لیے جس کنجی کی ضرورت ہی وہ سائنس ہی ہی۔ علی ہذا القیاس جملہ اقسام فنون کی تکمیل اور اُس سے لطف اُٹھانے کے لیے بھی سائنس ہی ہمکو تیار کرتا ہی۔

یہ ساری گفتگو اس لحاظ سے تھی، کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کس علم کے معلومات و ہدایات سب سے زیادہ کارآمد ہوتے ہیں، لیکن ابھی یہ دیکھنا باقی ہی کہ تربیت ذہنی کے اُن اجزا کے لیے جنکا تعلق زندگی کے ہر شعبہ کے ساتھ ہی (مثلاً قوت حافظہ) کون سا علم ضروری ہی؟ اسکے جواب میں عموماً لوگ، زبانوں کی تعلیم کو پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس سے ذہن کی ایک خاص تربیت (Discipline) ہوتی ہی، جس سے ہر شعبہ زندگی میں مدد ملتی ہی۔ مگر اسپنسر عام خیال کے برخلاف، اس اعزاز کا مستحق بھی سائنس کو قرار دیتا ہی۔ بقول اُسکے

قوت حافظہ کا فائدہ، مطالعہ الفاظ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہی، لیکن سچ یہ ہی کہ حافظہ کی مشق کے لیے، سائنس اس سے وسیع تر میدان مہیا کرتا ہی۔ نظام شمسی کا پورا حال ذہن میں محفوظ رکھنا، کہکشاں کی بناوٹ کے متعلق تمام دریافت شدہ امور کا ازبر کر لینا، مرکب مادی چیزوں کی تعداد کو، جنھیں بجز مخصوص پروفیسروں کے کوئی نہیں شمار کر سکتا، یاد رکھنا، معمولی کام نہیں۔ اور سالمات (Atoms) کی ترکیب، اور اُنکے مرکبات کے تعلقات کا یاد رکھنا، تاوقتیکہ انسان تمام عمر، کیمسٹری کے مطالعہ میں نہ صرف کرے، تقریباً ناممکن ہی..... اسی طرح نباتات کی انواع تقریباً تین لاکھ بیس ہزار تک پہنچ چکی ہیں۔ اور حیوانات کی مختلف نوعی صورتوں کا اندازہ، علماے حیات کے تخمینہ میں بیس لاکھ تک ہو چکا ہے۔

اسی طرح قوت فیصلہ و امتیاز کی ترقی، اور علت سے معلول، اور معلول سے علت کے دریافت کی قابلیت کا نشو و نما، جس قدر سائنس کے ذریعہ سے ہوتا ہی، زبان کی تعلیم میں اسکا عشر عشیر بھی ممکن نہیں۔ اسکے علاوہ، جو چیزیں اخلاق کی روح رواں ہیں، مثلاً آزادی کے

صبر و استقلال، راست بازی۔ ان سب چیزوں کی تکمیل بھی بآسانی منفک و دفعات کے دوران تحقیقات میں بخوبی ہوتی ہے، بخلاف اسکے تحصیل زبان سے اجتہادِ فکری مفقود ہو جاتا ہے۔ معلمِ لسان، بلا وجوہ وسبب بتلانے۔ ایک تحکمانہ لہجہ میں صرف یہ کہتا ہے کہ "فلاں لفظ کے یہی معنی ہیں" "فلاں محاورہ یوں ہی ہے" اور اس سے طالب علم میں بجائے آزادی اجتہاد و شوقِ جستجو کے۔ غلامی، تقلید اور قناعت پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔

الغرض اسپنسر کے نقطۂ خیال سے، اگر دنیا میں کوئی شئے ایسی ہے جو انسان کی جسمانی، ذہنی، اور اخلاقی قوی کو ہر طرح پر نشوونما دیتی ہے، اور جو تربیت کا حقیقی مفہوم پورا کرتی ہے، تو وہ صرف سائنس ہے۔ اسکا یہ منشا نہیں کہ ہر شخص اعلیٰ سائنس دان ہو جائے، ایسا ہونا ممکن العمل ہے اور نہ ضروری و مناسب۔ بلکہ ہر شخص کو صرف سائنس کے ابتدائی اصول جاننا ضروری ہیں

(باقی آئندہ)

"متعلم"

# کلامِ شاد

از مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب بالقابہم

جز ذاتِ تو ایدوست دگر هیچ کسے نیست — ای بے ہمہ و با ہمہ واللہ بسے نیست
مرغِ ملکوتم بسر عرش مقام است — این کالبد چار عناصر قفسے نیست
در عالمِ تنہائی و شبہاے جدائی — کس مونس و غمخوار مرا جز نفسے نیست
ہر چند کہ نمایش کنی آں محفلِ عشق است — جائیکہ کسے را خبر از حال کسے نیست
ایں دیدہ و دل طالبِ وصلِ تو مدام اند — جز حاصلِ سودائے محبت ہوسے نیست
غرقابِ جہاں گشت تلاطم جو بپا شد — از سر چو گذشت آب دگر خار و خسے نیست
از غیر چرا حاجتِ خود را طلبد کس — تا دامنِ وصلِ تو اگر دسترسے نیست
یارب بتو فریاد از آنست کہ باشد — در ہر دو جہاں غیرِ تو فریادرسے نیست

جز ذاتِ خدا شاد ز کس کار ندارم
دانم کہ مرا مونس و غمخوار کسے نیست

# برخوردار

الفاظ کیا ہین؟ حروف کا مجموعہ۔ حروف کیا ہین؟ بات چیت گفت و شنید اور تلفظ کا صحیح ذریعہ۔ بات چیت، گفت و شنید یا تلفظ کیا ہو؟ چند آوازین یا چند صدائین جو جاندار اور غیر جاندار مخلوق کے حلق یا منھ اور تصادم سے نکلتی یا سرزد ہوتی ہین۔ جو آواز نکلتی اور جو صدا ہمارے کانون تک پہنچتی ہو وہ کوئی نہ کوئی ہوائی شکل یا ہوائی مجسمہ رکھتی ہے۔ اگرچہ بظاہر بولنے یا تلفظ کے بعد اسکی کوئی شکل یا مجسمہ نہین ہوتا مثلاً جسوقت ہم دو دکھا دو سنا دو کہتے یا تلفظ کرتے ہین تو اسوقت ان الفاظ یا ان صداؤن کا کوئی وجود یا کوئی شکل نہین ہوتی گو مخاطب ان کا مطلب اور مفہوم سمجھ لیتا ہو لیکن اگر متکلم اور مخاطب دونون سے یہ کہا جائے کہ ان صداؤن ان آوازون ان الفاظ کی صورت یا شکل کیسی اور کیا ہو تو دونون مین سے کوئی بھی نہین بتا اور دکھا سکے گا۔

خود متکلم بھی اس کا ثبوت سوائے اسکے اور کچھ نہین دے سکے گا کہ اسکے منھ سے یہ چند الفاظ نکلے تھے اور ان کے یہ معانی تھے۔ یا ان کا یہ مطلب اور یہ مفہوم تھا۔[له]

جسطرح مادی مواد مین ایک طاقت اور ایک اثر ہوتا ہو اسی طرح الفاظ اور فقرات یا جملون مین بھی ایک طاقت اور ایک اثر ہوتا ہو۔ تعریف خوشامد مذمت اور گالی بھی الفاظ اور فقرات کا مجموعہ ہین۔ دونین ایک اثر اور ایک جذب ہو۔ تعریف اور خوشامد سے انسان خوش ہوجاتا ہو اور مذمت سے اسکی طبیعت اور دل و دماغ پر ایک تکلیف دہ اثر پڑتا ہو؟ ہر لفظ و ہر فقرہ ہی نہین بلکہ ہر حرف اور ہر جملہ اور ہر فقرہ مین ایک طاقت اور ایک اثر ہو اور اسکی وضع اور ترتیب ایک حقیقت یا ایک کیفیت رکھتی ہو اور ہر لفظ یا ہر فقرہ اور ہر جملہ کی حقیقت اور کیفیت دوسرے الفاظ و دوسرے فقرات و دوسرے جملون سے جداگانہ اور ممتاز ہوتی ہو۔

اگر مختلف الفاظ کی ساخت ترکیب اور ترتیب پر غور کیا جائے تو پتہ لگ جائے گا کہ واضعین نے ان کی ساخت اور ترتیب یا ترکیب مین کوئی نہ کوئی ایسی خوبی یا عمدگی رکھی ہو جو کسی نہ کسی رنگ مین قابل اعتراف ہو۔ الفاظ کیا ہین؟ ایک ایسا اعلان ایک ایسی منادی جو اپنی ذات مین سوائے صداقت اور حقیقت کے کچھ رکھتی ہی نہین گو کہ کہنے والے اور سننے والے کے دل و دماغ مین اور ہو۔ لیکن الفاظ یا ان الفاظ مین جو بولے اور سنائے جاتے ہین کوئی غلطی نہین ہوتی۔ جو شخص منھ سے لفظ مین، تو، وہ، تیرا، جیسا، نکالتا ہو انکی وہ کیفیت جو انکی ذات مین مستتر ہو کبھی زائل نہین کرسکتا۔ اسکا دل کوئی اور منصوبہ کرسکتا ہو لیکن ان الفاظ کی معنوی کیفیت نہین تبدیل کرسکتا مثلاً مین کے اطلاق سے کبھی تو کا مفہوم نہین لیا جا سکتا یا تو کے اطلاق سے کبھی وہ

---

له یہ بحث بھی دلچسپی سے خالی نہین کہ الفاظ اور معانی یا مفہوم مین کیا نسبت ہو جب ہم کوئی آواز یا کوئی لفظ یا کوئی فقرہ منھ سے نکال لیتے ہین تو اس کا کوئی نہ کوئی مفہوم یا مطلب ہوتا ہو جب ہم یہ کہتے ہین کہ ایسا کرنا چاہیئے، ایسا ہونا چاہیئے، ایسا ہوسکتا ہو تو یہ فقرات ایک مفہوم اور ایک مطلب رکھتے ہین۔ سننے والا فوراً ہی سمجھ جاتا ہو کہ گوینده یہ کہتا اور یہ چاہتا ہو۔ ان الفاظ مین یہ مطلب بھرا گیا ہو یا یہ الفاظ اس مفہوم کے قابل ہین گویا الفاظ قالب و جسم ہین اور مفہوم یا معانی جان اور روح۔ یا الفاظ اور فقرات ذات ہین اور معانی یا مفہوم صفت اور کیفیت یا حقیقت جسطرح بعض انسان باوجود انسان ہونے کے کوئی خوبی نہین رکھتے اسی طرح بعض الفاظ اور فقرات باوجود الفاظ اور فقرات ہونے کے کوئی مفہوم یا اثر نہین رکھتے جنھین مہمل یا بے معنی کہا جاتا ہو یہ بحث ہم کسی دوسرے مضمون مین کرین گے کہ الفاظ کا مفہوم یا معانی کس طرح مختص ہوئے ہین اور کس طرح لفظ تو؟ تھا، وہ، ازس سے وہی معانی مراد لیے جاتے ہین یا لے جا سکتے ہین جو بہ عرف عام لوگ لیتے ہین۔ ۱۲

مراد نہین لے سکتے جیسے زید زید ہے ایسے ہی مین مین ہے
الفاظ تین کیفیتین رکھتے ہین :-
(الف) کیفیت معنوی۔
(ب) کیفیت مرادی
(ج) کیفیت مفہومیہ۔

معانی اور مفہوم مین فرق ہے۔ لفظ آرزو کے معنی خواہش اور طلب کے ہین لیکن آرزو کا مفہوم کچھ اور ہے معانی عام ہین اور مفہوم خاص ہے اکثر اوقات ان دونون مین کوئی فرق نہین کیا جاتا۔ کیفیت مرادی ان دونون سے الگ ہے۔ لفظ آرزو ایک معنی رکھتا ہے لیکن ایسی مفہوم نہین رکھتا جب ہم یہ کہتے ہین کہ ہماری مراد یہ ہے تو اُس کا مطلب ایک مفہوم ایک خاص مفہوم ہوتا ہے جو عام معانی سے کسی حد تک مغائرت رکھتا ہے۔ الفاظ سے بلحاظ معانی ہر دو مفہومات کے کام لینا ایک دلچسپ استدلال ہے بعض الفاظ بجائے خود فقرات ہین ایسے فقرات ہین جن سے بہت کچھ استدلال کیا جا سکتا ہے۔

بعض الفاظ ایسے ہین کہ اُن پر علمی اور عملی رنگ مین بہت کچھ کہہ سکتے ہین اور ہر لفظ کی بابت جُداگانہ لکھا جا سکتا ہے کیونکہ ہر لفظ[1] کے معنے اور مفہوم دوسرے الفاظ سے جُدا ہوتے ہین۔ الفاظ کی دو قسمین ہین :-
(الف) الفاظ علمی۔
(ب) الفاظ کاروباری۔

دونون قسمون کے الفاظ کے معانی اور مفاہیم انسانی زندگی کے واسطے عملی رنگ مین بہت کچھ مواد رکھتے ہین۔ اگرچہ ان دونون قسم کے الفاظ مین نسبتاً فرق ہے۔ لیکن عملی رنگ مین دونون قسم کے الفاظ مین ایک طاقت اور ایک اثر ہے بہت سے الفاظ مثالاً پیش کیے جا سکتے ہین۔ مثلاً برخوردار تین اجزا سے مرکب ہے۔

بر
خور
دار

تینون جُداگانہ معانی رکھتے ہین۔
بر کے معنے ثمرہ، میوہ، سینہ، آغوش، بغل، کنار کے ہین اور اگر بردن بمعنی لیجانا سے استدلال کیا جائے تو کہا جائے گا کہ یہ صیغہ امر بمعنی لیجا کے بھی ہے۔ خور کے معنے کہانے یا کھاؤ کے ہین اور دار کے معنے رکھو یا رکھنے کے ہین۔ تینون کا مجموعہ **برخوردار** ہوتا ہے۔

فارسی اور اردو زبان مین چھوٹون کو **برخوردار** یا برخورداری نورچشمی لکھا جاتا ہے یا لکھا جاتا تھا اگرچہ صاحب غیاث اللغات نے برخورداری نورچشمی لکھنا خلاف محاورہ فارسی قرار دیا ہے لیکن برخوردار کے لکھنے کا اکثر رواج ہے۔ برخوردار نام بھی ہوتا ہے۔

بادی النظر مین یہ لفظ محض ایک ایسا لفظ ہے جو خط وکتابت مین یا گفتگو مین اطلاق پاتا ہے۔ بزرگ یا بڑے چھوٹون کو محض ایک رسم کے طور پر برخوردار لکھنے کے عادی ہین جس غرض اور جس مدعا سے یہ لفظ ترکیب یا ترتیب دیا گیا ہے بہت کم لوگ اس مدعا اور اس غرض سے اسکا استعمال کرتے ہین وہ اعزا اور وہ لوگ بھی جنھین برخوردار سے مخاطب کیا جاتا ہے بہت کم اسکی عملی صورت اور عملی مفہوم پر غور کرنے کے عادی ہین پڑھکر یا سُن کر محض ایک رسمی خطاب سمجھ کر خاموش رہتے ہین۔ اگر عملی رنگ مین دونون جانب اسکی اصلیت اور حقیقت پر غور کیا جاتا تو لوگ سمجھنے لگتے کہ یہ کیسا جامع لفظ یا فقرہ ہے اور اسکے اندر کیا کچھ بھرا گیا ہے۔ چونکہ اسکی اصلی کیفیت سے بہت کم لوگ

[1] اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ زبانون مین الفاظ مرادف بھی ہوتے ہین لیکن میرا یہ مذہب ہے کہ ایسا ترادف ٹھیک معنون مین ترادف نہین ہوتا بلکہ مجازی طور پر ترادف کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ ایک ہی زبان کے اندر جن الفاظ کو مرادف کہا جاتا ہے اُنمین کلی ترادف نہین ہوتا بلکہ کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ ۱۲

واقفیت رکھتے ہین اسواسطے اسکا اطلاق یا استعمال بہت دفعہ مہمل بھی کیا جاتا ہی۔

برخوردار اپنی تہ مین یا اپنے اندر ایک روحانی تمدنی اور اکونمکل فلاسفی رکھتا ہی جسمین انسانی تمدن انسانی روحانیت انسانی دوراندیشی اور انسانی پیش بینی کے اصول پر توجہ دلائی گئی ہے

جب برخوردار کا اطلاق کیا جاتا ہی تو اسکا مفہوم کیا ہوتا ہی؟

ا جو کچھ دنیا مین انسان کماتا پیدا کرتا بناتا اور حاصل کرتا ہی اسکے تین حصے کرنا چاہئیے۔

الف- بر یعنی اپنی کمائی اپنے اندوختہ اپنے مال اپنی دولت سے خدا کی راہ مین بھی کچھ دینا چاہئیے رفاہ عام اور قومی کامون کے واسطے بھی کوئی حصہ خاص کرنا چاہئیے جو شخص ایسا کرتا ہی گویا وہ اپنی آئندہ زندگی یا آئندہ دنیا کے واسطے جسے دوسری زندگی کہنا چاہئیے ایک ذخیرہ جمع کرتا ہی۔

ب- خور- چونکہ انسانی زندگی انسانی آسائش اپنے کھانے پینے اور صرف کے مدنی سے نہین گزر سکتی اسی واسطے ان مایحتاج کے واسطے بھی اپنی کمائی اپنے اندوختہ کا کچھ نہ کچھ حصہ خاص کرنا چاہئیے جو شخص ایسا نہین کرتا وہ اپنی زندگی اپنے اوقات اور اپنی آسائش کو ایک تہلکہ مین ڈالتا ہی نہ صرف خود ہی کو بلکہ اپنے وابستگان کو بھی۔

ج- دار- تمدنی مراحل مین ضروری ہی کہ انسان اپنی کمائی اور اپنے اندوختہ مین سے آئندہ زندگی اور ذریات یا وابستگان کے واسطے بھی کچھ بچائے تاکہ ضرورت اور بیروزگاری کے وقت اسکو دوسرے ابنائے جنس کے پاس اپنی حاجت لیجانیکا موقع نہ ملے اور نہ اسکا بوجھ دوسری جماعت پر نہ پڑے۔

جو شخص راہ خدا مین کچھ نہین دیتا وہ اپنی قوم اور انسانی نسل کی واجبی امداد سے گریز کرتا ہی جو شخص قومی ضروریات اور قومی کامون مین کوئی حصہ نہین لیتا وہ اپنی زندگی کا جہاز خشکی پر لیجانیکا عزم رکھتا ہی اور توقع یہ رکھتا ہی کہ وہ ساحل انجام پر سلامتی سے جا پہنچے۔

جو شخص کنجوسی اور بخل سے واجبی مصارف سے نہین بچاتا ہی اور جو اپنے کنبہ اور بال بچہ کے واسطے خرچ نہین کرتا وہ سب کی زندگی وبال مین ڈالتا ہے۔

جو شخص کچھ بچاتا نہین وہ اپنے تئین اور نیز اپنے بال بچہ اور دیگر وابستگان کو ایسے پانی مین غوطہ لگانے کی ہدایت کرتا ہی جو ایک مہلک گرداب ہی۔

برخوردار کی تاویل بھی اکثر غلط کی جاتی ہی۔ بر کا یہ مفہوم نہین کہ اندھا دھند یا ایسے طور پر صدقہ و خیرات کی جائے کہ لینے والے لوگ پہلے سے بھی بدتر حالت مین ہو جائین اور یہ سمجھ لین کہ جب اور لوگ بیٹھے بٹھائے یونہی انکی پرورش اور امداد کر رہے ہین تو خود انھین محنت و مشقت اور تردد کی کیا ضرورت ہے۔

بر کا مفہوم دوسرے الفاظ مین یہ ہی کہ روپیہ یا دولت و مال ان امور اور ان مقاصد مین خرچ کیا جائے جس سے رفاہ عام کی مشکلات حل ہون اور ان لوگون کو امداد ملے جو واقعی امداد کے قابل ہین۔ ان قومی مراحل کی منزلین بسہولت طے ہو سکین جن پر قومون اور نسلون کی بہت کچھ ترقی اور خوشحالی کا مدار ہی نہ یہ کہ ایسے طور پر صدقہ و خیرات دیجائے کہ لوگ اور بھی کم محنتی اور گدائی کے دلدادہ ہو جائین۔

خور کا صحیح مفہوم یہ ہی کہ اپنی زندگی کے ضروری سامان اور ضروری آسائشین صادق تہذیب و شائستگی کے ماتحت بہم پہنچائی جائین۔ اپنے کنبہ اور اپنے بال بچہ اور ذریات کے واسطے تربیت اور تعلیمی سامان یا مواد ایک خوش اسلوبی سے وقت پر بہم پہنچایا جائے اور ان کی پرورش دوستانہ اور مربیانہ اصول پر کیجائے۔ خدانخواستہ اس طریق سے نہین کہ انکی اصلی تربیت اور پرورش کے وسائل کو کھو دیا جائے۔

خور کا یہ مفہوم نہین ہی کہ خود ہی کھائے پیئے دوسرون کی خبر نہ لے بلکہ یہ کہ ہر مستحق کی پرورش کرے۔ جو اپنا حق ہے خود لے جو بال بچہ

اور کینہ کا حق ہو اُسے دے، جو قوم اور ملک کا ہو اُنھیں دے جو گورنمنٹ کا حق ہو اُسکے حوالہ کرے۔

دار کا یہ مفہوم نہیں ہو کہ دولت کما کر زمین مین دبا چھوڑے یا اُس سے کوئی کام نہ لے بلکہ یہ کہ اُس سے مفید کام لے۔ اولاد کی تعلیم اور تربیت مین لگانا بھی دار کی تعریف یا حد مین آسکتا ہو۔ دوستون کی مدد کرنا بھی دار کا مفہوم رکھتا ہو۔ آئندہ زندگی یا آئندہ زمانے کے واسطے بچانا اور محفوظ رکھنا دار کی حد مین داخل ہو۔

ان تینون اجزا کی تفصیل اور تشریح ایک طول طویل بحث چاہتی ہو جو ایک حد تک دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ موجودہ بحث سے یہ ثابت ہو کہ اس چھوٹی سی ترکیب مین کیا کچھ خزانہ بھرا ہو وہ جملہ یا وہ لفظ جو ہر ایک شخص لاپروائی کے ساتھ لکھنے کا عادی ہو لکھنے ہی کا نہین بلکہ کہنے کا بھی اپنی تہ مین یا اپنے اندر کیا کچھ رکھتا ہو۔ صرف یہی نہین صدہا اور ہزارون الفاظ اور فقرات یا جملے ایسے ہین جو اسی قسم کی خوبیان اور عمدگیان اپنے اندرونہ مین رکھتے ہین۔ لوگ غور نہین کرتے۔ رسمی رنگ مین استعمال اور اطلاق کرنے کے عادی ہین۔

حقیقت الامور پر غور کرنا تہذیب اور ترقی کا پہلا زینہ ہو۔ اُستاد طالب العلمون کو رسمی معانی سے آشنا کرنے کے عادی اور مشاق ہین۔ اگر حقیقت اور کیفیت سے قرار واقعی شاگرد آگاہ کیئے جائین تو تعلیم بہت کچھ مفید ہو سکتی ہو۔ تعلیم پانے کے بعد بھی بہت کچھ وقت ایسے حقائق اور کوائف پر غور کرنے کا ملتا ہو لیکن اکثر لوگ ایسا موقع رائگان دینے سے دریغ نہین کرتے۔ تعلیم صرف پڑھنے اور پڑھانے کا نام نہین بلکہ غور کرنے اور سوچنے کا نام ہو جو لوگ غور نہین کرتے یا سوچتے نہین وہ صرف عوارض کے مشاق یا شیدائی ہین۔ حقائق سے اُنھین کوئی محبت اور کوئی لگاؤ نہین۔

حقیقت شناسی ہی اصلی تعلیم اور حقیقی تربیت ہو انسان سوچنے اور غور کرنے کے واسطے ہی بنایا گیا ہو۔ اُسکی خلقت کی علت ہی یہی ہو اور اسی وجہ سے اُسے اور دون پر فضیلت اور شرف کی ممتاز ڈگری ملی ہو۔

سلطان احمد

## دکن

دکن مین جو نہین لب پہ ہے اُنکے ہاے دکن
وطن کہین ہو مگر ہین سبھی فدائے دکن

مین سوچتا ہون پہ بس اُس طرف نہین کہتا
مگر بہشت کی ہمسر ہے اب فضائے دکن

یقین جانیئے دُنیا کا کوئی خطہ ہو
ملے کسی کو۔ نہ لیگا کبھی بجائے دکن

بڑے بڑے جو مدبر ہین صاف کہتے ہین
یہی زمانہ معراج ہے برائے دکن

ملا ہے شاہ رعایا نواز، دریا دل ایسا
شراب عیش کی جو کھول کر پلائے دکن

ملا دکن کو جو غازہ جمال یوسف* کا
فلک نے نذر دیا عیش رونمائے دکن

کوئی غریب ستایا گیا قلمرو مین
نظیر ایک بھی ایسی تو آج لائے دکن

زہے جمال تو گویہ قتیل عشوہ و نازہ
ہزار جان گرامی فدائے پائے دکن

ہے جانفزائی کا دعویٰ اگر تو سچ ہو گا
کہ خستہ جانون کو اکسیر ہے ہوائے دکن

ہمائے اوج ہی بسمل اُسی کے قبضہ مین
خلوص سے جو ہوا آکے جبہ سائے دکن

امین الحسن بسمل

* اعلیٰ حضرت بندگان عالی سے مراد ہے

# ایشور چندر ودیاساگر

کلکتہ کے مغرب میں تقریباً ۴۰ میل کے فاصلے پر بیر سنگھا ایک مقام ہے گذشتہ صدی کے شروع میں مفلس بنگالی برہمن بندوپادھیا نام کا ایک غریب برہمن خاندان اس جگہ آباد ہوا۔ اس کنبہ کا سربراہ رام جے ترکالنکار نامی ایک شخص تھا جس کی بیوی درگا دیوی وہاں کے ایک نامی پنڈت امانت ترکالنکار کی بیٹی تھی۔ رام جے آزاد خیال کا آدمی اور سیاحت کا شائق تھا اس لیے وہ بسا اوقات سالہا سال تک گھر سے غائب رہتا تھا اور اس اثنا میں اپنی بیوی کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ دیا کرتا تھا لیکن امانت ترکالنکار چونکہ خود نہایت مفلوک الحال تھا اس لیے درگا دیوی اور اس کے بچوں کا بوجھ اس کے واسطے اور بھی تکلیف کا باعث ہوتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب عورت کو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے چرخہ کاتنا پڑا۔ لیکن اس سے اسقدر کم آمدنی ہوتی تھی کہ وہ امداد جو روپیہ دو روپیہ وقتاً فوقتاً اپنے باپ کی طرف سے ملتا تھا ملا کر بھی اپنے کنبہ کو بمشکل فاقہ کشی سے بچا سکتی تھی۔ ان لڑکوں میں سب سے بڑے کا نام ٹھاکر داس تھا جو اپنی عمر کے پندرھویں سال میں اپنی ماں اپنے چھوٹے بھائی اور اپنی چار بہنوں کے گزارے کیلئے روزی تلاش کرنے کلکتہ پہنچا۔ یہ چونکہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے وہ ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتا تھا جو سنسکرت میں فضیلت رکھنے کے لیے مشہور تھے تاہم وہ خود اس زبان میں بہت کم مہارت رکھتا تھا اور چونکہ اسے اپنے سنسکرت کے مایہ علم میں اصلاح یا اضافہ کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس لیے ناچار اس نے انگریزی کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی کیونکہ اس زمانہ میں اس زبان کی تھوڑی بہت شدبد رکھنے والوں کو یورپین تاجرانہ کوٹھیوں میں ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ یہ واقفیت اس نے ایک تاجر کے کلرک سے حاصل کی۔ اس کوشش میں اکثر اوقات اسے شام کی روٹی کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ کچھ مدت کے لیے ایک فیاض منش شودر نے اپنے خرچ سے اسکی رہائش اور خوراک کا انتظام کر دیا لیکن اس شخص کی آمدنی چونکہ خود اس کے اپنے اخراجات کی بمشکل کفیل ہو سکتی تھی اس لیے ٹھاکر داس کو بیچ بیچ میں فاقہ کرنا پڑتا تھا جس سے تنگ آ کر آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی پیتل کی تھالی فروخت کر کے تھوڑی سی نقدی حاصل کر لوں۔ لیکن جب وہ تھالی بیچنے چلا تو اسے کوئی خریدار نہ ملا مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ رفتہ رفتہ مفلسی یہاں تک غالب ہوئی کہ ایک دن اسے بالکل کھانا نہ ملا۔ اور بھوک کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے وہ بازار میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اس طرح چلنے پھرنے سے بھوک اور بھی تیز ہوئی اور وہ تھک کر ایک عورت کی دوکان کے آگے جو خشکہ بیچتی تھی بیٹھ گیا۔ اسے اس حالت میں بیٹھا دیکھ کر اس عورت نے سبب دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے ذرا سا پانی پیا چاہتا ہوں۔ عورت نے خیال کیا برہمن دیوتا ہو خالی پیٹ پانی پلانا ٹھیک نہ ہوگا اس لیے اس نے اسے تھوڑے سے چاول دیے جنھیں وہ جلدی جلدی کھا گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس نے پوچھا کیا تم نے آج کھانا نہیں کھایا؟ جس کا جواب بلا تامل اس نے نفی میں دیا۔ عورت رحمدل تھی۔ اسکی حالت دیکھ کر دل پسیجا۔ تھوڑا دہی اور چاول کیلے کے پتہ پر ڈال کر اس کے آگے رکھ دیے اور کہہ دیا آئندہ کبھی اس طرح بھوکے ہو تو میرے یہاں چلے آیا کرو۔ اس واقعہ کے تھوڑی مدت بعد اسے آٹھ روپیہ ماہوار کی ملازمت مل گئی۔

غریب درگا دیوی کے لیے یہی ایک بڑی بھاری رقم تھی۔ انہی ایام میں ٹھاکر کی شادی ایک فاضل پنڈت کی بیٹی بھگوتی دیوی سے ہو گئی اور ان کا پہلوٹھا بچہ ایشور چند پیدا ہوا۔



پنڈت ایشر چندر ودیا ساگر

ایشور چندر ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ان کے دادا رام جے کو خواب میں نظر آیا کہ میرے خاندان میں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو تمام خاندان کا نام روشن کرے گا اور اپنے ہموطنوں کو بیشمار فوائد پہنچائیگا۔ اسی قسم کی پیشین گوئی بھونند بھٹاچاریہ نامی ایک جوتشی نے بھی کی تھی۔ بالآخر ستمبر ۱۸۲۰ء میں بھگوتی دیوی کے گھر وہ مضبوط صحت اور خوبصورت بچہ پیدا ہوا جسکی صورت دیکھکر ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری توقعات پوری کر دکھائیگا۔

بچہ چونکہ ورشبھ راس میں پیدا ہوا تھا اس لیے بڈھا رام جے اسے مذاقاً "بچھڑا" کہا کرتا تھا اور فی الحقیقت اسے اپنی زندگی کے اندر مختلف غلطیوں اور تعصبات کا مقابلہ کرنے میں ایک سانڈ کی طرح جد وجہد کرنا پڑی۔ بچہ اپنے دادا کی طرح جسمانی طور پر مضبوط تھا چنانچہ ایک موقعہ پر جب عالم شباب میں وہ کسی سیاحت کو طے کر رہا تھا اسکا ایک ریچھ سے مقابلہ ہوگیا جس نے ہر چند اسے بہت زخمی کر دیا تاہم اس نے اسے لوہے کا ڈنڈا مار کر جان سے مار دیا۔

جب ایشور چندر کی عمر پانچ برس کی ہوئی تو انھیں بیر سنگھ کی ایک پاٹ شالا میں تعلیم حاصل کرنے بھیجدیا گیا جہاں اُنھوں نے کالی کنت چٹوپادھیا نامی معلم سے بنگالی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آخرالذکر انکی تعلیم سے بہت دلچسپی رکھتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی بھر شاگرد کی اس سے خوب ہی محبت رہی۔

نوجوان ایشور چندر بڑا ہی شوخ طالب علم تھا۔ وہ اپنے ہمسایہ کے باغیچوں سے پھل چرا لاتا، انکی فصلیں خراب کرتا اور کپڑے جو دھو کر خشک کرنے کے لیے دھوپ میں رکھے ہوتے انھیں خراب کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمسایہ کے لوگ اکثر اس کے شاکی و نالاں پائے جاتے تھے لیکن باوجود اسکے اُستاد نے کبھی اس سے زیادہ مار پیٹ کا سلوک نہیں کیا۔

ایشور چندر کی عمر ۹ برس کی تھی کہ ان کے والد ٹھاکر داس انھیں مزید تعلیم دلانے کلکتہ لے گئے۔ ان دنوں سڑکوں کی حالت نہایت خراب تھی جسکی وجہ سے ۵۶ میل کا فاصلہ تین یوم میں پورا ہوا اور یہیں سے انکی پیادہ روی کی وہ طاقتیں ترقی پذیر ہونا شروع ہوئیں جو بعد میں انکے اندر نمایاں طور پر موجود پائی جاتی تھیں۔ بسا اوقات اُنھوں نے بیرسنگھا اور کلکتہ کا درمیانی فاصلہ صرف ایک دن میں طے کیا اور ایک موقع پر اُنھوں نے ۲۵ گھنٹہ میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ چلنے میں بڑے بڑے مضبوط جوان ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور بارہا دیکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہمسفروں کو آرام دلانے کی خاطر ان کا بوجھ بھی اپنے ہی سر پر رکھ لیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں بھی جب کہ امراض اور بڑھاپے کی وجہ سے انکی جسمانی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی ایک روز جبکہ وہ کرماٹان میں جہاں وہ علٰحدگی کی زندگی بسر کرتے تھے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سمیت سیر کرتے پھر رہے تھے، ان کے پوتوں میں سے ایک نے جو جوان عمر تھا کہا "دیکھوں آپ مجھ سے بھی زیادہ تیز چلنے والے ہیں۔ کسی روز ہمارا اور آپ کا مقابلہ ضرور ہوگا۔" عمر رسیدہ ایشور چندر نے جواب دیا کہ "کسی روز کیا ابھی کر کے دیکھ لو۔" اتنا کہکر اُنھوں نے دھوتی کو خوب کس لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نوجوان اور اس کے بعض ہمراہیوں کو چند فرلانگ پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ شیخی باز نوجوان نے ان تک پہنچنے کی جان توڑ کر کوشش کی مگر رہ گیا۔ بوڑھا بابا دور سے اسکی کوششوں کو دیکھتا اور مسکرا کر چپ رہ جاتا تھا۔

جب ایشور چندر کو کلکتہ پہنچایا گیا تو ان کے والد ٹھاکر داس کو صرف [illegible] ماہانہ ملتے تھے لیکن اس پر بھی اُنھوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ انھیں بہتر سے بہتر ممکن تعلیم دلائی جائے۔ ایک شریف النفس کائستھ نے باپ بیٹے پر رحم کھا کر انھیں نہ صرف اپنے ہاں رہنے کے لیے جگہ دی بلکہ کھانے کپڑے کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس کنبہ کے سبھی آدمی بالخصوص ایک بیوہ عورت (رئیمنی) ایشور چندر سے بے حد محبت کرتی تھی اور اسے اپنے بیٹے سے بھی بڑھ کر سلوک کیا کرتی تھی۔ ایشور چندر نے جہاں اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اس کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ "میں نے رئیمنی سے بڑھکر مہربان محبت کرنے والی اور فراخدل عورت نہیں دیکھی

اس پاکباز عورت کی تصویر مدت العمر میرے دل پر نقش رہے گی۔ وہ ایک دیوی تھی جسکی مین اپنی مان سے بھی بڑھکر تعظیم کرتا ہون۔ اور بڑھاپے مین بھی جب کبھی اسکی یاد آتی ہو تو بے اختیار آنکھون سے آنسو نکل پڑتے ہین۔ ایشور چند جب تک زندہ رہے ہمیشہ عورت کی عزت و تکریم کرتے رہے۔ اس احساس کی بنا عام خیال کے موجب اس نیک سلوک کے باعث ان کے دل مین قائم ہوئی تھی جو رحمدلی نے ان سے اُس خنکہ بیچنے والی عورت نے ان کے والد سے کیا تھا۔

کلکتہ پہنچنے کے بعد ابتدائی تین ماہ کا عرصہ ایشور چند رنے ایک ورنیکولر پاٹ شالا مین بسر کیا جہان انھون نے تھوڑی بہت بنگالی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھین سنسکرت کالج مین داخل کرا دیا گیا جس جگہ عمر رسیدہ پنڈت پرانے طریق پر طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے معلم اور متعلم دونون فرش پر بوریہ بچھا کر بیٹھا کرتے تھے۔ حاضری مین باقاعدگی یا پابندی اوقات کا فریقین کو خیال نہ ہوتا تھا اور معلمون مین سے بعض دن کا ابتدائی حصہ سو کر گذارا کرتے تھے۔ تعلیم کے آٹھ کورس مقرر تھے جن کی سرسری تفصیل حسب ذیل تھی:-

(۱) گرامر یعنی ویاکرن۔
(۲) علم ادب یعنی ساہتیہ۔
(۳) علم کلام۔
(۴) قانون یا سمرتی۔
(۵) فلسفہ۔
(۶) ویدانت۔
(۷) علم نجوم۔
(۸) آیورویدہ۔

ظاہر ہو کہ ان سب کو ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی تھی لیکن اس زمانہ کے معلم بڑے قابل اور فاضل لوگ ہوتے تھے اور تعلیم نہایت اطمینان بخش طریقہ پر دی جاتی تھی۔ ایشور چند رکو جنوری ۱۸۲۹ع مین اس جگہ داخل کرایا گیا تھا اور ۱۸۴۱ع تک اس جگہ زیر تعلیم رہے۔ بالآخر جب انھون نے تعلیم ختم کی تو ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی۔ اس جگہ انھون نے جو ۱۲ سال بسر کئے اس کے دوران مین انھون نے علوم کی شاخون مین سے چھ مین کامیابی حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا زمانہ نہایت ہی شاندار تھا، یعنی ایسا جو صرف نادر قابلیت اور خوبی کے لوگون کو نصیب ہو سکتا ہو۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کالج کی ایک جماعت سے دوسری مین ترقی کرتے رہے سوائے ایک کے وہ تمام امتحانات مین نمبر اول پر رہے اور ہمیشہ انعام اور وظائف حاصل کرتے رہے۔ زمانہ طالب علمی کے تیسرے سال مین ساہتیہ کے پروفیسر نے انھین اپنی جماعت مین داخل کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انکی عمر اسوقت صرف ۱۱ سال کی تھی لیکن آخرکار اسے بھی انکی قابلیتون کا قائل ہو کر داخل کرنا پڑا۔ ۱۲ سال کی عمر مین سنسکرت کے ایسے عمدہ شلوک لکھ سکتے تھے کہ سب لوگ انکی تعریف کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی مین ان کا رسوخ اسقدر بڑھ چکا تھا کہ ایک پنڈت کو انکی سفارش پر فلسفہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ تعلیم ختم کرنے سے پہلے وہ خود بھی گرامر کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہو گئے اور ایک مرتبہ جب نیائے شاستر کے ایک دقیق مسئلہ پر انکی پنڈت رام موہن ترک سدہانت سے جو اپنے عصر کا بڑا نامور فیلسوف ہو گذرا ہے بحث ہو گئی تو انھون نے اسے از روئے استدلال مغلوب کر دیا۔ جب اس واقعہ کی خبر بڈھے ٹھاکر داس کو ملی تو وہ فوراً کالج مین پہنچا اور پنڈت جی کے پاؤن کی خاک اپنے بیٹے کے سر پر رکھی تاکہ وہ انکسار کا سبق سیکھ سکے۔ ایک اور عمر رسیدہ پروفیسر کو انکی دوراندیشی اور عاقبت بینی کے خیال پر یہان تک اعتماد تھا کہ جب اس نے بڑھاپے مین ایک جوان لڑکی سے دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ کیا تو اس مسئلہ پر ان سے رائے لینی ضروری خیال کی بجا لیکہ ان دنون ان کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی۔ ایشور چند رنے اپنے معلم کے دلائل کو بڑے صبر و تحمل سے سنا اور وہ صرف اسی نتیجہ پر پہنچ سکے کہ بڈھے پنڈت کا اپنی پوتی کی عمر کی لڑکی سے

شادی کرنا حد درجہ کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی پر دلالت کرتا ہی، اس لیئے اسے صاف لفظون مین بتادیا کہ آپ اگر یہ کام کرین گے تو سخت غلطی کے مرتکب ہونگے۔ لیکن اسوقت ان کے کہنے کی پروانہ کی گئی اور نہ صرف بڈھے نے اس لڑکی سے شادی کرلی بلکہ وہ ایشور چندر کو اپنی بیوی دکھانے کے لیئے ساتھ بھی لے گیا۔ وہ اپنے معلم کے ہمراہ بہت کچھ تامل کے بعد گئے اور لڑکی کو دو روپیہ منھ دکھائی کے دیئے۔ وہ غور سے اس کا منھ دیکھے بغیر واپس ہونے ہی کو تھے کہ بڈھے نے ان کا بازو پکڑکر اسکا چہرہ پورے طور پر دیکھنے پر مجبور کیا۔ ایشور چندر نے اس حسین لڑکی کے چہرہ کی طرف دیکھا اور فوراً وہان سے لوٹ آئے۔ جب انھون نے اس بات پر غور کیا کہ قدرتی طور پر اس غریب کو عنقریب مختلف دشواریان اور مصیبتین پیش آنے والی ہین تو بے اختیار انکی آنکھون سے آنسو نکل پڑے۔ ان کے خیالات بالکل سچ ثابت ہوئے اور لڑکی چھوٹی عمر ہی مین بیوہ ہو گئی۔

جب ایشور چندر نے سنسکرت کالج کا آخری امتحان پاس کرلیا تو انھین "ودیاساگر" (بحر العلوم) کا خطاب دیا گیا۔ اسکے علاوہ کالج کے سارے پروفیسرون نے جُداجُدا طور پر انھین سندات دین کیونکہ انمین سے ہر ایک کو اس قسم کے ہونہار شاگرد کا معلم ہونے پر فخر تھا۔ ان دنون انکی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ اِس سے اندازہ ہوسکتا ہی کہ چھوٹی عمر ہی مین وہ کسقدر ذہین اور محنتی تھے۔

لیکن خالی ذہانت رکھنے سے کسی شخص کو قابل ذکر قابلیت حاصل نہین ہوسکتی۔ معلوم ہوتا ہی کہ ودیاساگر کو ہمیشہ اس مقولہ کی صداقت کا اعتراف تھا کہ "ذہانت کے ساتھ غیر معمولی محنت سے بھی کام لیا جائے تو انسان اس رفعت پر پہنچ سکتا ہی جو دُنیا مین اس کا نام روشن کرے۔" اگر کسی شخص کو ودیاساگر کے برابر ذہانت حاصل ہوتی لیکن وہ غیر معمولی محنت اور جدّوجہد کا معتقد نہ ہوتا تو شاید اُن حالات مین کام کرتے ہوئے جو ایشور چندر کو پیش آئے وہ کبھی ان کے برابر ناموری حاصل نہ کرسکتا۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہی ودیاساگر ایک بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کی آمدنی صرف اتنی تھی کہ جس سے وہ بمشکل اپنا اور اپنے کنبہ کے لوگون کا گذارا چلا سکتا تھا۔ اِن حالات مین جیسا بُرا بھلا کھانا کپڑا نصیب ہوتا اسی کو غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اتنی توفیق حاصل نہ تھی کہ کوئی اچھا سا مکان کرایہ لیا جائے یا کوئی نوکر کام کرنے کے لیئے رکھین۔ اِن وجوہ سے ودیاساگر کو بچپن مین خراب کھانا، بُرے کپڑے، مضر صحت مکان، اور دقت تواحات مین زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ انھین اپنے والد اور بھائیون کے سبھی کام مثلاً سودا خریدنا، کھانا پکانا، جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، صفائی کرنا، خود ہی کرنا پڑتے تھے۔ اِن بواعث سے انھین صبح اور رات کے پہلے حصّہ مین مطالعہ کرنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ لیکن اِن مشکلات پر بھی جب کبھی انھین وقت ملتا وہ مطالعہ مین منہمک رہتے تھے۔ بسا اوقات دیکھا جاتا تھا کہ سبزی پک رہی ہی اور یہ کتاب لیئے پاس بیٹھے پڑھ رہے ہین یا مدرسہ کو جارہے ہین تو راستہ مین کتاب دیکھتے جاتے ہین۔ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور وہ وقت کی بے حد قدر کرتے تھے۔ لیکن اِس پر بھی چونکہ انھین بہت کم اور ناکافی وقت مل سکتا تھا اسلیئے وہ بہت رات تک مطالعہ کرتے تھے۔ سُنا گیا ہی کہ وہ رات کے دس بجے سوتے تھے، اور ان کے اصرار پر ان کا والد ۲ بجے انھین جگادیا کرتا تھا۔ اسوقت سے لیکر صبح تک وہ برابر مطالعہ مین مصروف رہتے تھے۔

ان کے سونے کی جگہ ایک ۳ × ۲ فٹ کے برآمدہ مین تھی جہان وہ اتنی ہی لمبی چوڑی چٹائی پر لیٹ رہتے تھے۔ لیکن جب ان کا تیسرا بھائی انکے پاس آکر رہنے لگا تو ایک ہمسایہ نے ازراہ عنایت اِن کے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ دیدیا جس کا فرش بہت سیلا تھا جہان مچھر کھٹمل اور جھینگر بکثرت تھے۔ لیکن جو شخص دن رات مین اسقدر محنت کرتا ہو اسے مچھرون، پسّوؤن، یا جھینگرون کی کیا پروا ہوسکتی ہی۔ چھوٹی عمر مین وہ پستہ قد تھے اور انکا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس لیے ان کے ہم جماعت

طلبہ انھین "جسور ے کا ئی" یا "کسو ر ے جائی" کہا کرتے تھے جس سے مراد جیسور کی اس مچھلی سے ہی جس کا سر بہت بڑا ہوتا ہی۔ ان کا والد باوجود محبت کرنے کے اکثر ان سے سختی کا سلوک کرتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے ابتدائی ایام مین وہ ہر روز رات کے وقت ان کا سبق سنتا اور ذرا سی غلطی بھی ہو جاتی تو انھین مارتا پیٹتا تھا۔ ان ایام مین وہ اس بات پر بھی مصر رہتا تھا کہ رات کو فلان وقت سے پہلے نہ سوتا اور اس سے پہلے کبھی ان کی آنکھ لگ جاتی تو انھین بڑی سختی سے بیدار کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی نیک دل رمینی ان کی شفارش کردیا کرتی تھی لیکن ایک دفع پر تو ان کے والد نے انسے اسقدر سختی کا سلوک کیا کہ باوجود ایک مطیع اور فرمانبردار لڑکا ہونے کے انھین بھاگ کر رام دھن گنگولی (ایک ہمسایہ کے مکان مین پناہ لینا پڑی۔ اتفاقات زمانہ سے آخر ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ سنسکرت کالج کے پرنسپل بنے اور رام دھن گنگولی ان کے ماتحت چھوٹی حیثیت مین کام کیا کرتا تھا۔ انھین واپس اپنے والد کے مکان پر پہنچا یا گیا لیکن باپ کی طرف سے ان کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی رہی تھی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عمداً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ طبیعت کے ایسے پکے تھے کہ جب ایک بات کا مصمم ارادہ کر لیا تو مار پیٹ کے باوجود اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔ لیکن آخر کار ان کے والد کو اپنی غلطی محسوس ہو گئی، اور اس نے ان سے محبت و نرمی کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ سے والدین ایک بہت اچھا سبق حاصل کر سکتے ہین۔ نہ صرف والدین بلکہ استادون اور تمام با اختیار لوگون کا فرض ہی کہ وہ بجاے سختی کے نرمی سے کام لیا کرین۔ انسانی طبیعت کو مطیع کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہین کہ نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے۔ حد درجہ کے شریف، مطیع اور نیک بچے بھی غیر معمولی سختی اور عدم توجہی سے نافرمانبردار اور گستاخ بن جاتے ہین۔ جب دیکھا جائے کہ وہ اس غلط راستے پر چلنے لگے ہین تو لازم ہی کہ وہ شخص جو ان پر اختیار رکھتا ہو فوراً اپنی روش بدلکر ان سے مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کرنے لگے۔

جب وہ کالج مین تعلیم پا رہے تھے اور ان کی عمر ۱۴ برس کی تھی انکی شادی دین مئے دیوی سے ہوئی جو شترگھن بھٹاچارجی نامی ایک مرفہ الحال اور عزت دار برہمن کی خوبصورت بیٹی تھی۔ اپنی بیوی سے انھین شروع ہی سے بے حد محبت رہی اور اسی کے بطن سے ان کا بیٹا نارائن چندر اور چند لڑکیان پیدا ہوئین۔ اسکا انتقال ان کے دو سال قبل ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۸۳۹ء مین جب انھون نے سنسکرت کالج کی طرف سے "ودیا ساگر" کا خطاب حاصل کیا تو اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کے پہلے اہم حصہ کا خاتمہ ہو گیا یعنی اُس حصہ کا جس مین اُنھون نے اپنی مشرقی تعلیم مکمل کی تھی۔ لیکن یہ تعلیم انکی اس کامل تعلیم کا محض ایک جزو تھی جسکی بدولت وہ اپنی زندگی مین کارہاے نمایان سرانجام دے سکے۔ انھین اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے انگریزی سیکھنا ضروری تھا جو سنسکرت کالج مین اُنھون نے بدرجہ اقل سیکھی تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انکے دل مین اس بات کی تیز خواہش پیدا ہوئی کہ انگریزی زبان سیکھین اور وہ واقعہ یہ تھا کہ سنہ ۱۸۴۱ء مین انھین فورٹ ولیم کالج کا ہیڈ پنڈت مقرر کیا گیا جہان وہ انگریز سویلین کو ملک کی ورنیکولر زبانین سکھایا کرتے تھے۔ اس حیثیت مین ہر روز ان کا واسطہ انگریز طلبہ سے پڑتا تھا اور چونکہ اسی سلسلے مین انکا اکثر دیگر نامی گرامی انگریزون سے میل جول ہوتا تھا اس لیئے قدرتی طور پر ان کے دل مین اس بات کی کوشش پیدا ہوئی کہ انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کرین۔ پس اُنھون نے بڑی محنت، استقلال اور ہمت کے ساتھ اس زبان کو سیکھنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے مین اس پر بخوبی قادر ہو گئے۔ اس زبان مین بہت جلد اُنھون نے یہان تک قابلیت حاصل کر لی کہ انکے انگریزی مضامین کی عام

طور پر تعریف کی جاتی تھی۔ مشہور و معروف ڈاکٹر درگا چرن بنرجی (جو بابو سریندر ناتھ بنرجی کے والد بزرگوار تھے) اور راج نرائن باسو ہر دو صاحب نے انھین انگریزی سیکھنے مین بہت کچھ مدد دی اور انھی ایام مین انکی ملاقات مشہور و معروف زمیندار راجہ رادھا کنت دیب بہادر، مشہور بنگالی مصنف اکشے کمار دت اور بعض دیگر مشاہیر بنگال سے ہوئی۔ وہ خود بعض ہم عمر سیدھے سادے عالمون کو سنسکرت پڑھایا کرتے تھے اور ان کا طریق تعلیم ایسا عجیب اور جدید تھا کہ جو مضمون سنسکرت کالج کے دیگر پروفیسر برسون مین پڑھاتے انکو یہ تھوڑے عرصہ مین پڑھا سکتے تھے۔ اپنے ایک شاگرد کی خاطر جس نے بعد مین ایک لائق استاد ثابت ہو کر ان کا نام بخوبی روشن کیا انھون نے سنسکرت کی مشہور ویاکرن (گرامر) "مگدہ بودھ" کو رات بھر کے اندر اندر خلاصہ کر کے بنگالی زبان مین لکھ لیا تھا۔

جن دنون وہ ہیڈ پنڈت کا عہدہ رکھتے تھے ہندوستان کے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کا معائنہ کرنے گئے اور بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۶ء تک بنگال کے مختلف حصون مین ۱۰۱ ورنیکولر اسکول جاری ہو گئے۔ ان اسکولون سے ان طلبہ کو بہت فائدہ حاصل ہوا جو سنسکرت کالج سے تعلیم پا کر نکلتے تھے کیونکہ ان اسکولون کے لیے معلم مقرر کرنے کا کام ودیا ساگر کے سپرد تھا۔ اس مین شک نہین کہ انکی اس کارروائی سے سنسکرت کالج کے پروفیسر بہت ناراض ہوئے تاہم حقیقت یہ ہو کہ انھون نے جن استادون کو نامزد کیا ان سب کی حالت مین کبھی اپنے ضمیر کا خون نہین کیا۔ راستی کے مقدر پابند تھے کہ ایک موقعہ پر کسی بات پر سنسکرت کالج کے پرنسپل سے تکرار ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے کوئی ایسی بات کرانا چاہتے تھے جسے یہ اپنے ضمیر کے خلاف پاتے تھے۔ آخر کار یہ اپنے عہدہ سے استعفا دینے پر آمادہ ہو گئے گو بعد مین یہان تک نوبت نہ پہنچنے پائی تاہم ان کے اس طریق عمل سے ان کے افسرون کی نظر مین انکی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اپنے موجودہ عہدہ پر وہ ۵۰ ماہوار تنخواہ پاتے تھے جو کسی طرح بھی زیادہ متصور نہین ہو سکتی لیکن جب ایک موقعہ پر سنسکرت کالج مین انھین گرامر کے پروفیسر کی جگہ دی جانے لگی جس سے انھین للعہ زیادہ ملنے کی امید تھی تو انھون نے اپنے نفع کی پروا نہ کرتے ہوسے یہ عہدہ مشہور و معروف تارا ناتھ ترک واچسپتی کو دلا دیا کیونکہ وہ انھین اپنے سے زیادہ قابل شخص سمجھتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جبکہ انھون نے ۴۵ گھنٹہ مین ۔ میل کا فاصلہ طے کیا اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ تارا ناتھ سے کہکر اس عہدہ کے لیے عرضی دلا مین جب اس فاضل پروفیسر اور انکے باپ نے ودیا ساگر کی زبانی یہ پیغام سُنا تو ان کی حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی اور وہ یک زبان ہو کر کہنے لگے "ودیا ساگر تم انسان نہین فرشتہ ہو" اس واقعہ سے اس بات کا پورے طور پر ثبوت ملتا ہو کہ لارڈ ہارڈنگ کے قائم کردہ اسکولون کی آسامیان پر کرنے مین انھون نے کس قدر دیانت داری سے کام لیا ہو گا۔

۱۸۴۶ء مین فورٹ ولیم کالج سے ان کا تعلق قطع ہو گیا اور وہ سنسکرت کالج کے اسسٹنٹ سکرٹری بنے۔ فورٹ ولیم کالج مین انھون نے پانچ سال تک جو کام کیا تھا اس سے دیگر فوائد کے علاوہ انھین ایک خاص فائدہ یہ حاصل ہوا کہ انھون نے انگریزی کی تعلیم حاصل کر لی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ کالج مذکور سے ان کا تعلق ان کی خوش نصیبی کی دلیل تھا کیونکہ اسی کی بدولت انکے خیالات کو وسعت اور آرا کو اہمیت حاصل ہوئی اور اسی کے وسیلے سے انھون نے بہ حیثیت ایک مصلح وہوا خواہ بنی نوع انسان بڑے بڑے معرکے کے کام سر انجام دیئے۔ یہ خیال غیر درست نہ ہو گا کہ حامی تعلیم کی حیثیت مین ان کے کام کی ابتدا فورٹ ولیم کالج ہی مین ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہان پر کالج کا کام کرنے کے علاوہ پرائیویٹ طور پر بھی وہ تدریس کا کام کرتے تھے۔ اس سے ہر چند کہ انھین کوئی خاص مالی

فائدہ نہین ہوا تاہم ان کے دل مین اس بات کا رجحان ضرور پیدا ہوگیا کہ سنسکرت تعلیم کو سادہ اور جدید اُصولون پر قائم کیا جائے اور یہی وہ بات تھی جو بعد مین ان کے لیے موجب شہرت ثابت ہوئی۔ ۱۸۴۶ء مین جب وہ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری بنے تو اس بارے مین انھین کام کا کافی موقع مل گیا اور بہت جلد اُنھون نے اپنے ضبط انتظام اور باقاعدگی سے شہرت حاصل کر لی۔ لیکن جب کالج کے سکرٹری یا منتظم خاص نے انکی بعض اصلاحی کارروائیون پر اعتراض کیا تو انھین مجبوراً اپنے عہدہ سے دست بردار ہوکر پرائیویٹ زندگی اختیار کرنا پڑی۔ ان کے ذاتی اعزاز اور خودداری کا ثبوت ایک اور واقعہ سے بھی ملتا ہے جو انہی ایام مین ہوا تھا۔ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری کی حیثیت مین انھین ایک روز ہندو کالج کے مسٹر کر کے ہان جانے کا اتفاق ہوا جس نے ان سے اچھا سلوک نہ کیا۔ جب یہ اس سے ملنے گئے تو اس نے انھین نہ تو کرسی دی اور نہ اچھی طرح پیش آیا بلکہ ٹانگین پھیلا کر آرام چوکی پر لیٹا رہا۔ ودیا ساگر کو اس سے رنج تو بہت ہوا لیکن اُنھون نے اسوقت اِس معاملہ کو رفت گزشت کر دیا اور مسٹر کر سے جو کام تھا اسے سرانجام دیکر واپس چلے آئے۔ لیکن اُنھون نے اپنے دلمین اس بات کا عہد کرلیا تھا کہ مین مسٹر کر کو اس بارے مین ضرور سبق سکھاؤنگا چنانچہ بہت جلد ایک موقع اس قسم کا درپیش ہوا کہ مسٹر کر ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ودیا ساگر نے کمرہ سے تمام کرسیان اُٹھوا دین اور خود اسی حالت مین بیٹھکر جس مین اُنھون نے مسٹر کر کو بیٹھا دیکھا تھا نوکر سے کہا کہ صاحب کو اندر آنے دو۔ اِس حالت مین مجبوراً صاحب کو کھڑا رہنا پڑا اور ودیا ساگر کے ہاتھون اپنی اِس طرح توہین ہوتے دیکھکر وہ سخت ناراض ہوئے یہان تک کہ آخر اس کی بڑی سختی سے شکایت لکھ بھیجی تعلیمی کونسل کے سکرٹری نے ودیا ساگر سے کیفیت طلب کی جسکے جواب مین اُنھون نے لکھا کہ مین اس سبق پر عمل کر رہا ہون جو خود مسٹر کر نے مجھے سکھایا تھا۔ اس بیان کو اطمینان بخش سمجھا گیا اور مسٹر کر کو جواب لکھ دیا گیا کہ آپ ودیا ساگر سے اپنے طور پر اس معاملہ کو طے کرلین۔ چنانچہ بعد مین ایسا ہی ہوا۔

سنسکرت کالج سے ودیا ساگر کا تعلق صرف تھوڑے ہی دن قطع رہا کیونکہ دسمبر ۱۸۵۰ء مین انھین علم ادب کی پروفیسری کا عہدہ پیش کیا گیا جسے اُنھون نے اِس شرط پر منظور کرلیا کہ مجھے پرنسپل یا اس انسٹی ٹیوشن کے افسر اعلیٰ کے برابر انتظامی اختیارات دیے جائین۔ ان کا تقرر اس وقت عمل مین آیا تھا جبکہ سنسکرت کالج مین طلبہ کی تعداد کے بتدریج کم ہوتے جانے سے تعلیمی کونسل کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہین انسٹی ٹیوشن کو بند ہی نہ کرنا پڑے۔ پس سب سے اول اُنھون نے ودیا ساگر کو جو کام تفویض کیا وہ یہ تھا کہ کالج کی ترقی کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرین اور اس کام کو اُنھون نے ایسے حسن طریقت سے سرانجام دیا کہ کونسل نہ صرف انکی اعلیٰ قابلیت اور دانشمندی کی قائل ہوگئی بلکہ جو طریق عمل اُنھون نے اپنی رپورٹ مین قائم کیا تھا اِس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی رضامند ہوگئی۔ پس اِس نے انکی اصلاحات مجوزہ کو سر بسر منظور کرلیا اور انھین باقاعدہ طور پر کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا۔ اِس طرح پر اختیارات حاصل ہوجانے پر اُنھون نے بہت سی اُن اصلاحات کو عمل مین لانا شروع کیا جنھین وہ اِس وقت جب چند سال پیشتر نائب سکرٹری کی حیثیت سے عمل مین نہ لاسکے تھے۔ حاضری کی باقاعدگی اور دیگر اُمور مین پروفیسرون اور طلبہ دونون کو یکسان طور پر تنبیہ کی گئی۔ سزائے جسمانی کا طریقہ موقوف کر دیا۔ تعلیم انگریزی کو جبری بنا دیا گیا اور اس بات کی عام اجازت دیدی گئی کہ کالج مین چھوٹی ذاتون کے لڑکے بھی پڑھ سکتے ہین۔ علاوہ برین سنسکرت تعلیم کو ایسے طریق پر مرتب کیا گیا کہ اسمین بہت کچھ سادگی پیدا ہوگئی اور وہ زمانہ موجودہ کے معیار تعلیمی کے مطابق اور ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوگئی۔

ان کا منشائے دلی یہ تھا کہ کالج کو ایک ایسے دار العلوم کی حیثیت دیجائے جہاں نہ صرف سنسکرت کی اعلیٰ و ارفع تعلیم حاصل ہو سکے بلکہ اس کے ذریعے سے بنگلہ لٹریچر کی اصلاح ہو اور یہاں سے جو استاد تعلیم پا کر نکلیں وہ تعلیم عامّہ کی اشاعت میں مدد دے سکیں۔ یہ بیان کرنا غیر ضروری ہوگا کہ مناسب وقت گذرنے پر ان کا یہ منشا تمام و کمال پورا ہو گیا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کے حصول میں انھیں بڑے صبر اور محنت و استقلال سے کام لینا پڑا۔ قریب قریب جتنے معلم ان کے ماتحت کام کرنے والے تھے وہ سب کسی وقت میں انکے اُستاد رہ چکے تھے اور ان سب کو ضبط کے دائرہ انتظام میں لانا واقعی ایک مشکل کام تھا لیکن انھوں نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے ایسی ایسی ترکیبیں سوچیں کہ بڈھے طوطوں کو بھی پڑھا ہی لیا۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ ودیا ساگر بڑے خوش مزاج تھے۔ اس خوبی کے علاوہ قدرت نے انکی طبیعت میں مذاق سلیم کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سزائے جسمانی سے انھیں جو نفرت ابتدا ہی سے تھی اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ بچپن میں وہ خود اس کا شکار رہ چکے تھے اور اسی کی وجہ سے چند مرتبہ انھیں اپنے والد کے احکام کی بھی خلاف ورزی کرنا پڑی تھی۔ شروع سے آخر تک ان کے دل میں یہی خیال پختہ رہا کہ کسی تعلیمی انسٹی ٹیوشن کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُستادوں اور طالبعلموں کا باہمی برتاؤ حُسن سلوک پر مبنی ہو۔ ہر کام میں طلبا اپنے استادوں کی امداد پر کمر بستہ ہوں اور اُستاد بجائے خود ان سے مہربانی اور نرمی سے پیش آئیں۔ جن دنوں وہ کالج کی عمارت میں رہتے تھے متعدد طلبہ کالج کا وقت ختم ہونے کے بعد ان کے پاس پرائیویٹ طور پر ملنے جاتے اور وہ ہمیشہ ان کی تواضع کسی نقل سے یا دلچسپ گفتگو کے ذریعے سے کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ انھیں صیغہ واحد حاضر میں مخاطب کرتے جس سے طلبہ کی انسے پوری بے تکلفی تھی۔ لیکن بوقت ضرورت وہ انہی طلبہ سے سختی کے ساتھ بھی پیش آسکتے تھے گو ایسی صورتوں میں انکی سختی صرف عارضی اور اسی قدر ہوتی تھی جتنی کہ ان کے خیال میں ان کے لیے مفید ہو جسوقت وہ نقص جو اس بدمزگی کا موجب بنا ہو دور ہو جاتا ان کا نرم دل فوراً پگھل جاتا تھا اور وہ پھر اسی نرمی سے سلوک کرنے لگ جاتے تھے۔

ایک موقعہ پر انھوں نے تمام جماعت کو عمداً احکام کی خلاف ورزی کرنے پر خارج کر دیا لیکن جب کھلے دو رہی طالب علم ان کے مکان پر جا کر معافی کے طلب گار ہوئے تو انھوں نے ان سب کو تہ دل سے معافی دیدی۔ اسوقت دوپہر کا وقت تھا اور جس وقت طلبا رخصت ہونے اُٹھ رہے تھے انہیں سے ایک نے یونہی مذاقیہ طور پر دوسرے سے کہا کہ "اگر ودیاساگر کا دل ویسا ہی رحیم ہوتا جیسا کہ مشہور ہے تو وہ یقیناً ہمیں کچھ کھانے کے لئے کہتے"۔ یہ الفاظ ہر چند کہ دبی زبان سے کہے گئے تھے تاہم وہ ودیاساگر کے کان میں پڑ گئے۔ انھوں نے تمام طلبہ کو واپس بلا کر کچھ کھانے کو دیا جس پر طلبہ میں سے ایک کہنے لگا۔ "بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے نیک نفس کے دل میں غصّہ رہ سکے؟"

جسوقت سنسکرت کالج کے تعلیمی سسٹم میں ترمیم کی گئی تو بنگالی زبان میں بہت سی درسی کتابوں کا لکھنا بھی لازم ٹھہرا۔ بالآخر یہ کام بھی ودیاساگر کے سر پڑا اور انھوں نے ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان متعدد کتابیں شائع کیں۔ ان کی علمی مصروفیتوں کی ابتدا ۱۸۴۷ء سے ہو چکی تھی جبکہ انھوں نے درسی کتابوں کے علاوہ "سکنتلا" اور "سیتر بن باس" (سیتا کی جلاوطنی) ایسی بعض معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔ مسٹر رمیش چندر دت آنجہانی انکی علمی قابلیت کا ذکر بدین الفاظ کرتے ہیں:-

> ادبی قابلیت کے معاملہ میں اس وقت تک بنگال بھر میں کوئی شخص انکے پایہ کا نہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بعد میں لوگ بابو بنکم چندر چٹرجی کی قابلانہ محنت کی داد دینے لگے۔

فی الحقیقت انھوں نے اور ایک بنگالی مصنف بابو اکشے کمار دت نے

مگر زمانہ حال کی شاندار بنگالی نثر کی بنا قائم کی تھی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُنھون نے زندگی کے آخری ایام تک جاری رکھا اور بیان کیا جاتا ہی کہ اُنھون نے صرف پانچ گھنٹہ مین شیکسپیر کا مشہور و معروف ڈراما Comedy of Errors "بھرانتی ولاس" کے نام سے لکھا تھا۔

سنسکرت کالج کے پرنسپل کی حیثیت مین ودیا ساگر نے جو خدمات سرانجام دین انکی حکام بالادست نے یہان تک قدر کی کہ ۱۸۵۴ء مین انکی تنخواہ دوگنی کر دی گئی اور انھین چار اضلاع کا خاص انسپکٹر مدارس اس غرض سے مقرر کیا گیا کہ وہ اس نئی تعلیمی پالیسی کو رواج دین جسکی ابتدا ۱۸۵۴ء کی مشہور تعلیمی مراسلت کے ذریعے سے ہو چکی تھی۔ اس پالیسی کا مطلب یہ تھا کہ ورنکولر تعلیم کا آسان ذریعہ بنانا چاہیے۔ اس عہدہ کے لیے ان سے بہتر شخص کا انتخاب ناممکن تھا کیونکہ جس تندہی، محنت اور قابلیت سے اُنھون نے کام کیا اس سے بہت کم لوگ کام کر سکتے ہین۔ اُنھون نے چارون اضلاع مین لڑکون اور لڑکیون کے لیے متعدد ماڈل اسکول جاری کرنے اور بنگال کے اول نارمل اسکول کی خود ہی بنا قائم کرکے اسکی نگرانی کی۔ ۱۸۵۶ء تک سب کام اچھی طرح چلتا رہا حتی کہ آخرکار اس سال بنگال مین ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا عہدہ قائم ہوا اور اسپر ایک نوجوان سولین کا تقرر عمل مین آیا۔ اس نوجوان نے جس کا نام مسٹر گارڈن ینگ تھا ودیا ساگر کے کام کی قدر نہ کی اور ۱۸۵۸ء کے قریب انھین بالواسطہ طور پر سرکاری ملازمت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔ ودیا ساگر سے اس شخص کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہی کہ اس نے ایک زنانہ اسکول کے متعلق رقوم اخراجات کی ادائیگی منع کر دی۔ یہ اسکول سر ایف ہالیڈے لفٹنٹ گورنر بنگال کی زبانی منظوری سے کھولا گیا تھا البتہ اس کے متعلق مسٹر ینگ کی باضابطہ منظوری نہ لی گئی تھی۔ لفٹنٹ گورنر موصوف ودیا ساگر پر بہت مہربان تھے اور انھین بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب انھین اس معاملے کی خبر پہنچی تو انھون نے ودیا ساگر کو اس عہدہ سے جسکی تنخواہ انھین ۵۰۰ روپیہ ماہوار ملتی تھی مستعفی ہونے سے منع کیا لیکن ودیا ساگر نے سمجھ لیا تھا کہ میرا اب اس عہدہ پر رہنا میری خودداری مین فرق لاتا ہی۔ پس انھون نے استعفا داخل کر ہی دیا۔ اس استعفا کو منظور کرتے ہوئے نواب لفٹنٹ گورنر نے انھین اطلاع دی کہ "ہندوستان مین اشاعت تعلیم کے بارے مین آپ نے جو کوشش بڑی سرگرمی سے مدت دراز تک کی ہے اس کا گورنمنٹ تہ دل سے اعتراف کرتی ہی۔"

اس زمانہ مین ودیا ساگر کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ بہ اعتبار ایک معلم و ادیب کے اُنھون نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس زمانہ کی تمام تعلیمی انجمنون سے ان کا تعلق تھا اور وہ کلکتہ یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔ ان کے ریٹائر ہونے کا افسوس ان کے ہندوستانی و یورپین احباب کو یکسان طور پر ہوا اور اندیشہ تھا کہ آئندہ انکی ذات سے پبلک کو استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکے گا لیکن خوش قسمتی سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ بقول مسٹر دت اُنھون نے ملازمت کی نسبت ملازمت سے علیحدگی کے ایام مین اپنے آپ کو زیادہ مفید ثابت کر دکھایا۔ انھین اپنی کتابون سے معقول نفع حاصل ہو رہا تھا اور تعلیمی کام سے انکی دلچسپی بدستور سابق تھی حتی کہ آخرکار ان کی بے غرضانہ کوششون کا نتیجہ کلکتہ کے میٹروپولیٹن انسٹی ٹیوشن کی صورت مین نمودار ہوا جو اپنی قسم کے انسٹی ٹیوشنون کے لیے ایک قابل فخر و یادگار نمونہ تھا۔ انکی مدد سے مسٹر بیتھیون نے کلکتہ مین جو زنانہ اسکول قائم کیا تھا اس کے ساتھ آنریری سکرٹری کی حیثیت مین انکا تعلق مدتون قائم رہا اور وہ چار سو روپیہ ماہوار کے خرچ سے اپنے وطن مین تین اسکول بھی برابر چلاتے رہے۔ انکے علاوہ اُنھون نے مختلف حصون مین متعدد اسکول قائم کیے اور ان کے چلانے مین مدد دیتے رہے۔

(۲)

اسمین کچھ شک نہین کہ ودیاساگر نے تعلیمی حلقہ مین بہت کچھ کوشش کی لیکن جس مخصوص کام کے لیے اسوقت تک انکا نام روشن ہی اور جو بات زمانہ آئندہ مین بھی ان کی شہرت برقرار رکھنے والی ہی وہ مجلسی اصلاح کے میدان مین انکی دلیرانہ کوشش اور غریبون اور محتاجون کی فیاضانہ امداد ہی۔ مجلسی اصلاح کے بارے مین سب سے پہلی کوشش جو انکی طرف سے عمل مین آئی وہ یہ تھی کہ وہ سنسکرت کالج کے پروفیسرون کے خلاف رائے ادنی ذات کے لڑکون کو بھی کالج مین داخل کرنے پر زور دیتے تھے اور اسبارے مین انھون نے یہان تک مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر گورنمنٹ انکی اس کارروائی مین مانع آتی تو وہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہونے تک کیلئے آمادہ تھے۔ دوسری کوشش جو ان کی طرف سے عمل مین آئی یہ تھی کہ زنانہ اسکول کے متعلق مسٹر بیتھیون نے ان سے مدد چاہی اور وہ اس کے لیے پورے طور پر آمادہ ہوگئے بحالیکہ اس کارروائی سے کلکتہ کے راسخ الاعتقاد ہنود مین بہت اضطراب پھیل گیا تھا۔ لیکن سب سے معرکہ کی فتح جو انھون نے اہل بنگالہ کے غیض و غضب کے شدید طوفان مین حاصل کی غریب ہندو بیوگان کے حقوق کی حمایت کے متعلق تھی۔ اس موقعہ پر بنگالیون مین جسقدر ہلچل اور اضطراب پیدا ہوا اسکی مثالین بہت کم دیکھنے مین آتی ہین۔ مسٹر دت فرماتے ہین:۔

بنگال کے ہر شہر اور ہر گاؤن مین اسی بات کا چرچا تھا۔ مشہور بنگالی شاعر ایشور چندر گپت اور بنگالی گویون کے سردار دشرتھی نے نوجوان مصلح کی نسبت طرح طرح کے طنزیہ اشعار لکھے۔ گاؤن کے لوگ جب کبھی الاؤ پر جمع ہوکر بیٹھتے تو اس معاملے پر گفتگو کرتے تھے۔ شانتی پور کے جلاہون نے ساریون کے کنارون پر ازدواج بیوگان کے گیت بنکر نمودار کیے۔ غرض بنگال کے ہر گھر مین کیا مرد اور کیا عورتین اسی انقلاب عظیم کے متعلق چرچا کرتے تھے۔

اس پر اکتفا نہ کرکے بعض گنوار لوگون نے ان سے ذاتی طور پر بھی گستاخانہ سلوک کیا۔ بعض نے مار پیٹ کی دھمکی دی اور بعض انکی جان کے لیوا بنے۔ لیکن اس سے ان کے ارادہ یا ہمت مین ذرا فرق نہین آنے پایا۔ ایک روز انھون نے سنا کہ فلان دولتمند آدمی نے اپنے نوکرون کو میری زدوکوب کے لیے متعین کیا ہی اور وہ اس بات کا مشورہ کر رہے ہین کہ کوئی مناسب موقع ملے تو بدسلوکی کی جائے۔ یہ خبر پاتے ہی وہ بڑی دلیری سے اس امیر کے مکان پر جا پہنچے۔ نوکرون مین سے ایک نے ان کے آنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "مین نے ایسا ایسا سنا تھا۔ ... دیا کہ تم لوگون کو میری تلاش کی خواہ مخواہ تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ آپ مین تمھارے سامنے کھڑا ہون جو کچھ جی مین آئے مجھ سے سلوک کرو۔" اتنا سنکر وہ سب شرمندہ ہوگئے اور انھون نے فوراً معذرت طلب کی۔

ایک اور موقع پر جب وہ ریل مین سفر کر رہے تھے ایک پرانے خیال کا پنڈت بھی انہی کے کمپارٹمنٹ مین سوار تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مین جس سے گفتگو کر رہا ہون وہی ودیاساگر ہے۔ بے سمجھے سوچے انکی نسبت طرح طرح کی بدکلامیان کرتا رہا۔ ایشور چندر بھی چپ چاپ سنا کیے اور اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ مین ہی وہ شخص ہون۔ منزل مقصود پر پہنچکر جب دونون گاڑی سے اترے تو کسی ذریعے سے پنڈت کو معلوم ہوگیا کہ یہی ایشور چندر ہی جسکی توہین خود اسی کے منھ پر کرتا رہا ہون۔ بہت نادم ہوا یہان تک کہ غش کھاکر گر پڑا لیکن انھون نے اپنے ہاتھ سے اسے ہوش مین لانے کی کوشش کی اور بعد مین ہر طرح کا اطمینان دلایا۔

عقد بیوگان کی تحریک کے ایام مین ودیاساگر کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئین۔ لیکن غصہ کے اس طوفان مین وہ چٹان کیطرح استقلال کے ساتھ کھڑے رہے۔ وہ اپنے دشمنون کے رکیک حملون کا جواب طرح طرح کو دیتے تھے اور دیانتدارانہ نکتہ چینی کا "فاضلانہ بحث اور قومی استدلال کے ذریعے سے" ان کی کوششون کا سمجھدار لوگون کے دلون پر جو اثر پڑتا تھا اسکا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہی کہ اس زمانے کے بڑے بڑے آدمی

مثلاً پرسن کمار ٹیگور، رام گوپال گھوش، پرتاپ چندر سنگھ، دوارکا ناتھ مترا، نریندر ناتھ سین وغیرہ سبھی ان کے حامی تھے۔ انھین ایام مین جب عقد بیوگان کی حمایت مین ایک ناٹک کا کھیل کیا گیا تو ان بڑے بڑے آدمیون مین سے بعض نے اس مین پارٹ لیے اور کیشب چندر سین نے اسٹیج مینجر کے فرائض ادا کیے۔ اس تمام جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ع مین گورنمنٹ نے عقد بیوگان کو قانوناً جائز سمجھا۔ اور ودیاساگر نے اپنی زیست مین کم از کم تیرا ایسی شادیان کرائین۔ اس تحریک کے لیے اس قدر کامیابی واقعی بہت اہم ہی یہان اس جد و جہد مین ان کا روپیہ بھی بہت صرف ہوا۔ چونکہ ان اخراجات کے لیے انکی آمدنی پورے طور پر کافی نہو سکتی تھی اس لیے انھون نے کرو مینی ...ا روپیہ قرض لیے اور مدت العمر خود ہی اسے ادا کرنے کی کوشش مین لگے رہے۔ انکے بعض دوستون نے ادائگی قرضہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی تحریک کی لیکن انھون نے بڑی سختی سے انھین ایسا کرنے سے باز رکھا۔ انھون نے عقد بیوگان کو اپنی زندگی کا مقصد عظیم بنا لیا تھا اور اس مدعا کو حاصل کرنے مین انھین اپنی جان تک کی پروا نہ تھی چنانچہ اپنے بیٹے نارائن چندر کی شادی کے موقعہ پر انھون نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ ہندو بیوگان کے متعلق اپنی کوششون کو مین اپنی زندگی کا سب سے زیادہ نیکی اور پارسائی کا کام سمجھتا ہون۔

معلوم ہوتا ہی کہ بیوگان کو مدد دینے کا مصمم ارادہ ودیاساگر کے دلمین چھوٹی عمر ہی مین ہو چکا تھا چنانچہ انکی عمر ابھی ۱۴ سال ہی کی تھی کہ انھون نے دیکھا کہ ایک لڑکی جو بچپن مین ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی شادی کے بعد بہت جلد بیوہ ہو گئی اور ایک اور بیوہ کے گھر ناجائز بچہ پیدا ہوا جسے اس عورت کی شرمناک کارروائی پر پردہ پوشی کرنے کے لیے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ وہ آخر دم تک اپنے اصول پر قائم رہے گو ان کے بہت سے دوستون نے ایک بار حامی بھر کر بعد مین انکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ جبکہ کسی بیوہ کی شادی ہونیوالی تھی اور ودیاساگر اسمین شریک ہونے جا رہے تھے انھون نے مشہور و معروف مصلح راجہ رام موہن رائے کے بیٹے رام پرشاد کو ہمراہ چلنے کیلیئے کہا لیکن جب وہ متامل ہوا تو انھون نے بانی برہمو سماج کی تصویر کی طرف جو دیوار سے لٹک رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ بہتر ہو آپ اسے وہان نہ لٹکائین بلکہ اتار کر ردی مین پھینکدین۔

ودیاساگر نے تمدنی اصلاح کے متعلق جو بیشمار کوششین کین ان مین ایک وہ بھی تھی جو انھون نے کلین براہمنون مین کثرت ازدواج کی خرابی کو روکنے کے بارے مین کی۔ اس معاملے پر انکی توجہ انکی ایک رشتہ دار عورت نے مبذول کرائی تھی جسکی شادی ایک کلین براہمن سے ہو چکی تھی اور جو اپنے شوہر کے تغافل سے تنگ آچکی تھی۔ انھون نے حسب معمول اس کام کو پوری کوشش سے شروع کیا اور ایک سے زیادہ عرضی ہزارہا لوگون کی دستخطی گورنمنٹ کی خدمت مین پیش کی۔ اس تحریک سے اس معاملے کے انسداد کے لیے کوئی قانون تو پاس نہوا البتہ عام رائے مین بہت کچھ اصلاح ہو گئی اور اس وقت سے یہ خرابی دن بدن کم ہوتی گئی۔

یہان پر ودیاساگر کے اصلاحی کامون کا سلسلہ ختم ہوتا ہو اور اب ان کے اس کام کا ذکر کیا جاتا ہی جو انھون نے بہ حیثیت ہوا خواہ بنی نوع انسان کیا اور اس مین یہان تک کامیابی حاصل کی کہ کل بنگالی قوم آجتک ان کا نام عزت و تکریم کے ساتھ لیتی ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ چھوٹی عمر ہی سے انھین رفاہ عامہ کا خیال پیدا ہو چکا تھا چنانچہ جن دنون وہ سنسکرت کالج مین ۱۵-۱۶ سال کی عمر مین وظیفہ یاب تھے تو بوقت ضرورت اپنے بیمار ہم جماعتون کی تیمارداری کرتے کسی شکستہ حال فقیر کو دیکھ پاتے حسب استطاعت اسکی مدد سے دریغ نہ کرتے اور اگر خود پاس نہوتا تو دوسرے سے مانگ کر دینے کو بھی موجب عار نہ سمجھتے تھے۔ جب دنون کالج مین تعطیلین ہوتین وہ دیہات مین جا کر بیمارون اور

محتاجون کی خبرگیری اور امداد کیا کرتے تھے۔ جب انھین فورٹ ولیم کالج مین جگہ ملگئی تو ان کے وسائل امداد بھی کسیقدر وسیع ہو گئے۔ اس زمانہ مین انھین پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور اس مین سے حتی الامکان کافی روپیہ بچاکر وہ اس سے غریب غربا کی مدد کرتے تھے۔ محتاجون کی خبرگیری کرنے مین انھین خاص طور پر آنند (مسرت) حاصل ہوتا تھا اور متعدی امراض کے مریضون کے پاس جانے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ کوئی اجنبی ہو وہ غریب ہی کیون نہ ہو ہمیشہ اسکی مدد پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک شخص کو جو کسی کھاتے پیتے گھرانے مین نوکر تھا ہیضہ ہو گیا۔ آقا نے مارے ڈر کے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب بازار مین پڑا دم توڑ رہا تھا کہ ودیا ساگر کی نظر اسپر پڑگئی۔ یہ فوراً اسے اُٹھوا کر اپنے ہان لے گئے اور جب تک صحت یاب نہ ہوا اسکی تیمارداری کرتے رہے۔ جن تین اسکولون کا ذکر قبل ازین ہو چکا ہے ان کے علاوہ انھون نے اپنے گاؤن مین ایک خیراتی شفاخانہ بھی کھلوایا جس کا ماہوار خرچ سو روپیہ تھا۔ جن دنون وہ خاص انسپکٹر مدارس کی حیثیت مین دورہ کیا کرتے تھے تو انکی یہ حالت تھی کہ راستے مین کسی شخص کو بیمار و نحیف پڑا پاتے تو اسے اُٹھوا کر پالکی مین لٹاتے اور خود ساتھ ساتھ چلتے جاتے حتیٰ کہ کسی سرائے تک پہنچ جاتے اور وہان ہر طرح اس کے آسائش و علاج کا انتظام کرکے آگے بڑھتے۔ جب کہین جاتے تو کچھ متفرق سکے پاس رکھ لیتے اور راستے مین کوئی حاجتمند نظر آتا تو اسکی امداد سے بالکل دریغ نہ کرتے تھے۔ کوئی شخص جو ان کے پاس جاکر اپنی مصیبت کی کہانی بیان کرتا ضرور ان سے مدد حاصل کرتا تھا اور کوئی نہین کہ سکتا کہ اُنھون نے در پردہ کتنی بیوگان اور یتیمون کی کھانے کپڑے اور اور ضروری سامان کے ذریعے سے مدد کی۔ وہ متعدد غریب لڑکون کو اپنے ہان رکھکر ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ اسطرح ایک موقعہ پر تو ایک سو لڑکے ان کے ہان کھانا کھاتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گداگر اور اجنبی ان تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل کرسکتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھون نے کبھی کوئی دربان نہین رکھا کہ مبادا کوئی حاجتمند ان سے ملے بغیر واپس چلا جائے۔ چند آدمی قرض کی بلا مین اسطرح پھنسے ہوئے تھے کہ ان کا رہا ہونا دشوار اور ناممکن نظر آتا تھا اور وہ تباہی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ انھون نے اپنے پاس سے انکی مدد کرکے قرض سے انھین خلاصی دلائی۔ ایک بڑا برہمن ۲۰۰۰ روپیہ کا مقروض تھا اور قرض خواہ اس غریب کی جو تھوڑی سی جائداد بچی تھی اسکی تاک مین لگا ہوا تھا۔ انھین جب اس معاملہ کی خبر ملی تو خفیہ طور پر معاملہ کو اوپر ہی اوپر طے کر دیا اور برہمن کو مطلق خبر نہ ہو سکی کہ یہ مہربانی کس نے کی ہے۔ لیکن یہ سب کوششین ۱۸۶۶ء کے قحط کے موقعہ پر ان کی عظیم امدادی کوششون کے مقابلہ مین ہیچ تھین۔ ان کے گاؤن مین قحط سے سخت مصیبت نازل تھی۔ جب یہ وہان پہنچے تو دیکھا کہ ان کی والدہ نے غربا کی امداد پہلے سے شروع کر رکھی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر ایک سو غریبون کو روزانہ کھلایا کرتی تھین لیکن ودیا ساگر کی نظر مین یہ مدد ناکافی تھی۔ اُنھون نے اپنے خرچ سے وہان اور آس پاس کے گاؤن مین لنگر جاری کرکے ایسا انتظام کیا کہ ایک ہزار غربا کو روزانہ مفت کھانا ملتا رہا۔

وہ ادنیٰ سے ادنیٰ ذات کی عورتون کو اپنے ہاتھ سے کھانا دیکر اپنے رشتہ دارون کے لیے ایک مثال قائم کرکے کھاتے تھے۔ صرف کھانا کھلانے کو انکی امداد کے لیے غیر مکتفی سمجھ کر اُنھون نے حاملہ اور زچہ عورتون کے لیے جداگانہ مکانات کھلوا دیئے۔ ان کی ان تمام کوششون کا اعتراف بارہا گورنمنٹ کی طرف سے ہوا لیکن اس اعتراف کا سب سے بڑا ذریعہ "ودیا ساگر" "ودیا ساگر" کے وہ بلند نعرے تھے جو ہر روز سیکڑون ہزارون بھوکون اور محتاجون کے منہ سے خود بخود نکلتے تھے۔ اس کے تین سال بعد بردوان مین ایک عجیب قسم کا بخار پھوٹ نکلا جہان اُنھون نے اپنی رفاہ عامہ کی کوششون سے پورے طور پر کام لیا۔ ان کا موثرین

ان کے ہزارون روپیہ خرچ ہوگئے مگر انھین اسکا کبھی خیال نہین آیا کیونکہ اس کام سے انھین جسقدر خوشی ہوتی وہ اور کسی طرح نہ ہوتی تھی اور گو ان کی آمدنی ان غیر معمولی اخراجات کے لیے کبھی مکتفی نہ ہوئی تاہم وہ خوش تھے کہ مین اس کو بہترین مصرف مین لا رہا ہون۔ اسبابے مین انکے دلی خیالات اور حسیات کا اظہار انکی وصیت سے ہوتا ہے جس مین اُنھون نے نہایت دور کے رشتہ دارون اور متوفی دوستون کے کنبہ والون تک کو فراموش نہین کیا۔

اِن حالات مین یہ بات ذرا بھی تعجب خیز نہین کہ رام کرشن پرمھنس ایسے شخص کو جو بنگال مین زمانہ حال کا سب سے بڑا مذہبی آدمی ہو گذرا ہے اور جس کے پیرو ہزارون کی تعداد مین موجود ہین یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ودیا ساگر کے مکان پر جاکر ان سے ملاقات کرے جب اس نے اس معاملہ کا ذکر اپنے بعض مقلدون سے کیا تو وہ اس پر نہایت متعجب ہوئے لیکن اسنے انھین بتایا کہ اگر ایسر ایشور کی مہربانی نہ ہوتی تو ودیا ساگر اتنا بڑا آدمی نہ بن سکتا۔ اس کے بعد ایک موقع پر سوامی جی خود ودیا ساگر سے ملنے گئے اور کہنے لگے کہ "مین ندی، نالے اور دریا عبور کر کے اب ساگر (سمندر) دیکھنے آیا ہون"۔ ودیا ساگر نے اُسی لہجہ مین جواب دیا "مجھے آپ کے تشریف لانے کی بہت خوشی ہے لیکن میری دانست مین آپکو ساگر مین کھاری پانی اور کوڑیون کے سوا اور کچھ نہ ملے گا"۔ سوامی جی نے استعارہ کی لطافت کو قائم رکھتے ہوے کہا "مین جس سمندر کے پاس آیا ہون وہ دودھ شہد وغیرہ رتنون (جواہر) سے بھرا ہوا ہے اور مجھے پوری توقع ہے کہ مین اس کے اندر سے انمول موتی حاصل کرسکونگا"۔ اِس پرلطف گفتگو کے بعد دونون مین بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی اور آخر دونون خوشی خوشی ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

لیکن باوجود مذہبی خیال اور مذہبی خصلت کا انسان ہونے کے معلوم ہوتا ہے کہ ودیا ساگر کسی خاص مذہبی فرقہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ ایک موقعہ پر اُنھون نے کہا تھا کہ:۔

اس قسم کے فرقے دراصل باہمی تفرقہ پیدا کرتے ہین۔ اگر ایک شخص اس بات کا قائل ہے کہ میرے پاپ گنگا اشنان سے دور ہوجائینگے اور دوسرا اس بات کا کہ شوجی کی بھگتی ہی کے ذریعے سے انسان کو موکش حاصل ہوسکتا ہے تو دونون کو ان کے عقائد مبارک رہین۔ میرے لیے وشنو، شیو، شوجی اور ان پر نہ ڈگنگا میرے والدین ہین اور مین تہ دل سے انہی کی پرستش کرتا ہون۔ مین کسی حالت مین فرقہ بندی کا حامی نہین ہوسکتا کیونکہ اگر کوئی فریق غلطی پر ہوا تو مین دوسرون کے گناہون کا جوابدہ ٹھیرایا جاؤنگا اور پرماتما مجھے جھوٹ کے لیے سزا دینگے۔

غرض یہ کہ اُنھون نے اپنا مذہبی عقیدہ کبھی کسی پر ظاہر ہی نہین کیا گو اس مین شک نہین کہ اپنے ماتا پتا (والدین) کی وہ اُن "برہما" اور "وشنو" ہی کیطرح پرستش کرتے رہے۔ وہ ہر روز صبح اُٹھکر انھین یا انکی تصاویر کو پرنام کیا کرتے تھے اور کسی اہم کام کو شروع کرنے سے پیشتر ان کی آشیش (برکت) ضرور حاصل کرلیتے تھے۔ والدین کی تعظیم ان کے دل مین یہان تک گھر کرچکی تھی کہ ازدواج بیوگان کے معاملے کو چھیڑنے سے پہلے بھی اُنھون نے ان سے اجازت حاصل کرنا ضروری سمجھا اور اگر ان کے ایک مرتبہ والد کی سختی سے تنگ آکر سرکش ہوجانے کے معاملے کو مستثنےٰ قرار دیدیا جاے تو انکی ساری عمر مین ایک بات بھی ایسی نظر نہین آتی جو انکی پابندی فرض وتعظیم والدین پر حرف لانیوالی ہو۔ ان کو سب سے بڑی محبت اپنی ماں سے تھی اور اسی سے یہ فیاض منشی ورثہ مین ملی تھی۔ ایک موقع پر صرف اپنی ماں کی خوشی پوری کرنے کے لیے وہ کلکتہ سے پیدل چلکر اپنے گاؤن مین پہنچے تھے۔ راستے مین اُنھون نے کہین آرام بھی نہ کیا اور دو بڑے دریاؤن کو جو خوب چڑھاؤ پر تھے عبور کر کے عین وقت پر اسکے پاس جا پہنچے! اُنھون نے عزم کرلیا تھا کہ اگر مجھے گاؤن جانے کے لیے فورٹ ولیم کالج سے چھٹی

نہ ملی تو نوکری چھوڑ دون گا۔ باپ سے انھین جو باتین ورثہ مین ملین وہ کام کی باقاعدگی اور سلیقہ اور پوری محنت تھین۔ چونکہ ان کے والدین پاک صاف اور محبت سے معمور دل رکھتے تھے اس لیے خدا نے انھین ہر بیٹا دیا وہ ہر پہلو سے کامل نمونہ کا درجہ رکھتا تھا جن دنون انکی شہرت بنگال مین چارون طرف پھیلی ہوئی تھی اِن دنون بھی اُنھون نے اپنے والدین کی خاطر ادنی سے ادنی خدمت کا کام سر انجام دینے مین انکار نہین کیا۔ جب وہ کرم اتار مین سادہ زندگی بسر کرنے والے سنتھالیون کے ساتھ جنگل مین رہا کرتے تھے تو ان کے ساتھ گھل مل گئے تھے کہ وہ انھین اپنی ہی برادری کا آدمی سمجھتے تھے۔ ہر روز صبح کے وقت اِن لوگون کی جھونپڑیون مین جاتے اور انھین کسی چیز کی ضرورت ہو تو بہم پہنچاتے تھے۔ بھوکون کو روٹی ننگون کو کپڑا اور بیمارون کو دوا دینا اِن کا فرض تھا اور بسا اوقات انھین پھل اور مٹھائی بھی دیا کرتے تھے۔ انکے لیے اُنھون نے ایک اسکول کھولدیا اور ان کی مچھلیان خود خرید کر ان کی آمدنی مین اضافہ کرنے کا طریقہ نکالا۔ انکے جنگلی ناچ سے وہ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ جنگل کی سبزی ترکاری بطور تحفہ انکے روبرو پیش کرتے جسے وہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتے تھے۔ ان مین سے بعض انھین ازراہ محبت باپ اور بھائی اور بعض چچا کہا کرتے تھے اور وہ اِن صاف باطن لوگون کے مہربانہ سلوک سے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک سنتھال کسی عورت کو ہمراہ لیے ان کے پاس آیا اور ان سے اس کے لیے کپڑا مانگا۔ اُنھون نے جواب دیا میرے پاس اسوقت اس کے دینے لائق کوئی کپڑا نہین ہے۔ لیکن سنتھال انکی طرف سے انکار کا لفظ سننے کا عادی نہ تھا۔ اس نے ودیاساگر سے الماری کی چابی لیکر خود ہی بکس کھول لیا اور اس بے تکلفی سے گویا وہ خود ہی اس گھر کا مالک ہے ایک قیمتی کپڑا نکالکر اس عورت کے حوالہ کر دیا۔ ودیاساگر اس شخص کی اس بے تکلفی سے بہت ہی خوش ہوے۔ سامان عیش سے انھین فطری نفرت تھی۔ ایک بار اُنھون نے ایک گھوڑا گاڑی رکھ لی تھی مگر پھر جلدی ہی اسے بیچ ڈالا۔ لباس انکا بے حد سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ یعنی ایک معمولی دھوتی، چادر اور پاؤن مین سلیپر۔ وضع کی پابندی اسقدر تھی کہ لفٹنٹ گورنرون سے بھی اسی لباس مین ملاقات کی۔ اِس قسم کے سادہ کپڑے پہننے کی وجہ سے بعض اوقات عورتین ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتی تھین۔ جن دنون وہ انسپکٹر مدارس تھے تو ایک موقع پر کسی دیہاتی اسکول کا معائنہ کرنے گئے۔ اسکول کی عمارت کے قریب بہت گنوار ان کی صورت دیکھنے جمع ہو گئے۔ عورتین بھی بہت تھین اور وہ قدرتی طور پر اس بات کی متوقع تھین کہ کوئی بڑا آدمی شاندار کپڑون والا دیکھنے مین آئے گا لیکن جب وہ دھوتی چادر پہنے ایک عام آدمی کی طرح پیدل چلتے نظر آے تو انکی حیرت بہت بڑھ گئی۔ ایک بڑھیا جو گھنٹون دھوپ مین کھڑی انکا انتظار کرتی رہی تھی اسے تو کسی طرح اس بات کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ شخص ودیاساگر ہو سکتا ہے۔ انکی طرف بہت دیر تک گھورتی رہنے کے بعد وہ آخر کار کہنے لگی "کیا مین اس اُڑیہ قلی کو دیکھنے اتنی دیر تک دھوپ مین جلا کی؟ نہ گاڑی نہ چپکن، نہ چغہ، نہ پگڑی، نہ گھوڑی، رام رام ایسا آدمی! اور لوگ کہتے تھے وہ اتنا بڑا آدمی ہے! واہ کیسا پاگل پن ہے!"

لیکن گو وہ خود اسقدر سادہ لباس پہنتے تھے، اور خانگی معاملات مین نہایت کفایت شعاری برتتے تھے تاہم اپنے شاندار کتب خانے کی کتابونکو خوب بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ یہان تک کہ ولایت سے انکی جلدین بندھوانے مین بہت سا روپیہ صرف کیا کرتے تھے۔ آخری ایام مین وہ کسی شخص کو اپنی کتاب عاریتاً نہ دیتے تھے اکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی کتابون سے بے حد محبت کرتے تھے اور لیجانیوالون پر انھین ایک طرح کی بے اعتباری تھی جو کسی طرح بے وجہ نہین

کہی جا سکتی۔ ایک بار ایک دوست ان سے ایک نہایت قیمتی مسودہ مطالعہ کی غرض سے مانگ کر لے گیا لیکن بجائے پڑھنے کے اس نے اسے بیچ ڈالا۔ اس طرح پر اس نے اس مسودہ سے نفع تو حاصل کیا مگر وہ نفع ذہنی نہین بلکہ مالی تھا۔ کچھ مدت بعد ودیا ساگر نے اس سے کتاب واپس مانگی تو بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگا "مدت ہوئی کہ کتاب آپ کو واپس کر چکا ہون"۔

سطور بالا مین جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے اس بات کا آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ودیا ساگر ایک ایسا شخص تھا جس پر ہر قوم یا ہر ملک کو فخر حاصل ہو سکتا ہے۔ انکی زندگی کی ہر بات مین کوئی نہ کوئی سبق ضرور پایا جاتا ہے۔ انمین وہ تمام صفات موجود تھین جو کسی شخص کو بڑا بناتی ہین اور انمین سب سے زیادہ قابل ذکر خوبیان صداقت، مہربانی، سادگی، استقلال، آزادگی، فیاضی اور جوش تھین۔ والدین کی وہ جسقدر تعظیم کرتے تھے اسے دیکھتے ہوئے پورانک زمانہ کا سمان نظرون مین پھر جاتا ہے۔ زمانہ طالب علمی مین انھون نے جو سختیان اور تکالیف جھیلین ان سے ہر نوجوان نہایت قیمتی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ ان کا زمانہ استادی ہمارے روبرو زمانہ قدیم کے رشیون کی مثال پیش کرتا ہے جو جنگلون کے اندر رہ کر اپنے مقدس آشرمون مین بڑے پیار و محبت سے اپنے چیلون کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ بہ اعتبار ایک سوشل ریفارمر کے انھون نے جو کام کیے وہ انکی فیاضانہ فطرت کو بخوبی واضح کرتے ہین۔

ایشور چندر ودیا ساگر نے ۷۰ سال سے زائد عمر حاصل کر کے ۲۹ جولائی سنہ ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا جس وقت ان کی ارتھی شمشان کو لے جانے لگے تو ہزارہا مرد و زن، پیر و جوان، ہر مذہب و ہر ملت کے لوگ اس کے ہمراہ تھے اور وہ سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر زمانہ حال مین کسی شخص نے سادہ زندگی بسر کرتے ہوئے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھنے کی عملی مثال قائم کی ہے تو وہ ودیا ساگر تھا جسے ہزارہا غریب لوگ "دیا ساگر" کہکر خوش ہوتے تھے۔

تیرتھ رام

## غزل

از افضل الدولہ مظفر الملک سید افضل علیخان شوکت جنگ بہادر متخلص بہ افضل خلف اصغر جناب آسیر مرحوم

نظارہ ہوگا شام تک اُس ماہتاب کا
دیکھا ہے اُٹھ کے صبح کو منھ آفتاب کا

محشر مین پھر مزا ہے سوال و جواب کا
ہو جائے گم جو بند ہمارے حساب کا

ثابت ہے ہی کی ہے مردم آبی نے ترک مے
اُلٹا پڑا ہوا ہے کٹورا حباب کا

اے موج بحر! بہر خدا جلد لے خبر
دم بند کر دیا ہے ہوانے حباب کا

مانا نہین کسی سے تعلق تھین، مگر
کہتا ہے برخلاف زمانہ شباب کا

امواج کو سمجھ کے گلے سے لگائیے
نازک ہے دل، پھٹے نہ کلیجا حباب کا

ساقی! نگاہ زاہد بدمست اگر پڑی
تھوکے گا منھ سے خون یہ شیشہ شراب کا

پھنس جائین شیخ دختر رز سے تو ہو مزا
پایان قدم مین بڑھ کے ابھی تو جناب کا

کرتے ہین سجدے آکے ملک جس پہ جنس سے
افضل یہ مرتبہ ہے در بوتراب کا

# سید محمد مرتضیٰ بیانؔ و یزدانی میرٹھی

زمانہ کسی وقت اور کسی دور میں کاملین فن سے خالی نہیں رہتا۔ جس طرح اقطاب ابدال کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ یہ روحانی رہنما ہر زمانے میں موجود رہتے اور اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو سیراب کیا کرتے ہیں اسی طرح جسمانی دنیا بھی متعدد اشخاص کے وجود پُر جود کے فیضان و بخشش سے کبھی محروم نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اصحاب خلقی طور پر نام و نمود کی خواہش نہیں رکھتے اور اس وجہ سے انھیں عام طور پر روشناس ہونے کا موقع نہیں ملتا اور اکثر انقلاب عالم کی عبرت انگیز کیفیات سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ انھیں ذاتی طور پر اپنے آپ کو پبلک کے سامنے لانے میں پس و پیش ہوتا ہے اور اس طرح انکے کارنامے پردۂ خفا میں مستور رہ جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں اُن اشخاص کا بھی شمار ہو سکتا ہے جو اپنی قابلیت و علمیت کے لحاظ سے ہر طرح قابل عزت ہوتے ہیں لیکن ناقدری اور نامرتبہ شناسی چونکہ عوام کی آنکھ پر پردہ بنکر پڑ جاتی ہے اس لیے وہ انکی صحیح پوزیشن کو معلوم نہیں کر سکتے۔

"گرے" نے جو انگلستان کے طبقۂ شعراء کا ایک ممتاز رکن ہونے کی حیثیت سے معرفی سے مستغنی ہے اپنے مشہور و معروف مرثیہ میں اسی مسئلہ پر کس قدر غائر نظر ڈالی ہے اور کتنی فلسفیانہ دقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "کتنے آبدار موتی سمندروں کی تہ میں اس طرح رہ جاتے ہیں کہ انسانی آنکھ تک اُن کی ضو بھی نہیں پہنچتی اور کتنے ہی خوشرنگ پھول ایسے جنگلوں میں کھلتے ہیں جنکی گوناگوں دلچسپیوں کا آدمیوں کو علم بھی نہیں ہوتا"۔ گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جس طرح بہت سے قیمتی موتیوں اور دلفریب پھولوں کی رسائی انسان تک نہیں ہوتی اور وہ سمندروں اور جنگلوں میں پوشیدہ رہ جاتے ہیں اسی طرح کتنے قابل دماغ ایسے ہونگے جن کے کارنامے بجائے خود سرمایۂ ناز اور کارآمد ہونے کے باوصف گمنامی کی حالت میں رہ جاتے ہیں اور اہل دنیا کو اُن سے مستفید ہونے اور تمتع حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ غور سے دیکھیے۔ "گرے" نے گویا اُن بے نشان لیکن ذی احترام لوگوں کی اصلی صورت کھینچ کر دکھا دی ہے جنکی خدمات فاضلہ اور صفات عالیہ انھیں مشاہیر عالم میں نمایاں قدرت دلانے کے لیے کافی تھیں لیکن استحقاق کے باوجود وہ شہرت نہ پا سکے، اور انکی ذہنی و دماغی کاوشوں کے نتائج دنیا پر آشکارا نہ ہو سکے۔ سچ پوچھیے تو یہ انکی نہیں بلکہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اُنکے خرمن فضل و کمال کی خوشہ چینی سے بھی محروم رہے۔

ہر ملک، ہر قوم، ہر فرقے، اور ہر طبقے میں اس قسم کے گمنام لیکن اقبالمند لوگ گذر چکے ہیں اور اب بھی اگر کھوج کرو تو تمھیں بہت سے مل سکتے ہیں۔ ہندوستان اس وقت علوم و فنون کی کساد بازاری میں مشہور آفاق ہے اور اسلیے یہاں تحصیل کمال کی تشویق و تحریص کے اسباب بھی مفقود ہیں لیکن اگر کوشش سے تلاش کیا جائے تو یہاں اب بھی آپ کو ایک معقول تعداد ایسے بزرگ سیرت اصحاب کی مل سکتی ہے جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے آنکھوں پہ بٹھائے جانے کے قابل تھے یا ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہم انھیں جانتے تک نہیں گویا جس عالم گمنامی میں وہ پیدا ہوئے اُسی بیخبری میں وہ پیوند خاک ہو گئے یا ہو جائیں گے۔

اُردو شاعری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو شعراء قطار در قطار نظر آئینگے۔ ناموں کی گنتی کرنا ہو تو اکثر تذکرے موجود ہیں۔ ان میں جہاں بہت سے مستحق اعزاز و تکریم نظر آئینگے وہاں بھرتی کے بھی ہوں گے۔ میرؔ و سوداؔ انشاؔ و مصحفیؔ، ناسخؔ و آتشؔ، اور غالبؔ ذوقؔ بلاشبہ ہمارے علم ادب کے قابل فخر محسنین میں ہیں اور انکے احسانات سے اُردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی لیکن ان محسنوں اور سرپرستوں کی تعداد یہیں پر نہیں ختم ہو جاتی بلکہ بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے مصداق

نیکی کن و بدریا انداز

اُردو اور ادب اُردو کے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن کسی سے داد طلب نہیں ہوے اور پبلک اُنکے کارناموں سے ناواقف رہگئی۔

حضرت بیان یزدانی اُردو شعرا کے اسی طبقہ میں شمار ہوسکتے ہیں۔ یہ ضرور ہی کہ عوام ان سے ایک حد تک شناسائی کا فخر رکھتے ہیں تاہم اُن کی وجہادی قابلیت اور تبحّر علمیت کے لحاظ سے اُنکا دائرۂ شہرت بالکل محدود رہا اور عام طور پر کسی کو اُنکے کلام کی عظمت، اُنکے ذاتی اوصاف، اور خاندانی حالات سے آگاہی نہیں۔ طبقۂ خواص میں گو اُنکے کلام کو بہت بڑی حد تک رسائی حاصل ہو لیکن وہ بھی اُنکی شناسائی مرتبہ نہیں رکھتے۔

حضرت بیان اس زمانے کے سر برآوردہ شعرا میں سے تھے جنکی علمیت اور نکتہ شناسی انصافاً اُنھیں بہت سے پیشرو مشاہیر سے ممتاز ثابت کرتی ہی۔ ایسے ذی علم لوگوں کا تذکرہ خالی از افادہ نہیں ہوسکتا۔ لہذا ہم کسی قدر تفصیل سے اُن کے حالات قلمبند کرتے ہیں اور اسکے بعد اُن کے کلام پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کریں گے۔ ان سطور کے مطالعہ سے ناظرین قیاس کرسکتے ہیں کہ بیان کا درجہ شاعری میں کیا ہی اور اُنھوں نے اپنے دل و دماغ سے کام لیکر اپنی فطرتی طباعی اور سخن سنجی کا کیسا کچھ ثبوت دیا ہے۔

سید محمد مرتضیٰ نام تھا۔ بیان و یزدانی تخلص کرتے تھے۔ انکے والد سید گوہر علی کے آٹھ لڑکے تھے جنمیں سے ایک حضرت بیان سے بڑے تھے اور باقی چھوٹے۔ ذاتی فضائل و اوصاف سے قطع نظر حضرت بیان نسباً بھی بڑے آدمی تھے انکا خاندان ساداتِ رضوی سے تھا اور مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ اِن کے نانا سید عمر دراز علی جھانسی اور کالپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اُنکے زمانۂ حیات تک بیان اور اُنکی والدہ زیادہ تر اُنھیں کے پاس رہتے تھے۔

سید بیان میرٹھ کے رہنے والے تھے لیکن اُنکے آبا و اجداد جارچہ ضلع بلند شہر میں سکونت رکھتے تھے۔ سید بیان کا ننہال میرٹھ کے قریب کسی موضع میں تھا اور بعض تعلقات نے بالآخر میرٹھ کو اُنکا گھر بنا دیا۔

سید عمر دراز علی بیان کے نانا نہایت اعزاز و امتیاز کے آدمی تھے جھانسی وغیرہ میں اب تک اُنکے مدّاح اور جاننے والے موجود ہیں۔ ایک مدت تک جھانسی میں ڈپٹی کلکٹری کی اور وہیں ۱۸۵۶ء میں بیان پیدا ہوے۔ چار سال کی عمر میں شفیق نانا کا سایہ اُٹھ گیا۔ لیکن دوراندیش باپ نے اُنکی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر اُسے کما حقہ انجام تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سید گوہر علی خود ایک قابل بزرگ تھے اور جیسا کہ پہلے زمانہ میں شریف خاندانوں کا عام دستور تھا وہ پڑھے لکھے تھے اور علوم مشرقی میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ سید بیان کی ابتدائی تعلیم اُنھوں نے خود کی اور جب تعلقات ملازمت کی وجہ سے وہ اس کام سے معذور ہوے تو مرزا باقر علی بیگ نے جو "میرٹھ میں فرقۂ شیعہ کے پیش نماز تھے" سید بیان کی تعلیم کی تکمیل کرائی۔

مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے سید انشا کی تعلیم کا ذکر کرکے اُنکے ذاتی جوہر کو اِن الفاظ میں نمایاں کیا ہے :-

باپ کے لیے مثال دے سکتے ہیں کہ عزیز بیٹے کو اس خوبصورتی سے تعلیم کیا مگر بیٹا جو جوہرِ طبیعت اپنے ساتھ لایا تھا اُسکی کوئی مثال نہیں ہی۔

یہی کیفیت سید بیان کی ہی۔ اُن میں خداداد قابلیت کا مادہ موجود تھا جو باپ اور اُستاد کی بزرگانہ اور شفقت آلود توجہات کے ساتھ سونے میں سُہاگے کا کام کرگیا۔ اُنھیں کتب بینی کا شغف بےحد تھا اور اسکے ذریعہ سے اُنھوں نے تجربے، مشاہدے، اور معلومات کے وہ تمام درجے بسہولت طے کرلیے جنپر عبور کرنا معمولی آدمی کے حیطۂ امکان سے باہر ہوتا ہی۔ اُنکی بلند نظری اور وسعتِ خیال کا ثبوت اُنکے کلام سے بھی ملتا ہی جسکے دیکھنے والے کو بہت جلد معلوم ہوجاتا ہی کہ شاعر کا دماغ گوناگوں جذبات و کمالات کا ایک بیش قیمت مخزن ہی۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ سید بیان کو حُسنِ سیرت و حُسنِ صورت مساوی طور پر مبدءِ فیاض سے عطا ہوے تھے۔ وہ نہایت خوش رنگ وجیہ تھے خلیق،



سید محمد مرتضیٰ "بیان" و "یزدانی" (میرٹھی) مرحوم

Alhilal Press

سار، اور ہمدردی کی صفات بھی اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ طبیعت
اس بھی بلا کے تھے۔ ہر شخص سے اُسکے مذاق کے موافق گفتگو کرتے تھے۔

وہ بہت خوبصورت تھے اور رنگ گورا چٹا تھا۔ اسکے متعلق ایک عجیب
اقعہ قابلِ ذکر ہے۔ غدر کے زمانہ میں جبکہ امن و امان کا جنازہ ملک سے اُٹھ چکا
ا سید بیان کو بعالمِ طفلی کہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا پڑا
تفاق سے راستہ میں باغیوں کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُن نامرادوں
نے انھیں انگریز کا بچہ سمجھکر گرفتار کرلیا اور ڈیڑھ سو روپیہ لیکر چھوڑا۔

شروع جوانی میں اُنھیں ایک مرض لاحق ہوگیا تھا جسے دماغی عارضہ
نہ سکتے ہیں لیکن اُسکی ماہیت و نوعیت کے متعلق حکمی رائے قائم کرنا مشکل
معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف خمخانۂ جاوید کا خیال ہے کہ اس عارضہ کو بظاہر وہم سے
منسوب کیا جاسکتا ہے۔" اس باب میں جو حالات سید بیان کے برادرِ عزیز میر سید حسین
صاحب میرٹھی سے دستیاب ہوے ہیں وہ بے کم و کاست درج کرتے ہیں۔
سید صاحب موصوف شہرت و قابلیت میں اپنے برادرِ معظم کے شریک و سہیم ہیں اور
صوبجاتِ متحدہ میں بعہدۂ تحصیلداری ممتاز ہیں۔ علمی رسالوں میں آپ کے
مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کی معنی یاب طبیعت کا بھی اندازہ
ہوسکتا ہے۔ آپ رقمطراز ہیں:۔

حالتِ مرض یہ تھی کہ قریب دو سیر وزن کی کپڑے کی گٹھری بنا کر دماغ پر رکھتے
تھے اور کہتے تھے کہ دماغ بغیر اسکے اُڑا جاتا ہے۔ تاریک کمرے میں شب و روز
رہتے تھے۔ اُسکے دروازوں پر دبیز پردے پڑے رہتے کہ روشنی مطلق نہ آسکے۔
ہاون کے چلنے اور چھالیہ کاٹنے کی آواز بھی اُنھیں ناقابلِ برداشت تکلیف دیتی
تھی۔ نہایت خفیف شور سے بھی وہ سخت پریشان ہوجاتے تھے۔ اگر کسی ضرورت
سے باہر نکلتے تو چھتری لگاکر۔ کہتے تھے کہ تاروں کی روشنی سے اذیت پہنچتی ہے
اور تارے دماغ میں چبھتے ہیں۔ اس مرض میں وہ تمام عمر مبتلا رہے۔ البتہ
چند سال کے بعد مرض میں وہ شدت نہ رہی تھی جو آغاز میں تھی۔ شور سے اب
مطلق پریشان نہ ہوتے تھے۔ مکانِ تاریک کی نشست ترک کردی تھی۔ کپڑے کی
کی گٹھری سر سے کندھوں پر اُتر آئی تھی۔

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد سوا اسکے کیا نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ انکا دماغ نہایت
نازک واقع ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بھی انکی دماغی کاوشیں بدستور جاری تھیں۔

سید بیان کئی اعتبار سے واقعی شاعر تھے۔ شاعری اور جنون کا ایک
درجہ رکھا گیا ہے۔ جس طرح عالمِ جنون میں انسان کو اور باتوں کا کوئی احساس
نہیں ہوتا اسی طرح حقیقی شاعر کی توجہ بھی فروعات کی طرف نہیں جاتی۔ وہ
اپنی دُھن میں مست رہتا ہے اور عالمِ خیال کی محویت اُس پر طاری رہتی ہے۔ اسے
قید علائق سے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلقات نکاح چونکہ آدمی پر
غیر معمولی ذمہ داری کا بار ڈالدیتے ہیں اور طرح طرح کے آلام اور تردداتمیں
پھنسا دیتے ہیں اس لیے انگلستان کے اکثر شعراء نے شادی نکرنا ہی اپنے
لیے اچھا سمجھا تھا۔ ہماری ذاتی رائے میں مناکحت ہر انسان کے لیے ایک
اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے اور مذہب نے اسکی ضرورت و اہمیت جس طریقہ
پر تسلیم کرائی ہے اُس سے بھی کسیکو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی باایںہمہ یہ
ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتا ہے جسکے اُٹھانے کی اگر کسی میں طاقت نہ ہو
تو وہ معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ سید بیان ذاتی طور پر دنیاوی علائق سے مستغنی
واقع ہوے تھے۔ وہ طبعاً آزادی پسند تھے۔ لباس، خورش، کسی چیز میں
وہ تصنع و آرایش یا تکلف کے پابند نہ تھے۔ بے غل و غش زندگی بسر کرنا اور
چمن سخن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرنا انکا نصب العین تھا۔ اسی لیے
اُنھوں نے کوئی شادی نہیں کی اور باوجود اصرار کے "سنتِ پیغمبری" سے
اپنے "گلو" کو بچائے رکھا۔

آزادمنشی کے ساتھ ظرافت میں بھی وہ یکتا تھے۔ مزاج میں استقلال
بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آخری دفعہ جب بیمار پڑے تو آثارِ موت ظاہر تھے۔
لیکن مستقل مزاجی کا عالم وہی تھا۔ بسترِ مرگ پر بھی خلقی ظرافت نے ساتھ نہ چھوڑا
اور عزم استقلال کے وہی دم خم تھے۔ مرنے سے پہلے ایک کارڈ اپنے عزیز بھائی
کو لکھا تھا جسے اس مصرعہ پر ختم کیا تھا ع

بہلے مُردن میں غسل خوب بتا دی تو بتا دو

آخر وہ وقت بھی آگیا جس سے کسی ذی روح ہستی کو چارہ نہیں ستمبر ۱۹۰۰ء کے موسم سرما میں سید بیان مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تقریباً دو مہینہ کی علالت کے بعد میرٹھ میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

بہت گر کوئی قیامت سلامت

ہم نہ رو رو کر رخصت سلامت

## سید بیان کی شاعری پر نظر

حضرت بیان کی شاعری کا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور وہ اپنے فضائل و محاسنِ کمال کے وسیلہ سے اس درجہ تک پہنچ گئے تھے جو معمولی شاعروں کے منتہائے نظر سے بھی دور ہے۔ علمیت، ذاتی قابلیت، طبیعت کی جولانی، فکر کی بلندی، خیالات کی نیرنگی یہی باتیں ہوتی ہیں جو شاعر کے کلام کو مستند و قابل قدر بنا دیتی ہیں اور انھیں اوصاف کی بدولت بیان نے بھی اپنی لازوال عظمت کا سامان مہیا کر لیا ہے۔

بیان کے کلام پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر شعبہ کے شیر اور ہر میدان کے مرد تھے۔ پرگوئی کے ساتھ مضامین آفرینی کا پہلو کم نظر انداز ہو جاتا ہے لیکن بیان نے سب کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے بہت زیادہ کہا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کا کلیات ابتک شائع نہیں ہوا ورنہ ہر شخص بجائے خود اندازہ کر سکتا کہ خیالات و جذبات پر انھیں کہاں تک قدرت حاصل تھی اور انکی خوش بیانی و نغز گوئی کن کن دلچسپیوں اور رنگینیوں کا دلفریب مجموعہ بنی ہوئی تھی۔ ہمیں میر سید حسین صاحب کی مہربانی سے بیان کے مختلف اصناف سخن پر غلط انداز نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے اور اسکے دیکھنے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ موجودہ شاعران اردو میں تو کوئی ایسا نہیں جو انکی نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکے بلکہ شعرائے سلف میں بھی اکثر سے بیان آگے نہیں لیکن کسی سے کم بھی نہیں رہے۔

بیان کے ایک پختہ کار سخن گو ہونے کی اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جس رنگ میں چاہتے تھے بے تکلف کہتے تھے۔ زبان پر انھیں خاصہ قابو تھا۔ وزن دار اور موزوں الفاظ گویا انکے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ خیالات کی گوناگوں کیفیات کبھی میر کے رنگ میں نظر آتی ہیں کبھی غالب کے۔ کہیں ذوق کی متانت اپنی ہو بہو تصویر میں جلوہ گر ہوگی کہیں جرأت و داغ کی شوخیِ بیاں کا لطف حاصل ہوگا۔ اس نیرنگی کے باوجود انکی خاص طبیعت کا رجحان مطالعہ کرنیوالے کے قلب پر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ خصوصیت انکے ہر صنف کلام میں موجود ہے۔

بیان کی اردو غزلیں بہت دھوم دھام کی ہیں اور انکی پرگوئی کی مثال مشاہیر میں ذرا لکھنوی کے سوا کسی اور میں مشکل سے مل سکتی ہے لیکن انھوں نے مؤخر الذکر کی پیروی رعایات لفظی کے اعتبار سے کہیں نہیں کی۔ اور اگر کسی جگہ کی بھی ہے تو خوبی سے نہ اس طرح کہ سامع کا خیال معانی و مطالب سے ہٹ کر الفاظ کی طرف پیدا ہو جائے۔

کئی کئی زمینوں میں سہ غزلہ اور چہار غزلہ تک کہا ہے لیکن کہیں اور کسی پہلو سے جھول نہیں۔ شعر کے بعد شعر پڑھیے اور آمد کا لطف اٹھائیے۔ انکے کلام کا بعض حصہ ایسا ہے کہ اگر کوئی شخص سرسری نظر سے بھی دیکھے تو غالب کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی ترکیبیں، وہی الفاظ کی نشست، وہی خیالات کی پیچیدگی، وہی مضمون کی دقت۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کی ہمہ گیر طبیعت ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی جن سخن وران کامل کو قدرتی طور پر فضل و کمال کا یہ درجہ ملتا ہے وہ ماں کے پیٹ سے صاحب فن پیدا ہوتے ہیں اور لاریب کہ بیان بھی ایک نظری شاعر تھے اور انکے جوہر کمال کو انکے ذاتی علم و قابلیت نے اور جلا دی تھی۔ بچپنے ہی سے انھیں شعرگوئی کا شوق دامن گیر تھا اور اپنے والد کی ناراضی کے باوجود وہ فکر سخن میں منہمک رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بالعموم مشاہیر کے حالات زندگی شرح و بسط سے منضبط کرنے کا طریقہ مروج نہیں ورنہ بیان کی شاعری کے مختلف مدارج پر غور کرنا خالی از دلچسپی نہ تھا۔ تاہم دو تین اشعار انکی

ابتدائی مشق کے جو ہم پہنچے ہیں انکے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آغاز ہی سے انکی طبیعت کس قدر معنی یاب واقع ہوئی تھی۔ تقریباً پندرہ برس کی عمر کے یہ تین اشعار انکی یادگار ہیں ؎

گھبرا کے جہاں سے یہ ستم کش ترے گھر جائے — اور در ہو ترا بند تو بتلا کدھر جائے
ہٹ ہٹ کے اندھیر نہ کرو آنکھوں کے آگے — واں تک تو نظر آؤ جہاں تک کہ نظر جائے
بتلاتے نہ ہو مجھ کو مرا حال نہ کہنا — میں جان سکوں تا تک کہ میری خبر جائے

سخن فہم حضرات دیکھیں گے کہ دوسرا شعر کس قدر بلیغ ہے اور تیسرے شعر میں غالب کے رنگ کی جھلک موجود ہے۔ یہ صفت ہر شخص میں نہیں ہو سکتی اور اس عمر میں اس پایہ کے شعر کہنا کوئی معمولی بات نہیں۔

بیان فنِ شعر میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ صاحب "خمخانۂ جاوید" نے انھیں سید احمد حسین فرقانی کا شاگرد رشید لکھا ہے اور اسی تلمذ کے ساتھ وہ اکثر علمی حلقوں میں مشہور بھی ہیں لیکن فی الحقیقت انھوں نے زانوئے شاگردی کسی کے آگے تہ نہیں کیا۔ میر سید حسین صاحب برادر حضرت بیان سے اس بارے میں استصواب کیا گیا تھا اسکے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ

برادر مرحوم حقیقت میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ میر احمد حسین فرقانی اُن کے ماموں تھے۔ برادر مرحوم اُنکی تعظیم کرتے تھے اور اسیلیے اُنکو اپنا اُستاد بھی لکھتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں اُنھوں نے انکو ایک شعر بھی برائے اصلاح نہیں دکھلایا بلکہ بحیثیت شاعرانہ اُن میں اکثر مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔

در حقیقت جو صاحب کمال "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق اپنی طبیعت میں خود جوہر فن رکھتے ہیں وہ دوسروں کے مشورہ سے عموماً مستغنی ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُستاد کی نظرِ تربیت سونے کو اکسیر کر دیتی ہے اور شاگرد کے ذاتی اوصاف کو اور چمکا دیتی ہے۔ بیان اس سے محروم تھے لیکن اُنھوں نے اپنی زوردار طبیعت کی بدولت اپنے لیے خود ایک ایسی شاہراہ پیدا کر لی جہاں ذوقِ سلیم کے سوا اور کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بیان کا کلام اُنکے کمال کی دلیل ہے۔ اُنھوں نے جس طرح چاہا اپنی طبیعت کا رنگ دکھایا اور اس میں شک نہیں کہ اُنکا ہر رنگ چوکھا ہی رہا۔ غالب کے کلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو وہ جدت کے ساتھ کہتے ہیں کہ سُنکر جی خوش ہو جاتا ہے۔ بیان بھی اس امرِ خاص میں غالب کے پیرو ہیں۔ مبتذل مضامین کو وہ ایسی شگفتگی سے باندھتے ہیں کہ سنکر لطف آ جاتا ہے۔ بعض جگہ محض ایک دو لفظ سے وہ شعر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ذیل میں دو چار شعر اسی نمونہ کے ملاحظہ ہوں ؎

اُٹھے زمیں سے لالۂ خونیں کفن کی طرح — محشر ہے ایک کھیت شہیدانِ یار کا
پہنچی گلے سے تیغ تو سودا فنا ہوا — یہ جونک خون چوس گئی جسمِ زار کا
لائے گھسیٹ کر تہِ تربت سے شہید کو — دامن لہولہان ہے روزِ شمار کا
دامنِ دشتِ قیامت بھی اک اچھی سی گلی — گل کھلائے غضب اے چاکِ گریباں تو نے

خیالات کی جدت ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

ترے چلنے سے سینے میں زمیں کے — اُٹھا اک درد محشر کے بہانے
ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے — کیے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے
کون آتا ہے قیامت کیسے شرم آتی ہے — کہ مرا خون چھپایا تہِ داماں تو نے

رفتارِ معشوق سے محشر برپا ہونا، دستِ جنوں سے کوہسار کے ٹکڑے اُڑانا، یا معشوق کا عرصۂ قیامت میں شرمسار آنا، اُردو شاعری کے متداول مضامین ہیں مگر بیان نے ہر مضمون کو جدت کے ساتھ نظم کیا ہے۔ رفتارِ یار سے زمین کے سینہ میں محشر کے بہانے درد اُٹھنا بالکل نیا خیال ہے۔ تیسرے شعر کے معنی بھی نہایت لطیف ہیں کہ خود قیامت نے معشوق کے محجوب ہونے کے خیال سے عاشق کے خون کو اپنے دامن میں چھپایا ہے۔

ذیل کے اشعار کس درجہ بلیغ واقع ہوئے ہیں۔ ان کی داد اہلِ نظر خوب دیں گے ؎

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے — کسی کا پردہ رکھنا تھا کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا
کس رشکِ مہر و ماہ کا آوارہ گرد ہوں — ہے آسماں لقب مرے مشتِ غبار کا

کھا ہے پاؤں وہاں ترے اشتیاق دید نے — ہے شمع طور راہ بیاباں فنا جہاں کا

بے ٹھکانوں کو ڈھونڈھتا ہوں میں — کہ پتے ہیں ترے ٹھکانے کے

میرے نالوں سے کانپتی ہے برق — تنکے میں تنکے ہیں آشیانے کے

ہر ایک شے میں پنہاں تیرا مقام منظر — تو راز جو حقیقت کدہ کو ہستی اسرار منظر

موخرالذکر طرح میں بہ تبدیل قافیہ ایک غزل لکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ معنًا زبان اور سلاست بیان خصوصیت سے قابل غور ہے ؎

ڈھنگ بے ڈھنگ ہیں زمانے کے — رنگ بے رنگ ہیں زمانے کے

مو سے شکلیں نئی باندھ لیں شکلیں — یہی سب بہانے ہیں زمانے کے

اک نیا رنگ روز لاتے ہیں — آپ ہم رنگ ہیں زمانے کے

واہ رے نقش، واہ رے نقاش — آئینے دنگ ہیں زمانے کے

گردش آسماں فلاخن ہے — آدمی سنگ ہیں زمانے کے

تیسرے شعر کا مضمون کس قدر لطیف ہے اور آخری شعر میں گردش آسمان کو فلاخن سے اور انسان کو پتھر سے کتنی قریب الفہم اور معنی خیز تشبیہ دی گئی ہے۔

ان اشعار پر بادی النظر میں غالب کا دھوکا ہوتا ہے ؎

سر شوریدہ پائے دشت پیما شام ہجراں تھا — کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے رونے دلکو پیٹے بیٹھے ہیں تلووں کو — فرو رگ رگ میں نشتر تھے نہاں نس نس میں پیکاں تھا

انکا منجملۂ ارباب وفا ہو جانا — میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

غم الفت گلوگیر نفس ہے پھیر دو خنجر — نہیں آساں ہے مشکل۔ ہمیں آسان مشکل ہے

مشکل ہے، قاتل ہے، اس زمین میں سید بیان نے جو غزل کہا ہے اور چاروں غزلیں بہت دھوم دھام سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک غزل جسکا ایک شعر یہ ہے بہت مشہور ہے اور ارباب نشاط کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے ؎

چلی آتی ہیں نذریں دھوم سے دربار قاتل ہے — کسی کا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے

چاروں غزلیں مصنف کے اصلی رنگ طبیعت کا دل فریب نمونہ ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ انکا ہر شعر دوسرے شعر سے بڑھا ہوا ہے۔ جو لوگ غزلوں میں شکوہ الفاظ و دبدبۂ مضمون کی تصویر دیکھنا چاہیں وہ ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں ؎

شہادت منزل مقصود ہے ملاح قاتل ہے — یہ موج بیتابی دم شمشیر ساحل ہے

تگ و تاز سمند جسم تا ایوان قاتل ہے — اتر لے اے سر شوریدہ اب نزدیک منزل ہے

وہ اٹھتا ہے دہن ہونٹوں پہ تلاش خون بسمل ہے — زباں نکلی ہوئی ہے کیا چھری تیغ قاتل ہے

وہ مجنوں ہوں وہ میرا شاہد لیلیٰ شمائل ہے — زمیں جسکا بیاباں چرخ ناقہ عرش محمل ہے

وہ محفل محفل شادی ہے ہر سو رقص بسمل ہے — شہید ناز ہے دولہا دلہن شمشیر قاتل ہے

یہ شعر کس موثر انداز میں کہا گیا ہے ؎

قیامت کی نگاہ یاس نے کیوں پھیر کر مارا — کہ قاتل نیم بسمل ہے دم شمشیر بسمل ہے

شاہد لیلیٰ شمائل کی تعریف اوپر ایک مطلع میں گذر چکی ہے۔ اسی محمل کے قافیہ کو ایک مقطع میں پھر اسی شان سے نظم کرتے ہیں ؎

مرا دل لے بیاں مجنوں ہے اس لیلیٰ شمائل کا

غبار عالم ایجاد جس کی گرد محمل ہے

ذیل کے شعر میں تکرار کتنی پُر لطف ہے اور مضمون بھی نہایت شگفتہ ہے ؎

وہ ہیں چشم تصور میں لگی ہے چشم شوق اس سے — تماشا ہے کہ میں قاتل میں ہوں اور دل میں قاتل ہے

وہ کہتے ہیں مرا پیکان ہے کہتا ہوں مرا ارماں — وہ کہتے ہیں مرا ہے کون میں کہتا ہوں مرا دل ہے

"نگاہ یاس" والا شعر نہایت پُر اثر ہے۔ زار و نالی کے مضامین انکے کلام میں کم نظر آتے ہیں باایں ہمہ جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔ یہ شعر کتنا حسرت آمیز ہے ؎

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھکو — کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

اسی طرح ارمان کی "جواں مرگی" کا ماتم بہت پُر درد ہے ؎

عمر بھر قید رہا ہائے جوانمرگ موا — کچھ بھی دنیا میں نہ دیکھا مرے ارماں تو نے

اس غزل کا مطلع قابل دید ہے اور دنیائے فانی کی کیفیات کا آئینہ ہے کہتے ہیں ؎

کیا ہوا ان کو اتارے تھے جو مہماں تو نے — کچھ بتایا نہ لب گور غریباں تو نے

ناظرین سخن فہم نے غور کیا ہوگا کہ بیان کس قسم کے شعر گو تھے اور انکا ادبی رجحان کس طرف تھا۔ جدت پسندی کے باوجود انکے کلام کا حصہ ایسا بھی ہے جو سلاست اور سادہ گوئی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

ہو نہ پکا کسی کی آرزو سے    ہماری آرزو نکلی لہو سے
یہ تو نے کی ہوائے گل سے واعظ    دری توبہ کو کیا نسبت وضو سے

ترا کشتہ اٹھایا اس نے بانے    چلے محشر کو مٹی میں دبانے
نگاہیں قہر میں ڈوبی ہوئی ہیں    چلے تم زہر میں چھریاں بجھانے
مرے مجموعۂ خاطر پہ تو نے    کیا جو تیرے گیسوے صبا نے
یہ ہے شام فرقت یہ ہے شام فرقت    نہ ہوگی نہ ہوگی سحر دیکھ لینا
وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنا تعلق    ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا
اب مجھے کھو کے نہ رو ؤ کہ اگر روئیگی شمع    جان پڑ جائیگی کیا خاک میں پروانے کی
جلوہ سے ڈال دیا چشم تماشا پہ نقاب    یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی
مجھے بھی نقد آمرزش کی محشر میں ضرورت ہے    شہنشاہا! کمی کیا ہے تری سرکار رحمت میں
جہاں پر شور ہوئے دل پڑا رہ کنج غربت میں    کہیں مارا نجائے جنگ ہفتاد و دو ملت میں

مضامین کی دھوم دھام اور الفاظ و ترکیب کی بلند پائگی کے اعتبار سے جس شخص کی غزلیں بسا اوقات قصیدوں کا دھوکا دیتی ہوں اُسکے قصیدہ کا کیا کہنا - ہمیں افسوس ہے کہ سید بیان کا کوئی اُردو قصیدہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا - اُنکے قصائد جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہے عموماً فارسی میں ہیں - سید بیان اُردو کی طرح فارسی کے ایک نغز گو اور جیّد شاعر تھے - اور اس میں یزدانی تخلص کرتے تھے - فارسی قصائد کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس معرکہ میں بھی اچھے اچھوں سے نمبر لیگئے ہیں - اُصولاً انکے قصیدے خاقانی کے اور ادائے مطالب کے لحاظ سے انوری کے قصیدوں کے ہم پلّہ ہیں - منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ایک قصیدہ کہا ہے جسکی تمہید قابل دید ہے - فرماتے ہیں ؎

اے خوشا کوکبۂ گل کہ بگلزار رسید    ژالہ شبگیر زد و لالہ بہ دیوار رسید
چہرہ را سنبل پُر پیچ چو شانہ آراست    کس صبا شانہ کش طرّۂ طرار رسید
در بہاراں گل اگر فرو بہائے دارد    خار را سرو قدے واں کہ ز فرخار رسید
باد در صحن چمن طبلۂ عطار کشود    پنبہ ساں غنچہ ازاں طبلۂ عطار رسید
سرو خضریست کہ پیرایۂ خضرا در بر    لب جو صورت عباس علمدار رسید
رنگ چوں آل محمد بہ ریاحین داوند    حُلّۂ سبز چو سادات باشجار رسید
از سمک تا بہ سمانیست وجود خلشے    گل ز گلزار و زجو ماہی بے خار رسید

سرو کی تشبیہ حضرت عباس علمدار سے کس قدر لطیف و با معنی ہے - اسی طرح آخری شعر میں خلش نہ ہونے کا ثبوت "ماہی بیخار" سے کتنا اچھا بہم پہنچایا ہے -

میرٹھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا - اُس میں سید بیان بھی شریک تھے - اسکے لیے ایک قصیدہ بڑے معرکہ کا کہا ہے تشبیب کتنی بلند ہے ؎

ساقی بیاور مے زدن کا وان باراں آمدہ    وز کوہساراں قطرہ زن ابر بہاراں آمدہ
اُردی بہشت آمد کنوں گلشن بہشت آمد کنوں    از خشت خشت آمد کنوں تا گل بہ ایواں آمدہ
از گل نشاط انگیختن در باد عنبر بیختن    از ابر لؤلؤ ریختن وز چاک داماں آمدہ
مرغ از طرب دستاں زند گلخندہ چوں مستاں زند    چقماق در بستاں زند برقے کہ رخشاں آمدہ

قصائد میں حصۂ غالب مدح ممدوح کا ہوتا ہے لیکن چونکہ تعریف میں مبالغہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس لیے سامعین کے دل پر اُسکا اثر چنداں نہیں ہوتا سید بیان نے اسی قصیدہ میں مسٹر محمود مرحوم اور آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تعریف نہایت معنی خیز طور پر کی ہے اور چونکہ اسمیں واقعیت کو بھی دخل دیا گیا ہے اس لیے مضمون مزیدار ہو گیا ہے - مسٹر محمود کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ترکان تازی را اگر پیر حجازی رہ انگر    محمود غازی را اگر با فر سلطاں آمدہ
دانش ورش را چ کند داراے ہندش کج کند    عزت کلاہش کج کند فرش فراواں آمدہ

مولوی سید حسین بلگرامی کی مدح میں یہ شعر داد طلب ہیں ؎

آن سید جیّد حسین آن مصطفیٰ را نور عین    صدر شرف را زیب و زین در بزم اعیاں آمدہ
گو نیدنامی گوہر است او بلگرامی گوہر است    لا بل گرامی گوہر است کز عدن عدناں آمدہ

منشی عبد الکریم سی آئی ای کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

بخلوت در - ندیم بارگاہ عزتِ جانی    بجلوت در - مشیر قیصر ہندوستاں بینم

دو دستِ امتناں لستہ و انگشتِ نطاق یا قلیم دو آب اندر و ہیچ بیابانیم

سید بیان کے قصائد و غزلیات کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ انکے نعتیہ کلام پر بھی سرسری نظر نہ ڈالی جائے۔ اس صنف خاص میں متاخرین شعرائے اردو میں حضرت محسن کاکوروی نے قابلِ رشک امتیاز حاصل کیا ہے۔ حضرت غلام امام شہید بھی مداحِ رسولِ امی کی حیثیت سے نہایت نامور ہو چکے ہیں ان بزرگوں کے کلام کی دل آویزی اور بالخصوصیت انکی وہ تاثیر کلام ہے جو صرف سچے عاشقانِ نبی کے دلوں میں پیدا ہو کر زبان و قلم سے نکل سکتی ہیں۔ مضامین آفرینی کے اعتبار سے نواب رضوان مرادآبادی بھی ذکر کے قابل ہیں۔ لیکن فی الحقیقت بہت کم شاعروں نے اس طرف توجہ کی ہے ہر شاعر کے دیوان میں چند نعتیہ غزلیں موجود ہونگی لیکن وہ صرف تیمناً و تبرکاً داخل کیجاتی ہیں۔ امیر مینائی لکھنوی نے البتہ پورا دیوان نعتیہ قصائد و غزلیات کا مرتب کیا ہے اور اردو میں اس قسم کے مستند کلام کی جو کمی تھی وہ اس سے بہت کچھ پوری ہو گئی ہے۔ سید بیان کا نعتیہ کلام محسن و شہید کے برابر نہیں رکھا جا سکتا لیکن انہوں نے بھی آں حضرت کی شان میں اپنی طرز میں اچھا کہا ہے اور بعض بعض چیزیں تو واقعی اس قدر موثر ہیں کہ گویا دل سے نکلی ہیں۔ انکی ایک نعتیہ غزل بہت مشہور ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹا لے آجا　　بے نقاب آج تو او گیسوؤں والے آجا

اس غزل کا یہ شعر بیحد کیفیت انگیز ہے ؎

ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں　　کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آجا

اسی کے چند اور اشعار قابلِ داد ہیں ؎

بیکسی پر مری خوں روتے ہیں چھالے آجا　　راہ میں چھوڑ گئے قافلہ والے آجا

پہنچا محبوب تو شاطرِ رحمت نے کہا　　خلوتِ راز میں لے ناز کے پالے آجا

رنگِ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں　　اے گلِ گلشنِ لولاکَ لَمَا۔ لے آجا

صورتِ لالہ ہے پُرداغ بیاں کا سینہ　　پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے آجا

ایک نعتیہ غزل اور قابلِ تذکرہ ہے جو ایک متداول زمین میں لکھی گئی ہے۔ اس میں سے چیدہ چیدہ اشعار دیکھنے کے لائق ہیں ؎

ضیائے دیدۂ عاشق ہیں دو رخسار محمد کا　　کہ ہے اللہ کا دیدار نظارہ محمد کا

قمر سمجھیں نہ ہم قرآن رخسار محمد کا　　یہ سیپارہ محمد کا وہ صد پارہ محمد کا

وہ محبوبِ الٰہی ہے کیا ہے اُسنے مہ پارہ　　کریگا سامنا کیا کوئی مہ پارہ محمد کا

اذاں ہے شور اُس سلطانِ دیں کے کوسِ شاہی کا　　سدا بجتا ہے پانچوں وقت نقارہ محمد کا

وہ شافی میرے دردونکا وہ کافی میرے دکھڑونکا　　میں دکھیارا محمد کا میں دکھیارا محمد کا

نعتیہ کلام کے آخر میں منقبت حضرت علی کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کو سید بیان کی پرگوئی اور قادر الکلامی کے ساتھ انکی وسیع النظری کا بھی اندازہ ہو سکے۔ لکھتے ہیں ؎

خانۂ حق میں علی سا گلعذار آنیکو ہے　　باغِ ابراہیم میں فصلِ بہار آنیکو ہے

جھومتا ہے بادِ فرو دیں سے کعبہ کا غلاف　　گلفشانِ شاخسارِ ذوالفقار آنیکو ہے

قلعہ گیر خیبر شکن عنتر فگن اژدر شکاف　　دیو در عفریت کش ضیغم شکار آنیکو ہے

بعض بندے جسکو نادانی سے کہتے ہیں خدا　　وہ مقدس بندۂ پروردگار آنیکو ہے

لافتیٰ الّا علی کا غلغلہ اٹھنے کو ہے　　آیۂ لا سیف الّا ذوالفقار آنیکو ہے

چوتھے شعر میں نصیریوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت علی کو (معاذ اللہ) خدا کہتے ہیں۔

مرثیہ بھی آجکل جداگانہ فن کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اور اس فن میں انیس و دبیر یا انکے جانشینوں نے جو نام پیدا کیا ہے اُسکے آگے کسی کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ غالب نے بھی اس میدان میں تلوار میان میں کر لی تھی حالانکہ جذبات نگاری کا فطری ملکہ جو انھیں تھا اُسکی نظیر کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ملنا غیر ممکن ہے۔ بیان نے میر انیس کی طرز پر تین چار مرثیے کہے ہیں اور بجائے خود وہ بہت کچھ قدر کے شایاں ہیں۔ ایک مسدس کی فخریہ تمہید یوں لکھی ہے ؎

خورشیدِ آسمانِ شرف ہے سخن مرا　　دریائے فیض کانِ شرف ہے سخن مرا

چترِ خدائیگانِ شرف ہے سخن مرا شاہنشہِ جہانِ شرف ہے سخن مرا
اس زور شور سے کوئی لشکر بڑھا نہیں
اس اوج موج سے کوئی دریا چڑھا نہیں

بسمل نیا عدو تو ستم ہے زباں مری گویا زبانِ تیغِ دو دم ہے زباں مری
تیغ علی کی طرح علم ہے زباں مری سیفِ خدا خدا کی قسم ہے زباں مری
نقب پکارتے ہیں کہ معجز نگار ہوں
مدحت طراز یادِ تیغِ ذو الفقار ہوں

اُنکے مراثی کو بلا استیعاب دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا مشکل ہے کہ سید بیاں کا مرتبہ گوئی میں کیا درجہ ہے۔ تاہم اوپر کے دو بند اُنکے انداز کے ذہن نشین کرنے کے لیے کافی ہیں۔ انیس و دبیر دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتے لیکن اُنکے خاندان والوں نے اپنے گرامی منزلت بزرگوں کا نام اچھی طرح روشن کیا ہے گویا ابھی تک مرثیہ گوئی اُن لوگوں کا موروثی ترکہ ہے۔ یقینی بات ہے کہ اُردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئی ملکیت کے دعویدار بھی پیدا ہوتے جائینگے اور ایکدن اپنا حصہ لیکر رہیں گے۔ سید بیاں اور اسی قسم کے دوسرے شعراء کی یہ کوششیں اُسی دعوے کا ابتدائی ثبوت ہیں اور اسی قبیل سے شعراء غالباً ایکدن اپنی مساعی جمیلہ سے دنیا پر ثابت کر دینگے کہ کوئی علم اور کوئی فن کسی خاص شخص یا کسی خاص طبقہ کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ ہمت کے آگے پہاڑ بھی سرنگوں ہوتا ہے۔

سید بیاں کے مراثی گو انیس و دبیر کی ٹکر کے نہیں ہیں لیکن اُن کے تصنیف کردہ "سلام" بہرصورت اس قابل ہیں کہ لکھنؤ کے مشاہیر کے بالمقابل لائے جائیں۔ مونس کا ایک مشہور سلام ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

عذابِ نارِ سقر سے معاف ہم بھی ہیں کہ عبدِ ہاشم و عبد مناف ہم بھی ہیں
گلے کے تیغِ علی نے کہا کہ بسم اللہ پڑھیں حضور کہ تیغ غلاف ہم بھی ہیں
نبی تو یاد کرا سے کعبۂ خلیل اللہ کہ مستحقِ ثوابِ طواف ہم بھی ہیں
نجف ہو یا کہ ہو جنّات عدن ہو یا کہ بہشت علی جہاں وہیں بے اختلاف ہم بھی ہیں
صراط بال سے باریک ہو تو ہو مونس
کچھ اسمیں فرق نہیں موشگاف ہم بھی ہیں

اسی ردیف و قافیہ میں سید بیاں کے اشعار دیکھیے ؎

سخن کے معرکہ میں گرم لاف ہم بھی ہیں برنگِ تیغِ علی بے غلاف ہم بھی ہیں
زبانِ چیں سے کہا ہستیٔ موالی نے کہ سیفِ دستِ خدا کے غلاف ہم بھی ہیں
زمیں پکاری کہ خاکِ درِ حسین ہو ہمیں کہا فلک نے شریکِ طواف ہم بھی ہیں
کہا سکینہ کے اعضا نے قطع ہو ہو کر مقطعات بلا اختلاف ہم بھی ہیں
بیاں بہشت میں مونس سے چلکے کہتے ہیں
کچھ اسمیں فرق نہیں موشگاف ہم بھی ہیں

مقطع میں سید بیاں نے شاعرانہ شوخی سے کام لیا ہے۔ مونس اپنے موشگافی کے دعوے میں بال برابر فرق تسلیم کرتے ہیں اور بیاں اپنے موشگاف ہونے میں اتنا فرق بھی جائز نہیں رکھتے۔ عبد مناف کا قافیہ بیاں نے بھی یوں نظم کیا ہے ؎

کہا یہ حُر نے شہِ دیں سے ہو کے پیوستہ کہ سرو گلشنِ عبدِ مناف ہم بھی ہیں

اس سلام میں سید بیاں نے قافیہ پیمائی کی شان نہایت عمدگی سے دکھلائی ہے بہت سے ناموس اور دقیق الفاظ کو نہایت خوبی سے نباہا ہے۔ ملاحظہ ہوں ؎

یہ آفتاب کا ہے قول خیطِ ابیض سے برائے مسندِ شہ نور باف ہم بھی ہیں
غبارِ شاہ کا ہے قول روشنائی میں عیونِ شمس و قمر کے غلاف ہم بھی ہیں
پکارے گر کے صنم جب علی نے کی تقطیع کہ بیتِ ربِ علا کے زحاف ہم بھی ہیں

اس شعر کا مضمون کتنا بیساختہ ہے ؎

رسول کہتے ہیں مولا کے فاکسا، دیں ہے فلک کرے تو کرے انحراف۔ ہم بھی ہیں

ایک اور سلام کا مطلع کس قدر پُر درد ہے ؎

صدا اجرانی آئی تھی لبِ شہ سے تیر قاتل سے رگیں پیاسے گلے کی خشک ہیں کٹتی ہیں مشکل سے

اسکا ایک اور شعر مضمون و طرزِ بیان کے لحاظ سے خوب ہے لیکن پیاسے بالکل

پسے دل کانوں کو اجنبی سا معلوم ہوتا ہے ؎

اب دریا پیاسے رہ گئے حضرت بھی غم ہے کہ ایک ایک موج اچھل اچھل کر کو گلا تی ہو ساحل سے

دو ایک معرا نظمیں محرم نامہ وغیرہ کے نام سے لکھی ہیں - ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

آگیا ساقی غم کا مہینا    توڑ دے ساغر چھوڑ دے مینا

آتا آتا وہ بزم کے آنا    خندۂ جام کو آنکھ دکھانا

بادہ عیش پہ سپکے    ہفتہ عشرہ بلکہ بھی سپکے

شیشۂ سبز تڑاق سے ٹوٹے    ساغر سرخ تڑاق سے ٹوٹے

ساغر دل نہ مینا بھر دے    خون جگر سے مینا بھر دے

شاعری خوب ہے لیکن جذبات صحیح نہیں - طرز بیان ایسا ہونا چاہیے تھا کہ سامعین کے دلوں کو گداز کرے - ان اشعار کو سنکر قلوب پر رنج وغم کے اثرات طاری نہیں ہوسکتے بلکہ خیال کو تلازمے اور استعارے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں - مولنا حالی کا وہ اصولی اعتراض جو آپ نے مثنوی گلزار نسیم کے اس حصہ پر کیا ہے جہاں بکاؤلی پھول چوری جانے پر گریہ وفریاد کرتی ہوئی یہ کہتی ہے ؎

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون    ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون

شبنم کے سوا ادھر آنے والا    اوپر سے تھا کون آنے والا

سید بیان کے شعروں پر بھی صادق آتا ہے - لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ اس مضمون کو پردرد انداز سے لکھنے پر قادر نہ تھے - اسی قسم کی ایک اور نظم کے مندرجہ تحت اشعار سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوجائیگی ؎

چاند محرم کا نظر آیا    آنکھ میں یا لخت جگر آیا

تڑپ رہے ہیں رسول کے جانی    بند ہوا ہے دانہ پانی

روتے ہیں بچے پیاس کے مارے    دُر نجف بے آب ہیں سارے

شاہ کا سر اور نیزۂ امت    نقل ہے جس کی مہر قیامت

رہتے تھے جس پہ ہونٹ نبیؐ کے    ایسے گلے پر دانت چھری کے

صاف وسادہ الفاظ ہیں لیکن کم وبیش تاثیر سے مملو ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین لکھنے پر قادر تھے - یہ اتفاقی بات ہے کہ کسی نظم میں طبیعت کا رجحان کسی خاص سمت ہو جائے - واجد علی شاہ اختر کا فارسی مرثیہ بہت درد انگیز لکھا ہے - مفصلۂ ذیل انتخابی شعروں میں ہستی ناپائدار کا خاکہ اچھا کھینچا ہے ؎

بیا تا بنالیم چون قمریاں    که شاهاں کجا یند و میراں کجا

بگورا بے تاجداراں خرام    نہ چاؤش وہاروں نہ کوس ودما

نہ آں تاج بینی نہ آں تارکش    نہ زنداں سرائے سکندر وکرا

کنوں یکدرم نیست زینساں اثر    فیا حسرتا ثم واحسرتا

نشیند یکے تا نہ خیزد دگر    ابر تخت اقبال تنگست جا

مکاری سرود الرحیل الرحیل    منادی زند الفنا الفنا

سید بیان جس زمانہ میں ایشیائی شاعری کے چمن کو اپنی آبیاری فکر سے نشوونما کا سامان بہم پہنچا رہے تھے اسی وقت ہندوستان میں وہ گروہ نمودار ہورہا تھا جس کی دوربین نگاہوں نے بتادیا تھا کہ مغربی شاعری کے اتصال سے اردو شاعری میں یقینی طور پر انقلاب آنیوالا ہے - موخر الذکر گروہ کے افراد کی انقلاب انگیز کوششیں شروع ہوچکی تھیں اور پروفیسر آزاد و مولنا حالی کے مقلدوں کی ایک نئی جماعت کے ہاتھوں ایشیائی طرز سخن کی اصلاح کا کام شروع ہوچکا تھا - سید بیان ان حالات سے کیسے ناواقف رہ سکتے تھے - غالباً انھوں نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ ہماری قدیم شاعری ترمیم واصلاح کی محتاج ہے - انکے کلام میں قومی غزلیات موجود ہیں - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بزم عزائے قومی میں جہاں حالی اپنا مرثیہ پڑھ پڑھ کر فدائیان قوم کو تڑپا رہے تھے سید بیان بھی آنسو بہانے کے لیے پہنچ گئے تھے - انکے یہاں اکثر قومی نظمیں ہوتی تھیں اور ان میں وہ خود اور انکے تلامذہ طبع آزمائی کرتے تھے - انھوں نے ایک مسدس "ایشیائی شاعری کی الوداع" کے عنوان سے لکھ کر

قدیم شاعری کا حق رفاقت ادا کیا ہے جسکا ایک بند یہ ہے ؎

کٹا راج تیرا سب اے شاہزادی   غمی سے مبدل ہوئی تیری شادی
مرادوں کے بدلے ملی نامرادی   زمانہ نے تصویر تیری مٹا دی
نہ وہ چاند سی شکل نکھری ہوئی ہے
نہ وہ عنبریں زلف بکھری ہوئی ہے

ایک قومی غزل کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے ؎

کیا عالمِ سکوت میں ہے گلستانِ قوم   کوئی نہیں ہے بلبلِ جادو بیانِ قوم
وہ ٹوٹ کر گرا ہے سنبھل نہیں کوئی   اللہ کس زمیں پہ رکھوں آسمانِ قوم
اب تک تو کچھ گیا نہیں، دیکھ آنکھ کھول کر   مٹ جائیگا تو پھر نہ ملے گا نشانِ قوم

کانفرنس والے قصیدہ میں علم کی ضرورت ان الفاظ میں بتائی ہے ؎

شاہنشہِ دیں گفتہ است با شیخ و آئیں گفتہ   ولو کان بالصیں گفتہ است ایں گفتہ بہاں مدہ
ہم علمِ ابداں بایدت ہم علمِ ادیاں بایدت   ہم ایں و ہم آں بایدت کالعلم علمان آمدہ
خواہ سرت دیہیم را از کف مدہ تعلیم را   کیں فاتح است اقلیم را فتحش نمایاں آمدہ

حضرت بیان نیچرل نظمیں بھی خوب لکھتے تھے۔ نمونہ کے طور پر ہم ایک نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ نیچرل مضامین کو کس ندرت اور کس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ جاڑے کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

دھوم مچاتی سردی آئی   دانت بجاتی سردی آئی
ڈھک گیا منھ اور چھپ گئے ہاتھ   جاء البرد مع الجبات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا   روئی کے پیچ نے سب کو پچھاڑا
گھر گھر بانٹی دولت اس نے   سب کو دیا ہے خلعت اس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری   کسی کا کمبل تول میں بھاری
آگ سے بیچ بیچ لاگ ہے سب کو   آس اولادی آگ ہے سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگالی   آج کل آگ ہے ننھی بالی
شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے   کوئلوں پر اب مُہر نہیں ہے

مولانا جعفر علی کا مرثیہ ترکیب بند لکھا ہے۔ پہلے بند کے یہ دو چار شعر دنیا

حالت کا آئینہ ہیں ؎

ہائے جہانِ گذراں کچھ نہیں   غیرِ خداوند جہاں کچھ نہیں
وادیٔ امکاں میں عبث دوڑ دھو   ماحصلِ ریگِ رواں کچھ نہیں
کھا نہ طلسماتِ فلک کا فریب   گنبدِ نیرنگ ہے یاں کچھ نہیں
عالمِ شہود نہیں کوئی شے   آئی صدا غیب سے ہاں کچھ نہیں

اُن کے بعض حصۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے واقف کار شخص تھے۔ انگریزی الفاظ بہت برجستہ استعمال کرتے تھے اور غیر زبان کے الفاظ ہونے کے باوصف اس طرح باندھتے تھے کہ بھدے نظر نہ آئیں۔ میرٹھ کے ایک سکول میں کوئی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ صاحب ضلع وغیرہ، رونق افروز ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک نظم پڑھی تھی جسمیں انگریزی الفاظ کی کھپت قابل دید ہے ؎

لال کرتی کا سپاہی ہے گلاب   کالی پلٹن کا ہے سنبل سولجر
جھانکتی ہے صورتِ نرگس خوشی   کھتی ہیں کلیاں چٹک کر کم ہیر
کرتے ہیں پتے مسرت کے چیرز   دیتے ہیں طائر خوشی کا لیکچر
لیتی ہے بلبل کنارِ شوق میں   کہتے ہیں ہنس ہنس کے گل مائی ڈیر

مسٹر محمود کی تعریف میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

درروے آں شیوا بیاں لرزد ایڈیسن را زباں   پیچیدہ لکنت در دہاں لب زیر دنداں آمدہ
تا در ادب بکشادہ لب زد در گش بکشادہ لب   سحبانِ فصحائے عرب ہومر زبوناں آمدہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مختلف ممالک کے قدیم و جدید علوم تاریخ و ادب پر کافی دسترس حاصل تھی ورنہ ہمارے بزرگ جن کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی ہو اُن کے لیے ایڈیسن اور ہومر سے روشناس ہونا کچھ کم حیرت کی بات نہیں۔

معلوم ہوتا ہے سید بیان کو سہرا لکھنے کا شوق تھا۔ ذوق و غالب والی طرح پر کم و بیش تین چار سہرے لکھے ہیں اور دوسری زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ہم انکے منتخب اشعار نیچے لکھتے ہیں اور ان کے تعلق

اپنی رسالے محفوظ رکھتے ہیں ؎

بنا ہے کعبۂ ابرو کا طاق جھوم جھوم کر | نقاب نور حرم کی حریم کا سہرا
گلوں کو جان کے جان سر فراز کیا | گواہ ہے ترے خلق عظیم کا سہرا
کلی جو غنچۂ دل کو چراغ حسن کی لو | تو بن گیا ید بیضا کلیم کا سہرا
پھول جھڑتے ہیں ترے خندۂ پیشانی سے | ہے بنا خندۂ حسن حسین کا سہرا
پھول چوٹی کا وہی ہے جو بسہ سر چڑھ جائے | کیوں نہ پھولا نہ سمائے چڑھ کے ترے سر سہرا
دام ہر تار زمیں بود گرفتار شدیم | رخ پر نور پہ کیوں ان کے تو ہو پر نور سہرا
لپٹی ہیں تار نظر پر جو حیا کی نظریں | بن گیا روشنی صبح کا تیرے سہرا
بوسے دیتا ہے جبیں پر کبھی رخساروں پر | زر زنہ منظور نظر ہوگیا ہے سہرا
گرمیٔ حسن سے ٹپکے جو عرق کے موتی | نکلے رخ کی شعاعوں میں الجھکر سہرا

اشعار کو تضمین کرنے میں بھی بیان کو امتیاز حاصل تھا۔ ناسخ کے مشہور و معروف مطلع سر دیوان پر کس برجستگی اور چستی سے مصرعے لگائے ہیں کہ دل سے بیساختہ مرحبا نکلتی ہے ؎

مرا دیدہ ہے منبع آدم ثانی کے طوفاں کا | مرا پہلو ہے مشہد کشتۂ امیدواراں کا
مرا حلقوم ہے مغرب ہلال تیغ براں کا | مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ایسے ہی وزیر کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے اور خوب کیا ہے ؎

حسن و قبح روئے زیبا کھل گیا | شرح کے خط سے معما کھل گیا
مو بمو مضمون سارا کھل گیا | عاقبت بینوں پہ نکتہ کھل گیا

حسن عارض عارضی تھا کھل گیا

خط کے آتے ہی لفافا کھل گیا

رعایت لفظی و معنوی کے اعتبار سے ناسخ کے شعر والی تضمین بالکل اچھوتی ہے۔ اس شعر پر اور لوگوں نے بھی مصرعے لگائے ہیں مگر کوئی بھی اسکی خوبی کو نہیں پہنچتے۔

تاریخی مادے بھی بہت با معنی اور برجستہ کہتے تھے۔ کسی عزیز کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی تاریخ کہی ہے ؎

ہوا احسان عظیم احدی سے لڑکا | گل رخ دیکھکے جس کا دل بلبل پھڑکا
رخ فرزند سے ہے حق کی تجلی پیدا | طور کا شعلۂ خاموش دوبارہ بھڑکا
جوش عشرت کا ہوا نوبت اقبال بجی | چرخ پر سے خوشی و عیش کا بادل کڑکا
زینت تاج سعادت ہے یہ تابندہ گہر | فکر تاریخ میں یوں طبع کا توسن بھڑکا

دیکھ کر روئے ولا ہاتف غیبی نے کہا

زیب کیا دیتا ہے ماں باپ کو موتی لڑکا

۱۲۱۴ھ

اپنے والد کے انتقال کی تاریخ کہی ہے ع گوہر افتاد ز تاج آفاق۔

رباعیات بیان بھی قابل قدر چیز ہیں۔ بطور نمونہ دو ایک درج کی جاتی ہیں ؎

کیا نور ہے کیا نور ہے کیا نور ہے تو | باطن سے عیاں بصر سے مستور ہے تو
عرش سدری کجا۔ کجا حبل ورید | کتنا نزدیک کس قدر دور ہے تو

حضرت کو طبیب درد امت پایا | کیا نسخۂ تبرید قیامت پایا
رحمت کا زلال اور شفاعت کی شکر | بیمار نے کس مزے کا شربت پایا

اکثر رباعیوں میں فخریہ مضمون باندھا ہے ؎

پروردۂ خلاق جہاں ہے یہ فقیر | سن اسکی صدا کہ خوش بیاں ہے یہ فقیر
خلاق نے بھرا ہے کوٹ کر مغز سخن | ہر چند کہ مشت استخواں ہے یہ فقیر

فیض سخن آفریں ہے دمساز مرا | کیوں روح قدس نہو ہم آواز مرا
بیٹھے رہیں بس چرخ چہارم پہ مسیح | دکھلائے سخن زمیں پہ اعجاز مرا

پہیلیاں بھی کہتے تھے مثلاً یہ انگشتری کی پہیلی ہے :۔

ہٹ ترے سر پر پتھر پیٹ میں انگلی

غرض کہ ہر فن میں کمال رکھتے تھے۔ اردو میں نثر بھی خوب لکھتے تھے لیکن انکی نثر بعض اوقات مقفٰی ہونے سے نثر غالب کی لطافت سے عاری ہوتی تھی۔ باایں ہمہ اکثر جگہوں پر بیساختہ لکھ گئے ہیں اور مقفٰی ہونے کے باوجود اس میں کوئی سستی یا اور عیب نہیں پیدا ہونے پایا۔ ایک

جگہ دفترِ وجود کے عنوان سے لکھتے ہیں : -

دفترِ وجود ایک سپید و سیاہ کتاب ہے۔ آسمان و زمین کے پٹھے لگے ہوئے ہیں۔ منقش جلد بندھی ہے۔ بحرِ محیط کا دائرہ اُسکی لاجوردی جدول شمار کی گئی ہے۔ کوہ سپید کا حاطہ اُسکا گنجان حاشیہ قیاس کیا گیا ہے۔ ایام و لیالی یعنی دن اور رات اُسکے کالے اُجلے ورق ہیں۔ نیّروں نے ورق پر زرِ بیل افشاں چُنی ہے۔ ستاروں نے سنہرے نقطے لگائے ہیں۔ مہتاب نے جلد پر چاندی کا کام کیا ہے۔ دھوپ نے ورق پر سونا پھیرا ہے۔ نشو و نباتی کی رنگ آمیزیاں صفحات کتاب پر مینائی نقش و نگار ہیں۔ لالہ و گل کا طور، سرو و سنبل کی سود خواشی کی پھول پتیاں ۔

دلچسپ مرقع ہے۔ اک نقش ہے یاں کا نقشہ کسی اُستاد نے کھینچا ہے جہاں کا

نثرِ آزاد کی رنگینی اور نثرِ غالب کی لطافت کو یہ نثر نہیں پہنچ سکتی لیکن اس سے اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر سید بیان کو اردو میں "پنج رقعہ" لکھنے کی خدمت سپرد کیجاتی تو وہ اسے کس عمدہ اسلوب سے پورا کرتے۔

مسند نشینہ کی تین سیر کے عنوان سے انکا ایک نثر مضمون اُس طرزِ تحریر کا نمونہ ہے جو کسی زمانہ میں اُردو اہل قلم کا نصب العین تھا۔ اس قسم کی تحریریں اب بھی ناولوں میں نظر آجاتی ہیں لیکن تبدیل مذاق کے ساتھ اب انکے قدرداں یہاں رہے نہیں : -

قامت کی شوخیاں روِ میں، قیامت کے فتنے جلو میں، پتی ہلتی تو ٹھٹک جاتی، پرچھائیں پڑتی تو جھجک جاتی، نرگس آنکھیں بچھا کر منتیں کرتی تو سمندِ ناز سے نیچے اُترتی، شوخی کا سُرنگ ترارے بھرتا تو آنچل سبزہ پر اٹھکیلیاں کرتا۔ پوشاک کی کلیاں مہک جاتیں۔ گل سے پیرہن کی لپٹ جاتی تو نکہتِ گُل دوڑ کر لپٹ جاتی۔

حضرت بیان کے احسانات جو اُردو زبان پر ہیں یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اُنکا قلم ہر طریقہ سے اُردو علم ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ ایک عرصہ تک "جلوہ طور" اُن کے مفید مطلب مضامین سے مزین ہوتا رہا ہے "طوطی ہند" کا نام اُنھیں کی بدولت آج تک چل رہا ہے۔ وہ مدت تک اُسکے باقاعدہ ایڈیٹر تھے۔ اُسکے پہلے دو صفحے میرٹھ پنچ کے عنوان سے چھپتے تھے جسکے ظریفانہ مضامین خود حضرت بیان کی ظرافت پسند طبیعت سے نکلتے تھے۔ ایک عرصہ تک اودھ پنچ سے معرکہ آرائی رہی۔ اودھ پنچ کے بیسیوں نامہ نگار اپنے پرچہ کی مدد کے لیے کمربستہ میدان میں نکل آئے تھے مگر اس شیر نے تن تنہا سب کا جواب دیا اور اپنا نام رکھ لیا۔

آخر میں اُنھوں نے اپنا ایک خاص رسالہ لسان الملک کے نام سے جاری کیا جو بارہ برس تک نکلتا رہا۔ اس میں مضامین نظم و نثر مساوی طور سے درج ہوتے تھے انکی غزلیات اور انکے شاگردوں کے کلام کے لیے بھی اسمیں گنجایش نکالی جاتی تھی۔ لسان الملک ۱۸۸۸ء میں جب جاری ہوا تھا شاید اُسوقت تک نظم و نثر کا مشترکہ مذاق پیدا کرنیوالا کوئی پرچہ نہ نکلا تھا۔ علمی مضامین کے علاوہ ادبی مسائل پر بھی زوردار تحریریں ہوتی تھیں۔ مولانا حالی کی مثنوی حقوق اولاد پر ایک اعتراضی مضمون نظم حضرت بیان نے اسی پرچہ میں مسلسل چھپوایا تھا۔

لسان الملک میں ایک عرصہ تک حل المطالب کے نام سے ایک سلسلہ مضامین نکلتا رہا ہے۔ یہ حضرت بیان کی شرح دیوان غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آج تک شایع نہیں ہوئی ورنہ ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر کی شرح درج کیجاتی ہے جس سے بیان کی نکتہ رسی اور سخن فہمی کا بھی ایک حد تک اندازہ ہو جائیگا : -

شعرِ غالب = سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

لغات : - سبزہ - روئیدگی، خط - مسیں، محاسن، کاکل - سر کے اوپر کے بال لیکن استعمال زلف و گیسو وغیرہ سب پر ہوتا ہے - زمرد - پنّا، ایک ہرے رنگ کا جواہر ہے حریف - مدمقابل، دَم - سانس، افعی - سانپ

معنی : - مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک معشوق کے سبزۂ خط نہ آیا تھا کاکل افعی کی طرح بل کی لیتا رہا اور عاشقوں کو رنگیلی اداؤں سے ایذائیں دیتا رہا۔ مگر

سکے اثر سے سانپ اندھا ہو جاتا ہی اور اسکی نیش زنی کی طاقت بالکل جاتی رہتی ہے اسکی یہ وجہ کہ خط زمردی پیدا ہوا اور زلف کی ایذا رسانی کا وہی عالم رہا۔ شاید یہ وہ افعی ہے جس پر زمرد کا اثر نہیں چلتا۔ مراد یہ ہے کہ خط نکل آنے سے سلطان حُسن کی سپاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ ہمارے معشوق کا بڑھاپا، حُسن خط آنے سے بھی نہیں گھٹتا۔ ظاہر ہے کہ صاف چہرے پر زلف کی درازی میں کمی نہیں آتی۔ حاصل ؎

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے　　وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

شرح معانی و مطالب کا اسلوب عموماً عام فہم ہی لیکن اس شعر کے حل میں ماخذ کو مشترک کر دیا گیا ہی اسکی صحت میں ہمیں کلام ہی۔ مختصر یہ کہ سید بیان ایک جامع کمال شخص تھے۔ انکی ادبی حیثیت ناظم و ناثر ہونے کے اعتبار سے یکساں ممتاز و مستند ہونی چاہیے اور یہ افسوس کہ انکی عمر نے وفا نہ کی ورنہ اردو ادب کی بہت سی خوشگوار امیدیں ان سے پوری ہوتیں۔ ایسے ذی ہنر مشاہیر کی موت کی تلافی اگر کوئی چیز اس عالم میں کر سکتی ہی تو وہ انکے بیش قیمت کارنامے ہیں۔ سید بیان آج دنیا میں موجود نہیں لیکن انکے کارنامے اور انکی علمی خدمات ادب ہمیشہ انکے نام کو صفحۂ تاریخ میں روشن رکھینگی۔ انھوں نے خود ہی کہا ہی ؎

نفس گم اور سخن باقی رہیگا　　نہو گا تار اور ہوں گے ترانے

## تنقید کتب

**روزنامچۂ سیاحت** اس نام سے، حال میں، آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب بی۔ اے، ایل ایل بی، کا سفرنامہ شایع ہوا ہی۔ خواجہ صاحب مئی ۱۹۱۱ء کے وسط میں ایک طویل سیاحت کی غرض سے گھر سے نکلے اور عراق، حجاز اور عجم وغیرہ کے مختلف اقطاع کا دورہ کرکے اُسی سال دسمبر میں واپس تشریف لائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسوقت کئی بزرگ ایسے موجود ہیں جو ان مقامات کی سیاحی کر چکے ہیں اور انکی روداد سیاحت قلم بند ہوکر شائع ہو چکی ہی، مولنا شبلی، منشی محبوب عالم، منشی عبدالقادر اور خدا غریق رحمت کرے عبدالرحمن امرت سری مرحوم، ان سبھوں کے سفرنامے اُردو لٹریچر میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کا روزنامچۂ سیاحت کئی خصوصیات میں ان سب سے الگ ہی۔ مثلاً یہ کہ اُنھوں نے واقعات سفر کو تاریخ وار قلم بند کیا ہی۔ عمارات و قابل دید اور تاریخی مقامات کے تذکرہ کے عوض خواجہ صاحب نے وہاں کے باشندوں کی اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی حالات پر روشنی ڈالی ہی۔ ایک اہم خصوصیت روزنامچۂ سیاحت کی یہ ہی کہ اس میں ایران کی موجودہ کیفیت پر زبردست اور نتیجہ خیز معلومات موجود ہی اور یہ بات کسی سفرنامہ میں اس وجہ سے نہیں پائی جاتی کہ اس سے پیشتر کسی سیاح نے سرزمین ایران کی سیر نہیں کی اور اگر کسی نے کی بھی تو خواجہ صاحب کے سے انہماک و دلچسپی کے ساتھ نہیں کی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خواجہ صاحب کی اصلی غرض سفر ہی یہی تھی کہ ایران کے چشم دید حالات سے مطلع ہوکر، بشرط امکان، ان خرابیوں کی اصلاح کے وسائل عمل میں لائے جائیں جن کی بدولت وہاں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہی۔ سفرنامے کے صفحات اس بات کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے اس اولوالعزم سپوت نے ایران کے فلاح و بہبود کے لیے اُسی دردِ دل، اُسی جوش، اور اسی نیک نیتی کے ساتھ اپنے دل و دماغ کو وقف کر رکھا تھا، گویا علیگڈھ میں "صیغۂ اصلاح تمدن" کا کام کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ رُجحان خواجہ صاحب کا ایرانیوں کی اخلاقی حالت کے سنوارنے کی طرف تھا۔ اسکے لیے اُن سے جو کچھ ہو سکا، کیا۔ اُمرائے سے ملے، مجتہدوں سے ملاقات کی، پبلک میں لیکچر دیے، مضامین لکھے، اہل الرائے طبقہ والوں سے مباحثہ کیا، آپس کے اتفاق و اتحاد کی ترغیب دی، اور دوسری ضروری اصلاحات کی طرف توجہ دلائی۔ خواجہ صاحب کا یہ انہماک اسدرجہ تھا کہ قسطنطنیہ میں بھی اُنھیں ایران کی دُھن لگی تھی۔ یہی زاد

سے، جو ایران کے فرقہ ذاکرات کا رہنما اور قسطنطنیہ میں مقیم ہے، کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایران کے حالات کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ نجف اشرف، کربلائے معلی، کاظمین شریف، بغداد، طہران قسطنطنیہ، اور دیگر مقامات میں خواجہ صاحب کو اُن لوگوں سے ملنا پڑا، جنکا مذہبی یا سیاسی پہلو سے معتد بہ اثر ایران کی پالیٹکس اور معاشرت پر پڑتا تھا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انکا نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلا۔ اسکا الزام خواجہ صاحب پر نہیں بلکہ اُن غیر مآل اندیش جاہلوں پر ہے جن کی افراتفری نے ملک کو تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ عام طور پر عمارات وغیرہ کے تذکرے، روزنامچۂ سیاحت میں نہیں ہیں لیکن بعض مقامات پر یہ التزام قائم نہیں رہا۔ مثلاً قسطنطنیہ کی بعض مساجد اور عمارات اور نیز اکثر مناظر کے حالات نہایت دلچسپی سے قلم بند کیے گئے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی عبارت کا اختصار ہے جسکی وجہ سے غیر دلچسپ غیر ضروری باتیں دخل نہیں پا سکیں۔

انصافاً کہنا پڑتا ہے کہ واقعات کے ساتھ خواجہ صاحب نے اپنی ذاتی آراء کے اظہار میں کمال احتیاط و دانشمندی سے کام لیا ہے۔ یوں بھی خواجہ صاحب نہایت اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں۔ مخالفت و موافقت میں، انکی جانب سے کبھی افراط و تفریط دیکھنے میں نہیں آئی۔ شیعہ کانفرنس کے واقعات گویا اسکا ثبوت ہیں۔

جو لوگ بیرونجات کی سیاحت کا شوق رکھتے ہوں اُنکے لیے اس کتاب میں کثیر التعداد مفید معلومات موجود ہیں۔

اس کتاب کے متعلق خواجہ صاحب سے ایک شکایت ضرور ہے کہ اسکی اشاعت میں کافی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ، یہ تینوں چیزیں جیسی کہ چاہیے نہیں ہیں۔ "مقامی مطابع کی بے ترتیبی" کا عذر اس حالت میں قابل لحاظ نہیں ہو سکتا کہ باہر کے پریس والے اچھے سے اچھا کام کرنے کے لیے موجود ہیں۔ تاہم، پانسو صفحات کا یہ سفرنامہ، جس کا مطالعہ دلچسپ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے اور جس کے دیکھنے سے ہر شخص کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتا ہے، عہ میں بہت ارزاں ہے اور منشی تراب علی صاحب، محرر آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب وکیل ہائیکورٹ میرٹھ یا دفتر رسالہ العصر لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتا ہے

**کلیاتِ عنبر** | اس نام کا کلیات، جسکی لکھائی چھپائی اور کاغذ وغیرہ سب قابل توصیف ہیں، گورکھپور سے شائع ہوا ہے جسکے مصنف منشی سنت لال صاحب عنبر، وکیل و رئیس گورکھپور ہیں۔ شروع میں چند مشاہیر کے قلم سے دو چار تقریظیں شامل کی گئی ہیں جنکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عنبر خاندانی شاعر ہیں۔ انکے والد حضرت معنی، بقول علامہ احسان اللہ عباسی اُستاد وقت شمار کیے جاتے تھے۔ گویا ذوقِ سخن جناب عنبر کو وراثتاً ملا ہے، اور کلیات کے سرسری مطالعہ کے بعد انکی پرگوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے

منشی سنت لال اُس زمانہ شناس کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ضروریات کے وقت سانچے میں ڈھل جانیکا عجیب و غریب فطری ملکہ پایا جاتا ہے۔ اس جگہ مراد کایستھوں سے ہے۔ اس قوم کے افراد نے اسلامی ادبیات سے جس قدر فائدہ اُٹھایا اُسکی نظیر کسی اور جماعت میں ملنا محال ہے۔ فارسی میں جو دسترس انھوں نے بہم پہنچائی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اُنکی تصانیف و تالیفات قدیم نصاب تعلیم کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ یہ کسی حد تک قابل مسرت امر ہے کہ حضرت عنبر نے اپنے بزرگوں کا مسلک ترک نہیں کیا بلکہ فارسی کے ساتھ اپنا شغف قائم رکھنے کے باوجود اُردو کو بھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اُنکے کلیات میں فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کی چیزیں موجود ہیں۔

جناب عنبر بظاہر اصول شاعری سے ناواقف نہیں نظر آتے۔ اگر بعض فروگذاشتیں اُنکے کلام میں ایسی ضرور پائی جاتی ہیں جو اس زمانہ میں بہر صورت قابل گرفت ہو سکتی ہیں لیکن ان پر زور دینے

انصافاً ٹھیک نہیں ہو سکتا کیونکہ عنبر اس زمانہ کے شاعر نہیں ہیں۔

کلیات عنبر مختلف اقسام کی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس، مخمس، اخلاقی نظمیں، نوحے، سہرے، تہنیت نامے اور اسی قبیل کی اور بہت سی چیزیں موجود ہیں، جن سے مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ ہز آنر لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کے ورود گورکھپور کے متعلق جو مسدس لکھا گیا ہے وہ نہایت درجہ دلچسپ ہے۔ حضرت عنبر نے نہ صرف اُن تمام انتظامات کا ذکر نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے جو اس موقع پر ہوئے تھے بلکہ سارے واقعات بے کم و کاست اس عمدگی سے نظم کیے ہیں کہ باید و شاید۔ دربار کے موقع پر حضور لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنی زبان فیض ترجمان سے جو تقریر فرمائی تھی اسکا ترجمہ نظم میں نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی نظمیں خاص خاص تقریبات اور سوشل مجمعوں سے متعلق ہیں اور اکثر اچھی ہیں۔ ہندو یونیورسٹی کے بارے میں جو ہمدردانہ خیالات ظاہر کیے ہیں اُنکا نمونہ یہ ہے

مبارک اہل گورکھپور کو ہو آج یہ جلسہ — مبارک آپ کو یہ نظم خوانی حضرت عنبر
خدا سے یہ دعا ہے اسکا چرچا ہو یہاں گھر گھر — بہ لے اکتساب علم دیویں لوگ سیم و زر
رہے دار العلوم اب یادگار ہندواں باقی
رہے جب تک فلک باقی نظام دو جہاں باقی

آخر میں "مخمس کریا" شامل ہے جو حضرت عنبر کے بڑے بھائی منشی دمان پرشاد صاحب کی تصنیف سے ہے اور اسکا جوڑ کلیات کے ساتھ صرف اس وجہ سے موزوں کہا جا سکتا ہے کہ دو بھائیوں کے نتائج افکار پر ناظرین کو غور کرنے کا پہلو بہ پہلو موقع مل سکتا ہے۔

اس کتاب کے آغاز میں منشی عنبر صاحب کی ہاف ٹون تصویر باعث زینت ہے۔ مصنف نے اپنی تصنیف کو دیدہ زیب بنانے کے لیے عمدہ طور پر مجلد بھی کرایا ہے۔ مجلد کی قیمت عہ؍ اور غیر مجلد کی عہ؍ کسی طرح زیادہ نہیں۔ حضرت عنبر سے گورکھپور کے پتہ سے طلب کرنا چاہیے۔

**خون شہادت کے دو قطرے** | دو جز کے ایک مختصر رسالہ میں، کارکنان نظام المشائخ دہلی نے منصور و سرمد کے پُرخروش مگر صحیح اور مستند حالات شائع کیے ہیں۔ جس طرح مضمون کتاب دو نامور عاشقان الٰہی میں مشترک ہے اسی طرح امتیاز تالیف میں بھی دو بزرگ شریک ہیں، یعنی حضرت منصور کے حالات مُلا محمد الواحدی نے اور جناب سرمد کے سوانح مولنا ابو الکلام آزاد نے قلمبند فرمائے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں، خاص کر آزاد کا انداز تحریر، جس میں جوش اور اصلیت کا کچھ اور ہی عالم پایا جاتا ہے۔ کتاب دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض حالات نامکمل اور تحقیقات تشنہ ہیں۔ لیکن اسکے لیے قابل مولفین میں سے کوئی بھی قابل گرفت نہیں بلکہ اسکے برخلاف انصاف سے کہنا پڑتا ہے کہ ان ہمت والوں نے اِدھر اُدھر سے جو کچھ لاکر اکٹھا کر دیا ہے وہ بسا غنیمت ہے، ورنہ کسی ایک کتاب میں اسقدر حالات کا ملنا اب تک غیر ممکن تھا۔ قیمت اسکی مع محصول ڈاک ۲ر مناسب ہے۔ شائقین کو دفتر نظام المشائخ دہلی سے فرمایش کرنا چاہیے۔

**شکوہ و فریاد** | مندرجہ عنوان نام سے کارپردازان رسالہ نظام المشائخ نے ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کو مختصر تقطیع کی کتابی صورت میں شایع کیا ہے اور اُسی کے ساتھ حضرت سیماب صدیقی الوارثی اکبر آبادی کا ایک مسدس، موسومہ "فریاد" بھی شامل کر دیا ہے۔ "شکوہ" حضرت اقبال کی مقبول عام و مشہور تمام کلام میں نمایاں درجہ رکھتا ہے اور اس سے پیشتر وہ اخباروں اور رسالوں میں نکل چکا ہے اسلیے اُسکے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہوگا۔ البتہ حضرت سیماب کے نتائج افکار تازہ چیز ہیں۔ "شکوہ" و "فریاد" کا مابہ الامتیاز ایک تو یہی ہے کہ "شکوہ" جہاں اس مصرعہ کی تفسیر کا کام دیتا ہے ع شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجکو، وہاں "فریاد" دربار رسالت میں کی گئی ہے جسکا انداز اور لب و لہجہ کہہ رہا ہے کہ اُس جوش سے مستفید ہو کر اظہار خیالات کیا گیا

ہی جو ایک زمانہ میں جنگ ترکی و اٹلی کے سبب مسلمانوں میں عام ہو رہا تھا مضامین کے اندر بھی اس لڑائی کا جا بجا حوالہ دیا گیا ہی۔ دو ایک بند نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں :-

پاش پاش کشمکش غم کر مٹا جاتا ہوں — میں تری کاوش پیہم سے گھلا جاتا ہوں
تا بہ رسید و لاکت مٹا جاتا ہوں — لے کے ... سالتیں گلا جاتا ہوں
شنو بھی نہ سنئے تا شنو ابھی : سنئے
میری فریاد کے لفظوں کو خدا بھی : سنئے

واو منصور نہیں قابل بیداد ہوں میں — خوگر درد ہوں منت کش جلاد ہوں میں
دوسروں کے لیے دلگیر ہوں ناشاد ہوں میں — اک بڑی ذات سے آمادہ فریاد ہوں میں
وہ جسے درد محبت کی دوا کہتے ہیں
ہاں خدا تو نہیں محبوب خدا کہتے ہیں

اکثر بند برجستہ و شگفتہ واقع ہوے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے بھی، درد، اور سوز و گداز کی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔ کہیں کہیں طرز بیان حد درجہ موثر پایا جاتا ہی۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہی کہ حضرت شیدا ایک مشاق شاعر ہیں جنھیں اپنے جذبات کے قلمبند کرنے پر قدرت تامہ حاصل ہی۔ اس مختصر رسالہ کی قیمت ۲/ علاوہ محصول ڈاک رکھی گئی ہے اور ملنے کا پتہ دفتر نظام المشائخ دہلی ہے۔

**تاریخ احسن** | یہ کتاب جسکا دوسرا نام "معین الطلباء" ہی مولوی محمد عبد الحکیم صاحب سکنڈ مولوی ہائی انگلش سکول حاجی پور ضلع مظفر پور نے ترتیب دی ہی۔ اس میں اُن تمام اشخاص و مقامات کے حالات بتحقیق و تدقیق سے ردیف وار قلمبند کیے گئے ہیں جنکا مجمل تذکرہ "تعلیم الاطفال" اور "انتخاب جیب" میں آیا ہی۔ گویا "تاریخ احسن" ان دونوں کتابوں کے لیے ایک حد تک شرح کا کام دیتی ہی اور اس لحاظ سے اسکو مستقل کتاب کی حیثیت نہیں مل سکتی۔ تاہم حضرت مولف کی محنت شاقہ کا معترف ہونا چاہیے، جنھوں نے طلباء کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ مناسب ہوتا کہ یہ شرح جداگانہ طور پر اشاعت پذیر ہونے کی جگہ انھیں کتابوں کے ساتھ شامل کر دیجاتی جن سے اسکا تعلق ہی۔ بہرکیف اس کی قیمت ۸/ ہی اور حضرت مولف سے مندرجۂ بالا پتہ پر مل سکے گی۔

**دی پریکٹیکل ٹرانسلیشن سیریز** | اس سلسلہ کی دو کتابیں بغرض اظہار رائے موصول ہوئی ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہی انمیں ترجمہ کرنے کے سہل اور آسان عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔ اسکے مصنف مسٹر آئیں ایم رضی، بی اے (علیگ) سابق صدر مدرس اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ ہیں جنھوں نے کمال جانفشانی سے یہ سلسلہ مرتب فرمایا ہی۔ طلباء کے لیے یہ کتابیں غیر معمولی فائدہ کی چیز ہو سکتی ہیں بشرطیکہ انھیں تعلیمی کورس میں شریک کر دیا جائے۔ ان دونوں حصص میں مصنف نے ترجمہ کرنے کے اصول عملی طور پر نہایت عمدگی سے دکھائے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم شروع سے آخر تک اُن تمام مشقوں کو از خود کرنے کی کوشش کرے تو وہ آخر میں ایک کامیاب مترجم بن سکتا ہی۔ فن ترجمہ پر اسوقت تک کئی چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے نکل چکے ہیں اور شاید اپنی خوبیوں کے لحاظ سے مسٹر آئیں ایم رضی کی کوشش سب سے زیادہ شکور ہونے کی مستحق ہی۔ حصۂ اول کی قیمت ۸/ اور حصۂ دوم کی عہ ہی۔ مینیجر صاحب بہار گو اسکول بکڈپو امین آباد لکھنؤ سے طلب کرنا چاہیے۔

**بھرتری ہری شتک** | بھرتری ہری جی ہندوستان میں عجیب و غریب بزرگ گزرے ہیں۔ بادشاہ ہونے کے علاوہ وہ ایک اعلی درجہ کے پنڈت اور شاعر بھی تھے۔ فقیر منش وہ اسدرجہ کے تھے کہ آخر کار تخت سلطنت چھوڑ کر دنیا سے تائب ہوگئے۔ انکی ایک کتاب سنسکرت زبان میں "بھرتری ہری شتک" نام سے بہت مشہور ہی جس میں یوگ اور توحید کے مسائل پر صوفیانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہی۔ اسی کا ترجمہ بابو گوری شنکر لال صاحب نے اُردو میں شائع کیا ہی جو ہمارے سامنے ہی۔ اسکا مطالعہ اخلاقی طور پر ہر شخص کیلیے بلا تفریق مذہب مفید ہوگا۔ ۱۰/ قیمت بہت زیادہ ہی۔ مترجم سے دفتر رسالہ شاد لکھنؤ دہلی کے سے منگوانا چاہیے۔

"سید القلم"

# یک عشق و ہزار بدگمانی

شام کے ساڑھے سات بجے ہین۔ لندن کے ایک متوسط طبقہ کا چھوٹا سا خوبصورت مکان ہو۔ صاحبہ خانہ مسز ایور سلائی اپنے شوہر کے انتظار سے تھک کر ٹیلیفون کے پاس جاتی اور گھنٹی بجاتی ہو (جواب سننے پر):۔

مہربانی فرما کر نمبر ۱۲۹۰ ایلبرن سے تار ملا دو (تار ملا دیا گیا)

مسز ایور سلائی: "کون ہو؟ کیا کاربو اسٹیل کمپنی سے تار آتا ہو...

اچھا!.. کیا مسٹر ایور سلائی دفتر سے روانہ ہو چکے ہین! تو کہان گئے ہین؟ کیا کمپنی کے کسی کام پر یا تو وہ رات تک واپس آسکین گے؟.. آسکین گے؟ اچھا تو اُنکے آتے ہی فوراً مجھ سے تار کے ذریعے سے بات کرنے کو کہہ دینا...

کیا؟... اُفوہ! مین انکی بیوی مسز ایور سلائی ہون... شکریہ"

خاتون صاحبہ اپنے کمرہ مین واپس آتین اور آپ ہی آپ یون کہہ رہی ہین:۔

حقیقت مین ہابی نے گزشتہ دو ایک ہفتون سے جو طرز عمل اختیار کیا کر رکھا ہو وہ کسی بیوی کو پاگل بنا دینے کے لیے بالکل کافی ہو۔ مین سمجھتی ہون کاروبار بدستور چل رہا ہو اور بیچارہ غریب اسکو اور ترقی دینے مین سرتاپا منہمک ہو۔ مگر اس سے حاصل کیا؟ رات رات بھر اسی طرح انتظار مین گذر جاتی ہو۔ مین یا تو کھانا نہ کھا کر بھوکی بیٹھی رہتی ہون یا تنہا زہر مار کرنے پر بعض دفعہ مجبور ہو جاتی ہون۔ مجھے اس زندگی سے دیہات کی ایک جھونپڑی، سادہ غذا، اور افلاس و تنگدستی ہی زیادہ پسند ہو۔ جب وہ گھر واپس آتے ہین تو اسقدر تھکے ہوئے ہوتے ہین کہ اتنی بھی سکت نہین ہوتی جو "افسوس بڑی دیر ہو گئی پیاری" یا "ہان پیاری" سے کچھ زیادہ کہہ سکین۔ آہ! افسوس!!...... لیکن مین کل ضرور ناشتہ پر ان کے سر ہو جاؤن گی کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ تو جلد لوٹین۔ خواہ کچھ ہی آفت کیون نہ آئے مین ضرور اُن کو ایک ہی بار جلد واپس آنے پر مجبور کرون گی۔

مین نے بیشک یہ وعدہ کیا ہو کہ ان کے ساتھ محبت اور انکی عزت اور اطاعت کرون گی لیکن مین نے ہرگز یہ عہد و پیمان نہین کیا کہ اس طرح تنہا بیٹھی ان کا انتظار کیا کرون گی۔ ان نئی نئی پوشاکون کے پہننے کا فائدہ ہی کیا ہو جب کوئی ان کا دیکھنے والا نہ ہو... اچھا! اب ایک تدبیر میرے ذہن مین آئی!.. جمعہ کے روز چند احباب کی دعوت کرنی چاہیئے۔ اس بہانہ سے تو ہابی کو جلد آنا پڑیگا۔ ہابی تو رشک و محبت کا ایسا پتلا ہو کہ لبادہ اوڑھنے تک مین کسی اور کا میری مدد کرنا اُسے گوارا نہین ہوتا...

خیر تو مجھے اب کس کس کو بلانا چاہیئے؟ چند ہی لوگ کافی ہین۔ کھانے کے بعد تاش بھی ہو۔ اچھا تو کون کون ہوگا؟ ڈورا اسٹون... اور... اور... فرانک ولیس.. لیکن ڈورا اسٹون کا نیا پتہ مین نے کہان لکھ دیا ہو؟ ابھی حال مین ڈورا نے مجھے اپنا نیا پتہ بھیجا تھا۔ مین سمجھتی ہون مین نے... نہین... شاید وہ کہین پھینک دیا گیا۔ (ردی کی ٹوکری کی طرف جا کر) یا اللہ! یہ ٹوکری تو ہفتہ بھر سے خالی نہین کی گئی ہو۔ یہ شیشین تو کسی کام کی نہین۔ اسکو جواب دیدینا ہی بہتر ہو۔ (ردی کی ٹوکری کو فرش پر الٹ کر) اسمین تو ایسا کوئی کاغذ نہین نظر آتا (کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ مین لیکر سخت حیرت کے ساتھ) یا الٰہی! یہ کیا تماشا ہو؟......

مجھ پر اعتماد کرو

میرے پیارے عزیز از جان ہابی

ازل سے تمھاری محبت کرنے والی

ک

اَب ساری دُنیا مین ہابی کو اسطرح لکھنے والا کون ہے؟ انکی ماں تو وفات پا چکی ہین۔ انکی بوڑھی دایہ کا بھی انتقال ہو چکا۔ مگر کسی عورت

کی معلوم ہوتی ہے۔ اسکے سوا مرد تو اسطرح . . .

مجھ پر اعتماد کرو

میرے پیارے عزیز از جان باجی

ازل سے تمھاری محبت کرنے والی

ک

کیا؟ . . . (اس کے ساتھ کا پرزہ ڈھونڈھنے لگتی ہے)

حقیقت میں یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ میں کسی کے متعلق جاسوسی کرنے سے سخت نفرت کرتی ہوں۔ میرے شوہر کی جاسوسی تو مجھے بالکل ہی پسند نہیں۔ تاہم بیوی کے چند حقوق ہیں۔ ایلو ایک پرزہ نکل آیا!! . . .

ک . . کیٹی سینگزٹر۔

مجھپر اعتماد کرو

میرے پیارے عزیز از جان باجی

ازل سے تمھاری محبت کرنے والی

خدایا! کیٹی سینگزٹر! اس نے میرے شوہر کو اسطرح لکھا ہے۔ اس مہمل ذلیل اگر بے نے؟ آہ! اب مجھے اسکی تہ دریافت کرنی چاہیئے۔ اس شرمناک خط کے باقی حصہ کو کسی طرح تلاش کرکے پیدا کرونگی . . . (ردی کاغذات میں تلاش کرکے خط کے باقی پرزے جمع کرلیتی ہے) . . . آہا!

"پیارے باجی" . . . اوہ!

ہفتہ کے روز سے میں تمھیں سخت اضطراب کے ساتھ یاد کر رہی ہوں غالباً تم مجھے روزانہ تماشہ میں لیجانیسے اکتا گئے ہو۔ لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں اس بارے میں . . . . . . . .

آہ! اب میں آگے ایک لفظ بھی نہ پڑھونگی (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) آہ! آہ!! آہ!!! (کمرہ میں دیوانہ وار ٹہلنے لگتی ہے)۔

اچھا تو یہ بات ہے! اب وہ یہ کام کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو میرا شوہر ہاں ہاں! میرا شوہر پچھلے دو ہفتوں سے سخت مصروف ہے اور رات رات بھر اُسے فرصت نہیں ملتی۔ اس قطامہ کے ساتھ سارے شہر میں یوں وہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ بیشک کیٹی تو ضرور ایسا کرے گی لیکن باجی! آہ! باجی! مجھے تم سے کبھی اس کی توقع نہ تھی . . . . . .

اب یہ سخت ناقابل برداشت ہے۔ میں کبھی اسکو گوارا نہیں کرسکتی۔ نہیں ہرگز نہیں! ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں! اب میں انکے متعلق ان سے کچھ سننے کا بھی انتظار نہ کرونگی۔ جب وہ ہر روز مجھے اس طرح دھوکا دیا کرتے ہیں تو پھر بد رجہا بدتر افعال کے ارتکاب میں بھی انھیں دریغ نہیں ہوسکتا۔ جب وہ اس طرح کے خطوط میرے شوہر کو لکھتی ہے تو معلوم نہیں وہ کیسے خط اس کو لکھتے ہونگے۔ یہ ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ اماں جان نے پہلے ہی کچھ اپنا شبہ ظاہر کیا تھا۔ اب ان واقعات کو سنکر وہ کیا کہیں گی؟۔

"ازل سے تمھاری محبت کرنیوالی"

آہ! یہ کسقدر شرمناک ہے۔ میں اب کبھی ان کے ساتھ نہ رہونگی۔ اب ہرگز مجھ سے ایک دن بھی یہاں رہا نہ جائے گا۔ اب میں طلاق لے لونگی۔ بس اب طلاق ہونا چاہیئے۔

ہاں تو مجھے طلاق کے لیے کہاں جانا چاہیئے؟ کون وکیل کے پاس؟ . . . کیا اچھا سا نام ہے؟ . . . گیلی اور . . . ڈائرکٹری کہاں ہے؟ . . ہاں گیلی اور پورٹر . . یہی نام ہے۔ پتہ . . . . . ۲۰۸۶۳ سے فیر . . . . (ٹیلیفون کے پاس جاتی ہے)۔

"نمبر ۲۰۸۶۳ سے فیر سے تار ملادو"

میں مسٹر پورٹر سے گفتگو کرونگی۔ وہ بہت اچھا وکیل ہے۔ ابھی چند روز ہوے اس نے حیاط سے کیا اچھا تصفیہ کرادیا (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)۔

ہاں! کیا مسٹر پورٹر ہیں؟ مجھے طلاق کی ضرورت ہے . . . کیا؟ . . مسٹر پورٹر نہیں ہیں! تو پھر تم کون ہو؟ . . . محافظ! . . مسٹر پورٹر

کہاں گئے ہیں؟ ... باہر! ... اچھا مسٹر گیلی کو بلاؤ ... وہ بھی باہر گئے ہیں! ... یہ کیا مہملات ہے! تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے کاروبار پر بجا لاتے رہو۔ تمہارے دفتر میں ایسی سخت ضرورتوں کے وقت کسی نہ کسی کا موجود ہونا ازبس ضروری ہے! ... کیا؟ ... دونوں گھر گئے ہیں! ... کیوں گئے؟ ... دفتر بند ہو چکا! ... اچھا! تم جانتے ہو کہ آیا مسٹر پورٹر طلاق کے متعلق انتظام کر سکتے ہیں؟ ... یہ میں صرف اسلئے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میں نے ایک نہایت ذلیل خط پایا ہے ...

کیا؟ ... نہیں! کوئی ضرورت نہیں! مسٹر گیلی کو اطلاع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں صرف مسٹر پورٹر سے اسکا تصفیہ کرانا چاہتی ہوں۔ اُنھوں نے ایک مقدمہ میں میری مرضی کے مطابق کارروائی کی تھی۔ وہ بڑے قابل اعتماد شخص ہیں ... ہاں! تم مسٹر پورٹر کے مکان کے ٹیلیفون کا نمبر جانتے ہو؟ ... ۸۶، ویسٹ! ... شکریہ!"

کیا میں اسکی جرأت کروں؟ طلاق کے معنی سخت بدنامی و رسوائی کے ہیں۔ تمام اخباروں میں ایک ایک بات شائع ہوگی۔ (خط کے پرزوں پر نگاہ پڑ جاتی ہے۔ انکو دوڑ کر پھر اُٹھاتی ہے۔ دیکھکر بڑے غصے اور غیظ کے ساتھ پھینکدیتی ہے اور پھر ٹیلیفون کے پاس جاتی ہے)۔

"۸۶، ویسٹ سے تار ملا دو"

(تار ملا دیا گیا)

ہاں! کیا مسٹر پورٹر ہیں؟ آپ کو اس وقت تکلیف دینے کا مجھے نہایت سخت افسوس ہے لیکن ایک بہت وحشت ناک اور نہایت اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ میں ردی کاغذات کی ٹوکری میں کوئی کاغذ تلاش کر رہی تھی کہ مجھے اپنے شوہر کے نام کا ایک عاشقانہ خط ملا۔ آپ خود اس کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس خط کا مجھپر کیا اثر ہوا ہوگا۔ خط میں نہایت دلی محبت کا اظہار کیا ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ جس عورت نے وہ خط لکھا ہے اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ وہ مجھ سے کسی قدر کمسن ہے ... جی! ... میں کون ہوں! ... اوفوہ! مجھے یہ پہلے ہی بتانا چاہیئے تھا۔ میں مسز ایور سلائی ہوں ... مزاج شریف ... بیشک آپکو سخت تعجب ہوگا۔ خود مجھے بھی اس کے امکان کی توقع نہ تھی۔ بہر حال اب میں طلاق چاہتی ہوں۔ مگر آپ اسمیں حتی الامکان عجلت فرمایئے میں چاہتی ہوں کہ آپ تمام انتظام فرمائیں۔ اسکا زیادہ چرچا نہ ہونے دینا چاہیئے۔ اخبار والونکو اسکی اطلاع ... اسمیں شک نہیں کہ یہ بہت سخت کارروائی ہے مگر میں کیا کر سکتی ہوں؟ ... آپ کو معاف کیا جائے! آپ کے ہاں احباب کی ضیافت ہے! .. اچھا! (سرد مہری سے) مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مخل ہوئی لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ معاملہ کس قدر اہم ہے ... کیا؟ - کل صبح آپ سے دفتر میں ملوں! بہت اچھا! میں گیارہ بجے آؤں گی۔

میں غم و غصہ سے از خود رفتہ ہوں۔ اسلیئے نہیں کہ مجھے اس طرح دغا دی گئی بلکہ ... سنیئے! کیا آپ سُن رہے ہیں؟" ... یا الٰہی! ... ٹیلیفون کے پاس سے تو وہ چلدیئے۔ بدتمیز جانور! ہمدردی نام کو نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا نقصان صرف ایک کتے یا کسی کم قیمت زیور کے گم ہو جانے کے برابر ہے۔

اچھا اب مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔ اکثر با تو نہیں تو میں بالکل مجبور ہوں لیکن شکر ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت نازل ہوتی ہے تو میں اسکا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ (لکھنے کی میز کے سامنے بیٹھ جاتی ہے)۔ اب اس مبتذل کیٹی سینگرڈر کو لکھتی ہوں کہ میرا اسکے متعلق کیا خیال ہے۔

خاتون صاحبہ!

"میرے شوہر کے ساتھ تمہارے جو شرمناک تعلقات قائم ہیں اتفاقاً انکا تمہارے ایک حیاسوز خط کے ذریعے سے جو تم نے میرے شوہر کو لکھا ہے مجھ پر انکشاف ہو گیا۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے ان افعال کی تشہیر سے مجھکو کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچ سکتا مگر میں تمہیں یہ اطلاع کر دیتی ہوں کہ میں نے اس کارروائی کو اپنے وکیل کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس طرح تمہاری

نیکنامی کی کسی قدر مزاج پرسی ہو جائیگی۔

راقمہ۔ نی لس ایور سلائی

(غصہ کے ساتھ لفافہ بند کر رہی ہو۔ اتنے مین ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

یقیناً بابی ہو اُنکا ابا کوئی عذر معذرت کرنے کی سوجھی ہو گی۔ اوہ! شیطان سیرتی کی بھی حد ہو گئی! (ٹیلیفون مین "ہان! ہان!!... ہان! مین جانتی تھی کہ تم ہی ہو گے!... اوہو! تم نے اپنے تمام کام ختم کر لئے! اور اَب تمھارا قصد ہو کہ دعوت مین جاؤ اور وہان سے تماشہ مین (طنز کے ساتھ) ہان! ہان! ہان!!!... کیا؟... تم چاہتے ہو کہ مین بھی تمھارے ساتھ چلون! نہین! مین کہ دیتی ہون کہ مین نہین چلون گی! مین نے تمھین پہچان لیا ہو۔ سب کچھ مجھے معلوم ہو چکا" (غصہ کے ساتھ ٹیلیفون کے پاس سے چلی جاتی ہو)۔

آہا! پٹی سن! تم آگئین۔ ایلو یہ خط فوراً ڈاک خانہ مین ڈال آؤ۔ اسکے بعد میری ضرورت کی چند چیزین باندھ دو۔ مین بالفعل تو شب بسر کرنے کیلیے ہوٹل جاؤن گی۔ میرا لبادہ تو لادو۔ ۔ جلدی کرو!... (اس کی نگاہ تار کے لفافہ پر پڑتی ہو جو اسکے نام کا میز پر رکھا ہوا ہو)... یہ کب سے رکھا ہوا ہو؟ پٹی سن! تم نے مجھے یہ ابتک دیا کیون نہین؟ کتنی سست چھوکری ہو! مگر ایک ایسے وقت مین اسکو برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ! (کچھ سوچنے لگتی ہو اور تھوڑی دیر بعد کرسی پر گر پڑتی ہو اور کہتی ہو):-

باآبی! بابی! تم نے میرا دل توڑ دیا (رونے لگتی ہو) اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی، اگر مین تمھاری طرف ملتفت نہ ہوتی، اگر مین نے کوئی بے توجہی کی ہوتی تو بیشک یہ برداشت بھی ہو سکتا۔ مگر ہائے! میری زندگی کے ہر دن کا ایک ایک لحظہ اور ہر ہفتہ کا ایک ایک دن بالکل تمھارے ہی دھیان مین گزرتا ہو۔ کیا اس کے بعد بھی اور میرے اسطرح تمھاری محبت و اُلفت کا بھروسہ کرنے اور تمھارے شوہر ہونے پر ناز کرنے اور تمھاری ذات پر فخر کرنے پر بھی... ایسا... ایسا نتیجہ نکلنا۔ میری محبت و اُلفت کو اس بیقدری کے ساتھ... اوہ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا... ہائے!...

اس کی نگاہ پھر تار پر پڑتی ہو۔ وہ بمشکل اپنے تئین سنبھالتی ہو اور تار پڑھنے لگتی ہو... یہ تار آیا ہو... کس کے پاس سے؟... ہائین! اسکے کیا معنی؟... "ہماری شادی کی قرارداد ہو چکی ہمارے لیئے دعا کرو کیتھرائن سینگر ٹر اور رابرٹ ولسن" یا اله العالمین!... شادی کی قرارداد ہو چکی ہو۔ کیتھرائن سینگر ٹر اور رابرٹ ولسن۔ رابرٹ ولسن؟ رابرٹ؟ رابرٹ؟ باب ولسن! باآبی! یہی بات ہو! میرے پیارے عزیز از جان بابی" (دوڑ کر خط کے پرزے اُٹھا لاتی ہو) اُفوہ! بیشک یہی بات ہو! باب ولسن بیشک جمعہ کے روز یہان آیا تھا اور اسنے یہین چند چٹھیان بھی لکھی تھین۔ ایک چٹھی بھی چاک کر کے ڈال گیا تھا۔ وہی کیٹی سینگر ٹر کا منگیتر بھی ہو۔ میرے بابی کا اسمین کوئی دخل نہین!......

الٰہی! اَب مین کیا کرون۔ مین کیا کر بیٹھی! (کرسی پر گر پڑتی ہو۔ پھر کھڑی ہو جاتی ہو) مین نے پورٹر سے بھی طلاق کے متعلق گفتگو کی۔ میرے بابی سے بھی بات ہوئی۔ ہائے! اَب وہ کیا خیال کرے گا! پورٹر کے پاس آج ہی بابی کی دعوت بھی ہو۔ دعوت مین جانے سے اسے روک لینا چاہیئے۔ ورنہ... (موٹر کی آواز آتی ہو۔ وہ دوڑ کر کھڑکی مین سے دیکھتی ہو)... باآبی! ارے خود باآبی ہو! اَب مین کیا کرون؟... کیا کہون؟... پٹی سن!... (دروازہ پر گھنٹی بجتی ہو)... پٹی سن! گھنٹی کا جواب دو... الٰہی! اَب مین کیا کرون؟... کیا کہون؟... مین... مین... مین یہ کہدونگی کہ کسی غلط نمبر سے تار ملا اور معلوم نہین وہ کون عورت تھی جسنے بات کی۔ مجھکو کسی طرح ایبوپورٹر سے جلد مگر بابی کی اس سے ملاقات ہونے کے قبل پورا واقعہ بیان کر دینا چاہیئے۔ مگر ہان! پیٹی سن! کیا کیٹی سینگر ٹر کے نام کا خط ڈاک مین ڈال دیا گیا؟ نہین! رحمت کے فرشتے! (خط لیکر جلدی سے چاک کر ڈالتی ہو)

(ترجمہ) سید خورشید علی

# نظامُ الملک طوسی

علم تاریخ دُنیا کی تمام قوموں میں رائج اور متداول ہے۔ بدقسمت ہے وہ قوم جو اپنے بزرگوں کے یادگار کارناموں سے اور اُن کے حالات برگزیدہ سے ناواقف ہے۔ تاریخ کی تحصیل اور توسیع کے لیے وفورِ رغبت سے سیر و سفر کرتے رہے ہیں اور عالم و جاہل زمانۂ سلف میں اس کے یکساں شائق پائے گئے ہیں۔ اگر سطحی نظر سے دیکھیے تو تاریخ اسلاف کے گوناگون حالات و قرون ماضیہ کے رنگا رنگ واقعات کا مجموعہ ہے جسمیں ہر طرح کی باتیں ہر قسم کی مثالیں و حکایات بیان کیجاتی ہیں اور جب لوگ مجلس میں بیٹھتے ہیں تو اس فن کے ذکر اذکار کو رغبت سے سُنتے ہیں۔ تاریخ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کی حالت وقتاً فوقتاً کیونکر بدلتی رہی ہے اور کس طرح اقوام میں مختلف سلطنتوں کا آغاز اور اُنکا کمال ہوا کیونکر وہ اول زمین پر پھیلیں اور اُسے آباد کیا اور زوال نے اُنکو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کیطرح مٹا دیا۔ تاریخ حکمت کا سبق پڑھاتی ہے۔ کائنات اور اُسکے مبادی کی علتیں بتاتی ہے زمانہ کے واقعات اور اُنکے اسباب سے آگاہ کرتی ہے۔ فن و حکمت و فلسفہ علوم نقلیہ اور غیر نقلیہ و اساتذہ کے حالات اہل دنا اہل نسلوں کے اخبار پر اس غرض سے روشنی ڈالتی ہے کہ قابل تقلید اُمور پر موجودہ اور آئندہ نسلیں کاربند ہوں اور قابل نفرت باتوں سے آیندہ نسلیں پرہیز کریں اور نقاد فن اُنکی روایات کو جانچ کر فیصلہ کریں کہ اسناد کی کونسی نقل و روایت انکار و ترک کے قابل ہے۔

آجکل کی کثرت ناول نویسی نے دو متضاد اثر ہندوستان کے مختلف طبقوں پر ڈالے ہیں۔ اول کم علم اور حرف شناس نوجوانوں کے اخلاق پر تو بُرے سے بُرا اثر ڈالا۔ دوسرے ذی علم ماہرین کے ایک زبردست ٹھوکر لگاکر اُردو زبان میں تاریخ کے پیدا کرنیکا ذوق پیدا کر دیا۔ یہ احسان ہے اور اول عجب۔ مگر ہمکو اپنے ہمدرد قوم مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری کا اسوقت بعد شکریہ ادا کرکے اور اُنکی برسوں کی محنت شاقہ اور وسیع کتب بینی کی داد دیکر انکی دوسری تصنیف سلسلۂ وزرائے اسلام پر ایک نظر ڈالنا ہے اور اپنے عجز کمال اور کمزور خیالات کا اظہار کرنا ہے جو اگرچہ ناظرین کی تضیع اوقات کا باعث ہوگا مگر یقین ہے کہ مجھے معافی دیجائے گی۔

فاضل مؤلف نے یہ کتاب **نظام الملک طوسی** جس محنت سے لکھی ہے اس سے قوم کو عموماً جو کچھ معلومات میں نفع پہنچے گا اُس سے تھوڑی دیر قطع نظر کرکے رؤسا اور والیان ملک کو اگر وہ عمل پیرا ہوں تو سیاسی نفع بیحد پہنچ سکتا ہے اور عامہ کو تمدنی نفع۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ اول حصہ دیباچہ کے بعد طوس کی مختصر تاریخ ہے اور ضروری فٹ نوٹ بھی دیئے گئے ہیں، اور اُن شعرا اور بزرگان کا ذکر کیا ہے جو طوس کی شہرت عام اور بقائے دوام کا باعث ہوئے ہیں مشاہیر طوس کی مختصر سی فہرست بھی دی ہے جسمیں صوفیہ ائمہ، محدث، شعرا، وزرا، حکما کا ضروری تذکرہ کیا ہے۔ طوس کا موجودہ نام مشہد مقدس یا مشہد رضوی بتایا ہے اور یہ لقب امام علی رضا علیہ السلام کی ذات پاک سے ہے۔ خواجہ حسنؒ کا نسب عباس طوسی تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے عبدالحمید طوسی تک بمفصل شجرۂ نسب بھی دیا ہے۔ خواجہ حسن کی ولادت ۴۰۸ھ بتلائی ہے اور وفات ۱۰ شوال ۴۸۵ھ اور پورے طور سے اُسکے اُستاد کی حالت بھی بتائی گئی ہے۔ خواجہ حسنؒ کی وزارت کی ابتدا اور "نظام الملک" خطاب بعہد الپ ارسلان ہے سب سے اہم اور ضروری شے جو دوسرے حصہ میں ہے اور جس میں خواجہ حسن کا ایسا مرقع دکھایا گیا ہے جو اُس مقدس کی صورت کا خط و خال دکھاتا ہے اور اصلی تصویر کا جلوہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ خواجہ حسنؒ نظام الملک کا قانون سلطنت ہے جس کے مطالعہ سے ایک فرد واحد کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت ملتا ہے، جہان نہ

لیجسلیٹو کونسل کا پتہ ہی نہ عام آرہ کی ہوا ہی۔ ایک دریا بہا یا گیا ہی، تجربات کا مجموعہ ہی، سیاست کا دستور العمل ہی، ملکی تمدن کا زبردست ضابطہ ہی جسمین گنجائش حرف زدن نہین ہی، ایک ایسی لازوال شے ہی جس کو کوئی شخص نہ لوٹ سکتا ہی نہ اسین نقصان آسکتا ہی جو سلطنت یا ریاست اسپر عمل کرے یا اسکے مطابق قوانین مرتب کرکے سیاسی ضرورت کے موافق کاربند ہو تو کبھی سلطنت مین زوال یا وزارت پر الزام نہین آسکتا خواجہ کے ہم مکتب یا کلاس فیلو، غیاث الدین، ابوالفتح عمر خیام نیشاپوری، حسن بن صباح کی تصاویر دیکر اُن کے حالات بھی لکھے ہین مگر کوتاہ قلمی ضرور کی ہی۔ اگرچہ کتاب ہر حیثیت سے لاجواب ہی مگر صرف دقیق نظر سے کمی یا سقم یہ ہی کہ قانون سلطنت کے بعد کتاب کے ضروری حالات نہین لکھے اور لکھے بھی تو بہت ہی مختصر لکھے ہین۔ الغرض ہر حیثیت سے کتاب اُردو تاریخ مین لاجواب ہی اور ایسے مصنف کی تصنیف ہی جسکی البرامکہ نے ولایت تک شہرت کردی ہی۔ اس کی لاجوابی کی حالت اس کے طرز بیان، وسیع معلومات اور بلند نظری سے قرار واقعی ظاہر ہوتی ہے۔ افسوس ہی کہ کتاب ایسے وقت شائع ہوئی ہی جب سلطنت ایران کے حصے بخرے ہوچکے ہین، اور یہ الزام نامی پریس پر ہے اور دیر سے شائع ہونیکا گناہ منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کا حصہ ہے۔ اس وقت تک جس جس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ دل سے دلدادہ ہے اور ہمہ صفت موصوف بیان کرتا ہے۔

میری ذاتی رائے اس کی نسبت یہ ہے کہ یہ تصنیف اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر کتب خانے مین اس کی ایک جلد ضرور ہونا چاہیئے۔ مصنف کی رفتار مروت کی تصنیف کی قدر نہ کرنا اُن کا حوصلہ پست کرنا ہے اور یہ سخت بدقسمتی ہمارے ملک کی ہوگی کہ اس کتاب کی دل سے قدر نہ کی جاسے۔ رشید اعظم، اور آل سلجوق بھی تیار ہین اور ولایت سے ٹائپ مین چھپوانیکا مؤلف کا خیال ہے۔

سیّد محمد علی

## برجستہ جواب

کہتے ہین کہ لندن کے کسی قصبہ مین — اِک لڑکا تھا جمیس نام ہشیار و ذکی
ناگہ اِک روز باپ کی چوری سے — اِک بھونڈی سی مس کے ساتھ شادی کرلی
جب بی بی کو ساتھ لیکے گھر مین آیا — سُسرے نے بہو کی شکلِ زیبا دیکھی
پوچھا یہ کون؟ جمیس نے ہنس کے کہا — حضرت کی بہو ہے۔ اور میری بی بی
جھنجلا کے کہا باپ نے، کیون نالائق؟ — مجھ سے پوچھے بغیر شادی کرلی
اچھا، تو ابھی گھر سے نکل جا باہر — ایسے خلفِ خلف کی ایسی تیسی
جب باپ نے گالیان سُنائین بیحد — بس حد نہ رہی جمیس کے بھی غصے کی
بل ابرو پہ ڈال، نیلا پیلا ہوکر — کہنے لگا، پہلے سُن لو اِک بات مری
مجھکو نہ پوچھنے کا الزام دیا،
تم نے کب مجھ سے پوچھ کر شادی کی

احمد حسین امجد

## حاصلِ عشق

کھل گیا حق جبکہ اُنسے شکوۂ باطل ہوا ‏ کیا کہوں زاہد میں کہ اس باطل سے کیا حاصل ہوا
قیس نے سمجھا کہ اب ہوتی ہے لیلیٰ ہمکلام ‏ جب ذرا اونچا ہوا سے پردۂ محمل ہوا
دیکھنا یہ ظرافت بھی اے ادیبِ بزمِ عشق ‏ پھر یہ کہنا کہ میں محفل میں کیوں سائل ہوا

---

مرکے بھی پہنچا نہ اُن تک نامۂ آوارگی ‏ ہاے میت کم بھی ہوا تو یہ سرِ منزل ہوا
تیغِ قاتل کانپتی ہے کانکر رکھا ہے جان ‏ یہ تو اُلٹا نقص خنجر پر سرِ منزل ہوا
کس میں طاقت ہے کہ دیکھے کوئی تمکو بے نقاب ‏ یہ حجابِ جسم بھی اچھا ہوا حائل ہوا
ذرہ ذرہ میں جمالِ دلربا تابندہ ہے ‏ حضرت موسیٰ نے کیا دیکھا کہاں مائل ہوا

دل مرا ابھی صرفِ سوزِ گرمیِ نظارہ ہے
اے شرارِ طور یہ تیرا ہی آتشپارہ ہے

ہر طرف اُس یار نے ہے آگ بھڑکائی ہوئی ‏ واہ کیا کہنا ہے اچھی محفل آرائی ہوئی
عشق حسن افزا نہاں تھا حسن عشق انگیز میں ‏ کیا بجھیگی واعظو یہ انکی سلگائی ہوئی
چاک کر ڈالا ہے کیوں دستِ جنوں نے پیرہن ‏ یہ شکایت سچ ہے پر یہ انکی سلوائی ہوئی
زاہدو اک سوز ہے ہر زیر و بم کے ساز میں ‏ یہ تو وہ سمجھے کہ جسنے چوٹ ہو کھائی ہوئی
شیخ پیری میں تو جسکے واسطے وارفتہ ہے ‏ مجھکو وہ صورت طفولیت سے ہے بھائی ہوئی
درد جو اُٹھا تھا پہلو میں وہی درماں بنا ‏ واہ کیسے ڈھب سے میری ہمت افزائی ہوئی
آنکھ کھلتے ہی کسی نے کر لیا دلکو شکار ‏ اک بلا تھی ہائے انکی زلف لہرائی ہوئی

حسرتِ خلد و جناں افسانۂ فرسودہ ہے
حاصلِ عشق و وفا اک ذوقِ درد آلودہ ہے

عاشقِ جاناں میں الفتِ غلماں نہیں ‏ بزمِ دل وہ کونسی ہے جسمیں وہ مہماں نہیں
چشم بینا ہو تو ہے حسنِ مقدس آشکار ‏ دیدۂ جویا کو وہ جلوے کہیں پنہاں نہیں
بحرِ بے پایاں محیطِ قطرۂ شبنم ہوا ‏ آتشِ گل برقِ موسیٰ ہے گلِ خنداں نہیں
خرمنِ ہستی کا حاصل ہے اک آہِ سینہ سوز ‏ بے سبب شور و فغاں میں بلبلِ نالاں نہیں
عشق و الفت کیا ہیں؟ پروانہ سے پوچھا چاہیے ‏ شمع روتی ہے کہ حاصل مجکو یہ ارماں نہیں
دردِ پنہاں ہے صلائے لذتِ آلامِ عشق ‏ شیخ شاید واقفِ ذوقِ غمِ پنہاں نہیں
عاقلوں کو ہے بیاں پر بھی ہیولائے خلد ‏ رازِ جاناں کھولدوں لیکن مجھے شایاں نہیں
ہر دلِ بیدار طالب واقف ہوا اس راز سے ‏ اے حمید اس شعر میں کیا شوکتِ طغیاں نہیں

چون بہشتِ نقدِ من امروز حاصل میشود (حافظ)
وعدۂ فردائے واعظ را چرا باور کنم

حمید کوٹلوی

## ایک دوست کی وفات پر نوحہ

اے فدائے یاس و حرماں اے شہیدِ آرزو ‏ خاک کے دامن میں کیسا بیخبر سویا ہے تو
چشمِ دل کو باعثِ حیرت ہے تیری جستجو ‏ پھول تھا پر ہاتھ سے جاتا رہا مانندِ بو

لالہ و گل سے طبیعت تو نے بہلائی نہیں
کیا ہوا باغِ جہاں کی تجھکو راس آئی نہیں

قلزمِ عالم کی تو نے سیر کی مثلِ حباب ‏ خواب کا نیرنگ تھا یا تھا ترا حسنِ شباب
برق کا جلوہ تھا یا قوسِ قزح کی آب و تاب ‏ یا شرر یا قطرۂ شبنم میں عکسِ آفتاب

خانۂ تن تھا ترا سیلِ فنا کے سامنے
شمع تیری زندگی کی تھی ہوا کے سامنے

ایک دم میں لٹ گئی تیری جوانی کی بہار ‏ آہ ایسے بھی زمانہ سے گئے کم سوگوار
خود مرادیں اور تمنائیں ہیں تجھسے شرمسار ‏ دل ہے پہلو میں ترے یا آرزوؤں کا مزار

کون کہتا ہے کہ ہے زیرِ کفن میت تری
خاک و خوں میں منہ لپیٹے ہے پڑی حسرت تری

پاؤں پھیلا کر جو تو یوں سو رہا ہے بیخبر ‏ کیا ہے خوابِ مرگ میں خوابِ جوانی کا اثر
دیکھ آنکھیں کھولکر عالم ہے کیا پیشِ نظر ‏ آئی ہے فردوس سے سر پیٹتی روحِ پدر

سرو قد اُٹھتا نہیں جاتا اگر تعظیم کو
ہاتھ ہی اپنا ہلا دے آخری تسلیم کو

کچھ خبر ہے تجھکو اے دلدادۂ خوابِ فنا ‏ ہے سرِ بالیں یہ کیا ہنگامۂ محشر بپا
نعرہ ہائے درد یہ کیسے ہیں یہ ماتم ہے کیا ‏ چاک ہے کسکا گریباں کون ہے سر دُھن رہا

ہو تڑپتا کون دل جینے سے کسکا سیر ہو
بال کھنے لاش پر کھوے یہ کیا اندھیر ہو

دیکھو تیری بیوہ غمگین پہ کیا اُفتاد ہے  محوِ حیرت یاس سے وہ کشتۂ بیداد ہے
مہر خاموشی لبون پر دلمین تیری یاد ہو  حسنا دو یران کی صورت خاطر ناشاد ہے

خاک آلودہ مسرت ہائے پنہان ہوگئین
آرزوئین دل کی سب خوابِ پریشان ہوگئین

دردِ دل اُسکا لبِ خاموش کہہ سکتا نہین  اشکِ حسرت دیدۂ پُرنم سے بہہ سکتا نہین
بند سینہ مین مگر طوفان رہ سکتا نہین  یہ وہ صدمہ ہو کہ دل انسان کا سہہ سکتا نہین

محوِ حیرت ہو تبھین ہین سکی آہِ سرد سے
سوزشِ پنہان عیان ہو اسکے رنگِ زرد سے

خواب مین سُنتا ہو جیسے نغمۂ شیرین بشر  جس سے طاری دل پہ ہو کیفیتِ جادو اثر
یہ نوائے روح پرور بند ہو جائے اگر  آنکھ کھلتے ہی سیاہی شب کی ہو پیشِ نظر

اک عجب عالم ہو حیرت سکے دلِ بیتاب کا
جاگنے پر اس گھڑی اُٹھا گمان ہو خواب کا

بس یہی عالم ہے تیری بیوۂ ناشاد کا  نغمہ ہائے عیش سے تھے کان اُسکے آشنا
ہوگیا ہر اب جو تیرا سازِ ہستی بے صدا  کس تحیر کس پریشانی مین ہے وہ مبتلا

کیا کہے دردِ جگر منھ سے کہا جاتا نہین
تیرے مرنیکا اُسے ابتک یقین آتا نہین

مادرِ ناشاد تیری وہ ازل کی سوگوار  پہلے ہی اُسکی نگاہو نمین تھی دنیا تنگ و تار
تیرے دم سے تھا بندھا شیرازۂ صبر و قرار  ہائے اس بیکس کا اب بیڑا کریگا کون پار

آج اسکا مایۂ تاب و توان جاتا رہا
ناخدائے کشتیِ بے بادبان جاتا رہا

وہ اسیر بیوہ دی تیری یتیمِ خستہ سال  پھول سے چہرہ پہ اسکے ہے ابھی گردِ ملال
کچھ طلسمِ آفرینش کا نہین کھلتا مآل  پیرِ گردون کے ستم سے مجھکو حیرت ہو کمال

ہائے معصوم سو پنہ بھی ظالم ترس کھاتا نہین
یہ رُلاتا ہے انھین وہ انجھین آتا نہین

کیا وہ نادان ہین جو کہتے ہین نرے اعتبار  مصلحت رہتی ہے رنج و درد مین بھی آشکار
ہو فسانہ یہ حدیثِ صبر و تسکین و قرار  خوابِ ہستی کی نہین تعبیر ایسی زینہار

مین نظامِ دہر مین کچھ مصلحت پاتا نہین
اس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہین

خاک مین تجھکو ملانا تھا اگر با اشک و آہ  کس لیے تجھپر ہوئی وا منزلِ ہستی کی راہ
ساتھ تیرے کیون ملے مٹی مین اتنے بیگناہ  زندگی جنکی ہو اب وابستۂ حالِ تباہ

لب فغان کو چشم ہو آنسو بہانے کے لیے
دل ہو جلنے کو جگر ہے داغ کھانے کے لیے

وائے قسمت یہ کیا نیرنگِ دوران ہوگیا  تو عدم آباد پہنچا گھر بیابان ہوگیا
ہائے کیا دل تھا کہ وقفِ یاس و حرمان ہو گیا  یا تمناؤن پہ اپنی آپ قربان ہوگیا

تو بہارِ زندگی مین توڑ ہا نا کام عشق
لب تلک آنے نہ پایا تھا کہ چھلکا جام عشق

عیش و عشرت کے ہزارون جسنے سامان کیے  وہ مے راحت کے بدلے خونِ دل اپنا پیے
کیسے کیسے رنج تجھکو نامرادی نے دیئے  ہائے تو دنیا مین آیا تھا اسی دن کے لیے

داغِ حسرت یادگار اپنا ہمین دیکر گیا
خود زمانہ سے دل پُر آرزو لیکر گیا

پھر رہی ہو دیدۂ مشتاق مین صورت تری  کھیلتی رہتی تھی ہر دم تیرے ہونٹون پر ہنسی
ہو جاری پردہ ہائے گوش مین ابتک بسی  گفتگو تیری جوانی کی اُمنگون سے بھری

اب وہ لطفِ گفتگو حاصل نہوگا خواب مین
جانشین تیرا کہان ہو صحبتِ احباب مین

اب وہ ربط و ضبط وہ اگلی ملاقاتین کہان  وہ مگر تا اب کہان وہ میل کی باتین کہان
دل لگی کی ہر گھڑی فہم بنی گھاتین کہان  وہ زمانہ اب کہان وہ دن کہان راتین کہان

بے مزہ تیری مے لطفِ جوانی ہوگئی
داستانِ عیش اپنی بھی کہانی ہوگئی

ساتھ کسکے ہو گئی اب وقت سحر سیر چمن    گرم کسکی گفتگو سے ہو گئی شب کی انجمن
خندہ پیشانی سے دیگا کون اب داد سخن    کون ہوگا موت پر مجھ خستہ جان کے نوحہ زن

تو ادھر دیتا آشنا جاتا رہا
زندگی کا لطف مرنے کا مزا جاتا رہا

چشم ظاہر بین کو اب دید ار ہی تیرا محال    ہے مگر آراستہ تجھ سے مری بزم خیال
یہ وہ عالم ہے جسے مانا ہے سب نے لازوال    ہو مخمور اپنی صحبت میں فلک کی کیا مجال

ہان فنا کر دون گا مین نیرنگی تقدیر کو
آئینہ مین دلکے رکھونگا تری تصویر کو

صحبت احباب مین مین گر یہی رنج والم    کاشکے پیدا ہوئے ہوتے کسی صحرا مین ہم
زندگی کا عیش ہوتا اور نہ مرنے کا ستم    ہان اگر ہوتا تو ہوتا ایک تنہائی کا غم

نوحہ خوان ہوتا نہ کوئی چرخ گردان کے تلے
قبر بنجاتی کہین ریگ بیابان کے تلے

ہے مگر یہ دار فانی وہ طلسم دلنشین    یاد کم رکھتی ہے اسکی رحمتین طبع حزین
یہ وہ عقدہ ہے جو غور و فکر سے کھلتا نہین    جہل سے بدتر نظر آتی ہے عقل دور بین

ہائے رسم دنیا کی پابندی عجب دلگیر ہے
خود پہنتا ہے جسے انسان یہ وہ زنجیر ہے

ب۔ ن۔ چکبست

## ایک صبح

تھا دور ایک منزل ابھی لشکر سحر    سرہنگ شب نے بھانپکے دی ارض کو خبر
شبنم کے قاصد آئے غبار و نمین جھکر    ان سے صبا نے سنکے کیا تار مشتہر

سرگوشیان تھی غنچون مین ہر کسکا انتظار تھا
جو رایت شفق ہوا مشرق مین آشکار

آکر جو کی نسیم نے شوخی سے گدگدی    تو ہر کلی کی آنکھ دہن جھٹ سے کھل گئی
بلبل کی جانب اسنے جو ناگہ نگاہ کی    دیکھا ادھر ادھر کو پھر اکبار ہنس پڑی

تھی تاک مین شمیم دہن پر لگی ہوئی
اسکی بدولت اسکی چمن مین ہنسی اڑی

چپکے سے کیا نسیم سحر نے سنا دیا    غنچون کے دلکو فرط طرب سے کھلا دیا
باد سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا    شبنم کے چھینٹے دیکے چمن کو جگا دیا

غنچے جو کھل کھلا کے گلستان مین ہنس پڑے
شبنم کے موتی سبزۂ خوابیدہ پر جھڑے

رنگ شفق سے تھا جو افق ملک زرنگار    گل نے بھی اک خزینۂ زر کر دیا نثار
بندش میں وہ غنچہ کا تھا حسن اور نکھار    صدقہ ہزار جان سے تھی عندلیب زار

منھ شاہدان گل کے جو شبنم نے دھوئے تھے
سنبل کے بال بال مین موتی پروئے تھے

چھایا ہوا تھا دہر مین اک نور کا سمان    دھویا ہوا تھا آب رخ حور سے جہان
انجم کا آسمان سے نکلا تھا کاروان    مہتاب کے بھی منھ پہ اڑی تھین ہوائیان

شب زندہ دار چرخ کا بھی رنگ فق ہوا
غالب ہر ایک رنگ پہ رنگ شفق ہوا

پہنچا قریب جب شہ گیتی ستان صبح    حاضر پئے سلام ہوئے افسران صبح
فوج شعاع لیکے بڑھا پہلوان صبح    لہرا رہا تھا پیل فلک پر نشان صبح

ڈنکا ہوا طیور چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمد شہ گردون سریر کا

فوج شعاع کی ہوئی آمد کی جب دھوم    تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکر نجوم
مشرق مین آئے خسرو خاور کے جب قدوم    تو دوڑ کر وہین لیا ان کو افق نے چوم

اکدم مین شب کی تیرگی کافور ہو گئی
دنیا چمک کے اک کرۂ نور ہو گئی

لا غازۂ عذار عقیدت وہ صبح تھی    یا قشقۂ جبین سعادت وہ صبح تھی
نور رخ نیاز و اطاعت وہ صبح تھی    افشان روئے حسن ارادت وہ صبح تھی

جس صبح کیکئی نے سنایا تھا یہ پیام
چودہ برس وطن سے رہیں دور جاکے رام

کیفی دہلوی

---

# صبح بنارس

چمکا جو سیہ خانے مین وہ رشک قمر — دل یہ کہتا تھا الٰہی نہ ہو اس شب کی سحر
اسکا یہ ناز سے کہنا کہ رہے بخت ترے — میرا ہر بار یہ کہنا کہ مین قربان تجھ پر
ہائے کیا اسکی جوانی کا ہے کافر عالم — ہو گیا پیر فلک اور نہ آیا وہ نظر
یون چمکتی نظر آتی ہے جبین پر افشان — ماہ کے گرد درخشندہ ہون جیسے اختر
نظر آتے ہین جوانی مین غضب کے جوبن — سکے بیٹھے ہین اسی حسن کے میرے دل پر
زلف آتی ہے بوئے سمن و مشک ز باد — شب یلدا کی سیاہی ہے اسی مین مضمر
ساغر بادۂ گلرنگ کی آئی بوتل — بھر دیے ساقی گلفام نے پیمانۂ زر
ڈالکر باہین گلے مین یہ کہا اُس گل نے — میرے ہاتھون سے مے ناب کا پی اک ساغر
اپنے ہاتھون سے مجھے اس نے پلائی مے ناب — تاک انگور کی تھی نشہ چڑھا جب مجھ پر
سامنے آئین فواکہ کی بھی قابین سربزم — دل کو فرحت ہوئی جب لائے نظر تازہ ثمر
دور مین جام ہی تھا چشم کو بھی گردش تھی — مست آتی تھی نظر ساقی ہوش کی نظر
خوب چھینٹے دیے دریائے کرم کے اُس نے — دم جو ساقی کا بھرا بھر گیا دم مین ساغر
لحن پر درد مین گائی وہ غزل ہو کے مست — دیس کا بھیروی مین کچھ نظر آیا تھا اثر
پیچ مین جھوم کے اُس شوخ نے گایا ادخیال — وجد کرنے لگی مرقد مین بھی روح حیدر
دل عاشق کو ہلانے لگی دھن سوہنی کی — رقص جب اسنے کیا کھا گئی بل اسکی کمر
گتین کافی کی بجائین تو سمان خوب بندھا — تان کھماچ کی جب لی تو ہوا اور اثر
نصف شب جب کٹی اس شغل مین با عیش و سرور — لگ گئی نیند اُسے سو گیا وہ رشک قمر
نیند کیا عہد جوانی کی ہے اللہ اللہ — کروٹین بھی نہین لیتا ہے ہمارا دلبر
فلک پیر یہ ریحان جوانی دیکھے — سب کو اُسکی ہے خبر اُسکو نہین کوئی خبر
مین تو سو جان سے ہون اس تری بے خبری پر قربان — خواب مین محو ہے ایسا نہین انچل کی خبر
اب بھی اُٹھتا نہین وہ نیند کا ماتا اے دل — صبح کاذب کی ہوئی چھاؤنی مین توپ بھی سر
روئے مہ پر چھپی مہتاب ہوئی شب کا فور — خط ابیض ہوا ظاہر فلک اخضر پر

مرغ نے بانگ بھی دی بولے نشیمن مین طیور — باغ مین اپنی ہوا باندھتی ہے باد سحر
چرخ پر پھر بھی اب ہوگا کوئی دم مین طلوع — جھلملاتے نظر آتے ہین مجھے سب اختر
باغ سے آتی ہے ہر بار شمیم گل دور — ڈالیان جھومتی ہین آتی ہے جب باد سحر
دیے شبنم نے جو گلزار مین چھینٹے دو چار — کھل گئے سبزۂ خوابیدہ کے بھی دیدۂ تر
کوٹ بار گر کھولے ہے آنکھین نرگس — پتا پتا اُسے گلزار کا آتا ہے نظر
برہمن جاتے ہین تھا ذن ہے نگاہ کیطرف — وقت پوجا کا یہ ہے اور نہین اسکو خبر
آئی ناگاہ جو کلیون کے چٹکنے کی صدا — ہو گیا خواب سے بیدار وہ رشک گل تر
نرگسی آنکھ ہوئین رات کا ظاہر ہے خمار — جام بلور مین جیسے ہو شراب احمر
ہنسکے کہنے لگا کیون تم نے جگایا نہ مجھے — سیر کو جاتا ہون گلزار مین مین وقت سحر
آؤ تم بھی چلو ہمراہ مرے گلشن مین — دیکھو گلزار جہان مین روش برگ و ثمر
معتدل فصل ہے یہ ہو عمل باد بہار — پھونک کر باغ مین رکھتی ہے قدم اب صرصر
وہ سمان صبح کا گلزار کے وہ گل بوٹے — باغبان نے بھی لیا جن سے ریاضت کا اثر
برگ پر بار ہوئے پھول چمن مین دم صبح — اُسکے قطرون سے در بار ہوئے سبز شجر
کیون نہ اسکو کہون نو بادۂ گلزار جہان — وہ ریاضت کی کہ ہر پھول کے دامن مین ہے زر
پتیان ہلتی ہین شاخون مین تو آتی ہے صدا — پھولتا پھلتا رہے باغ کا ہر ایک شجر
آکے گلزار سے گنگا کا کیا رُخ اسنے — شور ہے آج وہ آتا ہے جو یکتا ہے گہر
سبد گل بھی ہے اک ہاتھ مین اس گلرو کے — گھاٹ پر اوڑھ کے جاتا ہے گلابی چادر
ہان مری طبع روان جوش کا ہنگام ہے یہ — بحر معنی مین جو یکتا ہے لٹا وہ گوہر

غسل کرنے کو جو گنگا مین گیا وہ دلبر — اے تری شان صدف نے کیے صدقے گوہر
جب لٹین زلف کی بکھرائین رخ روشن پر — لوگ کہنے لگے لو آ گیا بدلی مین قمر
زحل و مہر کا ظاہر ہوا عالم مین قران — رخ روشن کے قرین آ گئی زلف دلبر
بڑھ گئی مہر کی بھی آبرو گنگا جل سے — چھینٹے دینے لگا وہ طفل حسین سورج پر
کیون نہ آفاق مین خورشید کے دن پھر جائین — اُسکی پوجا مین ہے مصروف مرا رشک قمر
ہو چکا غسل سے فارغ جو وہ محبوب مرا — قطرۂ آب گرے زلف سے بن کر گوہر

سلطان حیدر جان لکھنوی۔

لال ساری تن نازک مین جیسے پہنی | عکس پڑتے ہی شفق گون ہوا گنگا کا بھنور
نئے سیندور کا قشقہ جو جبین پہ کھینچا | آگیا صاف نظر قوس کا سب کو منظر
کس قیامت کی ہے اُس طفل برہمن کی اٹھان | بت بھی آرزو رکھتے ہین کہ وہ آئے ادھر
کیوں نہ سو جان سے ہو محو صنعت ازل نہ کیا | آج یہ شکل حسین آئی ہے مردم کو نظر
میرے اللہ تری قدرت و صنعت کے نثار | تو نے ایسے بھی بنائے ہین خدائی مین بشر
آج تو رحمت اللہ کا الفت کا اثر دکھا گیا | کیون ہین بتخانے مین فدا وہ بتان آزر
ہائے کیا خوب سمان آج لب دریا ہے | گنگا نہان شہر کے ہین جمع یہین وقت سحر

کبھی ناقوس کی آتی ہے صدا مندر سے | اور اشلوک کبھی پڑھتے ہین پنڈت فرفر
رام کے بادۂ الفت سے ہے ہر اک بد مست | جوش مستی مین بھی ہے نام انھین کا لب پر
لب دریا تو نہاتے مین بنارس والے | ناؤ پر چڑھکے سمان دیکھتے ہین اہل نظر
کیا بھلا اور تہنا ہیں کرون گنگا جل کی | جو سدا ان رہتا ہے بیشک ہے وہ اباطر
غسل کے بعد حسین جاتے ہین ہر مندر مین | پھول کے ہار چڑھاتے ہین وہ ہر اک بت پر

دیکھ لی صبح بنارس تو قمر آنکھون نے
دیکھنا اب ہے مجھے شام جوانی کی سحر

قمر گیاوی

## کمار سمبھو

بھارت مین تھا ایک دیت[1] تارک
بہر فساد دیوتا سب کے
تارک کے ستم سے لے کے ذات
وشنو نے کہا کہ دیوتا ؤ اٹھ
ریشم ہو کر یہ ناگ سب ہو گا
اسکی تدبیر ہے فقط ایک
لذات جہان سے ہاتھ اٹھا کر
بیٹھی ہے اما ہما چل کی
اُن سے جو کمار[2] ہو گا پیدا
بولے تا کام سب کہ اے کام
رُت[3] کو ہمراہ لیکر آیا
مایا سے کھلا دو کا عندی باغ
پوجا کرنے اما جب آئی
ابرو نے کہا کہ تیغ لاؤ
شنکر پہ اُما نے گل چڑھایا
آنکھین کھولین تو غیظ آیا
خود آئے اما کو آزمانے
تو شیو پہ عبث فدا ہوئی ہے
جو کھائے دھتورہ آک[4] پھانکے
تیرا چہرہ ہے باغ کا گل
بولی یہ اما کہ سُن اے جوگی
جس نے دنیا کو تج دیا ہے
اُسکی جو زہر کی ڈلی ہے
کس کام کی شے۔ جو یہ نہین ہے
اُن سے جو ہوا کمار پیدا

ظالم سے فدا نہ بارک!
آئے وشنو[5] کے گھر ہو دب
پربت بھی کھڑا ہے باندھ کر ہاتھ
ناچار ہون کیا کرون بتاؤ؟
یہ لعل کوئی دن آگ ہوگا
اچھی خاصی۔ سفید او رنگ
بیٹھے ہین پہاڑ پر وہ جا کر
پیارے ہیں وہ شیو کے پر جل کی
تارک کو وہی فنا کرے گا
شیو کو کرے اما کا تو رام
پھیلائی فریب شیو کے مایا
جو باغ ارم کو دے گیا داغ
مٹی مین لگی دیا سلائی
آنکھین بولین۔ چھری چلاؤ!
نفرت کی نذرانہ دل دکھایا!
لیکن صادق اما کو پایا
سونے کو آگ پہ تپا نے
دیوانی تو اے اما ہوئی ہے؟
اُسکی پیاسی کنوئین تو جھانکے
اسکا گھر اچراغ کا گل!
شاید تری شامت آئی ہوگی
بیکنٹھ مین اُس نے گھر لیا ہے
مجھکو وہ نبات سے بھلی ہے
کس کام کی ہین جو وہ نہین ہے
موذی تارک کو اُس نے مارا
جو عشق حقیقی کا ہے طالب

خادم اُسکی تمام مخلوق
کہنے لگے سب غضب ہوا ہے
سورج اُسے تیج دے رہا ہے
اُسکو مین نے ہی بر دیا تھا
مین نے سینچا۔ ہے جو گل تر
عارف۔ کامل جو ہین مہا دیو
جب تپ مین ہین وہ محو ایسے
شیو جی جو اما سے راد ہو جائے
یا کر یہ جواب دیوتا سب
اس کام پہ مستعد ہوا کام
شیو جی تھے پہاڑ پر نہایان
تب سے شنکر کا دل پھرایا
تھا حسن اما کا شعبدہ باز
کاٹو نخل ریاض شیو کا
غش کھا کے گری وہ شیو کے آگے
بھجوا دیا اُس کو سمت گھر کے
کہنے لگے اے حسین گل اندام
جو سانپ گلے مین خود لپیٹے
تیرا زہرہ جبین ہو شنکر؟
تو لوٹ ہے ایسے سنگ دل پر
دلبر کی میرے نہ کر بُرائی!
شیو کے گیسو جو مار ہون گے
شنکر نے خاک جو ملی ہے
پایا شیو نے جو عشق سچا
نیکون نے نجات غم سے پائی
وہ ہے دائم ہوس پہ غالب

نادم اُس سے جفائے معشوق
اب تک نہ ہوا اٹھا آب ہوا ہے
سورج سے بھی گرد وہ لے رہا ہے
لیکن مین یہ نہ جانتا تھا
اُسکو آپ ہی جلاؤن کیونکر؟
یا حق۔ بے لوث اور بے ریو
ویک پہ فدا پتنگ جیسے
یعنی۔ دونون کا بیاہ ہو جائے
پیش کام آئے پھر مطلب
تارک کا تمام تا کہ ہو کام
یا مہر تھا آسمان پہ تابان
آندھی سے پیڑ کو گرایا
جادو کرنے لگا ستم ساز
آخر شنکر[6] کا دھیان ٹوٹا
شیو جی خواب گران سے جاگے
اور آپ جتی کا بھیس کرکے
جو حسن ارسے۔ وہ تو دلارام
اُس شیو کو تو زلف مین جگہ دے
ہیرے کا ہمنشین ہو کنکر؟
شیشہ ثابت رہے گا سل پر؟
گدڑی مین لعل ہے وہ بھائی!
وہ میرے گلے کے ہار ہون گے
اکسیر میرے لیے وہی ہے
خوش ہو کر اُما کے ساتھ بیاہا
نیکی پھیلی۔ مٹی بُرائی

طالب بنارسی

[1] دیو یعنی بدکار ظالم [2] پرورش کا دیوتا [3] نور اقبال [4] خراج [5] کر و فریب [6] بیٹا [7] عشق کا دیوتا [8] فصل بہار کی دیوی [9] شعبدہ بازی [10] شیو جی [11] بھکشیا۔

## خیر مقدم انصاری

کسکی آمد کی خوشی آج ہو انسانونکو — کسکے دیدار کا ہے شوق مسلمانون کو
کسکے انوارت زینت ہوئی کاشانونکو — صاف کرتی ہو صبا کیون چمنستانون کو

"باغ مین گل کھلے جاتے ہین کہ وہ آتے ہین"
"انگلیان سرو اٹھاتے ہین کہ وہ آتے ہین"

اہل اسلام کا ہمدرد کوئی آتا ہے — شیر دل اور جوانمرد کوئی آتا ہے
تجربہ کار جہان گرد کوئی آتا ہے — یون تو لاکھون ہین مگر فرد کوئی آتا ہے

ڈاکٹر نام کا اپنے ہے جو مختار احمد
ہو اسی قوم کے جانباز کی آمد آمد

تمکو معلوم بھی ہو آپ کی عزت کیون ہو — ڈاکٹر اور حکیمون پہ فضیلت کیون ہے
آپ سے قوم کے بچون کو محبت کیون ہو — آپکی دید کی ہر شخص کو حسرت کیون ہے

آبرو پائی ہو ہمت سے جوانمردی سے
قوم ہمدرد بنی آپکی ہمدردی سے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے آپ سے بیٹھا نہ گیا — زخمی ترکونکو تڑپتے ہوے دیکھا نہ گیا
بسملِ تیغِ ستمگار سے سرکا نہ گیا — آپ ہی اڑکے سرِ شمع پہ پروانہ گیا

یعنی ٹرکی مین گئے طبی مشن کو لیکر
ساتھ کچھ اور محبانِ وطن کو لیکر

ایک سے ایک سوا نیمن ہنر رکھتا تھا — بات جو کہنے کی ہوتی تھی وہ کر رکھتا تھا
ہاتھ شافی تھا دوا اون مین اثر رکھتا تھا — رات دن زخم رسیدون کی خبر رکھتا تھا

ظالمون نے جو دیا توڑ شکستہ دل کو
مومیائی سے دیا جوڑ شکستہ دل کو

آپ ٹرکی مین رہے رشکِ مسیحا ہوکر — کوئی مردہ بھی اگر تھا رہا زندہ ہوکر
چلنے پھرنے لگا بیمار بھی اچھا ہوکر — چشمِ امید رہی زخم پہ پھاہا ہوکر

سر مین گر درد ہوا سر کو دبا لے بیٹھے
آپ بیمار کی تسکین کو سرہانے بیٹھے

ہر کوئی ایسا جوانمرد مسلمانون مین — جو محبت کا نمونہ بنے انسانون مین
جان ڈالے نئی ترکیب سے بیجانون مین — تیر ارا ہی یہی آپ نے میدانون مین

بھولکر بھی نہ لیا ہاتھ مین تلوارون کو
یہ بڑا کام تھا اچھا کیا بیمارون کو

یون بہادر تھے بہت توپ چلانے والے — ترکے میدان مین دو ہاتھ دکھانے والے
ان سے بھی بڑھکے ہین ہمت کے بڑھانیوالے — ہاتھ سے زخم رسیدون کو اٹھانیوالے

قوم سیکھے گی سبق آپ سے ہمدردی کا
اے خلیق آپ نمونہ ہین جوانمردی کا

خلیق دہلوی

## تاثیر الفت

نشان مٹتا نہیں مغرب مین اب مہرِ درخشان کا — نظر آتا نہیں جلوہ ہمین خورشید تابان کا
تھکا ماندہ مسافر منزلِ مقصود پر پہنچا — نہ ٹھہرا راہ مین دم بھر بھی اپنی دھن کا پکا تھا
کہان غائب ہوا تو جلوہ افروزِ جہان ہوکر — ستم ڈھایا ہو تو نے اہل ہستی پر نہان ہوکر
کہان اب روزِ روشن کا پتہ۔ نورِ درخشان کا — تسلط ہو گیا سارے جہان پر شامِ ہجران کا
ستارونکی چمک سے ہو فقط چرخِ برین روشن — چراغون سے ہوئی ہو جا بجا بزمِ زمین روشن
ہوا بازار عالم سرد۔ سونی بزمِ مستی ہو — جہان سیلاب ہستی تھا وہان حسرت برستی ہو

---

بلا سے اس گھڑی ہو سامنا بیمارِ الفت کو — ترقی ہو رہی ہو دمبدم آزارِ الفت کو
کبھی ہو دردِ دل پیدا کبھی دردِ جگر پیدا — کیا ان ظالمون نے سینہ بسمل مین گھر پیدا
وفورِ درد سے گھبرا کے آخر آہ کر اٹھا — اٹھایا لاکھ بالین سے نہ اٹھنا تھا نہ سر اٹھا
نہین کھلتی ہین آنکھین خونفشانی اشکباری سے — کہ بہلائے دل رنجور کو اختر شماری سے
بپا خونِ تمنا حسرتِ مردہ کا ماتم ہے — کبھی وہ صورت تصویر ہو اور چپ کا عالم ہو
کبھی دل تھام کر ہاتھون سے سرگرمِ فغان ہونا — کبھی آثار پھر دردِ نہانی کے عیان ہونا

---

مسیحائی یہ کی امید نے بیمارِ الفت سے — تنِ مردہ مین پھونکی روح اک بجلی کی قوت سے

اُمید وصل نے ایسی طبیعت اُنکی گرمائی — کہ سیر کوچۂ جانان کے حیلے سے لگا لائی

ستم ایجاد کے آگے دل ناشاد جا پہنچا — اسی انداز سے وہ خانہ برباد جا پہنچا

وہان بیٹھا تو لب پر یون لگا کرنے خفا ہوتی — کہ صورت سی عیان ہوتی تھی اُنکی خود فراموشی

فسردہ خاطری چہرے سے اُسکے یہی ظاہر تھی — کہ جیسے ذرّے ذرّے کی زبانِ حال قاصر تھی

---

یہ کیا ہوا کیا کیا نالون نے میرے کچھ اثر پیدا — یہ کیا ہی اپنا کیا اُلفت نے اُسکے مین گھر پیدا

یہ کیا ہوا کیا کہا اُس بُت نے مجھ سے وہ جان ہو کر — یہ کیا ہے کون باتین کر رہا ہے [illegible]

یہ کیا ہوا کسنے پوچھا مجھسے تم تصویرِ غم کیون ہو — خموشی معنیٔ دارد سراپائے الم کیون ہو

---

وہ پوچھے مجھسے ہم تصویر سے خاموش رہ جائین — یہی موقع ہے باسط جو ہمین کہنا ہو کہہ جائین

بتا دین تجھ سے ظالم حال ہم آشفتہ حالی کا — نتیجہ ہے ستمگر سب یہ تیری پائمالی کا

ستا رکھا ہے قاتل تو نے مجھکو اک زمانے سے — ملا دے خاک مین ہستی تو لگ جائے ٹھکانے سے

قیامت ہے کہ تجھ بن مین تو ہون ہجر مین شیدا — قیامت ہے تجھے نفرت ہو میرے نام سے پیدا

غضب ہے رات فرقت کی کٹے خوابِ پریشان مین — بسر ہو تیری آرائش گیسوئے پریشان مین

غضب ہے مین پھرون با چشم نم دشت بیابان مین — ہے تو جا وہ فرما خوشدلی سے بزم خوبان مین

غضب ہے شمع سان ہو مجکو سوز و ساز مطلب — تجھے ہو فرش گل پر تجکو خواب ناز مطلب

غضب ہے مین ہون سرگرم فغان [illegible] — تجھے مطلب ترنم سے ہو اور نغمہ سرائی سے

غضب ہے مین اُڑاؤن دھجیان جیب و گریبان کی — تجھے مدِ نظر زینت ہو اپنے دور دامان کی

قیامت ہے نہ میری چاہ کی کچھ قدردانی کی — قیامت کی تغافل کیش تو نے سرگرانی کی

---

مری پُردرد باتون سے بہت گھبرا وہ قاتل بھی — سزاوارِ ترحم ہو گیا ہے آج بسمل بھی

مرے پہلو مین بیٹھا اور کہا طرفہ شکایت ہے — سمجھ ہی مین نہین آتی ہے یہ کیسی حکایت ہے

رہ و رسم محبت اے ستمگر عاشقی مین کیا جانون — بھلا آئین اُلفت سے مری عاشقی مین کیا جانون

ستا کر تو نے مجھکو عجب صورت نکالی ہے — سنا کر داستانِ غم غضب مین جان ڈالی ہے

مجھے ایسا کبھی موقعہ نہ پیش آیا مین کیا جانون — کوئی عرضِ تمنا یون نہین لایا مین کیا جانون

---

یہ تیری دوری وصل دلمین درد پیدا ہی — جگر مین سوز پنہان لب پہ آہ سرد پیدا ہی

مجھے تجھسے ہی ہمدردی نہ اب اسطرح غم کھا — جنون کو چھوڑ دے کیون ہو گیا ہے ایسا دیوانہ

جدا ہونگے نہ اب ملکر نہ اب رنج و الم ہونگے
مزے آئین گے باسط قدردان جب ترے ہم ہونگے

باسط بسوانی

## حمد

حمد خالق مین عندلیبِ قلم — گلفشان ہے زہے نصیبِ قلم

غنچے دیتے ہین یون چٹک کے صدا — وحدہٗ لاشریک ہے وہ خدا

بیل بوٹون مین رنگ قدرت کا — پتا پتا گواہ صنعت کا

کوئی سمجھا نہ آجتک یہ راز — سرو قمری مین کیون ہے ناز و نیاز

کرتی ہے نالہ و بکا بلبل — گل تر پر ہے کیون فدا بلبل

لالہ و گل کے رخ رنگین سے — سرخ مخمل کے ہین کھلے طاقے

ڈھنگ نرگس مین چشم مردم کا — رنگ غنچون مین ہے تبسم کا

سر اُٹھائے ہوئے بہار کہین — بلبل و گل مین چھیڑ چھاڑ کہین

اُسکی قدرت کا کچھ حساب نہین — اُسکی صنعت کا کچھ جواب نہین

کیسے کیسے حسین کئے پیدا — نازنین مہجبین کئے پیدا

باغِ عالم کو زیب و زینت دی — لوٹ ہو جائین دل وہ صورت دی

کیسا تارون کا خوشنما ہے چمن — آسمان کو بنا دیا ہے چمن

ہر جگہ ہے غرض وہی مستور
چاند سورج مین ہے اُسی کا ظہور

دیکھکر جلوہ اُسکی قدرت کا — ہے فرشتون مین شور صلِّ علیٰ

حمد کرتے ہین اُسکی جن و بشر — اُسکے اوصاف ہین زبانون پر

ایسی آنکھین کہان سے لائین ہم — اُسکی قدرت کو دیکھ پائین ہم

آنکھین بینا مری اگر ہو جائین — آئینہ صنعتین مگر ہو جائین

ذاتِ باری کو کوئی کیا جانے — آپ اپنے کو وہ خدا جانے

محو حیرت ہے چشم اہل نظر — خامشی یان سخن سے ہے بہتر

[illegible]

## مناجات

اے خداوند! اے کریم الغفر وجود و عطا — اے شہنشاہِ دو عالم مالکِ ارض و سما
دین و دُنیا کی شہنشاہی کا مالک تو ہی — پُر معاصی ہم ہیں بندے تیرا شیوہ ہے عطا
ہے تری سرکار عالی اور تو خلاق ہے — ہم تو ہیں ناچیز بندے بینوا و نا سزا
جس طرف دیکھا ترا جلوہ نظر آیا ہمیں — صاف ظاہر ہو گیا کوئی نہیں تیرے سوا
واقعی ہے ذات تیری لاشریک و لاجواب — دونوں عالم کا تو ہی مالک ہے میرے کبریا
ہم بھٹکتے پھرتے ہیں گمتے نہیں اب اوپر — راستہ سیدھا بتا اور بخش دے ہمکو خدا
تیری بخشش تیری رحمت تیرا احسان بیشمار — عمر بھر کفرانِ نعمت ہم سے ہوتا ہی رہا
باہمی دشمن ہوئے رسوائے عالم ہو گئے — ہمکو اپنی کور بختی کا نتیجہ مل گیا
اپنی بداعمالیوں کے ہم ہیں یارب معترف — اپنی کرتوتوں کی ہے جو پھل چکھتے ہیں سزا
دور کر یارب! نفاق اور حبِ قومی کر نصیب — ہے ہماری یہ دُعا مقبول بہرِ مصطفےٰ
بغض اور کینہ عداوت جہل ہم سے دور ہو — ہو ہمارا قلب پر تو پر جیسے آئینا
دادرس فریادرس تیرے سوا کوئی نہیں — بخش دے لطف و کرم سے اپنے بندوں کی خطا
یا خدا شانِ کریمی کے ہیں ہم امیدوار — حبِ قومی دے ہمیں اور قوم کا شیدا بنا
مذہبی جھگڑے مٹیں اور قومی تعصب نکال — متحد ہو جائیں ہم سب یہی تجھ سے دُعا
نورِ ایمان سے منور کر ہمارے قلب کو — تیرے پیغمبر کی اُمت کا ہو بہتر خاتمہ
ہے ابھی تک قوم میں تعلیمِ نسوان کی کمی — قوم میں تعلیم نسوان کا عطا کر ولولا
عورتیں تعلیم پائیں گر ہماری قوم کی — آجکل بھی ہم میں نکلیں سیکڑوں زیب النسا

رابعہ کی التجا تجھ سے یہی ہر وقت ہے
جوشِ قومی حبِ قومی سوزِ قومی کر عطا

رابعہ سلطان بیگم

## انسان

اے بشر! اے خاک کے پتلے! تجھے اتنا غرور — تیرے ہمجنس اور پھر تو ہی لب پہ اُنسے نفور
نشۂ زر نشۂ رز کی طرح کیوں چڑھ گیا — ہو گئی اُلٹی سمجھ کیوں؟ کیا ہوا تیرا شعور؟
تجھ سے ہیں محروم سائل سیکڑوں ذلت کا بھی غم — مفلسوں کو کب سمجھتا ہے تو اے منعم غیور
سینے میں تیرے ہے دل لیکن نہیں کچھ بھی درد — مُنھ میں تیرے ہے زبان لیکن زبان پر قول زور
اے ضعیف انسان! اے کیڑے زمیں کے! غور کر — کیا ہے تیری اصل؟ کیا کیا تجھ میں مضمر ہیں قصور
اے بشر! تجھ پر نہ ہوتا فضل اگر اللہ کا — تجھ کو کب ملتی یہ عزت، یہ شرافت یہ شعور
کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا — جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے روزِ نشور
حاملِ بارِ امانت کون ہے تیرے سوا — تو ہے اشرف گر نہ ہو تجھ میں چھپا شر و فتور
ہو کے انسان پھر کرے تو ہی جفا انسان پر — کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور!
دوسروں کے حق و باطل سے نہیں کچھ واسطہ — عدل کا خواہاں ہے ظالم سے جو ہو جائے قصور

وہ ہیں انسان جن میں کبر و نخوت ہے ذہین
ہے تو زیبا آدمی کو آدمیت ہے ذہین

سید غلام مصطفےٰ ذہین

## غزل رعد (جونپوری)

چارۂ دردِ محبت نہیں درکار مجھے — چھوڑ دیں حال پہ میرے مرے غمخوار مجھے
یاد آتے ہیں جو وہ ابروئے خمدار مجھے — آج ہر چیز نظر آتی ہے تلوار مجھے
دم بدم شمع کے مانند گھلا جاتا ہوں — کھائے جاتا ہے مرے عشق کا آزار مجھے
یہ جو سمجھے ہیں کہ بچنے کا نہیں یہ بیمار — دینے آتے ہیں تسلی مرے اغیار مجھے
تنکے کہتی ہے یہ تلوار مرے قاتل کی — مردِ میدان تو وہی ہے جو کرے پار مجھے
دل کی تسکین ہو تم جان کی راحت ہو تم — میری آنکھوں پہ کبھی بیٹھو تو ہو بار مجھے
کیسے کیسے مرے دشمن کو مزے آتے ہیں — گالیاں وہ جو سناتے ہیں لگاتار مجھے
بن پڑی ہے جو شبِ وصل تو سوجھی ہے نئی — اُنسے کہتا ہوں کہ تم آج کرو پیار مجھے
کیا تماشا ہے کہ رہتی ہے کمر میں تیری — سرخرو کرتی ہے قاتل تری تلوار مجھے
جانِ من کہنے کا اُن کے مجھے بدلہ یہ ملا — دل میں آئے تو کرے جان سے بیزار مجھے
میں دکھاتا ہوں جو انکو دلِ پر داغ اپنا — وہ دکھاتے ہیں بہارِ گلِ رخسار مجھے
دل تو کیا چیز ہے میں جان بھی دیدوں تمکو — تم بتاؤ تو سہی اپنا خریدار مجھے
بت پرستی میں ہوا مجکو یہ رتبہ حاصل — برہمن بھیجتے ہیں تحفۂ زنار مجھے
اُسنے پوچھا جو مرا نام تو میں نے یہ کہا — لوگ کہتے ہیں محبت کا گنہگار مجھے
وہ دن اچھے تھے وہ اچھا تھا زمانہ اے رعد — جبکہ نہیں تھا عشق کا آزار مجھے

# اڈیٹوریل

## انجمن ترقی اردو

شکر ہے کہ مدت تک خواب غفلت میں مدہوش رہنے کے بعد انجمن ترقی اردو اب پھر بیدار ہوئی ہے، اور سب سے پہلا کام جو ضروری خیال کیا گیا از سرِ نو قواعد وضوابط کی اشاعت ہے۔ گویا جو کام اپریل ۱۹۰۳ء میں کیا جا چکا تھا اب پھر اسکی تجدید ہوئی ہے۔ ترقی اسی کا نام ہے!

اس دس گیارہ برس کے عرصہ میں انجمن ترقی اردو نے کئی پلٹے کھائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہمیشہ قابل ہاتھوں میں رہی، مگر اسپر بھی ہنوز روزِ اول ہے۔ اس دفعہ جن مستعد ہاتھوں میں اسکی باگ دی گئی ہے، اُنکے نام نامی ہی اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ اب انجمن ترقی اردو میدانِ عمل میں قدم ماریگی چنانچہ حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوے ہیں:-

پریسیڈنٹ۔ عالیجناب نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی بہادر سی آئی ای

سکرٹری۔ جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے (دہلوی)

اسسٹنٹ سکرٹری۔ جناب مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم (لکھنوی)

یہ ایسے نام ہیں جن کی موجودگی میں انجمن ترقی اردو کا مستقبل نہایت شاندار و دلفریب نظر آتا ہے۔ ہر تحریک کی قدر و منزلت اسکی کامیابی و اہمیت کا اندازہ اُسکے کارپردازوں کی قدر و منزلت اور وسیع الخیالی سے کیا جاتا ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ملکی و مادری زبان کی احیاء ترقی و متوقعہ کامیابی کا اندازہ صاحبان موصوف الصدر کے گرامی قدر ناموں ہی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم ناموں کو سراہنا نہیں چاہتے بلکہ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے انجمن ترقی اردو کا کوئی علمی کام دیکھیں!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم انجمن ترقی اردو کے مشتہرہ قواعد وضوابط نقل کریں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ انجمن کے مقاصد کیا ہیں، اور اُنکے حصول کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔

### قواعد وضوابط انجمن ترقی اردو

۱۔ اس انجمن کا نام "انجمن ترقی اردو" ہوگا۔

۲۔ اسکے مقاصد حسب ذیل ہوں گے (۱) اصلاح زبان یعنی اردو زبان میں جو خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں انھیں دفع کرنا اور غیر مانوس جیسے الفاظ و محاورات جو غیر زبانوں کے بلا ضرورت زبان میں داخل ہوتے جاتے ہیں اُنسے بچنا۔ اور صحیح و فصیح زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۲) جن اضلاعِ ہندوستان میں اردو زبان کا رواج نہیں ہے۔ یا کم ہے۔ اُن میں اردو زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۳) قدیم کلام نظم و نثر کو ضائع ہونے سے بچانا اور جدید کو ترقی دینا۔

(۴) علمی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کا لغت مرتب کرنا۔

(۵) اردو زبان کی قدیم و جدید تالیفات و تصنیفات کا ایک کتب خانہ قائم کرنا۔

(۶) ہر صوبہ کی اردو ٹکسٹ بکس کو زبان کے لحاظ سے جانچنا۔ اگر ان میں نقص ہوں، تو اُس صوبہ کی گورنمنٹ سے اصلاح کی خواہش کرنا۔

(۷) اور اگر انتظام ممکن ہو اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا۔

۳۔ ان مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کیجائینگی

(۱) السنۂ شرقی و مغربی سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا جو ملک کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اور تصنیفات و تالیفات کی ڈایرکٹری تیار کرنا۔

(۲) ایسی جدید تالیفات و تصنیفات کرانا جن کی اردو زبان کو ضرورت ہے۔

(۳) قدیم اساتذہ کی ایسی قلمی کتابوں کا شایع کرانا، جو درحقیقت قابل قدر ہیں، اور جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ یا جو کبھی کسی زمانہ میں طبع ہوئی تھیں اور اب نایاب ہیں۔

(۴) ماہران علوم و فنون سے علمی کتب و اصطلاحاتِ علمیہ کا لغت مرتب کرانا۔

(۵) علاوہ اسکے جو صاحب اپنی کتاب کا حق تصنیف فروخت کرنا چاہیں

توبشرطیکہ وہ کتاب انجمن کی رائے میں مفید اور عمدہ ثابت ہو، مناسب صلہ دیکر اُسے خرید کرنا۔

(۶) انجمن کے لیے ایک ایسا سرمایہ قائم کرنا، جو اُسکی ضروریات کیلئے کافی ہو۔

(۷) انجمن کے مقاصد کی اشاعت و امداد کے لیے مختلف صوبوں اور مناسب مقامات میں انجمن کی شاخیں مقرر کرنا۔

**۴** ۔ انجمن اُن تمام تالیفات اور تصنیفات اور ترجموں کے لیے جو انجمن کی تحریک سے کرائے جائینگے، یا جن کا حق تالیف وہ خریدنا چاہیگی معقول صلہ دے گی۔ صلہ کی دو صورتیں ہونگی :-

(۱) یا تو انجمن نقد معاوضہ دیگی۔ اس صورت میں حق تصنیف انجمن کو حاصل ہوگا۔

(۲) انجمن کوئی نقد معاوضہ نہ دیگی۔ لیکن کتاب اپنے صرف سے طبع کردیگی

**۵** ۔ انجمن کے ارکان حسب ذیل ہونگے:۔

(۱) سرپرست ۔ امرا و روسائے ملک جو انجمن کو یکمشت ایک ہزار روپیہ ماہانہ یا سالانہ معتدبہ امداد عطا فرمائیں گے وہ انجمن کے سرپرست کہلائینگے۔

(۲) ارکان دائمی۔ جو یکمشت پانچ سو روپیہ عنایت کریں گے وہ رکن دائمی (لائف ممبر) قرار پائیں گے۔

(۳) ارکان معمولی۔ جو صاحب کم از کم ایک روپیہ ماہانہ یعنی ۱۲ عہ سالانہ یا اس سے زائد چندہ دینگے وہ رکن معمولی ہوں گے۔

(۴) وہ نامور ارباب قلم و صاحبان علم و فن انجمن کے ارکانِ شوریٰ قرار دیے جائیں گے، جن کی خدمت میں انجمن کی طرف سے کوئی کتاب بغرض اظہار رائے یا دیگر امور متعلقۂ انجمن مشورۃً پیش کیے جائینگے اور وہ اُسپر اظہار رائے اور مفید مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

**۶** ۔ انجمن کا دفتر اور حساب کتاب آنریری سکریٹری کے پاس رہے گا اور انجمن کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت سکریٹری سے کیجائیگی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں سکریٹری سال بھر کی کارروائی و حسابات کے متعلق رپورٹ پیش کرے گا اور ایسی رپورٹ عام طور پر شائع کیجائیگی

**۷** ۔ انجمن کی جو شاخیں ملک کے مختلف مقامات میں قائم ہونگی اُن کے سکریٹری انجمن کے جنرل سکریٹری کے اسسٹنٹ سکریٹری ہونگے اور اپنے اپنے صوبجات اور مقامات میں اُسکے مشورے اور صوابدید سے کام کرینگے ایسی انجمنیں یا شاخیں بھی اپنی اپنی ایک سالانہ رپورٹ تیار کرینگی۔

دستخط عماد الملک (سید حسین بلگرامی) دستخط عبد الحق

پریزیڈنٹ آنریری سکریٹری

کچھ شک نہیں کہ انجمن کے اغراض و مقاصد نہایت اہم و ضروری ہیں، اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ جملہ ابنائے ملک بھی خواہانِ اُردو ان مقاصد کو نہ صرف نظر استحسان دیکھیں گے بلکہ انکی تائید و تکمیل میں حتی المقدور سعی بلیغ اور امداد دلی فرمائیں گے۔

دوسرے مقصد کے تحت میں لکھا گیا ہے کہ "اگر انتظام ممکن ہو، اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا" یہ درست ہے کہ ہر جماعت کو اپنے اغراض و مقاصد کے اظہار و اشاعت کے لیے اپنے ہی ایک رسالہ یا اخبار کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، لیکن ہم اسکے خلاف ہیں کہ انجمن اپنا پرچہ جاری کرے۔ اخبار یا رسالہ اُسوقت جاری کرنا چاہیے جب انجمن اس سے زیادہ ضروری و اہم اصل کامیابی کے ساتھ طے کرلے۔ خدا کے فضل سے ملک میں بکثرت اخبار و رسائل جاری ہیں، مناسب ہے کہ انھیں میں سے کسی کو انجمن اپنا آرگن بنالے۔ خود العصر بھی اس خدمت کی انجام دہی کے لیے تیار ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ بابت ۱۹۰۳ء میں مولانا شبلی نے تحریر فرمایا تھا کہ " ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علیحدہ رکھا گیا ہے، چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اسکا اظہار بھی کیا ...." ہم سمجھتے ہیں کہ اب بھی یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ارکانِ شوریٰ کی فہرست ۴۴ اصحاب پر مشتمل ہے۔ اِن میں صرف

۵ ہندو ہیں۔ حالانکہ ملک میں بہت سے ہندو ایسے موجود ہیں جو اُردو زبان سے متعلق کافی واقفیت، استعداد، اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ارکانِ شوریٰ کی فہرست میں ایک بھی لکھنوی ہندو کا نام نہیں۔ حالانکہ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست بی اے، اور منشی جالیا پرشاد صاحب سکریٹری اودھ خیابان اور منشی مہاراج کشن صاحب قمر، اور منشی نوبت رائے صاحب نظر بہر طرح سے اہل تھے۔

ایک اور غلطی بھی انجمن سے ہوئی ہے کہ ارکانِ شوریٰ میں کوئی ہندوستانی مسیحی نہیں لیا گیا۔ ہمارا الزام اس میں ضرور ہے مگر سکوت نہ سمجھنا چاہیے ہندوستانی مسیحیوں میں پادری واعظ جویل لال صاحب ایم اے دہلی یا مسٹر جے۔ آر۔ رلئے جرنلسٹ، لاہور، یا مسٹر سلیمان تھنکورنگ گارڈنر (آپ اساتذۂ لکھنؤ میں مستند استاد مانے جاتے ہیں) و مسٹر ولی ایل گارڈنر، رئیسان کنہ پور چھاونی ضلع ایٹہ یا ڈاکٹر ٹی۔ ریل صاحب لطیف اجمیری، پادری تارا چند صاحب دہلوی اجمیر (وغیرہ) ہندوستانی مسیحی جماعت میں اہلِ زبان کی سی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہماری رائے میں کم از کم تین ہندوستانی مسیحی بھی ارکانِ شوریٰ بنائے جائیں تو نہایت مناسب ہوگا۔

ارکانِ شوریٰ میں ۳۸ نام مسلمان حضرات کے ہیں۔ ان ۳۸ ممبروں میں بہت سے نام زینتِ فہرست کے سوا کسی مصرف کے نہیں۔ مناسب ہے کہ کام کے آدمی نظر انداز نہ کیے جائیں۔ کیونکہ نام سے کام نہیں ہوتا بلکہ کام سے نام ہوتا ہے!

ہم اُمید کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو ہماری اس جائز نکتہ چینی سے فائدہ اُٹھاکر ہندوستان کے ہر فریق سے قابل قدر اصحاب کے نام ارکانِ شوریٰ کی فہرست میں داخل کریگی، ورنہ اُسے اپنے مقصد میں کما حقہ کامیابی نہ ہوسکے گی۔

---

## انجمنِ تعلیمِ ابتدائی

گزشتہ پانچ سال میں مسئلۂ تعلیم پر جس قدر توجہ کی گئی، اور جو کوششیں اس بارے میں کی گئی ہیں، انکی مثال ابتدائی تعلیم کی تمام تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ بالخصوص آنریبل مسٹر گوکھلے کی کوششیں اس بارے میں خاص طور سے بارآور ہوئی ہیں، اور اب ابتدائی تعلیم کا مسئلہ اُن معدودے چند مسائل میں شمار کیا جاتا ہے جن پر قوم کی آیندہ زندگی کا انحصار ہے۔ اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لحاظ سے ہماری حالت نہایت شرمناک ہے۔ ہم یہ بھی جاننے لگے ہیں کہ اگر ہم کو اس قعرِ ذلت سے نکلنا منظور ہے تو نہایت اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم مایوس ہوکر ہمت نہیں ہارتے، بلکہ مسئلہ کی اہمیت اور اپنے فرائض کی ذمہ داری ہم میں وہ جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے، جسکے روبرو ہر قسم کی مشکلات کے خوف بیجا معلوم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ بھی اپنی ذمہ داری کو اب، بہ نسبت سابق، زیادہ محسوس کرتی ہے اور قدم بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر ہم دیدۂ بصیرت سے دیکھیں تو اکثر ایسے آثار نظر آئینگے جن سے قوی امید پیدا ہوتی ہے کہ آیندہ پانچ سال کا زمانہ ابتدائی تعلیم کے حق میں ایک نہایت مبارک زمانہ ہوگا، جس میں نمایاں ترقی ہوگی اور ہمارے قدم آگے بڑھتے نظر آئینگے۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ نے اُس رزولیوشن میں جس میں ایلمنٹری ایجوکیشن کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوا تھا اُمید ظاہر کی تھی کہ

> اگر صوبجات متحدہ کی مالی حالت کو کسی خاص آفت سماوی کا سامنا نہ کرنا پڑا تو یہ ممکن ہوسکے گا کہ آیندہ پانچ سال بعد ابتدائی تعلیم پر گورنمنٹ پینتیس لاکھ روپیہ سالانہ زائد صرف کر سکے، اور اس طور سے ابتدائی مدارس کے طلبا میں تین یا ساڑھے تین لاکھ کا اور اضافہ ہوسکے۔

یہ سب باتیں نہایت ہمت افزا ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان کوششوں کا بہت کچھ حصہ جو گورنمنٹ اب ظاہر کر رہی ہے، اُن کوششوں کا نتیجہ ہے جو رعایا کی جانب سے کانگرس، کانفرنسوں اور کونسلوں میں کی گئی ہیں، اور جنکو اخبارات نے اپنے زورِ قلم سے تقویت بخشی ہے۔ پس اگر ہم گورنمنٹ کی پالیسی کی تبدیلی سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ابتدائی تعلیم جلد لازمی و مفت کر دی جائے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمیشہ مستعد رہیں اور اس مسئلہ کو کبھی نظرانداز نہ ہونے دیں۔

حال میں ایک ایلمنٹری ایجوکیشن لیگ الہ آباد میں، قائم ہوئی ہے جو ان

صوبجات کی تعلیمی ترقی میں بدل وجان کوشش کریگی۔ اس لیگ کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے :-

(۱) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے خیال کو عوام الناس میں بذریعہ مضامین لکچر و کانفرنس وقتاً فوقتاً اشاعت دینا۔

(۲) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے مسئلہ پر بذریعہ عرضداشت وغیرہ گورنمنٹ کو توجہ دلانا۔

(۳) ایسے ابتدائی درجہ کے مدرسے کھلوانے کی کوشش کرنا جن میں غربا کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جا سکے اور اُن ابتدائی درجہ کے مدرسوں کی حالت کو سنبھالنا جو ردی حالت میں ہیں۔

لیگ کی کوشش ہمیشہ یہ ہوگی کہ وہ سب فرقوں اور سب مذہبوں کے لوگوں کی ہمدردی اپنے کام کے ساتھ وابستہ کرسکے اور بلا لحاظ مذہب وملت سب کی بھلائی کی کوشش کرے۔ البتہ اگر ممکن ہو تو غریب اور نیچ قوموں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ یہ امر کہ لیگ کے مدرسوں میں کون سی زبان میں تعلیم دی جائے، اُن لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا جو مدرسہ کے قرب وجوار کے باشندے ہوں۔ حتی الامکان یہ کوشش کی جائیگی کہ اُردو ہندی دونوں زبانیں ہر مدرسہ میں پڑھائی جائیں۔

پراونشیل لیگ میں عنقریب تمام اضلاع کے ممبر شریک ہونگے اور اسکے اغراض ومقاصد کے انجام دینے کے لیے ایک انتظامی کمیٹی مع عہدہ داران کے منتخب کیجائے گی اور لیگ کا صدر دفتر الہ آباد میں ہوگا۔ لیگ اس امر کی کوشش کریگی کہ اپنی شاخیں رفتہ رفتہ عنقریب تمام اضلاع میں کھولے جو اس کے زیر نگرانی کام کریں۔ لیکن پراونشیل لیگ خود مدرسے کھولنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیگی۔ بلکہ یہ کام شاخوں کے سپرد ہوگا کہ جہاں ممکن ہو اور شاخیں ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں وہاں مدرسے کھولے جائیں۔ پراونشل لیگ اپنے سکرٹری اور دیگر عہدہ داروں اور کام کرنے والوں کے ذریعہ سے شاخوں کو اس امر میں مدد دیگی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں کمیٹیاں قائم کرسکیں، اور مدرسے کھول سکیں، لیکن مدرسوں کے لیے سرمایہ بہم پہنچانے اور اُنکی نگرانی کرنے کی ذمہ داری اُنھیں اضلاع کی کمیٹیوں اور شاخوں پر واجب ہوگی۔ ملکی معاملات کے لحاظ سے ان صوبجات کی جو کیفیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا قومی انجمنوں کی سرسبزی وشادابی کے لیے کچھ بہت زیادہ موافق نہیں ہے۔ پس اس امر کو ملحوظ خاطر رکھکر یہ امید کرنا کہ لیگ کے قائم ہوتے ہی کوئی خاص عجیب وغریب ترقی نمایاں ہوگی، امید موہوم ہے۔ لیگ اس امر کی ذمہ داری نہیں لیتی کہ وہ کسی بڑے پیمانہ پر عوام الناس کی تعلیم کا انتظام کریگی لیکن ہم اس امر کی اُمید ضرور کرتے ہیں کہ موجودہ حالت میں ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو لیگ کے قائم ہونے سے خاص تقویت ہوگی اور بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ علاوہ بریں یہ بھی غالب ہے کہ لیگ کے ذریعہ سے اہل اسلام واہل ہنود پالیٹکس کے دنگل سے باہر نکل کر ان متفقہ اغراض ومقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو سکیں گے اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکیں گی۔ بلاشبہہ یہ کام مشکل ہے اور بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اگر ہم اپنی دُھن کے پکے ہیں، اگر ہمارے ارادوں وعقائد میں استقلال موجود ہے، اگر ہم ایثار نفس کے لیے تیار ہیں تو کچھ شبہہ نہیں کہ ہمکو کامیابی ہوگی اور ہمارا صوبہ تعلیمی معاملات میں سب سے پیچھے نہیں رہے گا۔

مذکورۂ بالا تحریر چند نہایت ممتاز ہندو مسلمانوں کے دستخطوں سے شائع کیگئی تھی اور ۲۰ اگست انعقاد جلسۂ لیگ کی تاریخ قرار پائی تھی۔ اس جلسہ کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ نہایت حوصلہ افزا اور اُمید دلانیوالی ہے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ اس میں موجود تھے۔ پہلا رزولیوشن ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے پیش کیا اور دیگر صاحبوں نے اُسکی تائید کی۔ رزولیوشن حسب ذیل تھا۔

یہ جلسہ عوام الناس کے لیے ابتدائی تعلیم کو نہایت ضروری ولازمی سمجھتا ہے اور طے کرتا ہے کہ ان صوبجات کے لیے ایک ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ قائم کیجائے جس کے اغراض یہ ہوں۔ (۱) ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرنا

جہاں مدرسے نہوں وہاں نئے مدرسے قائم کرانا جن میں تعلیم جہاں تک ممکن ہو مفت دیجائے اور جو مدرسے ردی حالت میں ہوں انکی حالت سنبھالنا (۲) لازمی اور مفت تعلیم کے مسئلہ پر بذریعہ لکچر و مضامین و کانفرنس وغیرہ لوگوں کو توجہ دلانا (۳) مفت و لازمی تعلیم کے مسئلہ پر گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرانا۔

دوسرا رزولیوشن لیگ کے ممبروں اور انتظامی کمیٹی و عہدہ داروں کے انتخاب کے باب میں تھا۔ قریب سو اصحاب شریک لیگ ہوے ہیں، جن میں الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، بنارس، فیض آباد، بریلی، گورکھپور، علیگڈھ، اور دیگر اضلاع کے حضرات شامل ہیں۔ آنریبل پنڈت موتی لال نہرو صاحب لیگ کے پریسیڈنٹ منتخب ہوے ہیں، اور آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے سی آئی ای ائس پریسیڈنٹ۔ علاوہ آپ کے آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت بشن نرائن در، راے بہادر بابو گنگا پرشاد ورما، اور ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی صاحب بھی وائس پریسیڈنٹ منتخب کیے گئے ہیں، اور لیگ کے سکرٹری پنڈت ہردے ناتھ کنزرو قرار پائے ہیں۔

لیگ کی ممبری کی درخواست اور چندہ اور دیگر خط و کتابت بنام آنریری سکرٹری الیمنٹری ایجوکیشن لیگ ملا بنک روڈ، الہ آباد آنی چاہیے۔

مذکورۂ بالا تحریر سے ظاہر ہو کہ جو اصول لیگ نے ظاہر کیے ہیں، ان میں صاف طور پر اس بات کی خواہش کی گئی ہو کہ ہندو مسلمان، دونوں قومیں، مل کر اس باب میں کوشش کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے میں متفقہ کوشش سے کام لیں۔ یہ ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کی پہلی منزل ہو۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نے ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کا جو مسودہ کونسل میں پیش کیا تھا، اگرچہ وہ نامنظور کر دیا گیا، مگر آیندہ وہ وقت بھی ضرور آے گا جس میں مسودۂ مذکور دوبارہ پیش ہو کر پوری قوت کے ساتھ پاس ہوگا۔ اُس وقت سے پہلے اہل ملک کا فرض ہو کہ وہ اپنے دست و بازو پر بھروسا کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر صوبہ میں متفقہ کوشش سے کثیر التعداد اسکول کھولیں، اور جن امور میں انکے درمیان اختلاف راے ہو اُسکا فیصلہ آپس میں کر کے اس عمدہ تحریک کو ترقی دیں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ اس میدان میں دوش بدوش رہکر چلنے کے لیے تیار ہیں، اور ایک دوسرے کے حقوق کی عزت کرتے ہیں۔

---

## دیسی زبانوں سے ہماری غفلت

اگر ہماری تعلیمی درسگاہوں میں تہذیب و تربیت کے حصول کا ذریعہ دیسی زبانیں قرار دی جائیں تو یہ فعل سب سے زیادہ فائدہ رساں، معقول اور اقتضاے فطرت کے موافق ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہو کہ ہم ان زبانوں کو پسند نہیں کرتے، اور یہ غلط اندازہ ہمارے ذہن نشین ہو گیا ہو کہ اگر ہونہار طلباء کی تعلیم میں دیسی زبانیں استعمال کیجائیں گی تو نہایت کمتر نتائج پیدا ہوں گے۔ فی الحقیقت ہندوستانی طلباء کی قسمت بہت ہی زبوں ہو، اور غضب یہ ہو کہ اسے زبوں تر بنانے کی کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہو۔ ہندوستان کے تعلیم یافتوں کی اوسط عمر ماہرین فن کے تخمینہ کے بموجب ۲۵ سال سے زیادہ نہیں ہو۔ اسپر بھی اس چند روزہ زندگی کا بیشتر حصہ ایک نہایت مشکل اجنبی زبان، انگریزی، کی تحصیل و تکمیل میں صرف ہو جاتا ہو۔ طلباء کی تمام اعلیٰ قوتیں انگریزی کے ہجا، صرف و نحو اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف ہو جاتی ہیں، جن میں سے اول الذکر دونوں محض خیالی اور نہایت عسیر الحصول ہیں، اور موخر الذکر بھی موجب پریشانی ہو۔ ہندوستانی طلباء کو صرف انگریزی میں کمال حاصل کرنے کے لیے اپنے گراں قدر ایام عمر میں سے بارہ سال کا زمانہ درکار ہوتا ہو، اور اس طرح سائنس وغیرہ کی نہایت ضروری نظری و عملی شاخوں کے مطالعہ کے لیے جو وقت باقی رہتا ہو وہ بہت ہی ناکافی ہوتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ دیسی زبانوں کے ادبیات اور علوم و فنون کے حصول کا کسی کو خیال ہی نہیں رہتا۔

"ویدک میگزین" کا یہ خیال بالکل صحیح ہو کہ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیاں انگریزی زبان سے محبت کے باب میں لارڈ میکالے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ لارڈ موصوف کو ہندوستانی ادبیات اور علوم و فنون سے بالکل محبت نہ تھی اور

علی ہذا القیاس ان یونیورسٹیوں کو بھی صرف انگریزی سے محبت ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہ غلط خیال ہے جو ہماری بدقسمتی سے ان لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوگیا ہے کہ ہندوستانی طلبا صرف انگریزی پڑھنے کے لیے پیدا ہوے ہیں، اور انکی زندگی کا منتہاے خیال محض تعلیم انگریزی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ ہر سال انگریزی کے بڑے بڑے مشکل نصاب مقرر کرتی ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ روز بروز اس بوجھ کو اور بھی دونی کرنے کی فکر انھیں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ ہر سال وہ اس قدر کتابیں منظور کرتی ہیں اور اتنے زائد از ضرورت مضامین مقرر کرتی ہیں جو ایک سال کی میعاد کے لحاظ سے نہ صرف نامناسب ہی ہیں بلکہ طلبا کی پریشانی کی موجب ہیں اور اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ طلبا کی استعداد میں ترقی مسدود ہوتی جاتی ہے لیکن اسپر بھی انھیں اصرار ہے کہ انگریزی کے ناگوار اور تکلیف دہ نصاب میں چند اور کتابوں کا اضافہ طلبا کے لیے اچھے نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوگا ۔ یہ اُمید کس قدر غلط اور خلافِ واقع ہے!

لیکن ہمیں اس امر کے فوائد و نقصانات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ ہم اس بارگراں کو کس طرح ہلکا کر سکتے ہیں، اور ہمارے سابقہ علوم و فنون میں سے کون سا قابلِ حفاظت سرمایہ ہے جس کی حفاظت کرنے پر اب ہم بھی قادر ہیں۔ بقول ہمعصر وکیل اگر اس مہلک مرض کا دفعیہ مقصود ہے تو ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی دیسی زبانوں میں تعلیم دینا ضروری ہے، اور اسکے ساتھ ہی کارآمد انگریزی علوم بھی انھیں اس قدر پڑھانا چاہیے جو علمی اور صحیح طریقوں سے چند مہینوں میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یہ کام اس طریق سے فوراً شروع کر دینا چاہیے کہ ہم دیسی زبانوں سے پھر ایسا ہی فائدہ اُٹھانا شروع کر دیں جیسا کہ ان سے اٹھانا چاہیے۔ ہمیں اپنے اسکولوں میں، کالجوں میں، غرض کہ ہر حالت میں انھیں عزت کی جگہ دینا چاہیے۔ اور سب سے پہلے ہائی اسکولوں میں انھیں ذریعۂ تعلیم مقرر کرنا چاہیے۔ اگر ہم سے ہو سکے تو یہ کام ایسا ہے جو بغیر کسی توقف کے انجام پا سکتا ہے انٹرنس کا نصاب اس وقت بھی دیسی زبانوں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ ایف۔ اے کا نصاب ایک ہی سال میں دیسی زبانوں میں تیار ہو سکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو بی۔ اے۔ کا کورس بھی زیادہ سے زیادہ دو سال تک تیار ہو سکتا ہے۔ صرف مستقل ارادہ اور اپنی دیسی زبانوں کی بھی محبت درکار ہے۔

ہماری رائے میں اُردو زبان کی روز افزوں ترقی اور ہر دلعزیزی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اسکے ذریعہ سے ہر قسم کے کورس تیار کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں علمی مصطلحات کی کمی بے شک ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے لیکن اس رکاوٹ کو بہت جلد رفع کیا جا سکتا ہے۔ انجمن ترقی اُردو اپنے مقاصد کے لحاظ سے اصطلاحات کا لغت تیار کر سکتی ہے اور اُس لغت سے انگریزی اور دوسری زبانوں کے علوم و فنون اور نصاب تعلیم کی کتابوں کے تراجم اُردو زبانوں میں شائع کیے جا سکتے ہیں اس سے جو فوائد عظیم ملک کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کو حاصل ہوں گے انکو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ناممکن ہے۔

---

## رسالہ اَدیب الہ آباد

الہ آباد کا نامور رسالہ اَدیب، جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے دنیاے ادب میں چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا تھا اور جس کے علمی لٹریری کارنامے مدت تک ارباب ذوق نہیں بھول سکتے، افسوس ہے کہ جولائی ۱۹۱۳ء سے بند ہوگیا اور تشنہ کامانِ ادب کو اپنی یاد میں نوحہ کش حسرت چھوڑ گیا۔ اسکے بند ہو جانے کا افسوس تو تمام ہی خواہانِ اُردو کو ہے، لیکن جو صدمہ ہم کو یا حضرت نظر لکھنوی کو محسوس ہو سکتا ہے، وہ اور ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اُردو میں ہم اَدیب ہی پہلا رسالہ تھا جو یورپ اور مصر و قسطنطنیہ کے زرین رسائل کے مقابلے میں فخریہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اُسنے ظاہر کر دیا تھا کہ نفاست طبع اور مذاقِ سلیم کا احساس ابھی ہندوستان کے افراد سے مفقود نہیں ہوا ہے۔ اس گلشنِ ادب کی آبیاری کا فخر اولیں جنابِ نظر کو حاصل رہا۔ موصوف نے ایک برس چار ماہ اُسکو ایڈٹ کیا۔ انکے بعد ہم ایک برس آٹھ ماہ تک اپنی امکانی کوشش سے اُسکی خدمت کرتے رہے۔ ہمارے بعد میر حسین چھ ماہ اَدیب کی خدمتگزاری اور اپنے فرائض ایڈیٹری کی ادائی میں مصروف رہے، لیکن افسوس ہے کہ اس

تیسرے دور کا مستقبل جس قدر شاندار بتایا گیا تھا اُسی قدر نصب العین ثابت ہوا۔

ادیب کو دیگر اُردو رسائل کی طرح عام ناقدردانی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی بلکہ پبلک نے جس فراخ دلی سے ادیب کی قدر افزائی فرمائی اُتنی کسی دوسرے رسالہ کو مشکل سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارے زمانہ میں وہ پندرہ سو چھپتا تھا اور تقریباً تیرہ سو اُسکے خریدار تھے۔ ہمعصر ہند (لاہور) کا یہ قیاس بالکل خلاف واقع ہے کہ "ادیب کو مالی مشکلات یا خسارہ نے اس ناخوشگوار انجام کے لئے تیار کر دیا" اور یہ الزام بھی ہمعصر موصوف کا نہایت بیجا اور غلط ہے کہ "ملک کے بہترین رسالے اُردو داں پبلک کی لٹریری بدمذاقی اور ناقدردانی کے سبب بموت مر رہے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ بھی کچھ بہت اطمینان بخش حالت میں نہیں ہیں ..... الخ۔" اس کے بند ہو جانے کا سبب اُردو پبلک کی ناقدردانی اور بدمذاقی ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ اسباب اور ہی ہیں، جن کا اظہار یہاں کچھ بے ضرورت اور غیر مفید معلوم ہوتا ہے۔

ہمعصر ہند نے یہ بھی لکھا ہے کہ ادیب نے ساڑھے سات سال اُردو کی خدمت انجام دیں۔ خوب! ادیب کے بند ہو جانے سے زیادہ ہمیں ایسے اخبار نویس حضرات پر افسوس آتا ہے جن کے معلومات اس قدر کوتاہ اور خیالات اس قدر پست ہیں کہ وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات تو کجا ایک معمولی واقعہ کے متعلق بھی صحیح معلومات بہم نہیں پہنچا سکتے۔

یادش بخیر ادیب پر دو آنسو بہاتے ہوئے ہمعصر "آگرہ اخبار" نے العصر کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن نامبارک الفاظ میں اور بُری پیشین گوئی کے ساتھ۔ ہم اسکو بھی غنیمت سمجھتے ہیں ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

لیکن ہم صرف اس قدر التماس کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ بھی ہند کی طرح رائے قائم کرنے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیا کریں، اور قیاسی شبدیز کی جولانی دکھاتے ہوئے مستقبل کے واقعات کو حال یا گزشتہ سے مشابہ نہ مان لیا کریں۔ ممکن ہے کہ خاکم بدہن، العصر کا بھی وہی حشر ہو جو ادیب کا ہوا، مگر ایسی پیشین گوئی بدشگونی میں داخل ہے، اور جب ہی خواہان اُردو العصر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اُنکو ایسے الفاظ سے ہمارا حوصلہ پست نہ کرنا چاہیے، بلکہ اُنکا فرض ہے کہ اب پہلے سے زیادہ خود کوشش کریں اور ہمارا حوصلہ بڑھائیں تاکہ العصر پورے طور پر ادیب کا قائم مقام ہو سکے۔ گو ہمارے خیالات کی جولان گاہ اُس سے بھی بہت وسیع ہے۔

---

## مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بالقابہم

دولت کے ساتھ علم و لیاقت اور اقبال و حشم کے ساتھ سادہ مزاجی بہت مشکل سے جمع ہو سکتی ہیں، اور جس میں جمع ہو جائیں حقیقتاً وہ ذات نہایت قابل قدر اور مغتنم زمانہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد بالقابہم میں یہ سب باتیں موجود ہیں۔ پبلک موصوف کو صرف اسی حیثیت سے نہیں جانتی کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد کے سابق وزیر اعظم اور اب پیشکار ہیں۔ بلکہ علمی طبقوں میں اُنکا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ فن شاعری میں آپ کی قوت تخیلیہ زمانہ کو اپنے جوہر دکھا چکی ہے۔ آپکا لٹریری مذاق نہایت ستھرا ہے۔ اردو و فارسی کے علاوہ انگریزی اور عربی میں بھی اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اردو زبان میں آپ کی کئی نادر تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، اور آپ کا کلام جس سے ناظرین العصر بھی بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں، حسن تخیل کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ فن ناول نویسی میں بھی کافی مہارت ہے چنانچہ فسانۂ شیدا کے نام سے ایک ناول شائع ہو چکا ہے جس کی زبان نہایت پاکیزہ ہے۔ مزاج میں صوفیت اور سادگی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، جو باکمالی اور حقیقی دولت مندی و غنا کی سچی علامت ہے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں آپ بلا تفریق مذہب پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ آپکی علم دوستی اور روشن خیالی اور بے نیازی تعارف و تعریف کی محتاج نہیں رہی۔ ملک کی خوش نصیبی سے حال میں آپ کے ایک طولانی سفر اور سفر میں جود و کرم اور حق شناسی نے ثابت کر دیا کہ ہماری وہ ثنا جو اس تحریر کا حصۂ زریں سمجھی جا سکتی ہے، محض خوشامد یا ذاتی اغراض پر مبنی نہیں ہے۔ پنجاب میں آپ نے رفاہِ عام کے لیے بہت کچھ مالی امداد فرمائی، اور جابجا ہندو مسلمانوں کو برابر تقسیم زر و دولت



ڈاکٹر راش بہاري گھوش ۔ سي ايس آئي ۔ سي آئي اي --

سے سرفراز فرمایا۔ دفتر اہل حدیث (امرت سر) میں بذاتِ خاص تشریف لے جاکر اُسے عزت بخشی۔ الہ آباد میں "عشرت منزل" کی نیچے قدوم میمنت لزوم سے عزت افزائی فرمائی اور بھی بہت سی مخلوق کو فائدہ پہنچایا۔ جس کی آپ کی ذات سے بجا طور پر امید کی جا سکتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں اس وضع اور خیال کے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ ملک نہایت خوش نصیب ہے جہاں آپ ایسے محترم افراد کا وجود پایا جائے، اور وہ لوگ نہایت بلند اختر ہیں جن پر آپ ایسے عظیم الشان اور عظیم القدر بزرگوں کا سایہ ہو۔ ہماری دلی دعا ہے کہ یہ سفر آپ کی ذات اور رعایا دونوں کے لیے مبارک و مسعود ثابت ہو!

---

## ڈاکٹر گھوش کا گرانمایہ عطیہ

ہندوستان میں تعلیم سائنس کا ایسا معقول انتظام نہیں ہے جیسا ممالک یورپ و امریکہ میں ہے۔ ڈاکٹر بوس کے سوا ہندوستان نے کوئی اور ایسا ماہر سائنس پیدا نہیں کیا جس کی شہرت کا ہنگامہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا ہو۔ وہ ایجادات جن کی بدولت طرح طرح کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں؛ جن کے ذریعے سے ہماری زندگی کی ضروریات جلد اور ارزاں مہیا ہو سکتی ہیں؛ جنکی وجہ سے ہمارے کاروبار میں بہت آسانی اور سہولت پیدا ہوتی ہے؛ جو ہماری بہت سی تکلیفات اور دقتوں کو رفع کرنے کا باعث ہوتی ہیں، انکا خیال کچھ امریکہ اور یورپ والوں ہی کے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے جن سے بعد کو ساری دنیا فیضیاب ہوتی ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جسے ماہرین سائنس نے اپنے قابو میں نہیں کر لیا۔ وہ طاقتیں جو کسی زمانہ میں معبود قرار پائی تھیں اور جن کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کی قربانیاں کیجاتی تھیں وہی آج ہمارے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور بلا چون و چرا ہمارے احکام بجا لاتی ہیں۔ اسکی وجہ جانتے ہو؟ ذرا دنیا کے سب سے بڑے زندہ جادوگر (ایڈیسن) کو دیکھو کہ وہ کیونکر اپنی ایجادات سے دنیا کو محوِ حیرت بنا رہا ہے۔ یہ سب سائنس کی برکت سے ہے جن ممالک میں سائنس کا دور دورہ ہے وہیں صنعت و حرفت کی ترقی ہوتی ہے۔ سائنس ایک ایسی "دیوی" ہے جو ایک بڑی قربانی کے بغیر خوش نہیں ہوتی جب تک آدمی اُسی کا ہو کر نہ رہے اور اُسکے لیے سب کچھ قربان نہ کر دے، اُسوقت تک وہ کوئی "وَر" نہیں دیتی۔ کاش ہندوستان میں بھی اس دیوی کے اُپاسک (عبادت گزار) پیدا ہوں۔

ہمارے یہاں کیوں ماہر سائنس پیدا نہیں ہوتے؟ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں وہ سامان اور ذرائع موجود نہیں ہیں۔ نہ تو یہاں اُس قسم کی اعلےٰ درس گاہیں پائی جاتی ہیں۔ اور نہ ویسے قابل اور فخرِ روزگار اُستاد میسر ہو سکتے ہیں۔ افلاس اور فلاکت کی وجہ سے ہمارے ملکی نوجوانوں کو ڈگری لینے کے بعد ہی فکر معاش دامن گیر ہو جاتی ہے، اور یوں انکی علمی ترقی جاری نہیں رہتی۔ یہاں ہونہار طلبا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بہت کم وظائف ملتے ہیں یعنی ایسی معقول امداد نہیں دی جاتی جس سے انھیں علمی مشاغل میں اپنی زندگی صرف کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اکتساب علم کا وہ شوق ابھی پیدا نہیں ہوا جو شائستہ ممالک میں نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہاں بھی تعلیم سائنس کے لیے اعلیٰ درس گاہیں قائم کیجائیں تو بلا شبہ ہمارے یہاں بھی یہ شوق پیدا ہو سکتا ہے۔

ہمیں ہندوستان کے مشہور وکیل اور بنگال کے نامور لیڈر، ڈاکٹر راش بہاری گھوش، کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے جنھوں نے حال ہی میں دس لاکھ کا گرانمایہ عطیہ کلکتہ یونیورسٹی کو اس غرض سے نذر کیا ہے کہ اس سے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم سائنس کی اشاعت کیجائے۔ سر تارک ناتھ پالت نے بھی، کچھ عرصہ ہوا، اسی غرض سے ایک بڑی رقم کلکتہ یونیورسٹی کے سپرد کی تھی۔ ڈاکٹر راش بہاری گھوش، نے چند شرائط بھی قرار دی ہیں جنمیں قابل ذکر یہ ہیں:-

۱- مضامین ذیل کی تعلیم دینے کی غرض سے چار یونیورسٹی پروفیسرشپ قائم کی جائیں۔

(۱) اعلیٰ علم ریاضی

(۲) فزکس یعنی علم طبعیات

(۳) علم کیمیا

(۴) علم نباتات (خصوصاً شعبۂ زراعت سے متعلق)

۲ - پروفیسر ہمیشہ ہندوستانی اصحاب مقرر کیے جائیں

۳ - ہر پروفیسر کو چھ ہزار روپیہ سالانہ کے قریب مشاہرہ دیا جائے لیکن سینٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ یونیورسٹی یا کسی دوسرے سرمایہ سے اس مشاہرہ میں وقتاً فوقتاً اضافہ کرے۔

۴ - ان پروفیسروں کی نامزدگی ایک بورڈ کے متعلق ہوگی لیکن تقرر سینٹ کے اختیار میں ہوگا۔ سینٹ کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ کسی پروفیسر کو کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ دو سال کے لیے خاص تجربہ یا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ، امریکہ، یا جاپان جانے کی ہدایت کرے۔ اس صورت میں پروفیسر مذکور کو خاص وظیفہ دیا جائیگا۔

۵ - ہر پروفیسر کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے خاص مضمون میں نئی تحقیقات کرنے میں مصروف رہے اور طلباء میں بھی اس قسم کا شوق پیدا کرے اور اس باب میں اُنھیں ہدایت دے۔

۶ - آٹھ وظائف قائم کیے جائیں اور ہر ایک وظیفہ تو سو روپے کا ہو۔ بورڈ کی سفارش پر یہ وظیفے ایسے ہونہار گریجوایٹوں کو دیے جائیں جنھوں نے علم ادب یا سائنس میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی ہو۔ ہر پروفیسر دو طالبعلموں کی نگرانی اپنے ذمہ لے۔ ایسے طالب علم کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنا تمام وقت کسی خاص شعبۂ علم کی تازہ تحقیقات میں صرف کرے۔

۷ - بورڈ کی سفارش پر سینٹ لیبوریٹری، عجائب خانہ، اور دیگر ضروری آلات و سامان کا انتظام کریگی۔

۸ - حسب ذیل اصحاب بورڈ کے ممبر ہوں گے:-

(۱) کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر

(۲) ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم

(۳) یونیورسٹی کے فیکلٹی آف سائنس کے ڈین

(۴) انجینرنگ فیکلٹی کے ڈین

(۵) وہ چار پروفیسر جنکے تقرر کا ذکر اوپر ہو چکا ہے

(۶) یونیورسٹی کے ایسے چار ممبر جنکو سینٹ نامزد کرے گی

(۷) اس فنڈ کے قائم کرنیوالے کی طرف سے تین ممبر نامزد ہونگے۔ یعنے (۱) سر آسوتوش مکرجی (۲) پروفیسر رائے (۳) بابو مہندرو ناتھ رائے۔ ان تین ممبروں کو اپنے جانشین مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہوگا اور یہی اختیار اُن کے جانشینوں کو بھی حاصل رہے گا۔

یہ ہے اُس اسکیم کی مختصر کیفیت جو ڈاکٹر گھوش نے تیار فرمائی ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدا اُنھیں تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔ تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا کوئی علمی نتیجہ دیکھ سکیں۔

# العصر

ہر ماہ کے اخیر میں دفتر العصر، لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے

قسم اول: سالانہ للعہ - ششماہی ؎ - فی پرچہ ۷ ر

قسم دوم: سالانہ ستہ - ششماہی عہ - فی پرچہ ۵ ر

ممالک غیر سے عہ اور عہ سالانہ علی الترتیب -

(یہ شرح صرف عوام کے لیے ہے - خواص بنظر ہمدردی جو کچھ عنایت فرمائیں)

چندہ بہ پیشگی ارسال کیا جائے، مابعد کا حساب نہیں -

نمونہ کے لیے مقررہ قیمت بھیجنا چاہیے - مفت ارسال نہ ہوگا -

خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے -

جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا نصف آنہ کا ٹکٹ آنا چاہیے -

## قلمی معاونین سے التماس

العصر کے قلمی معاونین حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ

(۱) کاغذ کے صرف ایک جانب لکھیں -

(۲) مضامین صاف تحریر فرمائیں کہ پڑھنے میں دقت نہ ہو -

(۳) مضمون تحریر فرماتے وقت نصف صفحہ سے کچھ کم حاشیہ چھوڑ دیا کریں -

(۴) جو مضامین معاوضہ کی غرض سے ارسال کیے جائیں اُنکے متعلق صاف طور پر اطلاع دینا چاہیے، ورنہ بعد اندراج معاوضہ کے متعلق گفتگو کرنا فضول ہوگا -

(۵) جس مضمون کے ساتھ تصویر وغیرہ کی ضرورت ہو، اُسکا خود انتظام فرمائیں -

(۶) معاوضہ صرف اعلیٰ علمی و ادبی مضامین کیلیے دیا جائیگا - اسمیں بھی اوریجنل مضامین کی تخصیص ہے

اگر سب حضرات ان ہدایات کو ملحوظ رکھیں تو ایڈیٹر کا بہت سا وقت جو رائگاں جاتا ہے بچ جایا کریگا -

جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیے

**پیارے لال شاکر (میرٹھی) مالک و ایڈیٹر رسالہ العصر، لکھنؤ**

---

## العصر جلد اول

جس میں ساٹھ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاسی مضامین نظم و نثر درج ہیں، اور تیس نادر و نایاب تصاویر شامل ہیں - حجم علاوہ تصاویر پونے تین سو صفحات - بہت کم جلدیں باقی ہیں - جلد طلب فرمائیے، ورنہ پھر یہ علمی ذخیرہ کسی قیمت پر نہ مل سکے گا - قیمت مع محصول صرف عہ - (دو روپیہ)

قسم دوم کی بھی کچھ مکمل جلدیں موجود ہیں - قیمت مع محصول ایک روپیہ چار آنہ

جلد اول کے مختلف پرچے بحساب ۶ ر و ۴ ر فی نمبر مل سکتے ہیں - ہر پرچہ بجائے خود مکمل ہے -

**المشتہر: منیجر العصر - لکھنؤ**

---

## نوشتۂ تقدیر

آپ ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور تاریخ پیدائش یا پوسٹ کارڈ لکھنے کی تاریخ اور وقت لکھ کر بھیج دیجیے - ہم آپ کو آیندہ بارہ مہینے کے پیش آنے والے حالات و واقعات، یعنی خوشی و غم، کس ماہ میں کس تجارت سے نفع ہوگا، روزگار کے متعلق ترقی، تبدیلی، موقوفی، علالت، کیا اولاد ہوگی، وغیرہ جملہ باتوں کا خلاصہ عہ میں بذریعہ ویلیو پی ایبل ارسال کر دیں گے - نا مطابق ہونے پر قیمت بلا عذر واپس ہوگی -

اگر امتحان منظور ہو تو صرف ۲ ر کے ٹکٹ ڈاک کے ارسال کر دیجیے - ہم آپ کو آپکی گذشتہ زندگی کے خاص تین واقعات لکھکر بھیجدینگے - اس سے ہمارے اشتہار کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی - جنم پترا وغیرہ بھی تیار کیا جاتا ہے -

**المشتہر: (مسٹر) ایف - ای - میرل، وکٹوریہ گنج - لکھنؤ**

---

## منروا پبلشنگ کمپنی لکھنؤ

کی معرفت ہر قسم کی کتب کے طبع و اشاعت کا انتظام نہایت عمدگی سے ہو سکتا ہے - رنگین اور ہاف ٹون بلاک بھی ہم پہنچاتے جاتے ہیں - خط و کتابت بنام سکرٹری ہونا چاہیے -

باہتمام بابو منوہر لال بھارگوی ایڈ نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوا

جلد ۲ نمبر ۳ | ادب اردو کا ماہوار باتصویر رسالہ | اکتوبر ۱۹۱۳ء

# العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

تصاویر:- (۱) جان لیوا بہار (رنگین) (۲) نواب فصیح الملک داغ دہلوی (۳) رائٹ آنریبل سید امیر علی (۴) ہز ہائنس سر آغا خان

## فہرست مضامین




شاکر (میرٹھی) نے دفتر العصر لکھنؤ سے شائع کیا

قیمت سالانہ للعہ | [illegible] فی

# کیمیا گری

در اصل کامل صحت کا دوسرا نام ہے

کیونکہ صحت ہی کامیابی۔ طاقت اور دولت کی بنیاد ہے۔ اور صحت کے قیام کے لیئے رسائن دوائیں سب سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہو چکی ہیں۔ جسطرح اکسیر لوہے کو سونا بنا دیتی ہے۔ ویسے ہی رسائن دوائیں جسم انسانی کے تمام ظاہری اور باطنی نقائص کو دور کرکے جسم کو مضبوط بناتی۔ عمر کو بڑھاتی۔ دماغ کو طاقت بخشتی اور جملہ اعضائے بدن کی حفاظت کرتی ہیں۔ ان میں سے بھی

## منوہر رسائن

تمام رسائن دواؤں کی سرتاج تسلیم کی گئی ہے

کیونکہ یہ معدہ کی خرابی کیلئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے جو تمام بیماریوں کی جڑ ہے
کیونکہ یہ بگڑے ہوئے خون کو صاف کرتی اور صاف خون پیدا کرتی ہے
کیونکہ یہ ضعف دل۔ اختلاج القلب افسردہ دلی۔ پژمردگی اور پریشانی کو دور کرکے حوصلہ اور ہمت بڑھاتی اور دل کو فرحت بخشتی ہے
کیونکہ اسکے استعمال سے ضعف دماغ۔ نسیان۔ کند ذہنی۔ درد سر دائمی اور دوران سر کی شکایات بالکل دور ہو جاتی ہیں۔ اور قوت حافظہ و ذہن بڑھکر مطالعہ کتب اور دماغی کاموں میں بڑی مدد ملتی ہے۔
کیونکہ سالوں کا بگڑا ہوا نظام اسکے استعمال سے چند ہی ہفتوں میں مفید ہو جاتا ہے
کیونکہ اس کے متواتر استعمال سے رقت۔ سرعت۔ احتلام اور جریان کی شکایات بھی رفع ہو جاتی ہیں۔ جو مردانہ اجسام کو گھن کے کیڑے کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا بنا دیتی ہیں۔
کیونکہ اس کے استعمال سے دودھ۔ گھی اور مکھن وغیرہ اشیاء بسہولت ہضم ہو جاتی ہیں۔

قیمت فی پیکٹ (۲۰ گولی) صرف اڑھائی روپے (۲/۸) ہے

مسٹر پیارے لال صاحب شاکر ایڈیٹر رسالہ العصر لکھنؤ فرماتے ہیں
"منوہر رسائن" کو میں نے استعمال کیا۔ اس سے مجھے بے حد فائدہ ہوا دماغی کام کرنیوالوں کیلئے میں منوہر رسائن کو بہت مفید چیز سمجھتا ہوں۔

ملنے کا پتہ

ویدراج سری رام لال منیجنگ ڈائرکٹر آیورویدک فارمیسیوٹیکل کمپنی لمیٹڈ لاہور

## یہ کیا؟ اس کا نصف کالم کیوں خالی ہے؟

رہنے دیجیے اس میں کیا ہے۔

سبب ہم صرف یہ بتلانا چاہتے کہ بچوں سے ضعیف تک کے لیے ڈاکٹر ایس کے برمن کی ایجاد کی ہوئی چالیس سخت امراض کی ان ادویات کی پوری فہرست اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے۔

اسکے رکھنے سے سوائے نفع کے نقصان نہیں ہو سکتا۔

کیا ایک فہرست آپکی خدمت میں روانہ کر سکتا ہوں۔

ادویات ہر موضع ہر قصبہ و شہر میں مل سکتی ہیں۔

**ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ و ۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ**

## کیا آپ نے [illegible] کی توسیع اشاعت
## کے متعلق اپنا فرض ادا کیا؟

اگر نہیں تو اب جلد ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرمائیے۔ یاد رکھیئے توسیع اشاعت ہی پر رسالہ کی ترقی منحصر ہے۔ یہ میوچوال ہیلپ (باہمی امداد) ہے جب تک دو طاقتیں باہم نہ ملیں کوئی کام درستی کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا۔

ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں آپ اپنا فرض ادا کیجیئے!

# جناب صرف ایک تو مصالح اور ساری عمارت تیار

ناظرین والاشان ہم نے صرف کثیر سے آپ صاحبان کے آرام و حد درجہ کفایت شعاری کے لیے ایک قسم کی اعلیٰ درجہ کی سفیدی تیار کرائی ہے جسکو اگر آپ سوکھی پسوا کر رکھ بھی چھوڑیے تو خراب نہ ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ تک وہ خراب نہیں ہوتی - اس سفیدی میں تین گن ہیں - جو ہر عمارت کے تیار کرنے کے واسطے مصالح کی قسم سے سب سے اول ہر شخص کو درکار ہوتے ہیں یہ سفیدی ایسی طاقتور دیرپا ہے کہ اسکے اندر اگر آپ ۲ حصہ ریت کی سرخی خواہ راکھ - خواہ بھٹی کے چونے کے بھٹے کوئلے کا ریتہ - خواہ بجری - خواہ دریائی ریتا - خواہ پرانا کٹا ہوا چونا غرض جو آسانی سے مل سکے ملا لیں تو بڑی آرام سے یہ تیار ہو کر نہایت مضبوط خوبصورت پختہ اور دیرپا چنائی یا جوڑائی ہر عمارت کی کر سکتی ہے - دوم اگر اسکو خالص پانی میں گاڑھا گاڑھا گھول لیا جاوے تو بڑے مزے سے نہایت خوبصورت اور پائدار پلاسٹر کا کام ہر دیوار و زمین کی لپائی کا کر سکتے ہو - تیسرے اگر اسکو خالص پانی میں پتلی سفیدی بنائی جاوے تو ہر مکان و عمارت میں نہایت سفید یا رنگین صاف شفاف دیرپا سفیدی کرانے کا کام لیجیے - غرض یہ سفیدی ہر کام کے لیے اپنی نظیر آپ ہی ہے - چھوٹی سے لیکر بڑی سی بڑی عالیشان عمارت اس سفیدی سے باآرام اور نہایت کفایت کے ساتھ نہایت مضبوط و پختہ و خوبصورت تیار ہو جاتی ہے تمام سرکاری عمارات کے لیے نہایت شوق کے ساتھ یہ ہزاروں من استعمال کی جاتی ہے - آپ بھی ضرور اسی کو منگا کر کم از کم ایکمرتبہ اپنے مکانات کے بنوانے کے واسطے اسکا امتحان کیجیے - اگر کچھ شبہ ہو تو ۱۰ کے ٹکٹ خواہ منی آرڈر بھیجکر ہر سہ نمبر کی سفیدی کا نمونہ منگا لیجیے جو کہ مضبوط ٹین کے بکس میں حفاظت کے ساتھ پیک کر کے روانہ کی جاتی ہے - مگر اسکو وی پی سے روانہ نہ کیا جاوے گا -

قیمت مال نمبر ۱ جو اعلیٰ قسم کی خالص نہایت طاقتور اور لکڑی سے بجھی ہوئی ہوگی اور ہر ایک تیسرا حصہ عمارت میں کام میں لائی جا سکتی ہے فی من [illegible]

قیمت مال نمبر ۲ جو کوئلہ سے بجھی ہوئی ہوگی اور ہر طرح سے اعلیٰ خالص طاقتور ہوگی فی من [illegible]

قیمت مال نمبر ۳ جو باریک مگر نہایت عمدہ صاف کی ہوئی ہوگی چنائی کے کام کے واسطے نہایت عمدہ فی من [illegible] - ہماری اس سفیدی کا دیگر کوئی قسم کنکر یا پتھر کا چونا یا سفیدی ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتی ہے - ضروری اطلاع واضح رہے کہ ہر نمبر میں سے فی مرتبہ ایک ایک بوری کم سے کم جو تقریباً ۲½ من کی ہوتی ہے بھیجی جاوے گی دوسری واسطے اطمینان قبولیت مال ہر فرمایش کے ساتھ اول نقد روپیہ خواہ کم از کم چوتھائی قیمت وصول ہوئے بغیر مال ہرگز روانہ نہیں ہو سکتا ہے - دیگر اخراجات بوری باردانہ وغیرہ بذمہ خریدار ہوگا - اور ہر حالت میں خریدار کو ریل کا کرایہ دہلی سے دینا ہوگا - خواہ مال کے اسٹیشن سے بک ہو اپنے قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور تحریر فرما دیں - اور یہ ہدایت بھی ساتھ ہو کہ مال سواری گاڑی سے بھیجا جاوے یا مال گاڑی سے - نوٹ دوکانداران تھوک فروش کو خاص رعایت بشرطیکہ ایک ویگن سے کم مال کا آرڈر نہ ہو - ایک ویگن بوری منگانے سے ریلوے کرایہ میں بھی بہت تخفیف ہوتی ہے - جس نمبر کا جسقدر مال بھی جن صاحب کو درکار ہوگا روزانہ خواہ ہفتہ وار برابر روانہ کیا جا سکتا ہے - ہر جواب کے لیے ٹکٹ ضرور روانہ ہو ورنہ شکایت جواب معاف - ہمارا دیگر نوٹ - بیجروں کے نمبروں کا بھی کل اخبارات میں ملاحظہ فرما دیں تمام زبانوں کے معلومات - [illegible]

# ضرورت ہے

ایک معلمہ کی جو لڑکیوں کا تعلیمی کورس اُردو میں اچھی طرح پڑھا سکتی ہو - اہل زبان کو ترجیح دی جاوے گی - رہایش کے لیے مکان مفت - مشاہرہ ۳۰ ماہوار

المشتہر سکرٹری زنانہ اسکول نمبر ۱۳ یوروپین اسائلم لین ٹالکانہ مدرسہ کلکتہ

---

# اودھ ایجنسی لکھنؤ

آپ لکھنؤ کی جس قسم کی چیز چاہیں بلا تردد ہم سے طلب فرمائیں - ہم آدھ آنہ فی روپیہ کے کمیشن پر آپ کی فرمایش کی تکمیل کرینگے اور اپنے انتظام کے بھروسہ پر کہہ سکتے ہیں کہ انشاءاللہ تعالیٰ آپ کو وہ چیز براہ راست خریدنے پر بھی اسقدر کفایت سے نہ ملے گی جو ہم بھیجیں گے - ثبوت کے لیے اسکے سوا چارہ نہیں کہ ایکمرتبہ کوئی چیز منگوا کر ہماری خوش معاملگی کا امتحان فرمائیے -

المشتہر

صدیقی برادرس - مالک اودھ ایجنسی - محمود نگر - لکھنؤ

---

# کوکین نامہ

جسمیں اعلیٰ درجہ کا اخلاقی و سوشل نوٹ کھینچا گیا ہے - پڑھنے والے پر عجیب حالت طاری ہوتی ہے - کبھی تو کوکین خور کے کرتوتوں کے نقشہ پر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں کبھی عبرتناک سین دل پر رقت طاری کرتے ہیں - یہ معمولی رسالہ نہیں بلکہ بڑے بڑے ذی علم اصحاب کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہے - قیمت کچھ بھی نہیں صرف ایک آنہ علاوہ محصولڈاک

المشتہر

منشی عبدالخالق خلیق - لال چاہ گلی چابک سواران

# الحکما

## حکیم سقراط

**سقراط کا درجہ تاریخ میں** | تاریخِ عالم میں بالعموم اور قدیم تاریخِ یونان میں بالخصوص جو بلند مرتبہ سقراط کو حاصل ہے، وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ حکمائے یونان میں اس کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ لیکن اُس کی اس شہرت کا یہ سبب نہیں ہے کہ دیگر حکما کے مقابلہ میں اس کا دماغ زیادہ فلسفانہ تھا، یہ کہ اُس نے فلسفہ میں جدید مسائل دریافت کئے ہوں۔ اس کی شہرت کا صرف یہی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ اُس کی زندگی کے مطالعہ سے طالبِ حق کو ایک مفید سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ اُس کی زندگی نہایت خوبصورتی اور نرالی شان کے ساتھ ختم ہوتی ہے، اور کچھ شک نہیں کہ اُس کے حالات نہایت مفید اور سبق آموز ہیں۔

**ولادت اور ابتدائی حالات** | سقراط کا باپ سفرونسکس سنگتراش، اور ماں فینارٹی دایہ تھی۔ ۴۶۹ء قبل از مسیح میں سقراط کی ولادت ہوئی۔ والدین اگرچہ غریب تھے مگر اپنے لڑکے کو اُنھوں نے معمولی ابتدائی تعلیم دلائی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اپنا آبائی پیشہ سنگتراشی بھی سیکھا تھا۔ اس پیشہ میں اُس نے کچھ کمال حاصل کیا یا نہیں؟ یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس نے کچھ کمال حاصل نہیں کیا کیونکہ بہت جلد اُس نے یہ کام ترک کر دیا۔ دیوجانس نے ڈیمی میٹریس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایتھنس کا ایک متمول شخص (کریٹو) سقراط کی عادات سے اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے اُسے دوکان سے اُٹھا لیا اور اپنے خرچ سے تعلیم دلانے لگا۔ یہی کریٹو ایک وقت اپنے آوردہ کا باادب شاگرد بنا، اور اُسی غریب نوجوان سے عقل و حکمت کا سبق لینے لگا۔

سقراط کس کا شاگرد تھا؟ اس کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ عام مورخین اُسے اینکساغورس، اور پروٹاغورس اور پروڈکس کا شاگرد بتاتے ہیں مگر سقراط نے اپنی ایک تقریر "کورنی ویم" میں (جو زینوفن کی تصنیف ہے) بیان کیا ہے کہ کسی کی تعلیم سے استفادہ حاصل نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ سقراط گاہے گاہے مذکورہ بالا معلمین کے درسوں میں جایا کرتا ہو۔ اُس زمانہ میں طریقۂ تعلیم ایسا نہیں تھا جیسا زمانہ حال میں ہے بلکہ اُس وقت صرف زبانی لکچر اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ سقراط باقاعدہ طور پر کسی کا شاگرد نہیں ہوا اور یہ ناممکن بھی ہے کہ ایسا آزاد منش شخص کسی خاص اُستاد کا

سقلد ہوتا۔ ہاں، اس میں شک نہیں کہ فتلمت معلمین اور بالخصوص انکیساغورس کی تقریروں سے اُس نے فائدہ حاصل کیا۔

ابتدا میں سقراط کو طبعیات کا بہت شوق تھا۔ اس زمانہ میں طبعیات کی تحصیل ایسے غلط طریقہ پر ہوتی تھی کہ اس کے سمجھنے اور سیکھنے میں مابعد الطبعیات سے بھی زیادہ کھیڑا تھا۔ چونکہ وہ طبعیات زیادہ تر فلسفی تخیلات اور نظریات تھے، لہذا اس میں سقراط کا جی نہ لگا۔ متنفر ہو کر اس کو ترک کر دیا۔

باپ سے علیحدگی اور تعلیم و تلقین شروع کرنے کی درمیانی مدت کے واقعات بہت کم معلوم ہیں۔ مگر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آپ نے خیر سے شادی کی، اور جس بُردبار و خاموش خاتون کو آپ نے اپنی زوجیت میں قبول کیا وہ زینطپی تھی جس کی بدمزاجی اور بدزبانی ضرب المثل ہے۔ اس سے سقراط کے دو بچے پیدا ہوئے۔ سقراط نے نہایت خوش مزاجی اور تحمل کے ساتھ اپنی بیگم صاحبہ کے غصہ کو برداشت کیا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی بیوی کے متعلق تمسخر آمیز لہجہ میں کہا کہ

> جو لوگ شہسواری میں طاق ہونا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر بدگھوڑے کو اپنی سواری کے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ جب وہ قابو میں ہو جاتے ہیں تو پھر سب گھوڑے قابو میں ہو سکیں گے چونکہ میں آدمیوں کے ساتھ رہنا اور اُن سے معاملہ رکھنا چاہتا ہوں اس لئے میں نے اس عورت سے نکاح کیا ہے کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر اس سے میری نبھ گئی تو سب سے نبھ جائے گی۔

زینطپی کو خواہ کتنا ہی بدمزاج کیوں نہ کہا جائے، مگر ہمیں اُس نیک بی بی سے ہمدردی ہے۔ خاوند کے اطوار تو یہ کہ گھر کی مطلق خبر نہیں کہ آیا بیوی کے پاس کپڑا اور بچوں کے لئے ٹکڑا ہے کہ نہیں۔ تمام دن شہر میں مارے مارے پھرنا اور سب سے لڑائی مول لینا آپ کا شیوہ۔ آپ سب کے سامنے یہ تقریر کرتے تھے کہ "ہم اور تم سب احمق ہیں، اگر اس میں کچھ شک ہو تو آؤ بحث کر لیں!" طبیعت میں استغنا اس قدر کہ اگر شاگرد کچھ نذر کرتے تو آپ کو اس کے قبول کرنے میں انکار، ایسی حالت میں ایک صاحب لا ولد بی بی خواہ وہ فرشتہ ہی کیوں نہ ہو، کیا وجہ ہے کہ بدمزاج نہ ہو جائے، پھر زبان اور تیز مزاج تو وہ پہلے ہی تھی، اُس پر سقراط کا یہ حسنِ سلوک! اگر اُس نے کبھی سقراط کو اُس کے دوستوں کے سامنے دھمکایا اور طیش میں آکر برتنوں کا دھوون اُس پر پھینک دیا تو کون تعجب کی بات ہے۔ رہا سقراط کا تحمل اور اُس کی خوش مزاجی؛ اس کی کیفیت زینطپی سے دریافت کرنا چاہئے کہ اُسے سقراط کی لطیفہ گوئی اور تحمل پر کس قدر غصہ آتا ہوگا۔

تعلیم و تلقین کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے سقراط جنگ اسپارٹا اور ایتھنس کی تین لڑائیوں میں بھی شریک رہا اور لڑائی میں دادِ شجاعت دی۔ پہلی لڑائی میں بہادری کا انعام بھی اُس کو ملا مگر یہ اُس نے اپنے دوست ایلسی بائیڈیز کو دلادیا کہ اُس کا حوصلہ بڑھے۔ میدانِ جنگ میں سقراط کی کیا حالت تھی؟ اس کے متعلق مختلف قصے مشہور ہیں۔ جاڑے کی ایسی شدت کہ تمام زمین برف سے پٹی ہوئی مگر سقراط ننگے پاؤں اور بہت کم لباس پہنے ہوئے اُس پر پھرتا تھا۔ ایک موقعہ پر وہ چوبیس گھنٹے تک ایک ہی مقام پر غور کی حالت میں کھڑا رہا۔ میدانِ جنگ کی کیفیت اور اہل ایتھنس کی شکست کے بعد سقراط کی حالت کی تصویر افلاطون نے نہایت دلکش الفاظ میں کھینچی ہے جس کے مطالعہ سے طبیعت پر عجیب اثر ہوتا ہے، مگر بخوفِ طوالت ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

**پبلک زندگی** اب ہم سقراط کی پبلک زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ اُس کی تعلیم اور اُس کے اصول اخلاقی تھے۔ پس یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خود اُن پر کہاں تک عامل تھا۔ سقراط کا یہ اعلان تھا کہ "زندگی کے سب طریقوں پر نیکی کو ترجیح ہے!" اُس کی ہدایت تھی کہ "بہادری اور استقلال کے ساتھ انصاف سے وابستہ رہو کہ حقیقی خوشی وہی ہے"۔ اس کا قول تھا کہ "نامنصف مزاج آدمی ہی دُنیا میں ناخوش رہتا ہے"۔ پس یہ سوال بیجا نہ ہوگا کہ آیا وہ خود خوش تھا کہ ناخوش؟

سپاہی کی حیثیت سے جو دادِ مردانگی اُس نے دی اُس کا ذکر اوپر

ہو چکا ہے۔ مگر پارلیمنٹ ایتھنس کا ممبر ہونے کے وقت جو دلیری اُس نے دکھائی اس کا پایہ بہت بھاری ہے۔ اُس میں اخلاقی جراءت و دلیری اس وجہ تھی کہ وہ موت سے بھی نہیں گھبراتا تھا۔ عام رائے کی مخالفت میں اُس نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ دُنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک ہی شخص ظالم وجابر حکام اور عوام کالانعام کے گروہ کا مقابلہ کر سکے۔ مگر سقراط نے ایسا کر کے دکھا دیا۔

سقراط کے زمانہ میں ایک دفعہ تیس غاصب ایتھنس پر حکمراں تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے سقراط کو مع چار دیگر اشخاص کے تھولوس میں جو دارالامارۃ تھا طلب کیا اور حکم دیا کہ سقراط ان چاروں کو ساتھ لیکر لیون (باشندہ سلیمیس) کو گرفتار کر کے ایتھنس میں لائے۔ لیون نے ایتھنس والوں کے حقوق حاصل کر لئے تھے مگر غاصبوں کے ڈر سے وہ سلیمیس میں رہتا تھا۔ سقراط نے لیون کی گرفتاری سے صاف انکار کیا۔ وہ خود اپنی آخری تقریر میں کہتا ہے کہ

اگرچہ گورنمنٹ زبردست تھی، مگر اُس کے عتاب اور دھمکیوں کے باوجود میں یہ نا منصفانہ کام کرنے سے باز رہا۔ دارالامارۃ سے نکل کر وہ چاروں شخص تو سلیمیس کو گئے اور میں سیدھا اپنے گھر چلا آیا۔ مجھے اس حکم عدولی کے لئے ضرور سزا ملتی، مگر خیر گذری کہ چند روز بعد ان غاصبوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

ایسا ہی ایک اور بھی واقعہ گذرا تھا۔ ایتھنس میں ایک پارلیمنٹ یا پنچایت تھی جس کا نام ممبروں کی تعداد کی مناسبت سے "پانسو" تھا۔ اس کے ممبر وہاں کے دس قبائل میں سے منتخب ہوتے تھے۔ ہر ۳۵ یا ۳۶ دن کے بعد ایک قبیلے کے صدر مجلس بننے کی باری آتی تھی۔ صدر مجلسی کے درجہ کو "پرائی ٹینس" کہتے تھے۔ پچاس پرائی ٹینس میں سے ہر ہفتہ دس آدمی میر مجلس ہوتے تھے، اور ان دس میں سے ہر روز ایک آدمی، قرعہ اندازی کے ذریعہ سے، سب کا افسر چنا جاتا تھا۔ ریاست میں سب سے زیادہ معزز شخص وہی ہوتا تھا۔ وہی لوگوں کی رائے لیتا اور اُن کا شمار کرتا تھا۔ الغرض صدر مجلس پارلیمنٹ کا سب کام کرتا تھا حتیٰ کہ ریاست جمہوری کے خزانہ کی کنجیاں بھی اُسی کے پاس ہوتی تھیں۔ مگر کوئی شخص ایک دن سے زیادہ اس عہدہ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بعض امیر البحر مجرم قرار دئے گئے تھے کہ اُنھوں نے آرگنوسی کی لڑائی کے بعد مردوں کو دفن کرنے میں غفلت کی۔ مردوں کا دفن ہونا نہایت اہم فرض تھا ورنہ اُن کی ارواح سو برس تک قعرِ جہنم کے کنارے پریشان پھرا کرتی تھیں۔ صورتِ مقدمہ یہ تھی کہ آرگنوسی کی لڑائی کے بعد ایک سخت طوفان آیا جس کی وجہ سے مقتولین کی لاشیں دستیاب نہ ہو سکیں، امیر البحر اپنے ماتحت افسروں کو اُن کے دفن کے لئے چھوڑ آئے۔ مگر طوفان کی وجہ سے وہ بھی یہ فرض ادا نہ کر سکے۔ اب اُن امیر البحروں پر مقدمہ قائم ہوا۔ اُنھوں نے صفائی کے گواہ پیش کئے جن کے بیانات سے ثابت ہوا کہ طوفان کی وجہ سے لاشیں دفن نہیں ہو سکتی تھیں، اور اگر کچھ قصور ہے تو ان ماتحتوں کا جو اس کام کے لئے وہاں چھوڑ دئے گئے تھے۔ ان بیانات کا بہت اچھا اثر ہوا، اور اگر اس وقت رائے لی جاتی تو وہ افسر جن پر جرم عائد کیا گیا تھا صاف بری ہو جاتے۔ مگر مقدمہ ملتوی کر لیا گیا کہ اب اندھیرا ہو گیا ہے اور ہاتھوں کا شمار نہ ہو سکے گا۔ دوسرے دن مقتولین کے عزیز و اقارب اور دیگر اجرتی ماتم دار تمام شہر میں روتے پیٹتے پھرے اور عوام میں جوش پیدا کرتے رہے کہ ان بحری افسروں کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس گریہ وزاری کا ممبران پارلیمنٹ پر بہت اثر ہوا۔ دوسرے دن حُسنِ اتفاق سے سقراط تمام پرائی ٹینس کا سردار تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ آیا بحری افسروں نے غفلت کی یا نہیں؟ نیز یہ کہ کثرتِ رائے سے ان کو پھانسی اور ضبطی مال و متاع کی سزا ملنی چاہئے یا نہیں؟ سقراط کے کہنے سے پرائی ٹینس نے اس ناجائز سوال کی بابت رائے لینے سے انکار کیا۔ عوام غضبناک ہوئے اور اُنھوں نے چلا چلا کر کہا کہ یہ شخص ہماری مخالفت پر آمادہ ہیں، خود انھیں پر مقدمہ قائم ہونا چاہئے۔ تمام پرائی ٹینس متزلزل ہو گئے مگر سقراط ایک آہنی بُرج کی طرح اپنی جگہ پر استقلال کے ساتھ جما رہا۔ اور عوام کی دھمکیوں کی اُس نے مطلق پروانہ کی۔ اُس نے کہا کہ "میں اس جگہ صرف انصاف کے لئے کھڑا ہوں، ظلم کے لئے نہیں۔ مجھے

متعلق میں کوئی رائے نہیں لے سکتا؛ غرض اجلاس ملتوی ہوا۔ دوسرے دن کوئی اور شخص میر مجلس تھا۔ رائے لی گئی اور بحری افسروں پر قتل کا فتویٰ لگایا گیا۔

**سقراط کے حالات کا ماخذ** سقراط کے حالات زیادہ تر اس کے شاگردوں زینوفن اور افلاطون کی تصنیفات سے معلوم ہوتے ہیں۔ زینوفن اپنی کتاب میموریلیا میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں اصل الفاظ اور گفتگو سقراط ہی کی ہے اور یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی تھی کہ بیدینی یعنی مذہب۔ ریاست سے انحراف کا جو الزام سقراط پر لگایا گیا تھا اس سے اس کا ازالہ ہو سکے۔ رہی افلاطون کی ضخیم تصنیفات اور بے شمار مکالمے، جن میں زیادہ تر حصہ سقراط کا ہوتا ہے، ان میں اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ کہاں سقراط کے خیالات ختم ہوتے اور کہاں سے افلاطون کے خیالات شروع ہوتے ہیں۔ افلاطون خود ایک حکیم تھا اور فلسفہ میں سقراط کا غلامانہ مقلد نہ تھا۔ اس نے سقراط کا طرز تحقیق اختیار کیا اور اپنے خیالات سقراط کی زبان سے ادا کئے ہیں چند تصنیفات مثلاً "معذرت نامۂ سقراط" اور "فیڈیو" اور "کرٹو" کی نسبت عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ سقراط ہی کے الفاظ و خیالات ہیں۔ باقی مکالمے تمام افلاطون کے خیالات ہیں۔ البتہ فلسفۂ اخلاق جو افلاطون نے بیان کیا ہے وہ بالکل سقراط کا ہے ممکن ہے کہ افلاطون نے اسے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کیا ہو۔

**ذاتی خصائل** تاہم ایک بات میں زینوفن اور افلاطون بالکل متفق ہیں۔ اپنے استاد کی خصائل اور عادات کی جو تصویر انھوں نے کھینچی ہے یا دوسرے لوگوں کی زبان سے بیان کی ہے ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، اور کچھ شک نہیں کہ اگر سقراط کے دوسرے شاگردوں کی تصنیفات موجود ہوتیں تو ان میں بھی وہی سقراط نظر آتا جس سے افلاطون کی تصنیفات پڑھنے والے واقف ہیں۔ زینوفن ایک بہادر سپاہی تھا، مگر تعلیم یافتہ اور سیدھا سادہ۔ اس کا دماغ افلاطون کی طرح حکمت کا مخزن نہ تھا۔ اس نے سقراط کی جو تعلیم پسند کی ہے وہ عملی قسم کی ہے، یعنی جس کا مقصد عام طور پر بدی اور معائب شخصی کی اصلاح کرنا ہے۔ مگر ان تقریروں سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ سقراط کی گفتگو منفی قسم کی ہوتی تھی یعنی وہ دوسروں کے تمام غلط خیالات کی تردید کرتا تھا۔ وہ تجزیہ خیال کو کام میں لاتا تھا، یعنی ہر خیال کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے الگ الگ ان سے بحث کرتا تھا۔ پھر اس کی تقریروں میں تعمیم بھی ہوتی تھی، یعنی وہ کسی مثال یا تشبیہ کو ایک عام قاعدہ بنانا چاہتا تھا۔ زینوفن کی تصنیفات کے مطابق سقراط کا رجحان یہی ہے۔ افلاطون نہایت حکیمانہ طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سقراط کے فلسفہ کا طریقہ یہی تھا، حالانکہ وہ فلسفۂ سقراط کے عملی رخ کو بیان نہیں کرتا بلکہ اصولی (تھیوریٹیکل) کو واضح کرتا ہے۔ تاہم وہ بھی اسی سقراط کو پیش کرتا ہے جس کی تصویر زینوفن نے کھینچی ہے۔

سقراط کے خصائل کے متعلق ہم دو واقعات کا ذکر کر چکے ہیں ہم جانتے ہیں کہ وہ موٹا کپڑا پہنتا اور معمولی کھانا کھاتا تھا۔ وہ تمام عمر مفلس اور جسمانی خوشیوں سے محروم رہا۔ سقراط کی خاص صفات جن کا ذکر گروٹ صاحب نے "تاریخ یونان" میں کیا ہے، حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس کی تمام عمر قناعت آمیز مفلسی، اور نصیحت آمیز و نتیجہ خیز مکالموں اور مناظروں میں گزری۔

(۲) اس کی طبیعت پر گہرا مذہبی اثر تھا، اور اس کو یقین تھا کہ خدا نے ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لئے اسے پیدا کیا ہے۔

(۳) اس کی قوائے عقلی میں ایجاد و اصلیت کا مادہ بے انتہا تھا۔ وہ اپنے ذہن سے نئے نئے مضمون نکالتا تھا، اور اس کا طریقۂ بحث بھی نیا تھا۔

یہ تینوں صفات اس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ ان کو علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ ان سب صفات میں وہ تمام سابقہ حکمائے یونان سے ممتاز تھا۔

افلاطون اور زینوفن کی تصنیفات سے جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے

یہی ثابت ہوتا ہے کہ سقراط کسی خاص عقیدے یا اصول کی تعلیم نہیں دیتا تھا۔ اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ حکیم و فلسفی اور مدبرِ سلطنت، شاعر و مصور، غرض اہلِ فن اور اہلِ علم جو کسی صنفِ خاص میں ماہر ہونے کے مدعی ہیں، اُن پر یہ ثابت کرے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ سقراط کی یہ منفی تعلیم اگرچہ بادی النظر میں غیر مفید معلوم ہوگی لیکن فلسفہ اور علوم کی تاریخ میں اسی سے عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوا ہے۔ غور سے دیکھئے تو انسان کے ذہن میں صرف چند خیالات اور سماعی باتیں ہوتی ہیں، جن کو وہ علم اور دانائی کے نام سے نامزد کرتا ہے۔ سقراط نے سمجھا دیا ہے کہ دانائی غور و فکر اور محنت کئے بغیر محض سنی سنائی باتوں سے نہیں میسر ہو سکتی۔

خاتمہ ۳۹۹ سنہ قبل از مسیح میں علانیہ سقراط پر یہ جرم عاید کیا گیا وہ بے دین ہے یعنی مسلّمہ دیوتاؤں سے انکار کرتا اور اُن کے بجائے نئے دیوتاؤں کی تلقین کرتا ہے نیز یہ جرم بھی اُس پر لگایا گیا کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتا ہے افلاطون نے "معذرت نامۂ سقراط" میں سقراط کی وہی تقریر قلمبند کی ہے جو اُس نے جوابِ دعویٰ میں کی تھی۔ مگر سب کوششیں رائگاں گئیں اور اس پر موت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد اُسے زہر کا پیالہ پینے کو دیا گیا۔ جو اپنا اثر کئے بغیر نہ رہا۔ اور اس طرح تقریباً ستر برس کی عمر میں سقراط کی مفید زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

غلام الثقلین

## داستانِ ذوق

نمودِ عالم میں ہر قدم پر جمالِ حیرت فزا نہاں ہے
ہر ایک صورت سے گنجِ مخفی کی شانِ معنیٰ نما عیاں ہے

شہودِ کثرت میں جلوہ گر ہے جلالِ وحدت کی دل ربائی
صنم کدہ میں بتوں کا چرچا بھی دلستانی کی داستاں ہے

ہر ایک ذرہ کی ذوقِ دل سے بلائیں لیتا ہوں مست ہو کر
الٰہی کس کس پہ ہوں میں قرباں یہاں تو ہر چیز دلستاں ہے

نگاہِ جویا کو ہر نظارہ نگار خانہ ہے دل بری کا
جہانِ زیبا ترا الٰہی ہزار حیرت کا اک سماں ہے

جہانِ ظاہر میں ہر قدم پہ کھلے ہیں اسرارِ رازِ باطن
اگر بصیرت کی ہوں نگاہیں تو ذرہ ذرہ جہانِ جاں ہے

قدم قدم پر ہے دلربائی سے کون مصروفِ خود نمائی
بڑی عجب ہے یہ جانفزائی جو غازۂ حسنِ کن فکاں ہے

جہاں تو سارا ہے بزمِ الفت چھڑی ہے کیوں شیخ و برہمن میں
فضائے دیر و حرم میں ہر جا انھیں کی بجلی شرر فشاں ہے

یہاں تمنائے وصل دل میں وہاں انھیں فکرِ آزمائش
اِدھر یہ حیرت کہ اُنکو دیکھیں اُدھر تقاضائے امتحاں ہے

کسی کے عشقِ نہاں کی گرمی نے پھونک ڈالا ہے دل جلوں کو
الٰہی وہ برقِ طورِ موسیٰ ہمارے خرمن میں کیوں نہاں ہے

ہوئے ہیں دیر و حرم سے فارغ کسی دل آرا کی جستجو میں
دلوں میں نکلا کہیں وہ ظالم بتا یہاں جسکا لا مکاں ہے

بٹھائیں پہلو میں اپنے کس کو کہ ڈھنگ بگڑا ہے دوستوں کا
خلوص و الفت سے ملنے والا بجز تمھارے کوئی کہاں ہے

بیانِ ذوقِ حمیدِ مضطر سنبھل کے سننا جنابِ زاہد
نہیں ہے حوروں کا یہ فسانہ یہ سرفروشوں کی داستاں ہے

حمید (کوٹلوی)

# فلسفۂ تربیت

## مصنفۂ اسپنسر پر ریویو (۲)

**چوتھا مسئلہ** یہاں تک جو کچھ لکھا گیا، وہ صرف فلسفیانہ حیثیت سے تھا یعنی اصولی طور پر یہ بتا دیا گیا، کہ تربیت کی ماہیت کیا ہے؟ تربیت کا لفظ کس مفہوم پر دلالت کرتا ہے؟ ایک عملی تربیت کے ارکان کیا ہیں؟ اور اس معیار پر کون سا نصاب پورا اترتا ہے؟ لیکن عملانہ نقطۂ خیال سے ابھی یہ نہیں بتایا گیا کہ بچوں کو کیوں کر تعلیم دینی چاہیے؟ اور عملی تربیت کے وقت استاد و طالب علم کو کن کن شرائط کا لحاظ رکھنا چاہیے؟

عام مصنفین کے حسب عادت اسپنسر بھی انسانی زندگی کو ان اقسام ثلثہ میں تقسیم کرتا ہے، ذہنی، اخلاقی، اور جسمانی، اور انسان کی تربیت انھیں تین حیثیات سے ہو سکتی ہے۔ تربیت کی ماہیت چونکہ پہلے بیان ہو چکی ہے، اس لیے اس حصہ میں اسپنسر کو جو کچھ کرنا رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ حصۂ اوّل کے ثابت شدہ اصول کو یہاں عملی قوانین کی صورت میں ترتیب دیدے (یعنی اس تھیوری کو یہاں چسپاں کردے) تو انین تربیت کا اصل راز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ ارتقائی اصول پر ہونا چاہیے۔ یعنی تربیت، چونکہ نام ہے، انسانی قوتوں کی نشو و نما کا، اس لیے ہماری مصنوعی تربیت کو قدم بقدم اسی راستہ پر چلنا چاہیے جس پر کہ خود فطرت، انسانی تربیت کا سامان کرتی ہے، اور اسی فطری روش تربیت کا نام ارتقاء تعلیمی ہے، اس اجمال کی تفصیل وہ ذہنی، اخلاقی، اور جسمانی حیثیات کو علٰحدہ علٰحدہ لیکر کرتا ہے۔

(الف) سب سے پہلے ذہنی تعلیم کو لیجیے۔ عام خیال ہے کہ بچہ کی تعلیم بالکل ابتدا ہی سے شروع ہو جانا چاہیے۔ اسپنسر اس رائے سے متفق ہو کر کہتا ہے کہ

> جس شخص نے ذرا بھی غور و فکر سے شیر خوار بچہ کو دیکھا ہے، جو کھلی آنکھوں سے گھور گھور کر گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالتا ہے، وہ اس امر کو بخوبی جانتا ہے کہ خواہ ہم قصد کریں یا نہ کریں، تعلیم ابتدائے عمر میں بالضرور شروع ہو جاتی ہے اور یہ جو بچہ ہر شے کو جو اُسکے ہاتھ میں آجاتی ہے، ٹٹولتا، چھوتا، اور چوستا ہے، ہر ایک آواز کو منھ کھول کر سنتا ہے یہ اسی سلسلہ کے ابتدائی مدارج ہیں، جو آخر کار سیاروں کی تحقیقات، کلوں کی ایجاد، اور دیگر علمی و ادبی کمالات پر جاکر منتہی ہوتا ہے، قوے کا یہ عمل چونکہ ابتدا ہی سے قدرتی اور لازمی ہوتا ہے، اس لیے اس سوال کا جواب، کہ آیا ہمیں بچوں کے لیے ابتدا ہی سے مختلف قسم کے مواد کی کافی مقدار بہم پہنچانی چاہیے، تاکہ اُن پر وہ اپنے قوی کی مشق کر سکیں، بجز اثبات کے اور کچھ ہو نہیں سکتا۔

اور اسی لیے شیر خواروں کی قوتِ امتیاز کے باقاعدہ نشو و نما کے لیے انکے سامنے

> جو آوازیں بلندی اور اُتار چڑھاؤ میں بہت مختلف ہوں، جو رنگ باہم مختلف ہوں، اور جو چیزیں سختی یا نرمی میں سخت نامشابہ ہوں، اُنھیں کو سب سے پہلے مہیا کرنا چاہیے۔

شیر خوارگی کے بعد جب بچہ کسی قدر ذی ہوش ہو چلے، اُسوقت اُسکی ذہنی تربیت، چند واقعات بتا دینے، یا کچھ معلومات کے حفظ کرا دینے سے نہیں، بلکہ اسباق الاشیا (Object Lessons) کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ اسباق الاشیا کا منشا یہ ہے کہ گھر کی معمولی چیزوں سے لیکر کنکریوں، پتھروں، پھولوں، پتیوں، سیپیوں، اور کیڑوں تک مختلف قدرتی اشیا، بچوں کے مشاہدہ میں لائی جائیں، تاکہ اُنکے قوائے مشاہدہ کو ترقی ہو، اور وہ اُنکی ساخت و صفات پر از خود غور کرکے اپنی قوتِ توجہ، حافظہ، اور امتیاز کو تقویت دیں۔ اسی قوتِ مشاہدہ کی ترقی کے ضمن میں اسپنسر مصوری کی خاص طور پر سفارش کرتا ہے: ۔

ہم یہ بات مکرر بیان کرتے ہیں کہ معلم کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جسپر قدرت اُسے توجہ دلاتی ہے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ بچے گرد و پیش کے آدمیوں، مکانوں، درختوں، اور جانوروں کی تصویریں بنانے کی ازخود کس قدر کوشش کیا کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی چیز میسر نہیں ملتی، تو سلیٹ یا کاغذ پنسل ہی سے تصویریں بنا لیتے ہیں۔ انکی نہایت اعلیٰ درجے کی خوشیوں میں سے ایک خوشی یہ ہے کہ انکو تصویروں کی کتاب دکھائی جائے۔ اور نقل اُتارنے کا قوی میلان جو بچوں میں پایا جاتا ہے اُس سے اُنکے دلوں میں یہ شوق بالعموم فی الفور پیدا ہو جاتا ہے کہ خود بھی تصویریں اُتاریں۔ یہ کوشش کہ جو چیز عجیب دیکھیں اُسکی تصویر اُتاریں، قوائے مدرکہ کی ایک طبعی مشق ہے۔ یعنی یہ ایسا وسیلہ ہے جس سے ترغیب ہوتی ہے کہ مشاہدہ زیادہ صحیح و مکمل طور پر کیا جائے، اور چونکہ بچے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اشیاء کے محسوس خواص کے متعلق اپنی تحقیقات کی طرف ہم کو بھی متوجہ کریں، اور خود بھی تصویر بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لیے گویا وہ ہمسے زبان حال سے یہ درخواست کرتے ہیں، کہ انکو ٹھیک اسی قسم کی تعلیم دینی چاہیے اور اسی کی اُنکو سخت ضرورت ہے۔

مصوری کے پہلو بہ پہلو، تربیت ذہنی کا ایک نہایت ضروری جزو، علم ہندسہ کی عملی، اور اسکے بعد اُسکی علمی تعلیم ہے۔ چونکہ ارتقائی حیثیت سے آرٹ، سائنس پر مقدم ہے، اس لیے علم ہندسہ کی مناسب تمہید یہ ہے کہ طالب علم کو مدت تک اپنے ہاتھ سے شکلیں بنانے کی مشق کرانی چاہیے، جس سے علم ہندسہ میں سہولت پیدا ہو جائیگی۔ دیکھو فطرت یہاں بھی رہنمائی کرتی ہے۔ بچے اس بات کی طرف قوی میلان ظاہر کرتے ہیں کہ کاغذ کو کتر کر کچھ چیزیں بنائیں، اور اپنے ہاتھ سے کوئی چیز تعمیر کر دیں۔ ایسا میلان ہے کہ اگر اسے تقویت دیجائے اور راہ راست پر ڈال دیا جائے تو اس سے نہ صرف علمی تصورات کا راستہ صاف ہو جائیگا، بلکہ دستکاری کی اُن قوتوں کو بھی ترقی ہوگی جو اکثر آدمیوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ پھر جب مشاہدہ اور قوائے موجودہ میں مطلوبہ قوت پیدا ہو جائے اُس وقت طالب علم کو ہندسہ علمی کی تعلیم شروع کرائی جا سکتی ہے۔

عملی ہندسہ سے مراد یہ ہے کہ بجائے نقطہ، خط، اور سطح کی تعریف بتانے کیلیے جو بچہ کے فہم سے بالاتر ہوتی ہیں، انکے سامنے مجسمات و مکعب اشکال پیش کیے جائیں، جنکو دیکھکر، اور جن پر عملی مشقیں کر کر کے، وہ ازخود ان دقیق تصورات تک پہنچے گا، اور اس طرح رفتہ رفتہ مسائل کو عملی طور پر خود ہی حل کرنے لگے گا۔

بیانات بالا سے معلوم ہوا ہوگا، کہ بچہ کی تعلیم کی ابتدا کن مضامین سے ہونا چاہیے۔ مگر معلم کے لیے ایک اہم ترین شے اُن ہدایات سے واقفیت حاصل کرنا ہے، جن پر کاربند ہونا ہر نصاب تعلیم کی کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ وہ ہدایات ارتقاء ذہنی کے مندرجہ ذیل، سات اصول ہیں:-

(۱) تعلیم میں آسان و زود فہم باتوں سے دقیق و غامض مسائل کیطرف جانا چاہیے۔

یہ مسلم ہے کہ نفس انسانی میں ارتقا ہوتا رہتا ہے، اور مثل تمام ارتقا پذیر چیزوں کے نفس بھی یکجنس چیزوں سے مختلف الجنس چیزوں تک بتدریج پہنچتا ہے۔ اب چونکہ باقاعدہ تربیت، اسی معنوی عمل کی ایک صوری شبیہ ہوتی ہے، اسلیے اسے بھی اُسی کے مثل تدریجی ترقی ہونا چاہیے۔ اس ہدایت کی تحت میں یہ بات بھی داخل ہے، کہ نہ صرف علم کی ہر شاخ میں علیحدہ علیحدہ، مفردات سے مجموعہ کی طرف جانا چاہیے، بلکہ سارا علم اسی طریقہ سے حاصل کرنا چاہیے، اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں ایک ہی دو مضمونوں کی تعلیم ایک ساتھ شروع ہونا چاہیے اور بتدریج اُن مضامین کی تعداد میں اضافہ کر کے آخرکار تمام مضامین کی تعلیم کو ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔ نہ صرف جزئیات میں، بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی آسان سے مشکل کی طرف جانا چاہیے۔

(۲) بچوں کو ابتدا میں علمی مصطلحات و تعریفات نہیں بتانا چاہیے۔

بلکہ انکی سمجھ کے مطابق موٹی موٹی باتیں بتا دینا کافی ہیں:- ارتقاء کا ایک قانون یہ ہے کہ اسکی رفتار ہمیشہ مبہم و غیر معین چیزوں کی طرف ہوتی ہے، ذہن و

دماغ بھی اسی قانون کا پابند ہی۔ چنانچہ جسمانی حرکات کی طرح، بچہ کی ابتدائی ادراکات وخیالات بھی مبہم وغیر معین ہوتے ہیں، اور اسوقت اسکی عقل بجز نمایاں ہونے اور نمایاں امتیازات کے، خواص اشیاء کی قسموں اور درجوں اور انکی شکل کے جزئیات میں تمیز نہیں کرسکتی، اسلیے وہ معلم سخت غلطی پر ہیں جو ایسی حالت میں دقیق منطقی تعریفات واصطلاحات، بچوں کے ذہن میں ٹھونس دیتے ہیں۔ نتیجہ اصول تعلیم کی بنا پر ہمیں چاہیے کہ

> ابتدائی تعلیم میں ناکمل خیالات پر قناعت کریں لیکن ان خیالات کو بتدریج زیادہ صاف وواضح کرتے رہیں، اور یہ مقصد صرف اس طرح پورا ہوسکتا ہے کہ طالب علموں کو ان تجربات وواقعات کے حصول میں مدد دیجائے جن سے ہونی ہوئی غلطیاں رفتہ رفتہ از خود دور ہوتی جاتی ہیں۔

(۳) اسباق، مادیات سے شروع اور مجردات پر ختم ہونے چاہییں۔

اصول مجردہ Abstractions کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ ہوتی ہی کہ لوگ چونکہ ان تعمیمات کو جزئیات کے مجموعہ سے منتزع کرتے ہیں، یعنی بہت سے واقعات کو ملا کر ایک قاعدہ بنا لیتے ہیں، اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو بھی اس قسم کے تصورات ضرور آسان معلوم ہونگے۔ حالانکہ وہ اس امر کو نظر انداز کرجاتے ہیں، کہ یہ عام اصول تو انکے لیے تمام جزئی واقعات کے معلوم کرلینے کے بعد آسان ہوا ہی، اور اس نفس کے لیے، جس میں اس مجموعہ کے جزئیات فرداً فرداً موجود نہیں، تو ایک مجرد اصول، ضرور ایک عقدۂ لاینحل رہیگا۔ اس بنا پر ایک دانشمند معلم کو

> نفس کو کسی عام اصول کی تعلیم، مثالوں کے ذریعہ سے دینا چاہیے، تاکہ ذہن کی رہنمائی تدریجاً خاص سے عام، جزئیات سے کلیات اور مادیات سے مجردات کی طرف

(۴) بچوں کی تعلیم کا سلسلہ اسی اصول پر ہو، جسکے مطابق نوع انسان نے تعلیم پائی ہی۔

مسئلۂ توارث نے ثابت کردیا ہی، اور اسکی تصدیق ہمارے ہر روزہ تجربہ ومشاہدہ سے بھی ہوتی ہی، کہ خط وخال، شکل وشباہت، کی طرح ذہنی اوصاف وخصائل بھی نہ صرف نسلاً بعد نسلٍ، بلکہ قرناً بعد قرنٍ مستقل طور پر قائم رہتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ جس ترتیب کے ساتھ نسل انسانی نے مختلف علوم پر عبور حاصل کیا ہی، اسی ترتیب کے ساتھ ان علوم کو حاصل کرنے کی قابلیت ہر بچہ میں بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ

> افراد کے نفس کو اسی راستہ پر قدم بہ قدم لیجائیں جسکو نسل انسانی نے من حیث المجموع طے کیا ہے

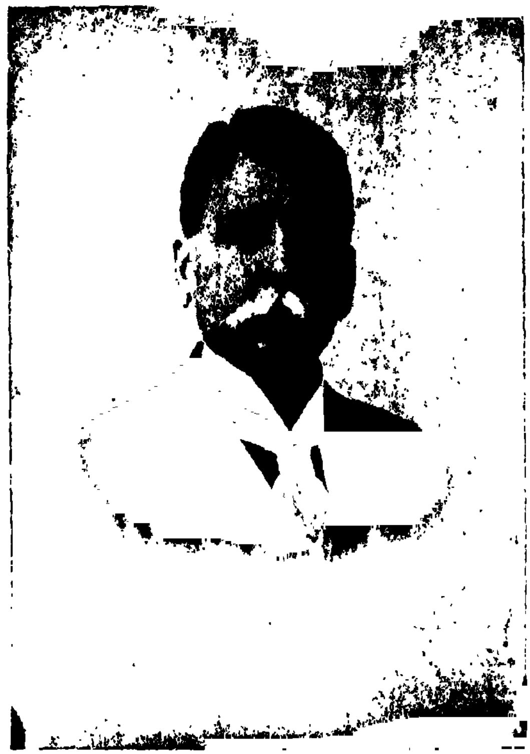
(۵) تعلیم کی ہر شاخ میں عملی علم کو عقلی علم پر تقدم زمانی حاصل ہونا چاہیے۔

> انسانی ترقی کے دوران میں ہر علم (سائنس) اپنے اپنے فن (آرٹ) سے نکلا ہی شخصی نیز اجتماعی حیثیت سے ہمارا ذہن مجبور ہی کہ مادیات کے ذریعہ سے مجردات تک رسائی حاصل کرے۔ اسی ضرورت کا یہ نتیجہ ہی کہ سائنس کے وجود سے پہلے مشق، تجربہ اور مشق کے عملی نتائج کا وجود ضروری ہی۔ سائنس نام ہی منضبط علم کا لیکن انضباط علم سے پیشتر ضروری ہی کہ اسکا کسی قدر حصہ ہمارے قبضہ میں ہو۔ اس لیے ہر مطالعہ کی تمہید، تجربہ ہونا چاہیے، اور جب مشاہدات کا ذخیرہ وافر جمع ہولے، اسکے بعد دلیل کا نام لینا چاہیے۔

اسی اصول کی بنا پر زبان کی تعلیم میں ادب کا نمبر پہلے، اور صرف ونحو کا درجہ بعد کو ہونا چاہیے۔

(۶) بچوں کی اس طرح رہنمائی کرنا چاہیے کہ وہ خود تحقیقات کریں اور اپنے نتائج آپ نکالیں۔

نوع انسان نے آج، بحیثیت مجموع جو اس قدر ترقی کی ہی، اس میں کس معلم کا ہاتھ شریک ہی؟ بجز خود اسکی طبیعت، اس کے نفس کے، اور کسی کا نہیں۔ اسی طرح دنیا میں جو ممتاز ترین افراد ہوے ہیں، وہ عموماً ایسے ہی ہیں جو کسی خارجی معلم کے ممنون احسان نہیں۔ اسکے علاوہ، ہر بچہ، پیدا ہوتے ہی اپنے گرد وپیش کی اشیاء کا نہایت ضروری علم بلا خارجی مدد کے حاصل کرتا ہی۔ اپنی مادری زبان از خود سیکھ لیتا ہی، اور مدرسہ سے باہر نکل کر اپنے ذاتی تجربات سے عقل میں بے نہایت ترقی حاصل کرتا ہی۔ اس لیے اگر بچہ کو بتایا جائے، اور انھیں باقاعدہ طور پر اپنے اوپر بھروسا کرنا سکھایا



رائٹ آنریبل سید امیر علی، ایم-اے ایل ایل ڈی-سی آئی-ای
(۔۔ال میں آپ مسلم لیگ "لندن" کی صدارت سے مستعفی ہوے ہیں)

جائے، تو تھوڑی مدت میں وہ بہت سہولت کے ساتھ علم کی کافی مقدار حاصل کرسکتے ہیں۔

(ء) طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیے، جس سے بچوں کو فرحت حاصل ہو۔ یہ مسئلہ اگرچہ حکما کے گروہ میں ایک بہت معرکۃ الآرا، مختلف فیہ حیثیت رکھتا ہے، لیکن اسپنسر اس امر کا نہایت معتقد ہے، کہ ایک انسانی قوت سے، جبتک کہ اعتدال کے ساتھ کام لیا جاتا ہے، اسوقت تک کام لینے والے کو ایک نوع کی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی حصول فرحت کو وہ طریقۂ تعلیم کی عمدگی کا آخری معیار قرار دیتا ہے۔ اگر کسی مضمون کا مطالعہ بچہ کو ناگوار گزرتا ہے، تو اسپنسر کے نزدیک اسکی تعلیم اسکے لیے مُضر ہے۔ لیکن اس تعمیم کے ساتھ اس دعوے کا ثابت کرنا دشوار ہے۔

(ب) اخلاقی تربیت۔ اگرچہ یہ سچ ہے، جیسا کہ صفحات گذشتہ میں ہر ہر سطر سے، الفاظ ہی کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ لہجۂ تحریر سے، مترشح ہوتا ہے، کہ بچوں کی ذہنی تربیت کی ذمہ داری، بہ نسبت اتالیق کے والدین پر زیادہ ہے، تو یہ اس سے بھی زیادہ سچ ہے کہ انکی اخلاقی تربیت کی ذمہ داری تقریباً تمام تر والدین پر ہے۔ فلسفۂ اخلاق میں چونکہ اسپنسر افادیت (Utilitarianism) کا قائل ہے، اس لیے اخلاقی حیثیت سے افعال کے حُسن و قبح کا معیار اسکے نزدیک صرف مسرت و غم کی وہ مقدار ہے، جو ارتکاب افعال سے پیدا ہوتی ہے؛ یعنی مدار اخلاق، نتائج افعال ہیں۔ اگر کسی فعل کے نتائج اسکے فاعل کے لیے مسرت بخش ہیں، تو وہ فعل نیک ہے۔ اور اگر اذیت رساں ہیں تو مذموم۔ اس بنا پر، طبعی طور پر، ہمکو بد افعالیوں سے روکنے والی، نیز خوش اعمالیوں پر آمادہ کرنیوالی شے، صرف نتائج کا خوف یا انعام ہوتا ہے، جو فطرت کے مقرر کردہ قوانین کے بموجب، اسی دنیا میں ہمیں جلد یا بدیر مل جاتے ہیں، اور یہ سلسلہ زندگی کے ہر حصہ میں جاری رہتا ہے۔ پس اخلاقی تربیت کا منشا صرف یہ ہے کہ انسان کو اعمال کے قدرتی نتائج کی ناگزیری کا خوگر کیا جائے۔ اسپنسر شیرخوارگی اور سنِ بلوغ کے زمانہ سے بہت سی مثالیں پیش کرکے کہتا ہے:۔

کیا ان مثالوں میں ہمکو اخلاقی تعلیم کا ابتدائی اصول نہیں مل گیا؟ کیا ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے، کہ جو طریقہ، اپنے نتائج کے اعتبار سے شیرخواری اور بلوغ کے زمانہ میں نہایت مفید ثابت ہوتا ہے، کیا وہ زمانۂ طفولیت میں بھی اسی قدر مفید نہیں ثابت ہوگا؟ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ ترجمان و کارکن قدرت کی حیثیت سے اس امر کا یقیناً والدین کا فرض ہے، کہ انکے بچے، عادۃً اپنے چال چلن کے حقیقی نتائج، یعنی قدرتی سزاؤں کا تجربہ حاصل کریں۔ اور والدین نہ تو ان سزاؤں کو ٹالیں، نہ انہیں سخت بنائیں، اور نہ مصنوعی سزاؤں کو انکا قائم مقام بنائیں؟

قدرتی سزاؤں کی مثالیں یہ ہیں کہ فرض کیجیے، ایک بچہ ہے، جسے اُس کے والدین روزانہ شام کو تفریح کے لیے اپنے ہمراہ باہر لیجاتے ہیں، لیکن وہ اپنی کاہلی سے ٹھیک وقت پر کپڑے پہن کر تیار نہیں ہو پاتا۔ ایسی حالت میں عموماً والدین کو غصہ آتا ہے، اور وہ بچہ کو جھڑکتے ہیں، کہ اسکے انتظار میں انھیں بھی دیر ہوئی، اور جب بچہ تیار ہو لیتا ہے، تو اُسے ساتھ لیجاتے ہیں، لیکن یہ اظہار غضب سر تا سر مصنوعی سزا ہے۔ وقت پر تیار نہ ہونے کی عادت اگر بچہ میں راسخ ہو گئی، تو آیندہ زندگی میں ہر ہر قدم پر ناکامیابیوں کا سامنا ہوتا رہیگا، کبھی ریل چھوٹ جائیگی، کبھی جہاز چھوٹ جائیگا، کبھی احباب سے وعدہ خلافی پر محجوب ہونا پڑیگا، کبھی دفتر یا عدالت میں (جہاں کہیں ملازم ہے) بعد از وقت پہنچے گا۔ پس والدین کا اصل فرض، بچہ میں اس عادت کا راسخ نہ ہونے دینا ہے، اور اسکا بالکل قدرتی طریقہ یہ ہے، کہ اگر وہ وقت مقررہ پر تیار نہیں، تو بغیر زجر و توبیخ کے چُپ چاپ اسے چھوڑ کر چلے جائیں، اور واپسی پر تفریح کے فوائد، دلکش مناظر، اور خوشنما نظاروں سے جو لطف انھیں حاصل ہوا ہے، اُسے بچہ کے سامنے بیان کریں۔ اس سے اُس بچہ کو سخت تنبیہ حاصل ہوگی، اور اُسے یقین ہو جائیگا، کہ کاہلی و غیر مستعدی خود اُسی کے حق میں مضر ہے۔

یا مثلاً، فرض کیجیے کہ ہمنے کسی بچہ کو ایک کھلونا لے دیا، جو اُس نے

دوسرے ہی دن محض اپنی لاپروائی سے کھو دیا۔ اور اب پھر دوسرے کھلونے کے لیے تقاضا کر رہا ہی۔ ایسی صورت میں قدرتی سزا، اسکو ڈانٹ ڈپٹ کرکے اسکی خواہش پوری کردینا نہیں ہی، بلکہ اسکی خواہش کو نہ پورا کرنا ہی۔ اور متانت کے ساتھ اس سے کہدینا ہی کہ "اس کھلونے میں میرے دام صرف ہوے تھے، اور روپیہ کمانے کے لیے محنت درکار ہی، میرے پاس اتنا روپیہ نہیں، کہ تمھیں روز نیا کھلونا دیا کروں" بچے کے ذہن میں مال کا مفہوم، اور اسکے حصول کے لیے محنت کا لازمی ہونا، اسی طرح ثابت ہوگا۔

اس قدرتی طریقۂ تادیب پر پوری پابندی کے ساتھ عمل کرنے سے چند ایسے فوائد پیدا ہوتے ہیں، جو مصنوعی سزاؤں کے ذریعے ممکن نہیں۔

اولاً۔ اس سے بچہ کو علت و معلول کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہی۔ جب اسے ہر قصور کی ہمیشہ سزا ملیگی، اور بلا قصور کبھی سزا نہ ملیگی، تو اسے یقین ہوجائیگا کہ اعمال اور انکے نتائج میں ایک ناقابل انفصال تعلق ہوتا ہی۔

دوسرے۔ اس سے احساس انصاف کی تربیت ہوتی ہی یعنی جس قسم کا قصور ہوتا ہی، اس میں اور اسکی سزا میں ایک خاص مناسبت ہوتی ہے۔ مثلاً بچے نے کیچڑ میں اپنے کپڑے لت پت کر ڈالے، اور ہمنے اسکی گوشمالی کی، تو بچہ کی صاف سمجھ میں نہ آئیگا، کہ اسکی شرارت کو سزا سے ربط کیا ہی۔ بخلاف اسکے اگر ہم صرف اتنا کریں کہ اسی سے اسکے کپڑے صاف کرائیں، تو اس سزا کے انصاف کی گواہی بچہ کا دل دے گا۔

تیسرے۔ یہ طریقہ والدین کے حق میں زیادہ سود مند ہی۔ بچوں پر ہر وقت اظہار غیظ و غضب کرنے سے والدین کو ایک قسم کی کوفت ہوجاتی ہے، اور پھر جب بچوں کی فرمائش پوری کرتے ہیں، تو گویا مالی حیثیت سے اپنے اوپر ایک اور جرمانہ کرتے ہیں۔ حالانکہ قدرتی طریق سزا ہی میں وہ ان دونوں تکالیف سے محفوظ رہیں گے

چوتھے۔ اس سے والدین و اولاد کا باہمی تعلق زیادہ دوستانہ اور زیادہ موثر رہتا ہی۔ مصنوعی سزاؤں سے بچے کے ذہن میں عموماً یہ خیال جم جاتا ہی، کہ والدین کو اس سے پرخاش ہی، اور وہ اسے ستانے کی غرض سے اسے بعض چیزوں سے روکتے اور سزا دیتے ہیں۔ لیکن قدرتی سزاؤں سے خود بچہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آجاتی ہی، کہ والدین صرف اسی کی بہبود و بھلائی کے لیے اسے بعض افعال سے منع کرتے ہیں۔

الغرض ہربرٹ اسپنسر کی رائے میں، بچوں کے ضابطۂ تعزیرات کا معیار تمام تر قدرتی طرز سزا ہی ہونا چاہیے۔ اور والدین و معلم کو خود کوئی سزا تجویز کرنے کے بجاے، محض فطرت کے ہاتھ میں آلۂ تعزیر رہنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ حال کے اکثر ماہرین فن نے نکتہ چینی کی ہی۔ ہمارے نزدیک اس رائے میں اسپنسر کسی قدر حد اعتدال سے بڑھ گیا ہی۔ اصل یہ ہی کہ فطری سزائیں ہمیشہ جرائم کے متناسب نہیں ہوتیں، مثلاً کسی بچہ کا ایک کھلا ہوا استرہ ہاتھ میں اٹھا لینا، اگرچہ ایک نہایت خفیف بداحتیاطی ہی، لیکن اگر والدین ایسے موقع پر دخل نہ دیں، تو بالکل ممکن ہی کہ بچہ کی جان کا خاتمہ ہوجائے۔ اسی طرح دیگر صدہا مواقع ایسے پیش آتے ہیں، جن میں اگر سزا کو محض فطرت پر چھوڑ دیا جائے، تو نہایت ادنی خطاؤں کی شدید ترین پاداش ملتی ہے۔

نصائح کی صورت میں تربیت اخلاق کے متعلق اسپنسر نے جو عملی ہدایات دیے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں:۔

(۱) بچوں سے زیادہ اخلاقی نیکیوں کی توقع نہ کرو۔ عام خیال یہ ہی کہ بچے معصوم ہوتے ہیں۔ اس جھوٹھ میں سچ صرف اتنا ہی کہ بچوں کو بداخلاقیوں کے وقت اسکا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کوئی مذموم فعل کر رہے ہیں، ورنہ اگر انکی روزانہ زندگی کا مشاہدہ کرتے رہو تو معلوم ہوگا کہ وہ کثرت سے ہر قسم کے ذمائم اخلاقی کے مرتکب ہوا کرتے ہیں، جسکی وجہ، قانون ارتقا کی روشنی میں یہ ہی کہ ہر متمدن شخص کو ابتدائی عمر میں، اس اخلاقی منزل سے ہوکر گزرنا پڑتا ہی، جس میں اسکے اجداد بعیدہ یعنی قدیم وحشی افراد تھے۔ جس طرح بچہ کا قیافہ، مثلاً چپٹی ناک، کھلے ہوے نتھنے، موٹے موٹے ہونٹ، پھٹی پھٹی آنکھیں، چہرہ کی غیر موزونی،

متانت کی عدم موجودگی وغیرہ، کچھ عرصہ تک وحشیوں کے قیافہ سے مشابہ رہتا ہے اسی طرح اسکی فطرت بھی انکے مشابہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرحمی، دغابازی، جھوٹ، اور چوری کا میلان بچوں میں نہایت عام طور پر پایا جاتا ہے، اور جس طرح رفتہ رفتہ اسکے جسمانی قیافہ میں تغیر ہوتا جاتا ہے، اسی طرح اس میلان میں بھی۔

(۲) اس لیے متوسط درجہ کی تجویزوں اور متوسط نتیجوں پر قناعت کرو۔

قوائے عقلی کی طرح، قوائے اخلاقی بھی نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ پس جس طرح اعلیٰ درجے کی عقل آہستہ آہستہ حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اعلیٰ درجے کی اخلاقی زندگی بھی رفتہ رفتہ تدریجی نشوونما ہو سکتا ہے۔ اسیلیے والدین کا اولاد کو بات بات پر ٹوکنا، اور اُنکے تمام جزئیات کو اعلیٰ اخلاقی معیار پر مکمل پانے کی توقع رکھنا خود اُنکی خام خیالی ہے۔

(۳) بچوں کے حق میں محض عیسیٰ آلہ کی طرح برتاؤ نہ کرو۔

یاد رکھو کہ بچہ کے افعال کی ان قدرتی سزاؤں کے علاوہ جو مختلف حالات کے اثر سے اسپر عائد ہوتی ہیں، تمھاری خوشنودی یا ناراضی بھی ایک قدرتی سزا ہے۔ ہمکو جس طریقہ پر اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ جو سزائیں فطرت نے رکھی ہیں، اُنکے بجائے مصنوعی سزاؤں اور والدین کی ناراضی کو رکھا جاتا ہے، لیکن ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں کہ قدرتی سزاؤں کے ساتھ ساتھ بھی انکو استعمال نہ کرنا چاہیے۔ یہ بیشک نہ ہونا چاہیے کہ، دوم درجہ کی سزا، اول درجہ کی سزا کی جگہ غصب کرلے، تاہم اسے اول درجہ کی سزا کے ساتھ، بطور ضمیمہ اعتدال کے ساتھ شامل کر دینا مناسب ہے۔

(۴) احکام کی تعداد میں کمی کرو۔ حکم صرف اُسوقت دینا چاہیے جب وسائلِ تربیت بچہ کی سمجھ سے باہر ہوں، یا وہ ناکام رہے ہوں۔ اسکے علاوہ تمھارے احکام کا محرک، تمھارا ذاتی رنج یا غصہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ اُسکا مقصود صرف بچہ کی اصلاح، اور اسکے قصور پر ملامت ہونا چاہیے۔

(۵) مگر جب کبھی حکم دو، قطعیت و استقلال کے ساتھ دو۔ اگر صورتِ واقعہ تمھیں تحکم پر مجبور ہی کر رہی ہے، تو اپنا حکم ناطق جاری کرو، اور پھر ہرگز اُس سے انحراف نہ کرو۔ جو حکم دینے والے ہو، اُسکے تمام پہلوؤں کو سوچ لو، اُسکے تمام نتائج کا وزن کرلو، اور اس بات پر غور کرلو کہ تمھارے ارادہ میں کافی استقلال ہے یا نہیں۔ پھر جب آخرکار ایک قانون بنالو، تو چاہے کتنا ہی نقصان ہو، اُسکی تعمیل پر زور دو۔ تمھاری سزائیں اُن سزاؤں کے مشابہ ہونی چاہئیں، جو موجوداتِ غیر ذی روح دیتے ہیں، یعنی اٹل ہونا چاہیے۔ بچہ جب پہلی مرتبہ آگ کے قریب ہاتھ لیجاتا ہے، تو گرمی محسوس کرتا ہے، دوسری مرتبہ بھی محسوس کرتا ہے، سہ بارہ بھی یہی ہوتا ہے، یہاں تک کہ اُسے یقین ہو جاتا ہے، کہ آگ ہمیشہ جلائے گی۔ پس اگر تم بھی اپنے احکام میں مستقل رہو، تو قوانینِ قدرت کی طرح، تمھارے قوانین کی وقعت بھی اُسکے ذہن میں پیدا ہو جائے گی۔ ورنہ یاد رکھو کہ تمھارا ہر تلوّن، تمھاری ہر کمزوری، بچہ کو عدول حکمی کی ترغیب دے رہی ہے۔

(۶) بچہ کے عقلی نشوونما کے ساتھ اپنی تحکمانہ مداخلتوں کو کم کرتے جاؤ۔

تربیت کا مقصد ایسے شخص کا پیدا کرنا ہونا چاہیے، جو اپنے نفس پر آپ حکومت کر سکے، نہ ایسا کہ جسکے اوپر دوسرے حکومت کریں۔

اگر تمھاری اولاد کی قسمت میں دائمی غلامی لکھی ہو، تو بیشک اُنھیں جس قدر غلامی کا خوگر بناؤ، بہتر ہے، مگر چونکہ انھیں رفتہ رفتہ آزاد ہونا ہے، اس لیے جب وہ تمھارے زیر نظر ہیں، اُسی وقت سے اُنھیں اپنے نفس پر قابو رکھنے کی عادت ڈلواؤ۔ اس لیے جوں جوں اُنکی عقل میں نمو ہوتا جائے اپنی روک ٹوک میں کمی کرتے جاؤ۔

(۷) اگر بچہ زیادہ ضد اور خود رائی ظاہر کرے تو اُسکا افسوس نہ کرو۔

اگر ہمیں آیندہ نسل میں آزادیٔ رائے و اجتہاد فکری کی اسپرٹ پیدا کرنا مقصود ہے تو اُسکا لازمی مقدمہ یہ ہے کہ اُن میں بچپن ہی سے آزادیٔ افعال کا، حدودِ جائز تک نشوونما ہونے دو۔

(۸) آخری نصیحت یہ ہے، کہ صحیح طریقہ پر بچوں کو تربیت دینا آسان نہیں، بلکہ ایک پیچیدہ و مشکل کام ہے۔ اس لیے اگر کوئی کامیاب اخلاقی

معلم ہونا چاہتا ہے، تو اُسکے لیے مطالعہ، ذہانت، محنت، و نفس کُشی کے مجموعہ سے تیار رہنا لازمی ہے۔

اسپنسر کے نصائح ختم ہوچکے۔ لیکن ہمارے نزدیک جو نکتہ اخلاقی و عقلی دونوں چیزوں کی تربیت میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اسے اسپنسر نے تصریح کے ساتھ کہیں نہیں بیان کیا، اور وہ سائیکالوجی کا یہ زبردست قاعدہ ہے کہ "عملی نمونہ ہمیشہ زبانی ہدایت سے زیادہ کارگر و موثر ہوتا ہے" اسی لئے والدین و معلمین کے لیے شرطِ اولین یہ ہے، کہ وہ خود، اپنے بچوں کے لیے اخلاقی نیز عقلی حیثیت سے ایک زندہ نظیر ہوں، ایک مکمل نمونہ ہوں، جسکی تقلید کے لیے بچوں کا نفس اُنھیں غیر محسوس طور پر یعنی Unconsciously مجبور کرے گا۔

(ج) جسمانی تربیت۔ صحت جسمانی، جسم کی عام کیفیت سے عبارت ہے، اس میں عموماً جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اُنکے اسباب تحلیل ہوکر آخر کار ذیل کے چار عنوانات پر ٹھہرتے ہیں:۔

(۱) غذا کی خرابی سے،

(۲) لباس کی خرابی سے،

(۳) ورزش نہ کرنے سے،

(۴) دماغی محنت زیادہ از اعتدال کرنے سے۔

اسپنسر نے اس موضوع پر بجائے اصولی مباحث چھیڑنے کے، مرض کے انھیں اسباب اربعہ کو کسی قدر پھیلا کر بیان کردیا ہے، اور اُسکے پیش نظر مقصد کے لیے اتنا کافی تھا، اس لیے کہ مذکورۂ بالا بد احتیاطیوں سے بچنے ہی کا نام صحت ہے، اور قوانین صحت کے سمجھنے اور سمجھنے کے بعد انکے برتنے ہی کیلیے دوسرا لفظ، تربیت جسمانی ہے۔

سب سے پہلے غذا کی خرابیوں کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ غذائی بد احتیاطی کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یعنی ایک کمیت یا مقدار کے لحاظ سے بد احتیاطی دوسرے کیفیت، و نوعیت غذا کے لحاظ سے۔ پھر ان میں سے کمی بد احتیاطی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک پُرخوری، یعنی بھوک سے زیادہ کھالینا، دوسرے کم خوری، یعنی بھوک سے کم کھانا۔ عام خیال ہے کہ کم خوری بہرحال مستحسن ہے لیکن اسپنسر اس استدلال کی بنا پر کہ انسان و نیز دیگر حیوانات کے بہترین رہبر خود اُنکے طبعی خواہشات ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بچوں کے لیے بھوک سے کم کھانا مضر ہے۔ لہٰذا انھیں جب جب اشتہائے صادق معلوم ہو، کھانا کھانا چاہئے۔ یہاں تک کہ اُسکے نزدیک پُرخوری اور کم خوری اگرچہ دونوں یکساں مُضر ہیں، تاہم بہ اعتبار مضرت کے لحاظ سے اول الذکر بہتر و قابل ترجیح ہے۔ ایک مستند طبی شہادت کے حوالہ سے کہتا ہے کہ

اگر کبھی خوب ڈٹ کے کھا لیں، تو اسکے نتائج بھوکے رہنے کے مقابلہ میں کم مضر ہوتے ہیں، اور ان کا تدارک زیادہ آسانی سے ہوسکتا ہے۔

اسپنسر کا یہ دعوے اگرچہ بخوبی ثابت نہیں، اس لیے کہ جس طبی شہادت کا اُسنے حوالہ دیا ہے، اُس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ کبھی اتفاقی طور پر زیادہ کھالینا، اتفاقی کم خوری سے بہتر ہے، اور اس نتیجہ کی صحت سے بھی کسی کو انکار نہیں، بلکہ سوال یہ تھا کہ دائمی پُرخوری اور دائمی کم خوری میں کون نسبتاً قابل اختیار ہے۔ لیکن خیر، یہ سوال چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل مسئلہ جس پر اسپنسر و اُسکے مخالف خیال رکھنے والے دونوں متفق ہیں، وہ یہ ہے کہ بچوں کو اپنی اشتہا کے موافق کھانا چاہیے، اور افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہیے، اول الذکر سے تو اس لیے کہ اُسکا نتیجہ یقیناً سوء ہضم اور سلسلۂ امراض ہے، اور آخر الذکر سے اسلیے کہ کم خوری سے ان میں طاقت کم آئے گی اور اس طرح آیندہ نسل جوان ہوکر بھی کمزور رہیگی۔

مقدار غذا کے مساوی اہمیت رکھنے والا سوال، نوعیت غذا کا بھی ہے۔ بعض حلقوں میں ایک عام خیال پھیل گیا ہے کہ بچوں کے لیے مقوی غذا مضر ہے۔ بلکہ اُنھیں نہایت ہلکی غذا دینی چاہیے۔ اور اس بنا پر انھیں گوشت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ لیکن اسپنسر، علم الحیات اور طب کے قوانین کی بنا پر اس عقیدہ کی پوری تردید کرتا ہے، اور یہ ثابت کرکے کہ گوشت خوری جب تمام

بالغ و سن رسیدہ اشخاص کے لیے عموماً مفید ہی، تو بچے اس قانون سے کیوں مستثنیٰ ہوں؟ ہاں صرف شیرخوار بچہ کے معدہ کے لیے البتہ گوشت شاید ناموافق غذا ہو، اس لیے کہ اُس میں عضلاتی قوت ابھی کافی طور پر نہیں ہوتی، جو گوشت کے ہضم کے لیے ضروری ہی۔ لیکن اوّلاً تو یہ نقص محض اُس گوشت پر عائد ہوتا ہی جسکے ریشے نکال لیے جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ شیرخواروں (یعنی دو ڈھائی سال کے بچوں) کے لیے کوئی شخص گوشت خوری کی وکالت بھی نہیں کرتا۔

تیسری ہدایت، غذا سے متعلق اسپنسر یہ کرتا ہی کہ خوراک میں تنوع ہوتا رہنا چاہیے۔ یعنی مختلف اوقات میں اور نیز ایک ہی وقت میں مختلف اقسام کے کھانے ہونے چاہییں، اس لیے کہ علم افعال الاعضا میں ثابت ہو چکا ہی کہ تنوعِ غذا معدہ کے لیے ایک قوی محرک ہی، اور اس سے ہضم میں بہت سہولت ہوتی ہی۔ لیکن اس تنوع میں بھی اعتدال رہنا چاہیے۔ بہت کثرت سے کھانوں کا مختلف ہونا بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتا ہی۔

غذا کی طرح لباس میں بھی ہمیں بچوں کے احساسات پر کامل اعتماد رکھنا چاہیے۔ یعنی سردی و گرمی کے ناگوار حالات سے جسم کو محفوظ رکھنا لباس کی علت غائی قرار دینا چاہیے۔ اس بنا پر اسپنسر کی پہلی نصیحت یہ ہی، کہ

۱۔ بچوں کا لباس ہرگز اس قدر زیادہ نہ ہونا چاہیے، جس سے حرارت پیدا ہو؛ اور ہمیشہ اس قدر کافی ہونا چاہیے کہ سردی کا عام احساس نہ ہو۔

اسکے علاوہ، اُسکے نصائح ذیل بھی قابل لحاظ ہیں: ۔

۲۔ روئی۔ سن، یا مخلوط بناوٹ کے باریک کپڑوں کے بجاے، کسی عمدہ مادّہ کا کپڑا ہونا چاہیے، جس سے جسم کی حرارت باہر نہ نکلنے پائے۔ مثلاً دبیز اونی کپڑا

۳۔ کپڑا ایسا مضبوط ہونا چاہیے، جو طفلانہ کھیل کود کے باعث گھسنے اور پھٹنے سے محفوظ رہے۔

۴۔ اُسکا رنگ ایسا ہونا چاہیے کہ استعمال میں آنے اور کھلے رہنے سے جلد اُڑ نہ جائے۔

تربیت جسمانی کے ذیل میں تیسرا عنوان ورزش کا ہی۔ لیکن چونکہ عموماً لوگ ورزش اور اُسکے فوائد، اور اسکی اہمیت سے از خود واقف ہیں، اسپنسر کو اسکے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ اس سلسلہ میں وہ جن امور پر زور دینا چاہتا ہی وہ صرف دو ہیں ۔

اوّلاً یہ کہ ورزش کو لڑکوں تک محدود نہ رکھا جائے، جیسا کہ عام دستور ہی، بلکہ لڑکیوں کو بھی اس میں مساوی شرکت کا موقع دیا جائے۔ جو قوانین حیات لڑکوں کے لیے ہیں، وہی لڑکیوں کے لیے ہیں؛ جو اصول ایک کے لیے ہیں، وہی دوسرے کے لیے بھی؛ یہ نہیں کوئی وجہ نہیں ہی کہ محض رسمی شرم و مصنوعی حیائی خاطر، لڑکیوں کو ورزش کا موقع نہ دیکر، اُنکو ساری عمر کے لیے کمزور و ناتوان رکھی جائے۔ والدین ان معنوں کو سمجھنا چاہیے کہ جس شے کو وہ لڑکوں کے لیے منافی خیال کرتے ہیں، یعنی حسن صورت اسکا حصول بھی تا تر صحت جسمانی پر منحصر ہی۔ ورزش نہ کرنا، رخساروں کی سرخی کا نہیں بلکہ زردی کا باعث ہو سکتا ہی۔

دوسرے یہ کہ بچوں کے حق میں بجاے جمناسٹک وغیرہ مصنوعی ورزشوں کے، کھیل کود، دوڑ دھوپ، کی قدرتی ورزشیں زیادہ مفید ہیں۔ کچھ تو اسلیے کہ جمناسٹک وغیرہ میں بہ نسبت کھیل کود کی حرکتوں کے تنوع بہت کم پایا جاتا ہی اور اس سے جسم کے سارے حصوں میں محنت کی مساوی تقسیم نہیں ہوتی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ بعض اعضا پر زیادہ بار پڑ جاتا ہی، اور اس طرح مختلف حصص جسم کے نمو میں تناسب نہیں قائم رہتا اور زیادہ تر اس لیے کہ ان مصنوعی ورزشوں سے بچوں کو بجاے فرحت حاصل ہونے کے تکان بہت جلد ہو جاتا ہی۔ برخلاف اسکے کھیل کود سے انھیں دلی فرحت حاصل ہوتی ہی، اور یہ ایک مسلّمہ طبی مسئلہ ہی کہ "فرحت تمام مقویات سے بڑھکر ہی"۔

تربیت جسمانی کی بحث ناتمام رہ جاے گی، اگر اس میں صحت کے سب سے بڑے، مگر مخفی دشمن کا ذکر نہ کیا جائے، اور وہ زائد از اعتدال دماغی محنت ہی۔

یہ امر بظاہر سخت حیرت انگیز ہی کہ آج بیسویں صدی میں، جبکہ حفظان صحت کے اصول سے تجربہ واقف ہو گیا ہی، اور جبکہ طبی امداد و طبی مشوروں سے فائدہ اُٹھانے میں بے حد سہولتیں پیدا ہو گئیں، نئی نسل، بجاے کثیر التعداد

تنومند و قوی ہونے کے، پستہ قد، منحنی و ضعیف الجثہ ہوتی جا رہی ہی، اور گزشتہ نسلوں سے موازنہ کرکے کہا جا سکتا ہو کہ اس میں جسمانی انحطاط ہی۔ اس انحطاط کا خاص باعث یہ ہو کہ ہماری تعلیم گاہوں، اسکولوں، کالجوں میں علی العموم جو نصاب تعلیم ہوتا ہی، وہ ہمیں حد مناسب سے زائد دماغی محنت پر مجبور کرتا ہی۔ مگر چونکہ بقول اسپنسر کے۔

فطرت بہت سخت محاسب ہی، اور جس قدر خرچ کرنے کے لیے وہ آمادہ ہی، اگر تم کسی مد میں اُس سے زائد کا مطالبہ کرو، تو وہ کسی دوسری مد سے کاٹ کر اپنا حساب برابر کر لیتی ہی۔ اور اسی واسطے جسم کی محدود قوت سے، ایک مقدار مقررہ سے زیادہ نتائج حاصل کرنا ناممکن ہی۔

اس لیے دماغ پر جب ضرورت سے زائد بار پڑ جاتا ہی، تو جسم کی ساری نمو بخش قوتوں (مثلاً خون) کا رُخ اُسی طرف پھر جاتا ہی، اور دیگر اعضاء جسم گویا فاقہ کشی کرنے لگتے ہیں۔ اسپنسر نے انگلستان کے بعض مدارس کی مثالیں پیش کی ہیں، جن طلبا کو لازمی طور پر ۱۳۔۱۴ گھنٹہ روزانہ پڑھنا ہوتا تھا، اور اسکا لازمی نتیجہ طلبا میں، سوء ہضم، قبض، اسہال، اختلاج قلب، عام اضمحلال و لاغری کا پیدا ہو جاتا تھا، جس سے بعض مرتبہ تپ کہنہ اور دق کی نوبت آ جاتی تھی۔ (اسپنسر جیسے مصلحین کی جد و جہد سے اب انگلستان کے مدارس کی تو یہ حالت نہیں رہی، لیکن ہندوستان کے اسکولوں و کالجوں کا جو حال ہی، وہ ہر شخص بچشم خود دیکھ رہا ہی) لیکن اگر ۱۳۔۱۴ گھنٹہ روزانہ کی دماغی محنت، غیر معتدل ہی، تو معتدل دماغی محنت کے لیے کتنے گھنٹے روزانہ کا اوسط قرار دینا چاہیے؟ یہ ایک ضروری سوال ہی، جس کا جواب اسپنسر سے نظر انداز ہو گیا ہی، مگر ہم عام طبی، اصول کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹہ روزانہ، ورنہ ضعیف الجثہ لوگوں کے لیے اس سے کم۔

پھر تنہا دماغی محنت کی افراط اتنی مضر نہیں، جتنا وہ خاص طریقہ مضر ہی، جس سے ہمارے دماغ سے، کالجوں و اسکولوں میں کام لیا جاتا ہی، اور وہ طریقہ الفاظ کو حفظ کرنے اور ازبر کرنے کا ہی۔ طوطے کے مثل رٹ لینے سے جو خاص نقصانات ہوتے ہیں، اگرچہ وہ جسمانی اور ذہنی صحت سے یکساں تعلق رکھتے ہیں، مگر اسپنسر نے انھیں تربیت جسمانی کے زیر عنوان رکھا ہی:۔

(۱) یہ طریقہ خراب ہی اس لحاظ سے کہ جو کچھ علم اس سے حاصل ہوتا ہی وہ جلد فراموش ہو جاتا ہی۔ جس طرح جو غذا، بغیر چبائے ہوے اوپر تلے نگل لی جاتی ہی، وہ جزو بدن نہیں ہوتی اور معدہ اُسے فوراً نکال دیتا ہی، اُسی طرح رٹے ہوے معلومات بھی دیرپا نہیں ہوتے۔ رٹنے والے پاس شدہ طلبا کو دیکھو کہ امتحان کے بعد اپنا کورس کتنا جلد بھول جاتے ہیں۔

(۲) خراب اس لحاظ سے کہ چونکہ اس طریقہ سے بچہ کو دلچسپی نہیں پیدا ہوتی اسلیے آخرکار اُسکا ذہن علم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

(۳) خراب اس لحاظ سے، کہ اس سے تعلیم کا مقصد اصلی، یعنی "انضباط علم" فوت ہوتا ہی۔ ممکن ہی کہ قوی الحافظہ آدمی اپنے دماغ میں بہت سے معلومات ٹھونس لے، لیکن چونکہ وہ مرتب و مربوط نہیں ہوتے اسلیے اُن سے کام نہیں لے سکتا۔

(۴) خراب اس لحاظ سے، کہ چونکہ یہ صحت جسمانی کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اگر اس طریقہ سے انسان کامیاب بھی ہو گیا، تو زندگی کا لطف نہیں حاصل کر سکتا، ایسی دولت و شہرت سے انسان کو کیا لطف مل سکتا ہی جسکا لازمی ضمیمہ مراق یا اختلاج ہو؟

(۵) خراب اس لحاظ سے، کہ یہ جسم کو لاغر و ناتوان کر کے، قوت ارادی و مستعدی کو ضعیف کر دیتا ہے، جس کے بغیر انسان اپنی عقل سے کچھ کام نہیں لے سکتا۔

الغرض، غذا، لباس، ورزش، اور دماغی محنت میں اعتدال یہی چار چیزیں ہیں، جن پر عمل درآمد کرنے سے، اسپنسر کی راے میں جسمانی تربیت پوری طرح پر حاصل ہو سکتی ہی، اور ہمارے نزدیک اگر اس میں ایک چیز، یعنی انضباطِ وقت کا اور اضافہ کر دیا جائے، تو یہ فہرست بالکل مکمل کہی جا سکتی ہے۔

"متعلم"

# ہمارے تمدنی تصورات میں انقلاب

اہل نظر اور ارباب فکر اُن تغیرات سے واقف ہیں جو کچھ مدت سے مہذب دنیا کے خیالات و قیاسات میں نظر آ رہے ہیں۔ اسکی علت چارلس ڈاروِن کی بیس سالہ تحقیقات، غور و فکر، مشاہدہ اور سیاحت کے نتائج کی اشاعت قرار دیجاتی ہے۔ علمی تصورات کا انقلاب مسئلۂ ارتقا بذریعہ انتخاب طبعی یعنی "نیچرل سیلکشن" سے منسوب کیا جاتا ہے۔ خود انسان عمل ارتقا کا اعلیٰ ترین نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ بریں وجہ جملہ علوم میں ایک نیا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ علم انسان اور اُسکی تمدنی ترقی کے مسائل پر بھی ارتقائی پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔ اخلاقیات، سیاسیات، اقتصادیات، دینیات، اور فلسفہ کے تمام مسائل بھی اسی عالمگیر قانون کے تابع کیے گئے ہیں۔ اور اب انپر اسی اصول کی روشنی میں بحث کیجاتی ہے۔ صدیوں کے تصورات اور مفروضات، اور علمی مسلمات تہ و بالا ہو گئے ہیں۔ الغرض ایک نہایت عظیم الشان انقلاب خیالات میں واقع ہو رہا ہے۔ پُرانے اصولوں سے انکار اور اصول ارتقا کا اقرار ہر عالم اور محقق کی زبان پر ہے۔ یہاں پر مجھے خصوصیت کے ساتھ یہ دکھانا منظور ہے کہ ہمارے خیالات دربارۂ نظام تمدن پر ارتقا کا کیا اثر ہوا ہے۔ مگر اس سے قبل ارتقا کا تذکرہ لازم آتا ہے۔ کیونکہ بالعموم لوگ اس مسئلہ کی ہیئت اور معنی سے بخوبی ماہر نہیں ہیں۔ اور اسکی نسبت اُنکا علم "بندر سے انسان بننے" ہی تک محدود ہے۔

عام خیالات اور تصورات میں انقلاب

## مسئلۂ ارتقا کی تاریخ

"کون و فساد" کے معنی میں ارتقا نیا مسئلہ نہیں بلکہ پرانا ہے۔ یعنی کئی پرانے فلاسفر جن میں مشہور ہند و فلاسفر کپیل[۱] بھی ہے۔ یہ مانتے تھے کہ عالم اور ما فی العالم شروع سے اسی صورت میں نہیں ہیں جو ہمیں اب نظر آ رہی ہے، بلکہ عمل تغیر سے اُنکی صورتیں

کون و فساد کا خیال بہت پرانا ہے

---

[۱] مہرشی کپیل نے ارتقا کی دو صورتیں مانی ہیں۔ ایک تو "العالم متغیر" اور دوسرا اشیا سے ذی اعضا کا بتدریج پیچیدہ اور مرکب صورتیں قبول کرنا۔ اصول العالم متغیر تو اُسکے فلسفہ کی جان ہے۔ اور دوسری صورت محض اسکی شاخ ہے۔ کپیل کے اصول العالم متغیر (Cosmic Evolution) کو کماحقہ سمجھنے کے لیے پرش اور پرکرتی کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ دنیا کے مظاہر معروف کا اصلی مبدا (Noumenon) پرکرتی ہے۔ پرش "شعور مجہول" کا اصل اصول ہے۔ دنیا کے تمام مظاہر کی تہ میں تین قوتیں ہیں (۱) رجس۔ یعنی قوت متحرک (۲) تمس۔ یعنی قوت انفصال (۳) تیسری قوت ان سے بالکل نرالی ہے جو حرکت و سکون میں موافقت پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک عمل تغیر میں قوت مثبت قوت منفی اور قوت ارتباط ہوتی ہے اور انکی متوازن حالت یعنی ان سب کے مساوات کے ساتھ موجود ہونے کا نام پرکرتی ہے اور انکا توازن حالت سکون ہے جو حالت تغیر کی ضد ہے۔ سچ پوچھو تو یہ مجردات فلسفہ سے ہے۔ پرکرتی اپنی محسوس صورت میں پردھان یعنی دنیائے ظہورات کہلاتی ہے اور مختلف صورتوں میں اپنی قوت اور اہلیت کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر پرکرتی یا پردھان (کائنات) پرش سے لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے۔ پرکرتی کا پرش کے بغیر تصور کرنا محال ہے۔ پرش کا وجود سنسار پر ارتعاش یعنی اس تعلق باہمی سے عیاں ہے۔ مگر پرکرتی غیر ذی عقل اور متحرک ہے۔ پرش ذی عقل مگر ساکن ہے۔ پھر ارادت کی فعلیت، تخیل کی تحریک، اور اسکا سکون کیسے پیدا ہوتا ہے؟ کپیل اسے اصول العالم متغیر سے منسوب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گو پرش عدم فعلیت کی حالت میں اور شعور مجہول سے بہرہ یاب ہے تاہم وہ پرکرتی کے عمل پر حکمراں ہے کیونکہ پرکرتی ہر جگہ موجود ہے۔ جیسے مقناطیس کی کشش لوہا قبول کرتا ہے ویسے ہی پرکرتی پر پرش کا اثر ہوتا ہے یعنے اسکی ہدایت یا بالفاظ دیگر روح کی حکومت کائنات پر اسکی قربت کی وجہ سے ہے جیسے مقناطیس کی نزدیکی سے لوہا ترکت کرتا ہے (پہلا کھنڈ ۹۶ اشلوک) اس اصول کو قبول کرنے سے یہ ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام مظاہر پرکرتی کے پرش کے پاس ہونے کی وجہ سے انقلابات اور تغیرات ہیں۔ پرکرتی سے اسی طرح پہلے ارادت کی فعلیت اور تخیل کا عمل مخرج ہوتا ہے۔ پرکرتی عمل ارتقا سے اپنے وجود سے ارادت اور تخیل کے خانے یا پنجر پیدا کرتی ہے جسکے اندر پرش رہتا ہے[۲]

بدلتی چلی آتی ہیں۔ ابتدائے عالم میں نہ تو انواع و اقسام کے اتنے نباتات تھے اور نہ مختلف قسم کے اتنے جاندار تھے۔ چند ہزار سال پیشتر انواع انسانی بھی اتنی نہ تھیں جتنی اب دنیا کے ہر گوشہ میں تمدنی ترقی کی مختلف منزلوں میں نظر آ رہی ہیں، مگر حصول ارتقائے انسانی اور اسکی وجہ سے نئے تمدنی حالات و مسائل کا بیان یہاں منظور نہیں ہے۔ ڈارون کی مشہور کتاب ابتدا الانواع (ORIGIN OF SPECIES) کی اشاعت سے پیشتر کئی عالم اور محقق ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ارتقا کا تصور پیش کیا تھا

**ڈارون سے سو برس پیشتر کی حالت**

اسکا مختصر ذکر مناسب ہے۔ ڈارون کی کتاب محولۂ بالا کی اشاعت سے پیشتر کئی عالموں نے ارتقا کا تصور پیش کیا تھا جسکی ابتدا اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں ہوئی تھی۔ جرمنی کے مشہور و معروف فلاسفر عمانوئیل کانٹ کے مسئلۂ سحاب (Nebular Hypothesis) کو فرانسیسی فلکی عالم لاپلاس اور مشہور انگریز محقق فلکیات سر ولیم ہرشل کی کوششوں سے سائنس کی تحقیقی صورت حاصل ہو چکی تو عالم کے ارتقائے طبعی کے خیال کی قبولیت کے لیے رستہ صاف ہو گیا۔ اور بیالوجی (علم الحیوۃ) کے کئی محقق علماء تحقیقات کی بنا پر یہ ماننے کو تیار ہو گئے تھے کہ انواع نباتی و حیوانی کی تدریجی صورتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور یہ قاعدہ مدت دراز سے کائنات میں رائج ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں فرانسیسی محقق بفون (Buffon) نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ پودھوں اور جانوروں کے درمیان صورتہائے متعلقہ کا پتہ چلتا ہے نیز اولاد اور والدین کی مشابہت باہمی کے اصول کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انکی ابتدا ایک ابتدائی جوڑے سے ہوئی ہے۔ لامارک (Lamarck) اور سینٹ ہلیر (St. Hilaire) نے جو فرانسیسی عالم تھے اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے تھے۔ لامارک کی رائے میں تمام انواع ایک یا چند ابتدائی صورتوں سے وجود پذیر ہوئی تھیں۔ گرد و پیش کے طبعی حالات اور رہائش کی وجہ سے جانوروں کے اعضا میں استعمال یا عدم استعمال سے ترقی ہوتی رہی اور اسی کی بدولت شکل و صورت و قد و قامت میں تغیر و تبدل ہوتے چلے آئے ہیں۔

**جرمن محققوں کی تحقیقات**

جرمنی اور انگلستان کے کئی محقق بھی اس نتیجہ کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ کانٹ کے نظریۂ سحاب کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ذی اعضا ہستیوں کی صورتیں تدریجی تغیر قبول کرتی چلی آتی ہیں۔ مشہور فلسفی شاعر فاضل گیٹی (Gœthe) اور طبعیات کے نامی عالم اوکن (Oken) نے یہ رائے دی کہ جانداروں کی صورتوں میں انقلاب پیدا ہوتا چلا آتا ہے۔ وولف جس نے علم جنین [Embryology] کی بنیاد قائم کی تھی، ہیکل، اور بیئر نے مضغہ کی نشو و نما اور رحم کے اندر کی تبدیلیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کرکے انسان اور جانوروں کے ارتقا کا خیال قائم کیا تھا۔ اس

---

لـه اور یہ کائنات کا اول تخم یا نتیجہ ہے جسے سحاب یا غیر معین وجود کہنا بجا ہو گا۔ اسکا مقصود اتھر (ظرف زمان) ہوتا ہے۔ پھر اس سے افرادی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو اہنکار یا شعور سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ پھر ارادت اور خیال کے ذخیرے اتھر سے پیدا ہوتے ہیں جیسے وہ جرم اہنکار تھا ہے۔ اتھر سے ظرف و زمان پیدا ہوتے ہیں۔ ارادت و خیال کے خانوں کے بعد شخصیت پیدا ہوتی ہے لنگ شریر (جسم اتھری) سے پانچ شعور و... یا تعلق ہے پانچ تن منترا یعنی حواس خمسہ کے اعضا پیدا ہوتے ہیں۔ پھر لنگ شریر سے جسم کثیف پیدا ہوتا ہے اور اسکے ساتھ دس گیارہ جسمانی حسیں پیدا ہوتی ہیں اور یعنی پانچ تن منتروں سے عناصر خمسہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہے اسکا ارتقائے عالم۔ اسکی دوسری شاخ یہ ہے کہ یہ لنگ شریر یا اہنکار سے شروع ہوتا ہے۔ کپل یا ہندو فلاسفروں کے خیال میں انسانوں، جانوروں اور درختوں کے محسوس رشتے نمایاں ہونے سے پیشتر ہر نوع اپنی اتھری جسم میں ہوتی ہے۔ کپل اسے جسم کثیف کا اصل مادہ قرار دیتا ہے۔ سانکھیہ کے پیرو کہتے ہیں کہ اجسام کثیف تخم، انڈے یا مضغہ سے ارتقا پذیر ہوتے ہیں وہ یہ دو وجودوں سے پیدا ہوتا ہے۔ انواع تخموں کے انقلاب سے پیدا ہوتی رہتی ہیں یعنی انواع سے بیج اور بیجوں سے انواع۔ یہ انقلابی چکر چلتا رہتا ہے۔ تغیر کا سلسلہ تخم یا انڈے یا مضغہ سے شروع ہوتا ہے۔ مگر تخم کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یہ پرش کے زیر نگرانی اسکے خادم یعنی لنگ شریر کے ذی شخصیت ذخیرے سے تیار ہوتا ہے۔ کپل کے مسئلہ ارتقا کا یہ مختصر خاکہ ہے جو مسٹر گشوری لال سرکار کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو چند سال ہوئے رسالہ "دی انڈین" میں شائع ہوا تھا۔ مغربی مسئلہ ارتقا سے اسے کیا نسبت ہے؟ اہل فکر خود فیصلہ کریں۔

گیٹی وغیرہ کے نظریہ کی تائید ہوئی۔ میکل نے ۱۸۱۲ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کوئی عالمِ فزیالوجی ایسا نہ ہوگا جسکے مشاہدہ میں یہ نہ آیا ہو کہ تمام جاندار وں کی ابتدائی صورت یکساں ہو"۔ ۱۸۳۲ء میں ہیٹر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اگر کائنات کی نسبت عقلانہ خیال ہی قائم کیا جائے تاہم اسوقت بھی یہ رائے درست ٹھہر سکتی ہو کہ انواع مستقل صورتوں سے آرہتے ہیں، اور انکی ظاہری صورت میں کوئی تغیر یا تبدیلی واقع نہیں ہوتی"۔ انگلستان میں کئی عالم مسلسل تغیر اور نشو و نما کے خیال کے

**برطانیہ کے عالموں کا خیال**

قائم ہو چلے تھے۔ ۱۷۹۸ء میں پادری میلتھس نے اصولِ آبادی پر ایک کتاب شایع کی تھی جس میں اُس نے تمدنی حالات کے انقلابات سے بحث کی تھی، اسی سے ڈارون کو انتخاب طبعی کے مسئلہ کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ادھر عالمانِ ارضیات کرۂ ارض کے طبقات کی ترکیب و رانکی ساخت کی تحقیقات میں مصروف تھے۔ مرچی سن، بکلینڈ، منٹل، لائل اور دیگر محققوں کی تحقیقات سے اس خیال کی کافی تصدیق اور تائید ہو چکی تھی کہ ہماری زمین ابتدا سے موجودہ صورت میں نہیں چلی آتی، بلکہ بتدریج اسکی ہئیتِ ظاہری میں انقلاب ہوتا چلا آیا ہو۔ نیز یہ کہ طبقات کی ساخت سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ انواع نباتی اور حیوانی بھی مختلف صورتیں اختیار کرکے اس درجہ تک پہنچے ہیں۔ سر چارلس لائل نے تو یہاں تک کہا کہ جو انقلابات اس وقت سطحِ زمین پر نظر آتے ہیں انھیں کی بدولت گذشتہ تغیرات بھی ہوتے رہے اور وہ اسی نوع کے تھے۔ مگر ان خیالات کی عام طور پر بہت مخالفت ہوئی۔ عالموں کی ایک کثیر جماعت انکی معقولیت تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی کہ انسان ارتقا کے عمل سے جانوروں کے طبقہ سے نکل کر ترقی کی اس اعلیٰ منزل تک پہنچا ہو۔ اسکی ایک وجہ تو دینی خیالات تھے اور دوسری یہ کہ اس مسئلہ کے حق میں مشاہدات اور تجربات کی بنا پر زبردست ثبوت پیش نہیں کیے گئے تھے جس سے اس کی صحت شک و شبہہ سے بالا سمجھی جاتی۔ ڈارون خود کہتا ہو کہ بڑے بڑے عالمانِ علمِ حیوانات و نباتات اور مشہور ماہرانِ ارضیات انواع کے تغیر کے قائل نہ تھے۔ جن عالموں سے میری بات چیت ہوئی وہ سب انواع کے استقلال و ثبات کے قائل تھے۔ لائل اور ہوکر نے بھی مجھ سے اتفاق نہ کیا گو وہ میری باتوں کو شوق سے سنا کرتے تھے"۔ آخر کار ڈارون کی معرکۃ الآرا

**اوریجن آف اسپیشیز کا اثر**

کتاب "ابتداء الانواع" شائع ہوئی جس سے دورِ جدید کی ابتدا ہوتی ہو۔ اس کتاب میں اُسنے انواع کے استحالہ کو اصول انتخاب طبعی کے تابع کیا ہو جسکا عمل از خود ہوتا رہتا ہو۔ نیز ضروری شہادت پیش کرکے مسئلۂ ارتقا کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہو۔ ڈارون نے عالمِ نباتات و حیوانات کے تغیرات نوعی و صوری کا اصولِ عظیم ظاہر کرکے اُسے عملِ ارتقا کے نام سے موسوم کیا ہو۔ اس سے انسان کے جسمانی، اخلاقی، اور تمدنی حالات کا مطالعہ و تحقیقات لازم ٹھیرا۔ انسان کو بھی اُن ہی اسباب کے زیر اثر سمجھنا پڑا جنکی بدولت انواع نباتی اور حیوانی کا استحالہ ہوا اور غیر ذی روح سے ذی روح بنی تھیں۔

اصولِ ارتقا کو تمدنی مسائل پر عائد کرنے میں بڑی دشواریاں درپیش ہوئیں۔ اوّل تو تمدن کو بحیثیت مجموعی اسکے تابع کرنا محال تھا۔ پھر وہ عقائد تھے جو صدیوں سے مروج چلے آتے تھے اور انھوں نے دلوں پر نہایت زبردست گرفت حاصل کر رکھی تھی۔ پھر انسان کے بنیادی خیالات جیسے اخلاقیات، سیاسیات، دینیات وغیرہ کے مسائل تھے جو ارتقا کے محکوم ہوکر خود نشو و نما کی گردش میں پھنسنے والے تھے یعنی انکو بھی اصول نمو کے تابع کرنا تھا۔ گویا ارتقا کو انسان پر عائد کرنا سیکڑوں برس کے خیالات و عقائد اور اصول کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر ایک نیا مسئلہ پیش کرنا تھا۔ خیر۔ رفتہ رفتہ انقلاب شروع ہوا اور انسان اور اُسکے متعلقہ حالات پر بھی اصول ارتقا سے غور و خوض ہونے لگا۔ مشہور و معروف انگریز عالم جارج رومینز کہتا ہو کہ "اصولِ ارتقا کی ہمہ گیری کا یہ اثر ہوا ہو کہ ہمارے جملہ علمی میلانوں اور خیالوں میں ایک ایسا عظیم انقلاب پیدا ہو گیا ہو جسکی نظیر تاریخِ عالم بہم پہنچانے میں قاصر ہے"۔

## بنی آدم کو عملِ ارتقا کے تابع کرنے کی ابتدائی کوشش

ڈارون کے مسئلہ کے متعلق دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں۔ ڈارون نے عملِ ارتقا کے حق میں جو شہادت پیش کی تھی اس سے بعض اصول ماخوذ ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر زندہ ہستی کی اولاد اس کثرت سے بڑھتی ہو

کہ وسائل زیست بالکل محدود اور غیر مکتفی ہوجاتے ہیں۔ بلا استثنا ذی اعضا وجود اتنی سرعت سے بڑھتے ہیں کہ اگر وہ برباد نہ ہوں تو ایک ہی جوڑے کی اولاد سے تمام جہان بھرجائے۔ دوم اس قوتِ پیدائش و افزائش کے ساتھ جانوروں کے اندر یہ جبلی خوبی موجود ہے کہ ایک خاص مدت کے اندر انکی اندرونی اور بیرونی ہیئت میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو، اور انکا کوئی فعل تغیر کے عمل سے بالا نہیں رہتا۔ اور یہ فرق والدین سے اولاد میں اور اولاد کی اولاد میں ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان واقعات سے جنکی صحت میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا انتخاب طبعی کا اصول[1] ماخوذ ہوا۔ ڈاروِن کہتا ہے کہ

> ہر نوع کے بہت سے افراد پیدا ہوتے ہیں مگر سب زندہ نہیں رہتے۔ جہد الحیوٰۃ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر اسکے اندرونی یا بیرونی ڈھانچہ میں ذرا سی بھی تبدیلی واقع ہوجائے تو اسے زندہ رہنے کا بہتر موقع ملجاتا ہے کیونکہ کشاکش زیست میں کامیابی ہونے کے لیے اُسے کوئی نیا وسیلہ یا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے گویا قدرت کی طرف سے زندہ رہنے کو منتخب کیا گیا ہے۔ وراثت کے زبردست اصول سے منتخب نوع نے نئی اولاد پیدا ہوگی۔ جس کے فطری ڈھچر میں تھوڑا سا فرق ہوگا۔

ڈاکٹر الفریڈ رسل والس کہتے ہیں کہ جس جانور کو قدرت کی طرف سے عمدہ وسائل اور سامان مہیا ہیں وہ جہد الحیوٰۃ کے مقابلہ میں اوروں پر سبقت لیجاتا ہے۔ یعنی بہترین جانور اس کشاکش میں کامیاب اور زندہ رہنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی اولاد کو بھی وہی طاقتیں بخشتا ہے جنکی بدولت اس میں جہد الحیوٰۃ کی قابلیت اور خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اس اصول کی تشریح ضروری تھی، کیونکہ انسانی سوسائٹی پر اسے عائد کیا گیا ہے۔

## اصول ارتقا کا اطلاق تمدنی مسائل پر

اصولِ ارتقا کی رو سے تمدنی مسائل پر سب سے پہلے ہربرٹ اسپنسر نے بحث کی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں اُسنے "ترقی" پر ایک مضمون لکھکر اصول انتخاب طبعی کو سوسائٹی پر بھی عائد کیا تھا۔ اس سے علم المعاشرت کے مسائل پر خاص اثر نمایاں ہوا۔ اور ذی اعضا ہستیوں کے ارتقا کا خیال بہت وسیع ہوگیا۔ انتخاب طبعی کے اصول کو تمدنی مسائل پر عائد کرتے وقت اس امر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ارتقاے تمدن کے تمام مظاہر اور واقعات اس اصول کے تابع کیے جاتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ سوسائٹی کی قابلیت مختلف افراد کی لیاقت[2] جہول کے مجموعہ سے جو انکے کردار انفرادی سے پیدا ہو کہیں بڑھ کر ہے۔ اسکی تائید روزانہ زندگی کے مشاہدہ سے ہوسکتی ہے۔ اور یہ خیال ترکیب و ترتیب مجلس، تقسیم محنت، ایک کام اور پیشہ کو چند خاص گروہوں تک محدود کرنے، اور خاص کر سوسائٹی کے وسیلہ سے اس علم و تجربہ کے اجتماع و انتقال کے نظام میں جنسے جہد الحیوٰۃ کی قابلیت اور طاقت پیدا ہوتی ہے منتج ہوتا ہے۔ اس سے ایک اور خیال بھی ماخوذ ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ارتقاے تمدن میں انتخاب طبعی کا عمل افراد پر براہ راست اثر نہیں ڈالتا بلکہ سوسائٹی کے وسیلہ سے انھیں متأثر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسکے معنے یہ ہیں کہ افراد کے فوائد مجلس کے فوائد پر مقدم نہیں ہیں۔ اسلاف کے فلسفۂ تمدن میں افراد کی نہیں بلکہ مجلس یا حکومت کی ہستی تسلیم کرلی گئی تھی۔ افراد اسکی فلاح و بہتری کو ترقی دینے کے لیے مخصوص

---

[1] پروفیسر کارل پیئرسن صاحب انسائیکلوپیڈیا برٹانکہ نہم ایڈیشن جلد آٹھ کے مقدمہ میں حسب ذیل لکھتے ہیں: مسئلہ ارتقا بذریعہ انتخاب طبعی چار باتوں پر مبنی ہے (۱) انواع کے خواص بدلتے رہتے ہیں (۲) خواص موروثی اور جبلی ہوتے ہیں (۳) موت کے ہاتھوں وہی ہستیاں جلد ہلاک ہوتی ہیں جنکے خواص اعلیٰ یا ادنیٰ ہوتے ہیں (۴) جو افراد جلد مرجاتے ہیں انکی اولاد بہت تھوڑی پیچھے رہجاتی ہے۔ یہ باتیں کس حد تک انسان پر عائد ہوسکتی ہیں (۱) انسان کی جسمانی اور عقلی خصوصیات بلاشبہہ بدلتی رہتی ہیں (۲) انسان اپنے بزرگوں کی عقلی اور جسمانی خوبیاں ورثہ میں پاتا ہے روحی اثر ایسا جلی و نمایاں ہوتا ہے کہ تین چار پشتوں میں انسان کی نسل میں تغیر واقع ہوسکتا ہے (۳) رشتہ داروں کی شرح موت پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی آدم کے درمیان تناسل اتنی فیصدی کے درمیان انتخابی موتیں ہوتی ہیں یعنی اُن افراد کے طبعی خواص ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مدت دراز تک زندہ نہیں رہ سکتے گویا قدرت نے انھیں زندگی کے پورے سامان نہیں دیے ہیں اسلیے وہ جلد مرجاتے ہیں (۴) برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ چھوٹی عمر میں مرجاتے ہیں اُنکی اولاد نہیں ہوتی پس ہم نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ڈاروِن کا مسئلہ بنی آدم کی حالت میں "خوشگوار نظریہ" نہیں بلکہ قانون ہے۔

[2] بنجمن کڈ۔ ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانکہ۔ نہم ایڈیشن جلد پنجم صفحہ ۱۰ -

ہیں۔ جن خوبیوں سے سوسائٹی کی قابلیت بڑھتی ہو انکے افراد کے اندر پیدا ہونے سے اصول انتخاب طبعی سے بالآخر ارتقاء انسان میں خاص نتائج پیدا ہونگے۔ ارتقاء تمدن بذریعہ انتخاب طبعی کا اصل اصول یہ ہے کہ افراد خود کو سوسائٹی کے تابع کر دیں۔ جن قوموں کے افراد اس عمل کا مقابلہ کرینگے انکی ترقی کا میدان بہت جلد تنگ ہو جائیگا۔ انھیں اُن قوموں کے سامنے سر جھکانا پڑیگا جن کے ممبر اپنے فوائد کو ملکی و قومی فلاح کے تابع کر دیتے ہیں۔ اخیر میں وہ نظام تمدن غالب آئیگا جس میں افراد کے حقوق کی نہایت اعلیٰ حفاظت ہوگی مگر وہ قومی فوائد کے محکوم ہونگے۔ جن عالموں نے اصول ارتقاء کو سوسائٹی پر عائد کیا تھا انھوں نے اس امر پر زور دیا تھا کہ اسے ایک ذوالاعضا جسم یا وجود تصور کیا جائے۔

**ہربٹ اسپنسر** مذکورہ صدر اصول ارتقاء کو مدنظر رکھکر ہربٹ اسپنسر نے ارتقاء تمدن پر بحث اُٹھائی تھی۔ اس نے ۱۸۶۰ء میں سوشل آرگنزم (نظام تمدن) کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جو بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اسپنسر نے اپنا فلسفۂ تمدن اسی پر مبنی کیا تھا اور دیگر عالم بھی اسی اصول سے ہدایت پذیر ہوتے رہے۔ دوسرے اس میں وہ دشواری بھی ظاہر کی گئی ہے جو ارتقاء مجلس پر اصول ارتقاء کے عائد کرنے میں پیش آتی ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نظام تمدن اور ذی روح جسم میں خاص مشابہت سمجھتا ہے۔ سوسائٹی کے ڈھانچہ اور جانور کے جسم میں چار امور مشترک پائے جاتے ہیں (۱) ابتدا میں ایک چھوٹا قبیلہ ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ بڑھکر ایک بڑی قوم میں تبدیل ہو جاتا ہے اسکے افراد کا شمار نامعلوم طور پر سیکڑوں گنا بڑھ جاتا ہے۔ (۲) شروع میں ڈھانچہ بہت ہی سیدھا سادہ ہوتا ہے مگر عمل نمو سے وہ بڑھتا، پھیلتا، اور پیچیدہ صورت قبول کرلیتا ہے، اور اسکی یہ پیچیدگی ہمیشہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ (۳) شروع میں اجزا ایک دوسرے کے محتاج نہیں ہوتے مگر جب ڈھانچہ بہت بڑھ جاتا ہے اور پیچیدگی اختیار کر لیتا ہے تو حصے ایکدوسرے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ آخرکار انکی احتیاج باہمی اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ انکی زندگی اور مصروفیت ایک دوسرے کی مدد و تحریک کے بغیر ناممکن ہو جاتی ہے۔

(۴) سوسائٹی کی ترقی اور ہستی اسکے افراد کی زندگی اور نمو سے بڑھکر ہوتی ہے اور اسکی نسبت زیادہ عرصہ تک رہتی ہے۔ افراد پیدا ہوتے، بڑھتے، کاروبار چلاتے، اولاد پیدا کرتے، اور مرجاتے ہیں۔ مگر نظام تمدن جو انسے مرکب ہے پشت در پشت قائم رہتا ہے۔ اسکا حجم، اسکی ترکیب اور اسکا اندرونی انتظام بڑھتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ جوں جوں سوسائٹی تمدن اور تمدنی لوازم میں ترقی کرتی ہے اسکے اندرونی ڈھانچہ میں تفریق در تفریق پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ حکومت کے مختلف شعبے اور انتظامات، سڑکیں، نہریں، راستے وغیرہ وسائل آمد و رفت اور پھر تجارتی، صنعتی، اور زرعی کاروبار کے پھیلاؤ وغیرہ معاملات وسعت پکڑتے ہیں۔ اسپنسر کہتا ہے :-

جانور کے جسم میں تو صرف کسی خاص حصہ میں حس پیدا ہوتی ہے مگر سوسائٹی کے تمام افراد حس سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ جسم میں سب اعضا کی بہتری نظام اعصاب کی فلاح کی تابع ہوتی ہے جسکی راحت بخش یا درد انگیز مصروفیتوں پر زندگی کی بھلائی برائی موقوف ہے مگر سوسائٹی میں یہ بات نہیں دیکھی جاتی۔ اگر افراد حکومت کے فائدہ کے لیے نہیں تو حکومت کیوں افراد کی بھلائی کے لیے ہو؟ یہ امر لازمی ہے کہ اجتماعی زندگی (Corporate Life) اجزا کی زندگی کے تابع ہو نہ کہ اجزا اجتماعی زندگی کے محکوم کیے جائیں۔

اسپنسر کی رائے میں "نظام تمدن" حکومت ہے، اور مذکورہ صدر اصول پر اُسنے اپنا فلسفۂ تمدن مرتب کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسنے انتخاب طبعی کو سوسائٹی پر کس طریقہ سے عائد کیا ہے۔ ڈارون نے خود نظام تمدن کے مطالعے اور تمدنی مظاہر کی تحقیقات پر زیادہ وقت صرف نہیں کیا تھا۔ اُسنے "ڈسینٹ آف مین" (DECENT OF MAN) میں چند فصلیں ان مسائل

**ڈارون کی رائے تمدن کی بابت** کے لیے وقف کی ہیں اور اُنسے ظاہر ہے کہ اُسے اصول انتخاب طبعی کو نظام تمدن پر عائد کرنے میں کچھ تذبذب تھا۔ اسکی رائے یہ تھی کہ ترقی یافتہ سوسائٹی میں انتخاب طبعی کچھ بہت کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

---

لہ مضمون مذکور۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانکہ صفحہ ۱۰ جلد ۵ دسویں ایڈیشن۔

نہایت متمدن قوموں کی مسلسل ترقی بہت تھوڑی حد تک انتخاب طبعی پر منحصر ہے۔ ہم مہذب لوگ عمل اخراج کے راستہ میں بہت سخت دقتیں حائل کر دیتے ہیں۔ بیماروں، اپاہجوں اور ناتوانوں کے لیے غریب خانے بناتے ہیں۔ لائق و تجربکار ڈاکٹر ہر شخص کی زندگی بچانے کے لیے دل و جان سے آخری وقت تک کوشش کرتے ہیں۔

**ڈاکٹر الفرڈ رسل والس کا خیال** | ڈاکٹر والس نے جو مسئلہ ارتقا کی اختراع میں ڈارون کے برابر کے شریک ہیں ۱۸۸۹ء میں "ڈارون ازم" (DARWINISM) یعنی "مذہب ڈارون" شائع کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس امر کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جسم کا مسلسل ارتقا تو مانتے ہیں مگر انسان کی ذہنی، اخلاقی، اور روحانی قوتوں کو عمل ارتقا کا نتیجہ نہیں سمجھتے۔ اس کتاب کی آخری فصل میں وہ لکھتے ہیں :-

انسان کی ذہنی اور اخلاقی فطرت کے بعض خاص حصے ہیں جو صرف اصول تغیر اور انتخاب طبعی سے نتیج نہیں ہو سکتے۔ بعض طاقتیں جن میں ریاضی، حسن پسندی کا میلان اور فلسفیانہ قوتیں شامل ہیں، جہد الحیوۃ میں ہرگز ہرگز کار آمد نہیں ثابت ہو سکتیں۔ اس لیے اصول انتخاب طبعی انکی توجیہ میں لاچار اور قاصر ہے۔

اس وجہ سے ڈاکٹر والس ان قوتوں کی نمو ان اسباب سے بالکل مختلف قرار دیتے ہیں جن سے زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے۔

**ہکسلے والس سے متفق الرائے ہے** | ہکسلے سب سے پہلے ڈارون کا معتقد بنا تھا مگر ۱۸۹۳ء میں "رومینز لیکچر" (ROMANES LECTURE) میں اصول انتخاب طبعی کو نظام تمدن پر عائد کر کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر ڈاکٹر والس عرصہ سے پہنچ چکے تھے۔ ہکسلے نے سوسائٹی کے اندر کے عمل اخلاقی کو عمل عام (Cosmic Process) یعنی سنگدلی کے بالکل متضاد ٹھہرایا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

تمدنی ترقی کے معنی سنگدلی کی قدم قدم پر مزاحمت کرنا اور اسکی جگہ دوسرے اسباب کو پیدا کرنا ہے۔ جیسے اخلاقی افعال جن کی علت غائی یہ ہے کہ صرف وہی افعال زندہ رہنے کے قابل ہیں جو اخلاقاً بہترین ہیں۔ نہیں جو ارد گرد کے فن مطابق اور طبعی قوتوں سے آراستہ ہیں۔ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ چونکہ پودے اور جانور جہد الحیوۃ سے اپنے اجسام کے کمال کو پہنچے اور اس سے "بقائے بہترین" منتج ہوتا ہے، اس وجہ سے انسان کو بھی بطور اخلاقی ہستی کے اسی عمل سے کمال حاصل کرنے کی توقع کرنا چاہیئے۔

## ارتقائے تمدن پر تاریخی نظر

جب ڈارون کے نظریہ کو عالموں نے قبول کر لیا تو ان میں سے کئی ایسے دل چلے اور بیباک تھے جنھوں نے انسان اور اُسکے تعلقات کو بھی ہمہ گیر عمل کے تابع کیا۔ اگر جسمانی اعضا اور قوائے اصول انتخاب طبعی کے مطابق کشاکش زیست میں تغیر اور ارتقا قبول کیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اخلاق، مذہب، تمدن، سیاسیات وغیرہ نے نہ کیا ہو۔ چنانچہ پروفیسر جارج رومینز نے ارتقائے ذہن، ہربرٹ اسپنسر نے ارتقائے اخلاقیات، پرنسپل ایڈورڈ کیرڈ نے مذہب، عقائد اور بنجمن کڈ نے تمدن اور خیالات کے ارتقا کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور اپنی تلاش و تجسس اور غور و فکر کے نتائج کو "سوشل ایوولیوشن" SOCIAL EVOLUTION میں پیش کیا۔ اس میں فاضل مصنف نے ہر پہلو سے انسانی مجلس کے ارتقا پر بحث کی ہے۔ اس مضمون کے بہت سے خیالات اسی مصنف سے ماخوذ ہیں۔

**تمدن کا پہلا مرحلہ** | شروع میں جب سوسائٹی ارتقا کی ابتدائی مرحلوں میں تھی تو جداگانہ کوششوں کی بجائے افراد مل جل کر کام کرتے تھے جس سے انتخاب طبعی کے مطابق نظام تمدن میں خوبی اور عمدگی پیدا ہوئی ہوگی۔ یعنی قبیلہ کی بہتری کے لیے افراد کی جداگانہ کوشش ایسی مفید نہ تھی جیسی سب کے اتحاد و اتفاق سے کام کرنے سے۔

**دوسرا مرحلہ** | اسکے بعد دوسرا مرحلہ آیا۔ جب قبیلہ کی بہبودی اور قابلیت ایک فرد واحد کی کوشش پر محدود رہی اور یہ سردار کی شخصیت تھی جو اپنی قوم کو ہمسایہ اقوام کے مقابلہ میں شاہراہ ترقی و آسائش پر کامیابی سے چلانے کے

لیے مختلف تجاویز کرتا تھا۔ اس طرح سوسائٹی میں ردوبدل ہوتے رہے جن میں قومی سرداروں کے خیالات کو بڑا دخل رہا یعنی یہ کہ آیا افراد کو سرداری سے الگ رہنا چاہیے یا اُسکے ماتحت اسکی دانشمندی و ہدایت کے تابع رہنا چاہیے۔ بہتری کا جیسا خیال غالب ہوتا ویسا انتظام اور ترتیب مجلس ترکیب قبول کرتی۔ اسی طرح ایک زمانہ آیا جب افراد نے قومی قابلیت اور اقتدار کو

**تمدنی نسل میں مذہب کا درجہ** اور سب باتوں پر مقدم قرار دیا۔ دوسروں سے الگ رہنا اور ان بزرگوں کی روحوں کی پرستش جنھوں نے قوم کی بہتری کے لیے جد و کوشش کی تھی اس زمانہ کے نظام تمدن کی خصوصیات میں۔ مذہب کو تمدن سے الگ کرنا دشوار تھا بلکہ قوم کے شیرازہ کو متحد اور مستحکم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ افراد کے چند تعلقات مشترک و عام ہوں جو اُنکی قومی قابلیت میں اضافہ کرنے کے باعث ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں قانون تجبر Law of Force سب سے اعلیٰ اور زبردست تھا۔ افراد کی بہتری کو حکومت کے تابع کیا گیا۔ لکھا یہ فرض تھا کہ جو کام کیا جائے اُس میں اجتماعی زندگی کی فلاح سب باتوں پر مقدم سمجھیں اور حکومت کا منصب اعلیٰ ملک گیری تھا جس سے نظام تمدن کا عظیم اصول "جسکی لاٹھی اُسکی بھینس" مرتب ہوا۔

## تمدنی تغیرات کا اصل محرک تخیل ہے

**تیسرا مرحلہ** اسکے بعد تیسرا مرحلہ نظام تمدن کے ارتقا کا آتا ہے جہاں افراد ایک طرف تو خود کو دوسرے طبقہ کے قبیلوں اور گروہوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے فوجی جمعیت کا مستقل اہتمام کرنے کو مجبور تھے ادھر ایسے تصورات سے اثر پذیر ہوتے تھے جن کی بدولت انسان کی ذمہ داری حکومت اور موجودہ ضروریات قومی کے ماسوا اور باتوں پر بھی حاوی تھی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس مرحلہ میں انسان اپنی اخلاقی ذمہ داری اور عالم غیر مرئی میں کچھ عرصہ کے بعد داخل ہونے کے میلان سے باخبر ہوگیا۔ کئی مذاہب کی شرع میں اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ قدیم ایرانیوں اور ہند دیگر قوموں نے فوجی انتظام کو معراج ترقی پر پہنچایا، ناشائستہ اقوام کو دنیا میں تمدن پھیلایا اور اس طرح انتخاب طبعی اور بقاے بہترین کا ثبوت بہم پہنچایا جیسا کہ یونانیوں اور رومیوں کی تاریخ سے عیاں ہے۔ اور اس سے بھی کچھ مدت پیشتر ہندوؤں نے اپنی تمدنی اہلیت کا ثبوت دیا تھا۔ اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ انسان اور اُسکے فرائض نظام تمدن کی ترکیب کے تصورات ایک بڑی حد تک اصول انتخاب طبعی اور تمدنی تغیرات کے محرک ہوتے رہے ہیں۔ جب یہ خیال غالب تھا کہ "ہم اکیلے کچھ نہیں کرسکتے بلکہ سب کو مل جل کر ترقی کی گاڑی کو چلانا چاہیے نیز یہ کہ افراد اجتماعی زندگی کی بہتری کو سب پر مقدم سمجھیں" تو نظام حکومت کچھ اور تھا اور سب کی ترقی اور عروج کی تمناؤں کا مرجع حکومت کی عظمت و شان تھی۔ اسی سے فوجی غلبہ کا خیال ماخوذ ہوا تھا۔ سوشل اسٹیٹیوشن مطلق العنانی اور شخصی جبر کے تابع تھے۔ لیکن جب کچھ مدت کے بعد یہ تصور بدل گیا تو اُسکے ساتھ نظام تمدن کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ آئین میں تغیر واقع ہوا اور اس طرح تمدن کی ترکیب کی نشو و نما ہوتی رہی۔

**چوتھا مرحلہ آزادی کا زمانہ** نظام تمدن کے انقلاب کا آخری مرحلہ یہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ پرانے خیالات تہ و بالا ہوگئے ہیں۔ ہم خود کو حکومت کی ترقی اور بہتری کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے بلکہ حکومت یا بقول ہربرٹ اسپنسر اجتماعی زندگی افراد کے لیے ہے۔ تمام جابرانہ آئین بدل دیے گئے ہیں غلامی موقوف کردی گئی ہے۔ افراد کی مساوات مسلمہ ہے۔ رواداری کا ہر طرف دور دورہ ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ تھا جب لوگ اپنی مرضی کے خلاف بعض عقائد کو ماننے پر مجبور تھے۔ مگر اسکے ساتھ زبردست قوتیں معرض وجود میں آگئی ہیں اور جن کی کشاکش اور رسہ کشی جاری ہے اُن سے اسلاف بالکل ناواقف تھے۔ جن خیالات پر غلامی قائم ہوئی تھی وہ خوردبرد ہوگئے ہیں، اور جن تصورات سے بعض گروہوں کا حکومت کے اندر غلبہ و اقتدار سمجھا گیا تھا وہ تتر بتر ہوگئے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں جن آرا کی وجہ سے

حکومت کی ملکی قوت کی تائید ہوتی تھی وہ مفقود ہو گئی ہیں۔ اب یہ خیال ہے کہ حکومت کی بلے یا اختیار رہستی مطلق کا نمایندہ نہیں ہو سکتا۔ اسی سے کئی ترقی یافتہ قوموں میں یکے بعد دیگرے مختلف پولیٹکل فریقوں کی حکومت قائم ہوئی ہے جیسے برطانیہ میں لبرل اور کنسرویٹیو اور ممالک متحدہ امریکہ میں ڈیماکریٹ اور ریپبلکن پارٹیاں باری باری ملک کا انتظام انجام دیتی ہیں۔ اس سے یہ بھی لازم آیا ہے کہ جو تجربہ تحقیق و تجسس نے ایک شعبہ میں حاصل ہوا ہے اس سے معروفیت اور کاروبار کے دیگر شعبوں میں مستفید ہونا مناسب ہے۔ سب آدمیوں کی جبلی مساوات کا اصول مسلمہ ہو گیا ہے جسکی بنا پر قومی بہتری کے معاملات میں سب کو ووٹ دینے کا عام استحقاق عطا کیا جانا ضروری ٹھہر گیا ہے اور اسی سے ملکی معاملات میں بلا امتیاز سب کو رائے دینے کا عام استحقاق عطا کیے جانے کی تحریک پیدا ہو گئی ہے۔ اور سب کے آخیر میں یہ خیال ہے کہ مال و متاع سب کے حصے میں برابر برابر آنا چاہیے تاکہ حکومت تمدنی معدلت گستری میں اتم الوجوہ کامیاب ہو۔ یہ مسائل بیسویں صدی کے نظام تمدن میں پیدا ہوئے ہیں جو ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ انھیں قوتوں کی بدولت آیندہ بھی تبدیلیاں اور انقلابات ہوتے رہیں گے۔ ایک زمانہ آئیگا جب ہمارے موجودہ تصورات تمدن اسی طرح ناقص و نامعقول ٹھہرینگے جیسے ہم متقدمین کے خیالات اور آراکو دقیانوسی اور مخالف ارتقا سمجھتے ہیں۔

**قابلیت فاضل کا خبط** مغرب کی قوموں کے درمیان جہد الحیوۃ کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک قوم دوسری سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے، اور انتخاب طبعی اپنا عمل و اثر دکھا رہا ہے۔ اس عمل کی خصوصیت "قابلیت فاضل" (Projected Efficiency) عرصہ سے چلی آتی ہے۔ جو قومیں اسکے زیر اثر ہیں انھیں ہر مرحلہ پر دوسروں سے دھینگا مشتی کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اسکے لیے فوجی قابلیت لازمی ٹھہرتی ہے۔ وہ تمام خوبیاں جو زمانۂ آیندہ کی عظمت سے تعلق رکھتی تھیں صدیوں تک ان کے ہاں بیکار پڑی رہیں بلکہ ترقی کی شاہراہ پر چلنے میں گلے میں سانپ بنکر لٹکی رہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ ضروریات کو مدنظر رکھکر انھیں نئے سامان بہم پہنچانے کی آفت سے الگ سا سنا رہا جس کی وجہ سے ارتقا کا عمل بہت دھیمی رفتار سے ہوتا رہا۔

**جہد الحیوۃ مغرب میں کس طرح جاری ہے** اسوقت جو جہد الحیوۃ ہو رہی ہے اس میں زندگی کی ذمہ داری کا اعلیٰ تر قانون کام کر رہا ہے۔ ہمارے فرائض جو تاحال حکومت سے بھی آگے پہنچ گئے ہیں جن کی وجہ سے ہم بیماروں کمزوروں، اپاہجوں اور بیکاروں کی بہتری کا انتظام کرتے ہیں، یا یوں کہو کہ یہ فرائض ہمارے موجودہ تمدن نے ہمپر عائد کر دیے ہیں اور اصول انتخاب طبعی کے رو سے انسے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کشاکش کے متعلق اس امر کو ذہن نشین کر لو کہ نہایت ترقی یافتہ قومیں موجودہ ضروریات کے اعتبار سے قومی قابلیت پیدا نہیں کر رہی ہیں بلکہ آنیوالی ضروریات زندگی کی رعایت ہے یا یوں کہو کہ وہ غیر متوقع واقعات اور ناگہانی مجادلہ کے لیے حتی المقدور اعلیٰ قابلیت اپنے میں رکھنا چاہتی ہیں۔ کچھ اسی قسم کے اصول سے تحریک پذیر ہو کر جرمنی نے تین ماہ ہوے اپنی سپاہ اور فوجی سامان بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ برطانیہ اسی خیال سے جنگی بیڑوں پر ہر سال کروڑوں روپیہ خرچ کرتا ہے۔ یہ "قابلیت فاضل" کا اصول ہے جو آج کل دنیا کی سب سے زیادہ مہذب قوموں کو فوجی اور مالی تیاریوں کی طرف مائل کر رہا ہے جب سے نظام تمدن کے اس آخری مرحلہ کا آغاز ہوا ہے یورپ کا تمدنی دیوتا "قابلیت فاضل" قرار دیا گیا ہے۔

**اصول ارتقا کو تمدن پر عائد کرنے کے نتائج** مسئلۂ ارتقا کو نظریۂ تمدن پر عائد کرنے سے جو انقلابات ہونے شروع ہوئے ہیں وہ ہنوز ابتدائی منزل میں ہیں۔ گو فلسفۂ سیاست پر اسکا کچھ اثر نمایاں ہوا ہے مگر اخلاقیات اور سائیکالوجی (علم النفس) کے خطہ میں اسکا اثر بہت کم نمایاں ہوا ہے۔ انسانی سوسائٹی اور انسانی ترقی کا جو نظریہ غالب چلا آتا ہے اس میں انسان کے نفس کی تمناؤں اور خواہشوں کو ہر قسم کی ترقیوں کا بانی اور محرک قرار

دیا جاتا ہی۔ گویا یہ معنوی نظریہ ہی، خارجی نہیں جو ارتقائی ہی۔ لیکن جو بحث بہ اصول ارتقا کے پہلو سے انسان کے تمدنی حالات سے بحث ہوگی ویسے ہی نفس اور اسکی خوبیوں کو تمدنی ارتقا میں غالب ماننا پڑیگا۔ جب یہ صورت ہوگی اور جب انسان کے قوائے عقلیہ و روحانیہ اور اخلاقی جذبات اور خواہشات بھی ارتقا سے ماخوذ سمجھی جائیں گی تو نظامِ تمدن میں انقلاب عظیم واقع ہوگا۔

نظام تمدن کا ارتقا ایک نہایت دلچسپ مبحث ہی مگر اس مختصر مضمون میں اسپر بحث کرنا دشوار ہی۔ اس مضمون کے دوران میں ارتقائے تمدن کے تعلق میں جو باتیں مذکور ہوئی ہیں اور جو اصول عام لکھے ہیں انکی اصلیت اور حقیقت پر اور بھی روشنی اُسوقت پڑتی ہی جب آسٹریلیا، افریقہ، امریکہ اوشنیا کے وحشیوں اور نیم وحشیوں، بھیلوں، گونڈوں اور سنتھالیوں، ترکستان اور عربستان کے قبائل چینیوں اور منگولیوں، ہندوستان، ایران، روس برطانیہ، جرمنی، فرانس، صوبجات متحدہ امریکہ، اور جنوبی امریکہ کی مخلوط نسلوں کی تمدنی حالت اور اُنکے عقائد کا مطالعہ کیا جاتا ہی۔ ارتقائے تمدن کے تقریباً سب طبقے اور درجے موجود ہیں جنکی بنا پر معقول نتائج نکل سکتے ہیں۔

جے۔ آر۔ رلے (جرنسٹ لاہور)

# ہادیانِ چین

## اور اُن کی حکیمانہ و اخلاقی تعلیمات

تمام باشندگانِ چین (مسلمانوں کو چھوڑ کر) تقریباً تین مذاہب کے پیرو ہیں (۱) مذہب کنفیوشش (۲) مذہب لاؤ ٹزی (۳) مذہب بودھ۔ ان تینوں مذاہب کی اصل جداگانہ ہی، عقائد اور مذہبی رسومات مختلف ہیں، اور ہر ایک کے فلسفیانہ نقطۂ خیال میں بُعدِ عظیم ہی، لیکن یہ عجیب اتفاق ہی کہ تینوں مذاہب کے بانی ہم عصر ہیں، کنفیوشش، لاؤ ٹزی اور بُدھ تینوں نے اپنے اپنے مذہب کی اشاعت چھٹی صدی قبل از مسیح یا اس سے قریب زمانہ میں کی۔ طرفہ یہ ہے کہ تینوں معاصر ملل ایک ہی ملک میں مروج ہیں، اور سب سے بڑھ کر حیرتناک امر یہ ہی کہ ان تینوں مذاہب کے پیروؤں میں ہمیشہ نہایت یگانگت، مساوات اور رواداری کا برتاؤ قائم رہا ہی جسکی نظیر دیگر ممالک کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہی۔ اہل چین، باوجود تین (بلکہ اس سے بھی زائد) مذاہب کے پابند ہونے کے ایک قوم کہلاتے ہیں، اور فی الحقیقت ایک قوم ہیں۔ مذہبی تعصب، تنفر، اور ناروا داری سے انکے دل پاک و صاف ہیں، اور کسی ایک مذہب کی پابندی انکی دوسرے مذاہب سے بے اعتنائی یا نفرت کا باعث نہیں ہوتی۔ آپس میں اس درجہ میل جول ہی کہ مشہور ہی کہ ایک چینی مختلف لحاظ سے تینوں مذاہب کا پیرو ہو سکتا ہے[۵]۔

ہر چند کہ محققین مذاہب و ملل اس مسئلہ کے جواب میں کہ مذہب و اخلاق کا کیا تعلق ہی، آیا وہ ہمیشہ یکجا پائے گئے ہیں، اور ایک کا وجود بغیر دوسرے کے یا دوسرے کا بغیر پہلے کے ممکن ہی یا نہیں، نہ ہم آہنگ ہیں اور نہ آئندہ کبھی ہونے کی امید ہی، لیکن اسپر سب اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں، جو اسوقت موجود ہیں یا جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں، تعلیم اخلاق مذہب سے وابستہ پائی جاتی ہی۔ چاہے ان میں اعتقادات اور رسوم مذہبی کا کیسا ہی اختلاف کیوں نہو، بہرحال اخلاق کی تعلیم جزو مشترک پائی جائیگی۔ عیب جوئی اور نکتہ چینی کسے نہیں آتی اور وہ کون شے ہی جسکی مخالفت میں آج تک کسی نے زبان نہ کھولی ہو؟ جس آدمی کا مرکوز خاطر صرف تلاش معائب و نقائص ہو، یہ یقینی امر ہی کہ اُسے اپنے سوا کسی میں کوئی بھلائی فطرۃً آئیگی، اور نہ دنیا کی کسی چیز سے وہ متمتع اور منتفع ہو سکے گا۔ مبارک ہیں

---

[۵] چینیوں کے اس اتحاد اور یکرنگی کا حال دیکھنا ہو تو ڈاکٹر جوزف ایڈکنس کی کتاب "چین میں مذہب کی حالت" یا سرالفرڈ لائل کی کتاب "ایشیاٹک اسٹڈیز" ملاحظہ ہو

وہ لوگ جو بہر حال جویاے محاسن ہیں اور ہمیشہ نفع رسانی خلائق کو مدنظر رکھتے ہیں
آدمی چاہے جس مذہب وملت کا پابند ہو اور اُسکے خیال میں کوئی ایک مذہب
سچا ہو، لیکن جب فراخدلی اور بے تعصبی سے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کریگا
اُسے بکثرت ہر جگہ ایسی باتیں دستیاب ہونگی جنکا تعلق کسی ملک، زمانہ اور قوم
سے نہیں ہے، بلکہ جن کی عام سچائی قید تخصیص سے آزاد ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مذاہب
عالم کا مطالعہ اس نقطۂ خیال سے نہ کیا جائے کہ اُن میں وہ کون سی باتیں ہیں
جو بہر حال غیر فانی حصہ سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، اور اسکی سچائی سے
کیسے انکار ہو سکتا ہے؟ کہ کسی مذہب کی اخلاقی تعلیم سے آگاہ ہونا یا اُسکی اچھی
پند و نصائح سے متاثر ہونا کسی کے دین اور ایمان میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔
بلاشبہہ یہ مذاہب کی مستقل شان ہے کہ وہ انسان کو اُنکے فرائض زندگانی
سے جن کا دوسرا نام اخلاق ہے، مختلف طریقوں سے مطلع اور متنبہ کرتے ہیں۔ اس
کلیہ سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ چین کے مذکورۂ بالا تینوں مذاہب احسن
الوجوہ اخلاق حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کی رہبری کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک
مذہب بودھ تو ہماری پاک سرزمین کا مولود ہے۔ اُسکا متبنیٰ مہاتما شاکیہ مُنی
گوتم بدھ مادر ہند ہی کا سپوت تھا۔ باقی دونوں مذہبوں کے بانی کنفیوشش
اور لاؤتزی چین ہی کے رہنے والے تھے۔ بہ نسبت بدھ کے یہاں کے لوگ ان
دنیا کے دو بڑے معلموں کے حالات اور اخلاقی تعلیمات سے بہت کم واقف
ہیں۔ لہذا ذیل میں ان مذاہب کا تذکرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا
ہے۔ نہایت ضروری ابتدائی حالات کے بعد ان میں سے ہر ایک کی اخلاقی
تعلیمات کو مقصود اصلی سمجھا گیا ہے نکتہ چینی اور عیب جوئی سے کہیں کام نہیں
لیا گیا۔ امید ہے کہ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

## (۱) مذہب کنفیوشش

کنفیوشس مسیح کی پیدائش سے تقریباً ۵۵۰ سال پہلے پیدا ہوا۔ اسکے زمانہ
میں چین کی حالت نہایت ابتر تھی، جا بجا چھوٹی بڑی خود مختار ریاستیں اور بادشاہتیں
قائم تھیں جن میں آئے دن معرکۂ جدال و قتال گرم رہتا تھا، قدیم تہذیب و
تمدن کو ظالم حاکموں اور فرماں رواؤں کے ظلم و تعدی سے بہت کچھ صدمہ پہنچ
رہا تھا، انصاف معدوم تھا، عوام الناس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے
اور سیاسی و مدنی حقوق کا کوئی خبر گیر اور محافظ نہ تھا۔ کنفیوشش نے ایسی خراب
و خستہ حالت دیکھ کر اپنی زندگی کا یہ نصب العین قرار دے لیا کہ اہل ملک کو قعر مذلت
سے نکال کر اُنکی اخلاقی، سیاسی، اور مدنی حالت درست کرے۔ اُس نے
اپنی ساری زندگی ہم وطنوں کے اخلاق و اطوار سدھارنے کی کوشش میں صرف
کی۔ لیکن اپنی محنتوں کا ثمرہ اپنی زندگی میں اسے دیکھنا میسر نہ ہوا بظاہر معلوم
ہوتا تھا کہ اُسکی عمر بھر کی تندہی اور دردمندی بالکل ضائع گئی، اس لیے کہ متبذل
قوم نے اُسکی پند و نصیحت پر توجہ نہ کی۔ وہ ایک امیر کے دربار سے دوسرے کے
دربار میں جاتا تھا، اور جاتا اسی لیے تھا کہ کہیں تو اُسکی شنوائی ہو، اُس نے
بہت سی ملازمتیں کیں، کہیں وزیر رہا، کہیں مشیر، کہیں منصف، کہیں مفتی،
لیکن کہیں اُسکی قدردانی نہیں ہوئی۔ اُسے اپنی قابلیت اور سعی پر بڑا بھروسا
تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موقع دیا جائے تو تباہ سے تباہ حکومت کی بارہ
ماہ میں نمایاں اصلاح کر سکتا ہوں، اور تین سال کے اندر ایسا انتظام کرکے
دکھا سکتا ہوں کہ ہر قسم کے جرائم مسدود ہو جائیں۔ اُسکی یہ آرزو کبھی پوری
نہ ہوئی اور اسکے بدقسمت ملک نے اُسے کبھی اتنا موقع نہ دیا۔ کنفیوشش نقارخانہ
کی طوطی کی طرح تھا جسکی آواز کوئی نہ سنتا تھا۔ ہاں چند رفقا اور تلامذہ اسکا
اخیر دم تک ساتھ دیتے رہے۔ ۴۷۸ قبل از ولادت مسیح اُس نے نہایت فلاکت
و محن کی حالت میں انتقال کیا۔

کنفیوشس کی تعلیم کو حکمت عملی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا منشا
اہل ملک کے اخلاق اور افعال کی اصلاح تھی۔ وہ واجب الوجود اور عالم
روحانی کا قائل تھا لیکن بجائے تعلیم آخرت کے اُس نے صرف دنیاوی اصلاح
کی جانب اس وجہ سے توجہ کی کہ اُسکے اہل وطن سیاسی، مدنی، اور اخلاقی حالت
میں بہت زوال کر رہے تھے۔ گو اُس نے مردہ آبا و اجداد کی پرستش اور دیگر
مراسم مروجہ کو اپنی تعلیم میں مصلحتاً برقرار رکھا مگر اُسکی تعلیم کا منتہائے مقاصد



هزهائی‌نس سر آغا سلطان محمد شاہ آغا خان، جی سی آئی ای
(حال میں آپ آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہوئے ہیں)

اس دنیا میں اعلیٰ اخلاقی زندگی بسر کرنے کے طریقوں سے آگاہ کرنا تھا۔

کنفیوشس کی ادبی خدمات تو صرف یہ تھیں کہ اُس نے تواریخ، نظم اور اخلاق کی قدیم کتابیں بڑی تلاش اور جستجو سے بہم پہنچائیں اور انھیں خود ایڈٹ کیا۔ ان قدیم کتب کے اسماء ہیں :۔

(۱) یی کنگ (ی ی ک ن گ)۔ "مقدس کتاب تغیرات"
(۲) شُو کنگ (ش ُو ک ن گ)۔ "کتاب تاریخ"
(۳) شی کنگ (ش ی ک ن گ)۔ "کتاب اشعار"
(۴) لی کی (ل ی ک ی)۔ "کتاب مراسم"

شو کنگ میں جو عہد مابعد کے واقعات موجود نہ تھے انھیں اُس نے خود تحریر کیا اور اس اپنی تصنیف کا نام "سوانح بہار و خریف" رکھا۔ اخلاقی تعلیم زبانی دیتا تھا۔ اُسکے شاگردوں نے اسکے اقوال و نصائح کو تین مختصر جلدوں میں فراہم کر لیا جو کنفیوشسی مذہب کی چار کتب مقدسہ میں شامل ہیں۔ اِن چاروں کے نام یہ ہیں :۔

(۱) تا ہیو (ٹ ا۔ ہ ی و) "علمِ مکبراں"
(۲) چنگ ینگ (چ ن گ۔ ی ن گ) "حکمت اوسط"
(۳) لن یو (ل ن ی و) "متفرقات"
(۴) منگ ٹزی (م ن گ۔ ٹ ز ی) "تصانیف منشس"

کنفیوشس نے اپنی تعلیم میں اسلاف کی تعظیم و توقیر اور والدین کی اطاعت خدمت گزاری پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ایک پورا حصہ جسکا نام ہیاو ینٹ (ہ ی ا و۔ ک ن گ) یعنی "کتاب متعلق فرماں برداری والدین" ہے اسی مبحث کے لیے مخصوص ہے۔ حسب ذیل اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں

ا۔ ہمارے اجساد ہمیں اپنے والدین سے ورثتاً ملے ہیں، لہٰذا ہمیں اپنے والدین کو صدمہ پہنچانے یا مضرت دینے کا کبھی قصد نہ کرنا چاہیے۔ یہ اطاعتِ والدین کا پہلا سبق ہے۔ پھر جب ہمنے اسکے ساتھ اپنے اخلاق درست کر لیے اور آنیوالی نسلوں کے لیے نام نیک چھوڑا، تو گویا ہمنے حقوقِ والدین کی اخیر منزل طے کر لی۔ اسکی ابتداء والدین کی فرماں برداری سے ہے۔ اسکا درمیانی بادشاہ کی اطاعت سے اور اسکی تکمیل نیک عادات کی تکمیل سے۔ (ب)

۲۔ والدین کے ساتھ عام برتاؤ میں اولاد کو صد درجے کے ادب اور لحاظ کا اظہار کرنا چاہیے جب اُنکی خدمت کرے تو پیش نظر رہے کہ انھیں صد درجے کا آرام پہنچے، اُن کی بیماری سے دل مضطرب اور بیقرار ہو جائے، جب وہ مرجائیں اُنکے غم میں بیحد انہماک ہو، جب اُنکے نام کی قربانی کیجائے تو نہایت عقیدت مندی کا اظہار کیا جائے۔ (ب)

کنفیوشس نے جہاں اطاعت والدین پر اس قدر زور دیا ہے، والدین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کے حقوق کی ادائگی کی بھی شدید تاکید کی ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک باپ نے اپنے بیٹے کی نالائقی کی شکایت کی تو کنفیوشس نے باپ اور بیٹے دونوں کو قید میں ڈالدیا۔ جب باپ کی طرف سے اپیل دائر ہوئی تو کنفیوشس نے یہ فیصلہ صادر کیا :۔

کیا مجھے ایک ایسے شخص کو اپنے باپ کے ساتھ نافرمانی سے پیش آنے کی سزا دینی چاہیے، جسے اُسکے باپ نے ایسی تربیت ہی نہ دی ہو کہ ماں باپ کی اطاعت اسکے جان گزیں ہو جائے؟ انسان فطری طور پر جرائم پیشہ نہیں ہے۔ اسلیے باپ خاندان کے اندر اور حکومت ملک میں اُن خطاؤں کے ذمہ دار ہیں جو اُنکے مقابلہ میں بیٹے یا اہل ملک سے سرزد ہوں۔ اگر بادشاہ اشاعت قانون میں بے پرواہ ہے اور رعایا کو احکام قانون کی خلاف ورزی کی سزا دیتا ہے تو وہ دھوکہ باز ہے، اگر وہ خراج رعایا کو بغیر اطلاع دیے وصول کرتا ہے، تو وہ ظالم ہے، اگر وہ لوگوں کو بغیر تعلیم و تربیت دیے قتل کرتا ہے تو وہ ستم پیشہ ہے۔

یہ بھی صاف طور سے بتلا دیا ہے کہ تمام حالتوں میں اولاد کے اوپر اطاعتِ والدین فرض نہیں!

جب کوئی معاملہ باپ کی بدکرداری کا پیش آئے تو بیٹے کو شکایت اور دادخواہی کا حق ہے، اسی طرح وزیر کو اپنے بادشاہ سے۔ چونکہ لڑکا باپ کی بد اطواری کی وجہ سے دکھ اٹھاتا ہے، اس لیے محض باپ کے احکام کی اطاعت کو کس طرح فرماں برداری والدین کی ذیل میں شمار کر سکتے ہیں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اور حقوق کی بنا بہر حال راست کرداری پر رکھی گئی ہے

چاہے وہ ماں باپ کا معاملہ ہو یا حاکم و محکوم کا۔

کنفیوشس انسان کی فطری نیکی پر بڑا بھروسا رکھتا تھا، اور نمونہ اور مثالی پر بہت زور دیتا تھا۔ اسکا قول تھا کہ جس طرح سونے کی خاصیت سختی، اور آگ کی گرمی ہے اسی طرح انسان کی فطری خاصیت نیکی، راست بازی، عقل اور دیانت ہے۔ گرد و پیش اسے بدکردار لوگ نظر آتے تھے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ طبعاً انسان درحقیقت نیک ہی ہے۔

انسانی فطرت اور اسکی استعداد و قدرت کی بابت جو خیالات کنفیوشس نے ظاہر کیے ہیں وہ حیرت خیز ہیں۔ اسکی تعلیم ہے کہ

انسان اپنی قسمت کا آپ مالک ہے، یہی نہیں بلکہ وہ ارض و سما کے برابر ہے اور قدرت پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ کامل خلوص سے وہ اپنی فطرت اور سرشت کی بدرجۂ اتم تکمیل کر سکتا ہے جب ایسا کرلے تو دوسروں کی طبیعت کی بھی اسی طرح اصلاح کر سکتا ہے۔ انسانی طبائع کی درستی کے بعد وہ حیوانات اور تمام اشیا کو مکمل کر سکتا ہے۔ حیوانات اور دیگر اشیاء کی تکمیل طبائع کے بعد وہ زمین و آسمان کی قوتوں کے تغیر و تبدل اور تربیت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ ارض و سما کا شریک ثالث ہو سکتا ہے۔ تب وہ ارض و سما کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو امن و امان اور عیش و راحت کا راج ہو جائے، اور تمام چیزیں مکمل ہو جائیں۔ یہ ہے انسان کا منصب عام ہیں۔ انسان کامل کی طبیعت بھی کامل ہوتی ہے۔ تمام انسان فطری صالح ہیں، اور انکے اندر وہ روحانی اوصاف مستتر ہیں جن سے وہ اپنی طبائع کو کامل بنا سکتے ہیں۔ جو چیز انسان کے اندر پوشیدہ ہے وہ نیکی ہے اور جب وہ درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ اسکی فطرت ہو جاتی ہے۔ [عـــہ]

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ خیال کہ انسان اپنی سرشت سے حقیقتاً نیک ہے اس خیال سے بدرجہا افضل ہے کہ وہ فطری بد ہے۔

ایک مرتبہ کنفیوشس سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ کون سا لفظ ہے جس میں تمام اعمالِ زندگی کی نیکی کا راز مخفی ہے۔ کنفیوشس نے جواب دیا "کیا وہ لفظ معاوضہ نہیں ہے - انچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند"۔ اسی مقولہ کو کسی دوسرے موقع پر اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے :

اعلیٰ انسان میں چار خوبیاں، جو میں اپنے میں کسی طرح جمع نہیں کر سکا، ہوتی ہیں۔ اپنے باپ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے بیٹے سے اپنے لیے چاہتا ہوں، اپنے بادشاہ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے ماتحت وزیر سے چاہتا ہوں، اپنے بڑے بھائی کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے لیے اپنے چھوٹے بھائی سے چاہتا ہوں، اور دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک پہلے آپ کرنا جیسا میں اپنے دوستوں سے اپنے واسطے توقع رکھتا ہوں۔

(چنگ ینگ باب ۱۳)

مذہب کنفیوشس کی رو سے نیکی کی پانچ قسمیں ہیں (۱) کرم (۲) صدق (۳) علم (۴) وفاشعاری و تدین (۵) شائستگی اطوار (یا حسن معاشرت) ان میں سے پہلی نیکی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ بلکہ منشس نے جو کنفیوشس کا سب سے بڑا شاگرد ہے یہاں تک لکھا ہے کہ "کرم ہی انسان ہے"۔ کو انگ یزی نے جو لاؤتزی کا شاگرد رشید ہے یہ لکھا ہے کہ کنفیوشس نے کرم کی تعریف اس طرح کی تھی کہ "کرم یہ ہے کہ انسان نہایت خلوصِ باطن کے ساتھ تمام موجودات سے گہری ہمدردی رکھتا ہو، تمام آدمیوں سے محبت کرتا ہو اور خود غرضانہ خیالات اسکے دل میں جگہ نہ پاتے ہوں"۔ الغرض کرم سے کنفیوشس کی مراد محض "خیرات" نہیں ہے بلکہ وہ نیکی ہے جو تمام تعلقاتِ زندگانی پر حاوی ہے۔ وہ ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے :-

نیکوکار کا کرم محض اپنے اعزا و اقربا تک محدود نہیں بلکہ اسکے دائرہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات بھی شامل ہیں۔ نیز اسی کا قول ہے کہ "کرم تمام بنی نوع سے محبت کا نام ہے"

دیانت کو کنفیوشس انسانی عادات کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے

۱۔ دیانت کو اصل الاصول سمجھو (۲) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوئی بغیر دیانت کے زندگی بسر کر سکتا ہے۔

کسی دوسرے موقع پر کنفیوشس نے انسانی نیکیوں کا یہ لب لباب نکالا ہے :-

وہ شخص جو یہ پانچ چیزیں کر سکتا ہے "نیک انسان" ہے! اپنی اور دوسروں کی عزت کرنا۔ سخاوت، وفاداری و خلوص، نیک کاموں میں چستی اور تمام انسانوں سے محبت کرنا۔

عدل و انصاف اور رواداری کی تعلیم اس طرح دی ہے :-

[عـــہ] ملاحظہ ہو ڈگلس صاحب کی کتاب "کنفیوشیزم" صفحہ ۱۴۴

۱۔ افضل انسان زندگی کے تمام حالات میں تعصب اور فساد سے مبرا رہتا ہے۔ صرف انصاف اس کا رہنما ہوتا ہے۔ اور اسکی تمام قوتیں عدل و انصاف اور بہی خواہی بنی نوع پر صرف ہوتی ہیں۔

۲۔ افضل انسان وہ ہے جو سب کے ساتھ مساوی بہی خواہی کا برتاؤ کرے، جو خود غرضی اور جانب داری سے پاک و صاف ہو۔

۳۔ بدتر وہ آدمی ہے جو صرف خود غرضی کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کا خیال اپنے دل میں نہ رکھتا ہو۔

**برتر انسان یا انسان کامل کون ہے؟ اسکے جواب میں اس حکیم کے خیالات حسب ذیل ہیں:۔**

۱۔ برتر انسان وہ ہے، جس کی روح میں ہمواری و مساوات کی صفات ہوں۔ رذیل کا دل ہمیشہ پریشان اور متفکر رہتا ہے۔

۲۔ برتر انسان ہمیشہ ذہن اور قوت عمل میں ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نالائق آدمی روز بروز جہالت اور بدکاری کی راہ میں بڑھتا ہے۔

۳۔ افضل انسان کے دل میں عدل و انصاف کا خیال رہتا ہے، کمینہ کے دل پر طمع غالب رہتی ہے۔

۴۔ اعلیٰ انسان عدل و مساوات کو تمام چیزوں سے بالا جانتا ہے۔

۵۔ برتر انسان اپنی لیاقت سے زیادہ نفع کا خواہاں نہیں۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اسکی قابلیت اسکے نفع سے بڑھی ہوئی ہو۔

۶۔ افضل انسان منہ سے الفاظ نکالنے سے پہلے یہ سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ الفاظ منہ سے نکالنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ وہ پہلے سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ کام مفید ہے یا مضر، تب وہ اُس کام پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہ ایسا نیک اور راست باز ہوتا ہے کہ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں۔ جس کام کو وہ ہاتھ لگاتا ہے اور پورا کرتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے اسے نظیر کے طور پر سمجھتے ہیں۔ اسکے چال چلن کو دیکھ کر لوگ سدھرتے ہیں۔ اسکے تمام حرکات و سکنات صحیح قوانین کے موافق ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں، اسے محبوب رکھتے ہیں، اسکی پیروی کرتے ہیں اور اس جیسے ہو جاتے ہیں۔

۷۔ افضل انسان یہ نہیں چاہتا کہ سارا نفع اپنی ہی ذات کے لیے ہو بلکہ وہ دوسروں کو بھی متمتع اور مستفیض ہونے کا موقع دیتا ہے۔

۸۔ برتر انسان سب کا منظور نظر اور محبوب ہوتا ہے۔ وہ آسمان کی طرح وسیع، سرچشمۂ آب کی طرح عمیق اور متحرک ہے۔ وہ مثل بحر ہے۔ جہاں جہاز پہنچ سکتے ہیں، جہاں انسانی قوت کی رسائی ہے، جہاں آسمان کا سایہ اور زمین کا فرش ہے، جہاں آفتاب ماہتاب درخشاں ہیں، جہاں کہرا اور شبنم پڑتی ہے۔ تمام ذی روح اور تمام متنفس اسکی عزت کرتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں[۱]۔ (لی۔کی ب ۳۱)

۹۔ افضل انسان جب لوگوں کی زبانی اپنی تعریف سنتا ہے تو صرف اس سے وہ خوش نہیں ہوتا۔ جب وہ ایسے شخصوں کا حال دریافت کرتا ہے جو سردی سے تکلیف اٹھا رہے ہوں تو وہ انھیں لباس دیتا ہے بھوکوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا ہے۔ (لی۔کی ب ۲۶)

۱۰۔ برتر انسان خفیہ طور سے اپنے باطن کا معائنہ کرتا ہے کہ مبادا کوئی بدی وہاں جاگزیں ہو۔ یا کوئی موقع بے اطمینانی کا ہو۔

۱۱۔ برتر انسان بننے کی یہ ترکیب ہے کہ اپنے دلی جذبات کو نکوئی اور راستی کی جانب مائل کیا جائے، مطالعۂ کتب سے محبت کی جائے، مطالعۂ کتب علم اور نیکی کا سرچشمہ ہے جسکی ثانی کوئی دوسری چیز نہیں۔ جب صدق اور خلوص کے ساتھ عمل کیا جائے اور دل خود غرضی سے منزہ ہو تو قلب درست ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ برتر انسان کے الفاظ اور اعمال میں مطابقت ہوتی ہے۔ کیا برتر انسان کی یہ صفت نہیں کہ وہ نہایت با اخلاص ہوتا ہے؟ (لی۔کی ب ۲۵)

۱۳۔ جب برتر انسان اپنے درجے کے موافق لباس زیب تن کرتا ہے تو اسکی آرائش افضل انسان کے اطوار و طرق سے کرتا ہے۔ اطوار و طرق کی زیبائش بڑے آدمیوں کے سے کلام سے کرتا ہے۔ زبان کی آرائش برتر انسان کے نیک اعمال سے کرتا ہے اسلیے کہ وہ اس سے شرمسار ہوتا ہے کہ لباس تو برتر لوگوں کا پہنے اور ان کے سے طور و طریق نہ ہوں۔

---

[۱] کہا جاتا ہے کہ یہ عبارت چین کی کتب مقدسہ میں نہایت فصیح و بلیغ ہے۔

یا ان کے حصول دولت ہوں لیکن گفتگو دیسی نہ ہو۔ یا نیکیاں تو ہوں لیکن وہ عملاً ظاہر نہ ہوں (لی۔کی)

مندرجہ ذیل نصائح کا منشا بھی تزکیۂ نفس اور تہذیبِ نفس ہے:-

جب تم کسی عقلمند کو دیکھو تو اپنے دل میں غور کرو کہ تم میں بھی اسکی خوبیاں ہیں یا نہیں۔

جب کسی بدکار کو دیکھو تو اپنے اوپر نظر ڈالو اور اپنے حال کی جانچ پڑتال کرو۔

کامل خود بینی کی عادت ڈالو، دوسروں کا اپنے سے مقابلہ ورانکے ساتھ ویسا برتاؤ کرو، جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں۔ یہ انسانیت کی تعلیم ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

دوسری نصیحت کا جزوِ اخیر اُسی حکمت کا اعادہ ہے جسے اُسنے لفظ "معاوضہ" میں مضمر بتایا تھا۔ نیک و بد کی صحبت سے پند آموز ہونے کا کیسا اچھا طریقہ بتایا ہے:

اگر ہم سفر کرنیوالے تین آدمی ہیں تو مجھے بہرحال دو استاد (اپنے ساتھیوں میں) مل جائینگے نیک آدمی کو میں تقلید کی نیت سے منتخب کرونگا اور بدکار کو دیکھ کر اپنی ذات کی اصلاح کروں گا۔

کنفیوشس دنیا کے اُن چند لوگوں میں سے تھا جن کے قول اور فعل میں مخالفت نہیں ہونے پاتی۔ وہ منکسر المزاجی میں مشہور خلائق تھا تعصب، ہٹ دھرمی، خودغرضی اور خود فریبی کا جن سے بچنے کی وہ دوسروں کو نصیحت کرتا تھا، اُسکے عادات میں نام و نشان نہ تھا۔ لیکن پاکبازی اور نیکدلی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے مطمئن نہ رہے۔ کنفیوشس ایسا پاک نفس اور صاف باطن تھا لیکن اپنی بابت جو رائے رکھتا تھا، اسے دیکھ کر ہر شخص پتہ لگا سکتا ہے کہ محاسبۂ قلب میں جیسی تاکید دوسروں کو کی ہے اُسے اپنے اوپر بھی ویسا ہی اہم فرض سمجھتا تھا:-

میں ایسا نیک نہیں ہوں کہ خواہشات پر غالب آجاؤں، نہ اتنا عقلمند ہوں کہ اپنے آپ کو بند مصائب و آلام سے رہا کروں، نہ اتنا بہادر ہوں کہ خوف و دہشت سے میرا دل کبھی ہراساں نہ ہو۔ (لن یو باب ۱۴ آیت ۲۵)

ایک اور موقع پر کہتا ہے:-

اگر میں ایک ایسے شخص کا تصور کروں جس کی ذات میں "اتقا اور انسانیت" جمع ہوں تو بھلا میں اپنا موازنہ اُس سے کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان نیکیوں پر بغیر ہٹ ہارے عمل کرنے اور بغیر مایوس ہوئے دوسروں کو تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

جھوٹی باتیں بنانیوالوں اور چکنی چپڑی باتوں سے لوگوں کو دھوکا دینے والوں کو اس طرح متنبہ کیا ہے:-

نامعبوری اور مصیبت میں مبتلا ہوگا وہ آدمی، جس کے دل لبھانے والے اقوال کا ایفا افعال مطابقت سے نہ ہو۔ (لی۔کی باب ۲۵)

ہمدردیِ بنی نوع، جو اُسکی تعلیم کا جزوِ اعظم ہے، اور جسکی بابت اوپر کی نصائح میں بھی جا بجا ذکر آیا ہے اُسکی بابت ذیل کا فقرہ کیسا دلپذیر ہے:-

جہاں گہری ہمدردی کا مادہ ہے وہاں انسانیت کا اظہار دوسروں کے ساتھ محبت کرنے سے ہوتا ہے۔ (لی کی باب ۲۹)

شاید ہی کوئی شخص، جو فلسفۂ اخلاق سے واقف ہو، کنفیوشس کے اس بینظیر قول سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ "نیکی کی محبت ایسی ہونی چاہیئے جیسی حُسن کی محبت ہوتی ہے"۔

اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جس طرح حُسن کی محبت صرف حُسن کے واسطے ہوتی ہے، اُسی طرح نیکی کی محبت محض نیکی کے واسطے ہو۔ یعنی کسی معاوضہ یا منفعت کی توقع امورِ خیر میں نہیں کرنا چاہیے ورنہ بحالت توقع نفع، نیکی حقیقی نہ ہوگی۔ دوسرے جس طرح حُسن کی محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اور دل حُسن سے بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا اُسی طرح نیکی کا تعلق دل سے ہونا چاہیے اور انسان کے دل میں ایسی صلاحیت موجود ہونا چاہیے کہ امورِ خیر سے بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکے۔ سبحان اللہ کیا پاک تعلیم ہے جسے ہر ذی ہوش کو اپنے دل میں جگہ دینا چاہیے۔

ایک جگہ تربیتِ حُسنِ معاشرت کے بعد وہ کہتا ہے:-

تربیتِ نفس اول اپنے گرد و پیش کے لوگوں پر اثر ڈالتی ہے اور رفتہ رفتہ تمام ملک پر

ہر شخص کو اپنے الفاظ کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اپنے اطوار کی حفاظت کرنا چاہیے۔ خلاقِ ذمیمہ کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دینا چاہیے اور نیکی کو اپنا مس، کرم کو اپنا راستہ، شائستگی و حسنِ لیاقت کو اپنا لباس، عقل کو اپنا چراغ اور دیانت کو اپنا جادہ و قرار دینا چاہیے۔ متانت، ادب، اور وفاداری تربیت یافتہ آدمی کی فضیلتیں ہیں۔ متانت اُسے عوام الناس سے ممتاز کرتی ہے، مؤدب ہو کر وہ محبوب خلائق ہوتا ہے؛ مطیع ہو کر وہ مطاعِ عالم ہوتا ہے؛ باوفا ہو کر وہ متدیّن ہوتا ہے،

نیز اُسی کا قول ہے کہ "خوش خلقی لیاقت کے قریب ہے؛ کفایت شعاری انسانیت کے قریب ہے؛ اور ایمانداری سچائی کے قریب ہے" ہر حالت میں سچائی پر قائم رہنے کی ان الفاظ میں اُس نے تاکید کی ہے کہ "تم شمال یا جنوب کے وحشیوں کے ملک میں بھی رہتے ہو تو بھی تمھارے اطوار خطا و قصور سے پاک ہونے چاہییں"۔ وہ لوگ اس نصیحت کو بالخصوص سُن رکھیں جو اپنے جرائم کو جھوٹی سچی مجبوریوں کا نام لے کر چھپانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح بادشاہوں کو ذیل کی نصیحت کس قدر عاقلانہ ہے:۔

بادشاہ کو اپنے وزرا کے انتخاب میں اپنے وجدان کے موافق سازرا اتا س کے نفع کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ اُسے اپنے فرائض کی تکمیل کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور ان لے فرائض کے قانون کو انسانی نیکی میں، جو تمام انسانوں کی محبت کا سرچشمہ ہے، تلاش کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کے لیے بھی سوا اسکے چارہ نہیں ہے کہ اپنی ذات کی اصلاح کرے اور تکمیل فرائض میں ہمیشہ سرگرم رہے۔

کنفیوشس بعض معلمین کی طرح دولت کو نظرِ حقارت سے نہیں دیکھتا تھا بلکہ وہ اسکی قوت سے بخوبی واقف تھا، لیکن وہ اسکی برائیوں سے بھی ویسا ہی آگاہ تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نصیحت ہمارے زمانہ میں جبکہ حصولِ دولت کا سودا عالمگیر ہے خصوصیت کے ساتھ نفع بخش ثابت ہوگی:۔

دولت اور عزت انسان کے مطلوب ہیں۔ اگر جائز طریقوں سے وہ میسر نہ ہوں تو انکے حصول کی خواہش دل سے نکال دینا چاہیے۔ غریبی اور بے توقیری وہ چیزیں ہیں، جو انسان کو مرغوب نہیں۔ اگر انسان راست کرداری کے ذریعہ سے ان کے پنجے سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا تو انکو مردانگی سے برداشت کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ کسی نے کنفیوشس سے دریافت کیا کہ عوام کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اُس نے جواب دیا "انھیں فارغ البال اور متمول بنانا چاہیے"۔ دوبارہ پوچھا گیا کہ اس سے زیادہ کیا کیا جائے؟ تو اُس نے کہا "انھیں تعلیم دینا چاہیے"۔

کنفیوشس نے علم کی جو تعریف کی ہے اور اُسکی تحصیل کا جو طریق بتایا ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کے تمام طالب علم اپنے لوحِ دل پر اسے نقش کر رکھیں:

جب تم کسی چیز کو جانتے ہو تو یہ کہنا کہ تم اُسے جانتے ہو اور جب نہیں جانتے تو یہ تسلیم کرنا کہ تم اُسے نہیں جانتے، یہی علم ہے۔

مطالعہ بغیر غور و خوض کے تضییع محنت ہے؛ ذاتی غور و خوض کا بغیر مطالعہ خطرناک ہے

کنفیوشس سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ موت کیا چیز ہے؟ اُس نے جو عاقلانہ جواب اس سوال کا دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر شخص اُسے اخیر فیصلہ ان کر شاعرانہ قیاسات سے باز آجائے:۔

جب انسان کو یہی نہیں معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے تو موت کا اُس پر کیا حال کھل سکتا ہے۔

کنفیوشس نے اعتدال پر بہت زور دیا ہے اور "خیر الامور اوسطہا" کی جابجا تعلیم دی ہے۔ اخلاقی جرأت، جس کا وجود معدودے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے اُسکا سبق بھی جابجا سکھایا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

دریا میں جا کر پانی کے درندوں اور خوفناک جانوروں کا مقابلہ کرنا ماہی گیری بہادری ہے؛ زمین پر شکار کرنا۔ شیر اور گینڈے کو مارنا شکاری کی بہادری ہے؛ میدانِ جنگ میں تیر و تفنگ کا مقابلہ کرنا اور موت کو حیات تصور کرنا سپاہی کی بہادری ہے؛ لیکن یہ معلوم کرنا کہ غریبی آسمانی حکم ہے، اور انسانی معاملاتِ زندگی مدوجزر کے ماتحت ہیں اور مصائب سے کسی طرح خائف نہ ہونا عقلمند کی بہادری ہے۔

عادات کس طرح سنورتی ہیں:۔

علم کا شوق علم کی نزدیکی ہے؛ استقلال نیکی کا قرب ہے؛ خجالت اور شرمساری سعادتمندی کی ہمسائگی ہے۔ جو شخص ان تینوں باتوں سے آگاہ ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عادات

اس طرح سنورتی ہیں۔ (لی۔کی)

ذیل میں چین کی کتب مقدسہ سے چین کے حکماے متقدمین کے چند پند و نصائح کی گل چینی کرکے ناظرین کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے ہر پھول کی رنگت بوشام دماغ کو معطر اور چشم ابصارت کو منور کرتی ہے۔ چونکہ ان کتابوں کا مدیر کنفیوشس ہے اس لیے ممکن ہے کہ بعض خیالات جو دیگر حکماے متقدمین کی طرف منسوب کیے ہیں خود اُسی کے خیالات کا پرتو ہوں۔

(ا) شاہنشاہ گُوہ، جس کا عہد سلطنت مسیح کی ولادت سے ۲۴۳۵ سال پیشتر تھا، کہتا تھا کہ

تمام انسانوں کی محبت سے بڑھ کر کوئی دوسری نیکی نہیں ہے اور مہمات سلطنت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام اہم نہیں ہے کہ تمام آدمیوں کو نفع پہنچایا جائے۔

اس قول کی بزرگی اور قدامت ہمیں حیرت میں ڈالتی ہے۔

(ب) ایک مرتبہ شہنشاہ شن نے (جس کا عہد سلطنت مسیح کی ولادت سے دو ہزار سال سے بھی پیشتر تھا) اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ نُو اخلاقِ حمیدہ کون سے ہیں۔ اُس وزیر نے جواب دیا:۔

(۱) خوش خلقی خودداری کے ساتھ (۲) نرمی استقلال کے ساتھ (۳) صاف گوئی ادب اور تعظیم کے ساتھ (۴) امور سلطنت میں چستی توقیر کے ساتھ (۵) انکسار تہوّر کے ساتھ (۶) راست بازی مہربانی کے ساتھ (۷) اطمینان عاقبت بینی اور دقیقہ شناسی کے ساتھ (۸) ہمت خلوص باطن کے ساتھ (۹) شجاعت اتقا کے ساتھ۔ (شوکنگ)

(ج) متقدمین میں سے ایک حکیم نے جسکا نام یُو ہے ایک بادشاہ کو مہمات سلطنت کی بابت اس طرح نصیحت کی ہے:۔

ہوشیار رہ۔ قوانین اور آئین کی بجا آوری میں تساہل نہ کر۔ آرام طلبی میں جادۂ اعتدال سے مت ہٹ۔ لائق لوگوں کو ملازم رکھنے میں اپنے اور اُنکے درمیان کسی واسطے سے کام نہ لے۔ بُرائی کو بلا تامل اپنے سے جدا کر دے۔ ایسی تدابیر پر عمل نہ کر جنکی خوبی کی نسبت تجھے خود شبہ ہو۔ مطالعہ کیا کر تاکہ تیری اغراض عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ لوگوں کی مدح و ثنا کی طمع میں راست بازی کے خلاف کوئی کام نہ کر۔ لوگوں کے مقاصد کی مخالفت ذاتی منفعت کے خیال سے ہرگز نہ کر۔ (شوکنگ جلد اول)

(د) ایک وزیر نے جس کا زمانۂ حیات مسیح کی پیدائش سے اٹھارہ صدی پیشتر تھا، حسب ذیل تحیرخیز خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

۱۔ نیکی کا کوئی یکساں معیار نہیں ہے۔ نیکی کی نسبت اعلیٰ خیال ہی اپنی آپ مثال ہے۔ نیکی کی کوئی مستقل اور یکساں صفت نہیں ہے جس کی بابت اعلیٰ خیال کیا جائے وہ صفت اُس جگہ پائی جاتی ہے جہاں وجدان علم سے موافقت و مطابقت ہو۔ (ایضاً)

۲۔ کبھی بجز خلوص قلب کے مت رہو۔ اگر تم نہایت سختی سے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کی حفاظت نہیں کرتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے بڑے کاموں میں تمہاری نیکی کو صدمہ پہنچے گا۔ (ایضاً)

۳۔ کم عقل کا خیال ہوتا ہے کہ نیکی کے چھوٹے چھوٹے کام غیر مفید ہیں اور اسلیے وہ انھیں نہیں کرتا۔ نیز وہ خیال کرتا ہے کہ بدی کے چھوٹے چھوٹے کام بے ضرر ہیں اس لیے اُن سے پرہیز نہیں کرتا۔ (یی کنگ)

۴۔ قابلیت کم عہدہ بڑا، عقل تھوڑی تدبیریں لمبی چوڑی، قوت کم اور بوجھ بھاری جہاں کہیں یہ اسباب جمع ہو جائیں شاذ ہی ایسا ہوگا کہ انکا انجام بد نہو (ایضاً)

۵۔ تکبر کو بڑھنے دینا نہ چاہیے۔ خواہشات نفسانی کو پورا نہ کرنا چاہیے۔ اپنی ہی رائے کی ہمیشہ تقلید نہ کرنی چاہیے۔ آرام و راحت میں کثرت سے کام نہ لینا چاہیے (لی کی)

مندرجۂ بالا حصۂ مضمون کے مطالعہ سے ثابت ہو گیا ہوگا کہ کنفیوشس کی تعلیمات میں پند و حکمت کے کیسے کیسے جواہر آبدار موجود ہیں۔ اُسکی تعلیمات سے ہم یہ ماحصل نکالتے ہیں کہ وہ ایک عالمگیر اتحاد اور یکجہتی کا خواستگار اور ساعی تھا جس کے رو سے اُن لوگوں کی عزت کیجائے جو اُسکے واقعی مستحق ہوں۔ راحت، غصہ، رنج اور خوشی کے جذبات کو انکے جائز حدود کے اندر رکھا جائے۔ انانیت کو مغلوب اور خواہشات نفسانی کو مطیع کیا جائے متانت، صدق، خلوص باطن، لطف و مدارات، خوش خلقی اور خوش لیاقتی کی صفات اپنے اندر پیدا کیجائیں اور تقویٰ کے ساتھ حسنِ معاشرت کو لازمی سمجھا جائے اسلیے کہ انہی کسی ایک کی عدم موجودگی انسان کو "انسانِ کامل" کے پایہ سے گرا دیتا ہے۔

## (۲) مذہب لاؤ ٹزی
### (تاؤ مذہب)

لاوتزی اپنی عمر کے اخیر حصہ میں کنفیوشس کا ہمعصر تھا۔ اُسکا سال پیدائش ۶۰۴ قبل مسیح ہے، یعنی کنفیوشس سے پچاس سال وہ بڑا تھا۔ سال وفات تحقیق نہیں، اتنا ثابت ہے کہ اُس نے بہت بڑی عمر پائی۔ چنانچہ جب لاؤ ٹزی کی کنفیوشس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اُسوقت کنفیوشس کی اکاوَن سال کی عمر تھی۔ اُسوقت بھی لاؤ ٹزی ایک ریاست میں عہدہ دار تھا جس سے بعد میں دست کش ہوکر ایک عرصہ تک سیر و سیاحت کرتا رہا اور پھر گوشہ نشین رہا۔
لاؤ ٹزی بہت ذہین اور طباع شخص تھا۔ کنفیوشس کے برخلاف اُسے رسم و رواج کی پابندی اور شائستگی اطوار کے بجائے سادگی پسند تھی۔ نیز لاؤ ٹزی ابنائے وطن کی اصلاح کی جانب سے مایوس تھا اور کنفیوشس کی کوششوں کا اُسے کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ شاہنشاہ چاؤ کے دربار میں جب کنفیوشس سے اُسکی ملاقات ہوئی تو معمر اور تجربہ کار لاؤ ٹزی نے کنفیوشس کی زبانی اُسکی ناکامیوں کا حال سُنکر مایوسی ظاہر کی اور مدد خواہی کا جواب نفی میں دیا۔

گو لاؤ ٹزی کنفیوشس کی طرح انسان کی فطری نیکی کا قائل تھا اور بعض دیگر تعلیمات بھی اول الذکر کے خیالات سے ملتی تھیں، اُسکی اور کنفیوشس کی تعلیمات میں بہت بڑا اصولی اختلاف ہے۔ لاؤ ٹزی رسوم اور ظاہری پابندیوں کا حامی نہ تھا بلکہ اُنکا مخالف تھا۔ اُسکی تعلیمات میں روحانیت اور فلسفہ کو زیادہ دخل ہے۔ اُسکے مذہب کا منشا تزکیۂ باطن اور تربیت نفس تھا۔ کنفیوشس یہ چاہتا تھا کہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے مراسم و اطوار کا تحفظ اور اُنکی پیروی کریں۔ لاؤ ٹزی یہ کہتا تھا کہ لوگ اُس ابتدائی حالت کی طرف رجوع ہوں جب انسان قیود و رسوم سے آزاد تھا۔ ہرچند کہ لاؤ ٹزی خیالاتِ یاس رکھتا تھا، کنفیوشس کی طرح وہ بھی رجائیت پسند تھا اور اُسکا مطمح نظر بھی لوگوں کی اخلاقی، سیاسی اور مدنی حالت سدھارنا تھا۔

پابند و حامی تکلفات ظاہری کو مخاطب کرکے وہ کہتا ہے:۔

اپنی عقل و دانش کو چھوڑ دو، اپنی خیر سگالی اور مآل اندیشی کو دور پھینک دو، پھر دیکھو لوگ سوگنا اچھے ہوجائیں گے، اپنی ہمدردی کو اُٹھا کر طاق میں رکھ دو، اپنی انصاف پسندی کو پس پشت ڈالدو، تب لوگ مطیع والدین اور بہی خواہ اولاد ہوں گے، اپنی ہوشیاری کو برطرف کردو اور طلب منفعت کا خیال دل سے نکال دو ...... اور اپنی فطری سادہ حالت میں ظاہر رہو، عفت و عصمت کی حفاظت کرو، خود غرضی کو دباؤ اور اپنی خواہشوں اور امنگوں کو مغلوب کرو (تاؤ تیہ کنگ ص ۱۹)

تین روحانی اوصاف کا وہ اس طرح تذکرہ کرتا ہے:۔

میرے پاس تین قیمتی چیزیں ہیں جنکو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں، اور جن کی میں نگہداشت کرتا ہوں۔ اوّل رحم، دوسرے کفایت شعاری، تیسرے انکسار۔ رحمدل ہوکر میں بہادر ہوسکتا ہوں، کفایت شعار ہوکر میں سخی ہوسکتا ہوں، منکسر ہوکر میں بزرگ خلائق ہوسکتا ہوں۔ اس زمانہ میں لوگ رحمدلی کو چھوڑ دیتے ہیں اور صرف بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کفایت شعاری کو چھوڑ دیتے ہیں اور سخی بننے کا خیال رکھتے ہیں۔ در اخیر جگہ چھوڑکر اول جگہ تلاش کرتے ہیں۔ یہی اُنکی موت ہے۔ رحمدل وہ ہے جو حملہ میں فتحمند اور مدافعت میں محکم ہوتا ہے۔ جسکا خدا حامی ہے اُسے آغوش رحمدلی میں جگہ دیتا ہے۔

لاؤ ٹزی کے بعض سیاسی اصول اُسکی نہایت روشن دماغی کا پتہ دیتے ہیں چنانچہ یہ خیال کہ "سب کچھ سائر الناس کے لیے اور سب کچھ سائر الناس کی رائے اور منظوری سے" جو فی زمانا جمہوریت کا منتہائے خیال سمجھا جاتا ہے اُسکی سیاسی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ نیز اُسکے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی بے نظیر ذہانت یہ معلوم کرچکی تھی کہ "قوم جاندار چیز کی طرح نشو و نما پاتی ہے اور بے جان چیز کی طرح مصنوعی نہیں ہے" وہ قتال و جدال بلکہ سزائے موت تک کا مخالف تھا۔ اُسکا قول تھا کہ اگر حکومت کا انتظام معقول ہو تو سزائے موت کا کیا ذکر کسی قسم کی سزا کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اگر لوگوں کو سادگی اور صفائے قلب کی تعلیم دیجائے تو بالکل انسداد جرائم ہوجائے۔ یہ دولت، منصب اور علم کی طمع ہے، جو لوگوں کے دلوں کو پریشان کرتی ہے، اُن کے جذبات کو مشتعل کرتی اور موت کو اُنکے لیے معمولی چیز بنا دیتی ہے۔۔۔۔ جو لوگ عیش و طرب کے لیے جیتے ہیں یا جنکا مقصود حیات خودغرضانہ خیالات ہیں وہ موت پر آمادہ

ہو جاتے ہیں، جب کسی نہ کسی وجہ سے انکے مقاصد حاصل نہیں ہوتے اور انکی طاقت تدابیر خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب کوئی قوم اس خطرناک منزل پر آجاتی ہے تو کسی قسم کی سزا اُنھیں معاصی سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جب لوگ موت سے نہ ڈریں تو بتاؤ موت سے اُنھیں کیسے مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص موت کا مستحق ہے تو وہ بڑا مارنے والا تو موجود ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ہے ......

لہذا جو شخص قاتل کا کام کرے وہ صانعِ عالم کے ہاتھوں سے اُسکا کام چھیننا چاہتا ہے، اور جو صانعِ عالم کا اختیار چھیننے کا خیال رکھتا ہے وہ خود اپنے ہاتھ کاٹتا ہے[۵]۔

اخوت اور رواداری کا سبق اس طرح دیتا ہے:۔

اپنے بھائیوں کی عیب جوئی نہ کرو۔ اپنا مال جان لینے پر قناعت کرو۔ خود پاک اور باعصمت رہو، لیکن دوسروں کو تنبیہ نہ کرو۔ اپنے آپ راست باز رہو لیکن دوسروں کو ایذا نہ دو۔ بدقسمت کو بدمعاشی کی تہمت نہ لگاؤ۔ ایک شخص مر جائے اور دوسرا زندہ رہے تو یہ مت سمجھو کہ ان میں سے ایک پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ جو واقعی نیک ہے وہ تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے اور کسی کی تردید نہیں کرتا، وہ سب کی عزت کرتا ہے اور کسی کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ نیک لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور اُنکی صحبت سے مستفید ہوتا ہے، لیکن بد آدمیوں کی اصلاح اُسکا کام ہوتا ہے اور لوگوں کو تاؤ (خدا) کی جانب متوجہ کرنا اُسکی زندگی کا مقصود۔

لاؤزی خود ضبطی، ترکِ انانیت اور محاسبۂ باطن پر بہت زور دیتا تھا۔

۱۔ جو شخص خود بین ہے وہ کبھی فروغ نہیں پا سکتا۔ جو خود پسند ہے وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ جو خود ستا ہے وہ لائق نہیں ہو سکتا۔ جو تعلّی پسند ہے وہ عالی مرتبت نہیں ہو سکتا

۲۔ ترکِ نفس پروری کا ایک فعل خود رائی کے ایک لاکھ کاموں سے افضل ہے۔

نیک آدمی کی مندرجۂ ذیل تصویر کیسی من موہنی اور قبولِ صورت ہے:۔

وہ کج راہ پر کبھی نہ چلے گا۔ وہ کبھی اپنے نفس کو دھوکے میں نہ ڈالے گا۔ وہ نیکی کا ذخیرہ فراہم کریگا اور نیک کام جمع کریگا۔ وہ تمام مخلوقات کے ساتھ رحم سے پیش آئے گا وہ اپنے چھوٹے بھائیوں پر شفقت کرے گا اور بڑوں کی اطاعت فرزندانہ کریگا۔ وہ یتیموں پر رحم کھائے گا اور بیواؤں کی غمگساری کرے گا۔ وہ اپنی اصلاح کریگا اور اس طرح دوسروں کی اصلاح کریگا۔ کیڑوں، گھاس اور درختوں اور کسی چیز کو اُسکے ہاتھ سے آزار نہ پہنچے گا۔ اُسے دوسروں کی بدخصلتوں پر نظرِ افسوس و ترحم ڈالنا چاہیے۔ لوگوں کی نیک عادتوں سے اُسے خوش ہونا چاہیے۔ ان کی مصائب و آلام میں دستگیری کرنا چاہیے۔ اُنھیں خطرہ سے نجات دلانا چاہیے۔ انکے منافع کو اپنا نفع سمجھنا چاہیے، اور انکے نقصان کو اپنا نقصان۔ اُنکے معائب کو شائع نہ کرنا چاہیے اور نہ اپنی خوبیاں اُچھالنا چاہییں۔ بدی کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور نیکی کا اظہار کرنا چاہیے۔ دوسروں کو اپنی ذات سے نفع کثیر پہنچانا چاہیے، اور اپنی ذات کے لیے تھوڑے پر قناعت کرنا چاہیے تحقیر و توہین کو بلا خیالِ انتقام قبول کرنا چاہیے اور عزت کو بلا اندیشۂ خوف۔ بھلائی کرنا چاہیے بلا امیدِ معاوضہ، اور دوسروں کو دینا چاہیے بلا شائبۂ حسرت۔ یہ ہے وہ جسے "مردِ صالح" کہتے ہیں۔ (تعائی شنگ یعنی رسالۂ اعمال و مکافات)

دنیا کی کسی دوسری مذہبی کتاب میں اتنی جگہ میں شاید اس سے بڑھ کر اخلاقی تعلیم نہ پائی جائے گی۔

مسیح کا قول ہے کہ "بدی کے بدلے نیکی کرو" اسی تعلیم کو مسیح سے چھ سو سال پہلے لاؤزی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

جو میرے ساتھ نیکی کرتا ہے میں اُسکے ساتھ نیکی کرتا ہوں، اور جو میرے ساتھ نیکی نہیں کرتا، اُسکے ساتھ بھی میں نیکی کرتا ہوں (تاؤ دی کنگ)

نصائح کے یہ گوہرِ آبدار بھی لاؤزی کے بحرِ دماغ کے آغوش پروردہ ہیں:۔

۱۔ دوسروں کو جاننا عقلمندی ہے، لیکن جو اپنے آپ کو جان لے وہ روشن دماغ ہے۔

۲۔ جو دوسروں پر ظفریاب ہوتا ہے وہ قوی ہے، لیکن جو اپنے اوپر فتح پائے وہ بہادروں کا بہادر ہے۔ جس کے پہلو میں قانع دل ہے وہ متمول ہے۔ جو مستعدی سے کام کرتا ہے وہ کامیاب و فائض المرام ہوتا ہے۔ جو اپنی فطرت کے خلاف نہیں کرتا وہ بہت عرصہ تک زندہ رہتا ہے لیکن جو مر جاتا ہے اور زندہ رہتا ہے وہ ابدی خوشیوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ (انضاً ۳۳)

---

[۵] ملاحظہ ہو چغتائی صاحب کی کتاب کنفیوشیزم اور تاؤ ازم صفحہ ۱۹۲

۲۔ جو شخص جلدی سے وعدہ کر بیٹھتا ہے وہ اُسے پورا کرنے میں بہت کم کامیاب ہوتا ہے۔
جو شخص آسان چیزوں کا متلاشی ہے اُسے تمام چیزیں مشکل معلوم ہونگی (ایضاً ب ۶۳)

۳۔ انتظام بے انتظامی سے پہلے ہونا چاہیے، اور تیاری ضرورت کی ونائی سے پیشتر (ایضاً ب ۶۴)

۵۔ اخلاقی تعلیمات "مجلد الطہارت" سے جو تاؤ مذہب کی کتب مقدسہ میں سے ہے، مقتبس ہیں:۔

انسانی روح کا میل جانب طہارت ہے، لیکن اُسکا دل اُس میں خلل انداز ہوتا ہے
انسان کا باطن خموشی پسند ہے، لیکن خواہشات مخل ہوتی ہیں۔ اگر انسان اپنے دل سے
خواہشیں نکال کر پھینک دے تو اُسکے قلب کو خود بخود سکون حاصل ہو جائے۔ دل صاف
ہونا چاہیے پھر روح خود منزہ ہو جائے گی۔ (دیکھو کانگ کنگ ب ۳)

لاؤ تزے جن متقدمین کی فطری سادگی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا
وہ عہد قدیم کے پاکباز لوگ، زندگی کی محبت اور موت کی نفرت سے ناآشنا تھے۔ نہ اس
دنیا میں آنا انکی مسرت کا باعث ہوتا تھا اور نہ یہاں سے چلا جانا انکے دل کو مشوش کرتا
تھا۔ مطمئن روح کے ساتھ وہ یہاں آتے تھے، اور یہاں سے جاتے ہیں (مقالات کونگ تزی ب ۴)

ایسے لوگ کہاں جاتے تھے؟ تاؤ میں جو غیر محدود ہے۔ یعنی محدود غیر محدود میں واصل ہوتا ہے، اور فنا کے بعد بقا میں شامل ہوتا ہے۔ یہ تعلیم بدھ مذہب کے مسئلہ نروان سے مشابہ ہے۔

تاؤ کیا ہے؟:۔

تاؤ خلا ہے۔ فعل و عمل میں انتھک ہے۔ عمق میں وہ تمام اشیا کے مستقبل پر حاوی ہے وہ نوک دار زاویوں کو ہموار کرتا ہے۔ وہ بدنظمی کو دور کرتا ہے۔ وہ چمکا چوند کو دل پسند کرتا ہے۔

تاؤ کی صفات کا خلاصہ یہ ہے:۔

مثل پیار کرنے والے باپ کے وہ تمام مخلوقات پر نظرِ شفقت رکھتا ہے۔ تمام مخلوقات اُسکے دروازہ سے عالمِ حیات میں آئی، اور ہستی کے تمام و کمال تغیرات و تبدلات میں وہ مدام اُنکے راست وچپ رہتا ہے۔ اور محبت سے نشو ونما دیتا ہے۔ سب کو زندگی عطا فرماتا ہے اور کسی چیز کے دینے سے انکار نہیں کرتا۔ گو سب کے سامنے، سب کے اوپر، اور سب کے اندر ہے، وہ دخل نہیں دیتا۔ گو تمام اشیا اُسکے تابع ہیں وہ اپنے آپ کو اُنکا آقا نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کے ساتھ سعی نہیں کرتا۔ وہ ہر فرد واحد کی زندگی کے اندر رہتا ہے۔ اُسکا نفوذ ایسی اشیا میں ہے جنکے اندر کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔ وہ پیدا کرتا ہے، نشو ونما دیتا ہے، بڑھاتا ہے، کھلاتا ہے، پورا کرتا ہے، پکاتا ہے، قوت بخشتا ہے، اور تمام چیزوں کو ڈھکتا ہے۔ وہ نیک آدمی کی شوکت اور بد آدمی کی اُمید ہے۔ وہ اُن لوگوں کو جو دوسروں کی حاجت روائی کرتے ہیں، دوگنا دیتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ ممکن سے ممکن چھوٹی مقدار ہے اور پھر بھی کُل ہے۔ وہ عالم کی وحدت ہے اور لہذا مدد کرتا ہے، قوت بخشتا ہے اور تمام کائنات کو نشو ونما دیتا ہے۔

مذہب تاؤ کی کتب مقدسہ میں دو چھوٹی سی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کا نام کن ینگ پین یعنی کتابِ جزا و سزا ہے۔ ذیل کے گوہر ہائے آبدار اُسی سے ہاتھ لگے ہیں:۔

(۱) جانوروں کے ساتھ رحم سے پیش آو (۲) راست بازی اور اطاعتِ والدین کی عادت ڈالو۔ اپنے چھوٹے بھائیوں سے محبت اور بڑے بھائیوں کا ادب کرو۔ (۳) اپنا تزکیۂ باطن کر اور دوسروں کو نیک بنا (۴) بیواؤں اور یتیموں پر رحم کھا۔ (۵) دوسروں کی واژگونی بخت کو دیکھ کر متالم ہو (۶) دوسروں کی خوش حالی سے مسرور ہو (۷) حاجتمندوں کی مدد کر (۸) مبتلائے آلام کو مصائب سے نجات دلا۔ (۹) دوسروں کے عیوب فاش نہ کر (۱۰) اپنی فضیلت کا اظہار نہ کر (۱۱) بدی کو روک اور نیکی کو ترقی دے (۱۲) بہت ترک کر اور کم لے (۱۳) نیکی کر اور معاوضہ کی توقع نہ رکھ (۱۴) نیکی کو بدی یا بدی کو نیکی مت سمجھ (۱۵) خطا کو جرم خیال نہ کر (۱۶) جب اپنی کوئی خطا تمھیں معلوم ہو جائے تو اُسکی اصلاح کر دو (۱۷) جس بات کو حق جانتے ہو اُسے ضرور کرو (۱۸) اپنا نفع دوسروں کو نقصان دیکر حاصل مت کر (۱۹) دوسروں کا دماغ مت چاٹو (۲۰) دوسروں کے محاسن پر پردہ نہ ڈالو (۲۱) عیش و طرب کے بندے نہ ہو

(۲۰) کبھی ایسی بات نہ کہو جو تمہارے دلی منشا کے خلاف ہو۔

دوسری کتاب کا نام "بن چہ وان تیئنے کتاب ۔ انعامات" ہے۔ یہ مختصر چھوٹی کتاب ہے کہ کل الفاظ کی تعداد صرف ۱۲۰۵ ہے۔ لیکن پند و حکمت کے جواہر سے یہ بھی مالامال ہے۔ مندرجۂ بالا نصائح کے اعادہ کے علاوہ چند بیش قیمت مقولے اس میں ایسی ہیں جنہیں بغیر لکھے ہم نہیں رہ سکتے:۔

صحیح اوزان اور پیمانے استعمال کرو اور لوگوں سے زیادہ دام نہ لو۔ بیواؤں کی تیمارداری کرو اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔ اپنے ہمسایہ کی برائیوں کو پوشیدہ رکھو اپنے تمام افعال میں خدا کے قوانین کی پابندی کرو اور تمام اقوال میں ایمانداری کا اظہار کرو۔ تمام سلف صالحین کو اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ وہ کون سی نعمات ہیں جو ایسے شخص کو میسر نہیں ہو سکتیں جو خفیہ طور پر کارہائے خیر کرتا ہے؟

سید حسن برنی (علیگ)

# کنیز

(۱)

اس کے سوا کہ ہم دونوں بقسمت بھائی بہن اپنے چچا کے گھر میں پیدا ہوئے تھے، ہمیں اپنی بابت کچھ علم نہیں۔ چچا کو بھی ہماری پرورش کا بار زیادہ دنوں نہیں اٹھانا پڑا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری بدولت انکی مالی حالت درست ہو گئی۔ ہم دونوں بھائی بہن چھ سات ہی برس کے تھے کہ ہمارے چچا نے میرے بھائی علی کو درویشوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ کچھ دن بعد مجھے بھی بازار میں بیچ کر پیسے کر لیے۔ اسکے بعد میں نہیں جانتی کہ میرے بھائی کا کیا حشر ہوا۔ میں اپنے نئے مالکوں کے ساتھ قسطنطنیہ چلی آئی۔ میرا آقا ایک معمر شخص تھا۔ کئی برس اسکے یہاں رہتے رہتے گزر گئے۔ اس اثنا میں وہاں سیکڑوں لونڈیاں آئیں اور چلی گئیں۔ ابتدا میں تو میں اس کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکی، مگر رفتہ رفتہ سب معلوم ہو گیا، جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی، میرے خریدار آ آ کر میرے آقا کو تنگ کرنے لگے۔

---

اب میری عمر زیادہ ہو گئی تھی۔ جب میں ندی کے کنارے باغیچہ میں بیٹھ کر دیکھتی کہ کتنے ہی مسافر کشتیوں پر سوار گاتے بجاتے چلے جا رہے ہیں، تو میں انکی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کر کے سخت بے چین ہوا کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میرے چاروں طرف ایک دیوار کھنچی ہوئی ہے، اور آسمان نے ایک سرپوشیا سے مجھے ڈھانپ رکھا ہے۔ اُف! وہی روزانہ کاروبار، وہی محنت و مشقت، وہی روکھی سوکھی روٹی۔ اور وہی غلامی! جب میں یہ یاد کرتی کہ میں صرف لونڈی ہوں، تو غم کے مارے میری چھاتی پھٹنے لگتی۔ آخر اس ارادہ پر مضبوط ہو کر کہ خواہ چھاتی پھٹے یا رہے، ہنسی خوشی تو رہنا ہی ہوگا کہ قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے، مطمئن ہو جاتی۔ مگر اس وقت مجھے مطلق اطمینان حاصل نہیں ہوتا تھا جب میں یہ خیال کرتی تھی کہ ایک نہ ایک دن میرے خریدار بازار میں سبزی ترکاری کی طرح میری بھی دیکھ بھال کریں گے۔

اسوقت میری عمر چودہ (۱۴) برس کی تھی۔ اب دنیا مجھے کچھ اور ہی نظر آنے لگی تھی۔ بھولے ہوئے خواب کی طرح وہ سب باتیں اب یاد آتی ہیں۔ ایک دن میرے آقا نے مجھ سے کہا "نورالنہار! غور سے سنو۔ یہ صاحب جو میرے ساتھ ہیں، آج سے یہی تمہارے مالک ہیں۔ انکو خوش رکھنا تمہارا فرض ہوگا۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں تمہارا خیرخواہ ہوں؛ تمہاری بھلائی کے خیال سے میں یہ کہہ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم لوگوں ہی کے آرام کے لیے ہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارا کچھ نہیں، جو کچھ فائدہ ہے تم لوگوں ہی کا ہے۔"

(۲)

میرے اُس نئے آقا نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا یہ نیا آقا، عادل، بہت اچھا آدمی تھا۔ خدا کی اس مہربانی کے لیے میرا دل تشکر سے پُر تھا۔ میرے ساتھ کی لونڈیاں غریب آدمیوں کے گھر جا پڑی تھیں۔ وہ دن بھر کام کاج کرتیں اور تکلیف جھیلتی تھیں، مگر مجھے عادل کے زیرِ سایہ ہر طرح کی عزت و حکومت حاصل تھی۔ لیکن ایک تکلیف تھی! عادل کے بھائی، مُراد، کا مزاج بہت کڑا تھا۔ وہ جا و بیجا مجھ پر سختی کیا کرتے۔ کوئی دن خالی نہ جاتا کہ میں اُنکے تیرِ ملامت کا نشانہ نہ بنتی، کبھی کبھی اس صدمہ سے میرے آنسو بھی جاری ہو جاتے، مگر مُراد کی زبان سے کبھی کوئی میٹھی بات سننے میں نہ آتی۔ اسکے لیے میں ہمیشہ ترستی رہی۔ لیکن میں نے کبھی اپنے غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ مُراد کی ان بیجا سختیوں کے لیے ہمیشہ دل سے اُنھیں معاف کر دیتی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ شام کے وقت میں برآمدہ میں کھڑی ہوئی گُنگُنا رہی تھی۔ اُسوقت آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے پسِ پشت کسی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ میں ایکدم کانپ اُٹھی، مگر فوراً ہی سمجھ گئی کہ مُراد کے سوا اور کون ہوگا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ کہیں مُراد نے میری گُنگُناہٹ نہ سُن لی ہو، میرے ہوش حواس جاتے رہے۔

مُراد نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نور النہار!"۔ ہاتھ پکڑنا تھا کہ میرے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ میں نے اُنکی طرف دیکھا ہی تھا کہ میرا سر خود بخود جھک گیا۔

مُراد نے کہا "نور النہار! تم یہاں کھڑی ہوئی کیا کرتی ہو؟"

میں۔ "آج وطن کا خیال آ گیا تھا۔ وہاں شام کے وقت باغیچہ میں بیٹھا کرتی تھی، اور یہی منظر وہاں بھی دیکھتی تھی کہ کس طرح آفتاب اپنے تمام دن کا سفر ختم کر کے تھکا ماندہ درختوں کی آڑ میں چھپتا ہے۔" یہ کہتے کہتے میری آواز کانپنے لگی۔

مُراد۔ "میری طرف دیکھو، نور النہار! ہیں، یہ کیا؟ تم روتی کیوں ہو؟"

میں۔ "نہیں، روتی تو نہیں ہوں۔"

مُراد۔ "نہیں کیسی؟ تمھاری آواز ہی صاف بتا رہی ہے۔"

میں "آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

مُراد۔ "خیر۔ تمھیں معلوم ہے نور النہار! کہ میری شادی ہوگی؟"

مُراد کے مُنھ سے یہ لفظ سُننا تھا کہ یہ معلوم ہوا گویا کسی نے کھینچ کر تیر مارا ہے۔ میں نے بہت سوچا، مگر اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ مُراد نے پھر کہا

"نور النہار! شاید تم میری سخت مزاجی کے باعث یہ سمجھتی ہوگی کہ جو عورت میری بیوی ہوگی، وہ میرے ساتھ خوش نہیں رہے گی۔"

میں نے حوصلہ کر کے جواب دیا۔ "نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ کیوں نہیں خوش رہے گی۔ یقیناً تم اُس سے محبت کرو گے۔ اگر کبھی کبھی مجھ پر خفا ہوتے ہو تو اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس پر بھی خفا ہو گے۔"

مُراد نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میرا سر اپنے سینہ کی طرف کھینچ کر کہا "تم سمجھتی ہو کہ میں تم پر صرف غصہ ہوتا ہوں، اور تم سے الفت نہیں کرتا۔ اچھا، سُنو۔ میں تمھیں پیار کرتا ہوں، اور دل سے پیار کرتا ہوں۔ جتنا کوئی شخص کسی کو پیار کر سکتا ہے، اُتنا ہی میں تمھیں پیار کرتا ہوں۔ اور سنو، میں تمھیں اِتنا پیار کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تم میری نہیں بلکہ کسی اور کی ہوگی تو میں اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار رہوں۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ آج پہلی مرتبہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ دُنیا اسقدر خوشنما اور مسرت بخش ہے۔ میں نے کہا "مُراد! پھر کیا وجہ ہے کہ تم مجھ پر اسقدر غُصہ ظاہر کیا کرتے ہو؟"

مُراد۔ "نور النہار! تم یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ میں غصہ کیوں ظاہر کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری سخت کلامی سے تمھاری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم دل میں بے چین ہوتی ہو۔ مگر تم یہ نہیں جانتیں کہ تم پر سختی کر کے میں خود بھی بے چین ہوتا ہوں۔ یہ تمھارے آنسوؤں ہی کی طاقت ہے کہ مجھ ایسے وحشی کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ یہ انھیں آنسوؤں کا صدقہ ہے کہ آج تم اس گھر کی لونڈی نہیں بلکہ نور النہار خانم اس گھر کی ملکہ اور میری پیاری ہو!"

اتنا کہہ کر فرہاد نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میری زلفوں کا بوسہ لیا۔ خوشی کے مارے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ فرہاد چلے گئے، مگر میں وہیں برآمدہ میں کھڑی ہوئی سوچتی رہی کہ "یہ کیسا خواب ہے"

اسوقت چاندنی پھیل چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے شام کی تاریکی کو روپہلے پانی سے دھو ڈالا ہے۔

(۳)

جنم کی لونڈی کو آج دوسرے ہی لوگ نہیں بلکہ ساتھ والی لونڈیاں اور فرہاد کے بڑے بھائی عادل بھی نورالنہار خانم کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں اپنی عادت جلد ترک نہ کر سکی۔ اب بھی کبھی کبھی عادل کے قدموں میں بیٹھ جاتی، لونڈیوں کی موجودگی میں بھی کبھی کبھی گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ ایسی حالت میں عادل نہایت محبت سے مجھے محل میں بیٹھنے کو کہتے۔ یہ سب محبت اور درگزر کا نتیجہ! رہی فرہاد کی محبت، سو وہ ایسی تھی کہ قدرتی سینریاں بھی ایسی دلکش نہ تھیں۔

لونڈیاں مجھے پنکھا جھلتیں، میرے جوتے صاف کرتیں، اور ہر طرح ادب و تعظیم سے پیش آتیں۔ ایک وہ دن تھا کہ میں بھی اُنکے ہمراہ اپنے آقا کے آرام کے لیے خدمت میں مشغول رہتی تھی۔ لیکن آج وہ میرے آرام کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ میں نے انکی خدمات یا دُکھ سکھ کا خیال نہیں کیا، اور خیال کرتی بھی کیونکر؟ مجھے فرہاد کی محبت مل چکی تھی، اور میں اسی محبت میں دنیا و مافیہا سے بےخبر رہتی تھی

ہمارا نکاح ہو جانے کے بعد عادل مجھے اور اپنے چھوٹے بھائی فرہاد کو اپنا سب مال و متاع سونپ کر بغرض سیاحت کہیں چلے گئے۔ اُسوقت سے آج تک اُنکا پتہ نہیں چلا۔

(۴)

فرہاد کی الفت دن بدن بڑھتی گئی۔ میرے آرام و آسایش کا اُنھیں اسقدر خیال رہتا تھا کہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ اسکے بعد ہمیں ایسی خوشی حاصل ہوئی جو حدِ بیان سے باہر ہے۔ اسکے بعد ہمارا جامِ مسرت چھلکنے لگا۔ خدا نے ہمیں فرزندِ نرینہ عنایت فرمایا، جس سے ہم اس قدر خوش ہوئے کہ امید بندھ گئی کہ اب مصیبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ مگر افسوس! ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ یہ امید موہوم تھی۔ کیونکہ اس اثنا میں ایک ایسا واقعہ گزرا جس کو ہماری مصیبتوں کا شروع کہنا چاہیے۔ یہ واقعہ کیا تھا؟ میری لونڈیوں کے رشک و عداوت کا نتیجہ!

میں ایک دریچہ کے پاس کھڑی تھی کہ مجھے کسی کے بات چیت کرنے کی آواز معلوم ہوئی۔ میں نے کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ میرا ہی ذکرِ خیر ہو رہا ہے — — "وہ بھی تو ہم لوگوں کی طرح غلام ہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اُس کی خدمت کریں، اور وہ ملکہ بنی بیٹھی رہے۔ کیا صرف اس لیے کہ خدا صورت شکل کی اچھی ہے؟ نہیں، اب یہ ہم سے ہرگز نہیں سہا جائے گا ....." گفتگو اسی قسم کی تھی۔ مگر لونڈیوں کے جلاپے سے میرا کیا نقصان ہو سکتا تھا؟ علاوہ ازیں میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ ان باتوں کا خیال کرتی۔ فرہاد، اور میرا پیارا اچھوٹا سا بچہ، دنیا میں یہ دو چیزیں ایسی تھیں کہ مجھے انھیں کے خیال سے رہائی نہیں ہوتی تھی۔

ایک دن فرہاد کے کسی دوست نے انکی دعوت کی تھی، وہ شام کو اُدھر روانہ ہوئے اور میں بچہ کو اپنی چھاتی سے لگا کر پڑ رہی۔ لونڈیوں کے رشک و عداوت کا مجھے خیال نہ تھا۔

---

رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک لونڈی میرے کمرے میں آئی۔ استقلال اور مضبوطی ارادہ کے نشان اُسکے چہرہ پر نمایاں تھے۔ لیکن کیوں؟ اتنا سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اُس نے کہا "گھر میں آگ لگی ہے!" اور فوراً کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ اُف! کیسی بھیانک ہنسی! میں ابھی کچھ بولنے نہیں پائی تھی کہ وہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ اور چلتے وقت باہر سے زنجیر لگا گئی۔

"گھر میں آگ لگی ہے!" اسکا کیا مطلب ہے؟ موت، اور اٹل موت! اپنی

مجھے چنداں فکر نہ تھی۔ اگر فکر تھی تو صرف اپنے پیارے بچہ کی، ہاں، وہی بچہ جسکو میں اپنی زندگی کا سہارا سمجھتی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا خوشی میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مار مار کر ہنس رہا تھا۔ اسوقت ہنسی! نادان بچہ!! نہیں جانتا کہ اسوقت وہ کس مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اُسکو معلوم ہی نہیں کہ آج اُسکی بے یار و مددگار ماں بھی اُسے اس مصیبت سے نہیں بچا سکے گی۔

کھڑکی کھول کر دیکھا تو گھر کے چاروں طرف آگ ہی آگ نظر آئی۔ خونخوار شعلے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ "آج میری زندگی انھیں شعلوں کی نذر ہوگی!" میں نے بستر، چادر، اور مسہری میں بچہ کو خوب اچھی طرح لپیٹا، اور چھاتی سے باندھ کر برآمدہ میں آکر دیکھنے لگی۔ شعلے اوپر کو اٹھ رہے تھے۔ اُف! جدھر دیکھتی تھی موت کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔

میں اُسوقت حواس باختہ تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتی تھی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ کوئی غیر محسوس طاقت مجھے اُبھار رہی تھی۔ بچے کا خیال آتے ہی میں برآمدہ سے نیچے کود پڑی۔

(۵)

ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے پڑی ہوں۔ یہ کیا؟ کیا ابھی تک آگ فرو نہیں ہوئی؟ نہیں، آگ تو بجھ گئی، اب کچھ اور ہی سمجھنا چاہیے۔ ہیں! یہ نئی زندگی ہے کہ مصیبتوں کا شروع؟ سرھانے کون بیٹھا ہے؟ مراد۔ ان کی شکل اُداس کیوں ہے؟ "بتاؤ! میرا بچہ، میری زندگی کا سہارا کہاں ہے؟"

مراد نے کہا "نورالنہار!" اس سے زیادہ کچھ اور نہ کہہ سکے، اور زبیدہ گئی۔ شدت غم کے باعث چہرہ اور آنکھوں پر چھائیاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے دوبارہ دریافت کیا "میرا بچہ کہاں ہے؟"

"وہ دیکھو، درخت کی آڑ میں سو رہا ہے۔ فکر و اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔ آگ سے اُسے مطلق ضرر نہیں پہنچا۔ مگر نورالنہار! ہمارا سب مال و متاع جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے کہا "یہ کیا؟ روتے کیوں ہو؟ بچہ بچ گیا، یہی کیا کم ہے۔ تم لوگوں کی موجودگی میں مجھے کسی قسم کا رنج و غم نہیں۔ خدا کا شکر کرو۔"

مراد۔ "ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔ نورالنہار! میرا مال و متاع تمھیں ہو! میں اسکو بہت غنیمت سمجھتا ہوں کہ اس آفت میں تمھیں نہ کھو بیٹھا۔"

آج ہم لوگ مفلس ہیں۔ سب کچھ آگ کی نذر ہو گیا۔ غلاموں اور لونڈیوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ مراد، میں، اور بچہ، بس صرف ہم تین موجود تھے۔ آہ! اگر اُسوقت لونڈیوں کی باتوں سے درگزر نہ کرتی، اگر اُنکی باتوں کو نظر ہی سے نہ دیکھتی، تو آج یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ انھوں نے ہی تو آتش رشک سے جل بھن کر گھر میں آگ لگا دی تھی۔

---

ہم لوگ اب ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ مراد نے ایک ادنیٰ سی ملازمت اٹھالی ہے جسکی آمدنی سے ہم لوگوں کا گزارہ ہوتا ہے۔ کام کاج کرنے کیلئے کوئی نہیں۔ گھر کا سب کام میں خود کرتی ہوں۔ مراد جب کام پر چلے جاتے ہیں تو میں بچہ کی پیاری صورت دیکھ دیکھ کر دن گزارتی ہوں۔ شام ہوتے ہی گھر کا کام کاج ختم کر کے بچے کو گود میں لے بیٹھتی اور اپنے مراد کی راہ دیکھا کرتی ہوں۔ جب وہ آتے ہیں تو ان کو کھلا پلا کر اُنکے پاؤں دابتی ہوں، اور جب وہ سو جاتے ہیں تو میں بھی سو رہتی ہوں۔ یہی میرا روزمرہ کا شغل ہے۔ ایک روز سب کام کاج کر کے میں مراد کے پاؤں داب رہی تھی، کہ اُنھوں نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہا "نورالنہار! تمھیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے یہی فکر رہتی ہے کہ کہیں اس محنت سے تمھاری صحت نہ خراب ہو جائے۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ غور کرنے لگی کہ مجھے کون سی تکلیف ہے۔ آخر یہ بھی تو کام کرنے کے عادی نہیں۔ میں نے فوراً اپنا سر اُن کے قدموں پر رکھ دیا اور بولی "میری محنت؟ پیارے! اسکے لیے کچھ غم نہ کرو میں تو تمھاری کنیز ہوں۔"

پلٹئے

# اُردو رسالوں پر سرسری نظر

سنا ہے کہ ایک مرتبہ زبان اور دانتوں میں باہم ٹھن گئی۔ دانتوں نے زبان سے کہا "پانی میں۔ سنا ہے تو کہ مجھ سے بے خوب نہیں۔ ہم بتیس ہیں اور تو ایک۔ چبا ہی نہ ڈالیں تو کیا کرنا" زبان بھی کب دبنے والی تھی۔ اس نے جواب دیا "بیشک! تم ہو تو زیادہ۔ مگر یاد رکھنا کہ مجھ سے عداوت مول لی تو تمہاری بھی خیر نہیں۔ جب تک میں اچھی، ہی تو تم ٹھیک۔ شامت ہو میں بگڑی تو خیال کرو تم کہاں ہو گے" یہی حال اس زمانے کے رسالوں اور اخباروں کا ہے۔ ان کی زبان درست نہیں تو ظاہری اور معنوی ساری خوبیاں خاک ہیں۔ یہ رسالے جو آب و تاب و پابندی وقت سے شائع ہوتے گیا کسی کو انکار ہے؟ کاغذ، لکھائی، چھپائی، ضخامت، تصاویر، مضامین وغیرہ کے اعتبار سے یہ اپنی آپ نظیر تھے۔ اعلیٰ مضامین نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھے گئے جس سے قابل مضمون نگاروں کی کوشش اور جگر کاوی کا پتہ چلتا ہے۔ خاص و عام نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ ہزاروں نے شوق کے ہاتھوں میں ان کو لیا، اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ سب کچھ سہی لیکن ان کی زبان کے متعلق ہمارا خیال کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ جس پرچہ کو دیکھا (بجز ایک یا دو کے) اُردو کے دامن پر بدنما داغ ہی نظر آئے۔ اُردو رسالوں کا پہلا مقصد تو یہی ہے کہ اُردو کو مکمل اور اعلیٰ زبان کے رتبہ کو پہنچائیں لیکن اس مقصد کے پورا کرنے میں یہ ناکام اور پیچھے ہی رہے جن میں ایسے فقرے دیکھنے میں آئیں "جب پھول کھلتا ہے اور خوشبو ہوا میں پھوٹتا ہے" ان کی زبان کو بھلا ہم کس طرح کہیں کہ صحیح و شستہ ہے۔

خاص اہل دہلی و لکھنؤ پر تو ان کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا کہ ان لوگوں پر جو اہل زبان نہیں اور یہی گروہ بڑا بھی ہے۔ نامی گرامی رسالوں میں جب غلطیاں ہوں گی۔ پائیں تو ایک اجنبی شخص کا غلطی میں پڑ جانا قرین قیاس ہے۔ ان کی وجہ سے سیکڑوں اور ہزاروں کی زبان بگڑ جائے بلکہ خود اُردو کی صورت مسخ ہو جائے تو تعجب نہیں نتیجہ ظاہر ہے۔ اُردو پر احسان کرنا تو کیا اُلٹے اس کے حق میں کانٹے بو دیئے۔ کاش زبان کی خاطر سے اس قسم کے مضامین درج کر دئے جائیں۔ یا کم از کم حاشیہ پر ان غلطیوں کی تصحیح کی جایا کرے تو اُردو مرہون منت رہے گی اور کسی کو شکوے کا موقعہ نہ ملے گا۔

اس خوف سے کہ کوئی اس کو گستاخی اور کفران نعمت نہ کہہ بیٹھے ہم اپنی اس تحریر کا ثبوت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمیں یہ گوارا نہیں کہ مضامین کی سُرخی اور مضمون نگاروں کے نام کو ظاہر کر کے دلشکنی کریں۔

میر مونس کا مصرع ہے "بوتلیں سُرخ ہیں ساقی ترے میخانہ کی"

اس میں "بوتلیں" گو انگریزی لفظ ہے مگر کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹاٹ، ریل، گلاس وغیرہ الفاظ ہیں کہ بالکل اُردو کے ہو گئے ہیں۔ ان کے استعمال سے کوئی مانع نہیں لیکن یہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک جج یا ایک افسر کے جاتے پر دوسرا جج یا دوسرا افسر باضابطہ چارج لیتا ہے اور اس کا گزٹ بھی ہوتا ہے"۔ اس کو ہم نہ اُردو کہہ سکتے ہیں نہ انگریزی۔

"اب پھر جا بجا زرعی کالج اور اسکول قائم کر کے لوگوں کو اس لاین کی طرف متوجہ کر رہی ہے"۔ لاین کا لفظ کہنا مقصود ہو تو اور بات ہے ورنہ ضرورت نہ تھی۔ زرعی کالج!

"ایک مخصوص نظام یہاں کے بیرونی آرگنایزیشن پر سبقت رکھتا ہے"۔ محض اُردو داں حضرات اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

"اس لئے اسکولی تعلیم کے بعد، اسکول کو ہی" لگا کر خوب اجراء کار کیا ہے۔

"آپ کے رسالے کے خریدار پُرانے ہمدرد فرنٹ ہو گئے"۔ فرنٹ ہونا ملاحظہ ہو۔

"وہ ایک آ[illegible]

"یہ کتاب درحقیقت برہمو سماج کے ڈیفنس میں لکھی گئی ہے۔" بہت بہتر!

"وہ ان عہدوں سے ریٹائر ہو جائیں۔" ضرور!

"کیونکہ اس میں اعلیٰ اسپیکر اور بہت بڑے تھنکر کے خیالات اور تجربات نہایت پسند آمیز اور دلچسپ طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔" اسپیکر اور تھنکر! ماشاء اللہ!! اور پسند آمیز طریقہ کی بھی ایک ہی کہی۔

"اس کی ترکیب میں دو گیسی اجزا آکسیجن و ہائیڈروجن شامل ہیں۔" گیسی اجزا! خوب! جہاں چاہا "ی" لگا دی۔

"فلسفی حقائق کو اعلیٰ ترین سائنسی سچائیوں سے وہی نسبت ہے۔" سائنسی سچائیوں! دوسرا اَنکل کھلا۔

"جن کے باپ دادا تیری تماک چومتے تھے۔"

"پھر عمدہ ساعت کے آنے پر برہمنوں کے۔" نیک ساعت محاورہ ہے۔

"ہاتھی دانت کے موٹھ کی تلواریں بھینٹ میں پیش کیں۔" تلوار کا قبضہ ہوتا ہے یا موٹھ؟

"مگر اس مصیبت سے چھٹانے کے لئے انھوں نے۔" چھڑانا فصیح ہے۔

"اس کے سر کو پاؤں سے ٹکرایا۔" پاؤں سے ٹھکراتے ہیں نہ کہ ٹکراتے۔

"انھیں مع ان کے معاونوں کے جان سے مار دینا چاہئے۔" مار دینا یہاں بالکل غلط ہے۔ "مار ڈالنا چاہئے۔" اور مع کی اضافت بھی غلط ہے۔

"شاید یہ سوال پوچھا جائے۔" سوال پوچھنا آج ہی سنا ہے۔

"جب وہ ہوا میں ملا تو موٹ پیدا ہوا جسے بعض کیچڑ کا اور بعض ترکیب آبی کا فضلہ پکارتے ہیں۔" کیونکر؟ چیخیں مار مار کر!

"لیکن جارج اسمتھ کی ان تھک کوششوں سے جو اس نے خط میخی پڑھنے میں مصروف کی تھیں۔" صرف کی تھیں چاہئے۔

"سمجھدار آدمی کو اس وقت تک فیصلہ نہ دینا چاہئے۔" فیصلہ دینا خلاف محاورہ ہے۔

"اور قریباً تو بیا تعلق" "ب" کو الف لگایا اور الف پر دو زبر۔ مگر کس قاعدے سے حضور؟ تقریباً میں تو مصدر کے ساتھ عربی قاعدے کے موافق یہ عمل کیا گیا تھا۔

"گفتگو کے دوران میں جواباً کہا تھا۔" یہ بھی ویسی ہی بات ہے۔

"اپنے فرض کی ادائیگی اور بندگانِ خدا کی خدمت گزاری کی۔" ادائیگی قابل داد ہے۔

"وہ اس کام میں اپنی زندگی کے اندر کامیاب نہ ہوسکے۔" تو پھر زندگی کے باہر کامیاب ہو جائیں گے۔ حرج ہی کیا ہے؟

"تم جانتے ہو کہ چاند زمین کے گرد چرخ لگاتا ہے۔" چرخ کھانا یعنی چکر کھانا ہی اصطلاح ہے۔

"بی بان نے کتنی دفعہ جن بار اس دعویٰ کی تکرار کی۔" کئی بار کافی تھا۔ دفعہ کو خواہ مخواہ بیچ میں اجنبی بنا کر داخل کیا۔

"مادہ کے وزن میں خفت و اضافہ نہیں ہوسکتا ہے۔" خفت ملاحظہ ہو۔

"قاعدہ کلیہ ہزار پانچسو لڑائیوں کی کیفیت اور شوق کو مشاہدہ کرنے کے بعد قائم کیا گیا ہے۔" لفظ پانچ کے ساتھ جب سات و سو کے الفاظ ملائے جاتے ہیں تو "چ" کو گرا کر پانسات اور پانسو کہتے ہیں۔

"اور دولہا سے یورپ خصوصاً۔" دول کو واحد تو نہیں سمجھ لیا اور پھر عربی لفظ کے ساتھ "ہائے" فارسی! خوب!!

"اور برسہا برس ایک ایک کتاب کو لائق علما نے درست کر کے شائع کیا۔" برسہا برس! انشا پردازی کے صدقے!

"ایک تارک الدنیا وعظ دے رہا تھا۔" وعظ کرنا نہ کہ وعظ دینا۔

"ننگی شخصیت لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا پڑتی ہے۔" ننگی شخصیت قابل داد ہے۔

"جیسا کہ اس کے دینی اور غیر دینی لٹریچر سے ظاہر ہے۔" غیر دینی کی جگہ غیر مذہبی لکھا جاتا تو درست ہوتا۔

"پڑھنے والوں کو خاص عقلی حظ حاصل ہوتا ہے" علاوہ "عقلی حظ" ذوقی حظ! بھی ہو تا !!

"عالمان اثریات بھی اثری شہادت کی بنا پر" اثری شہادت وغیرہ نئی اصطلاحیں ہیں۔

"وہ ایک معدوم زرعی سائنس کا بقیہ ہی معلوم ہوتا ہے۔" زرعی سائنس کی جگہ فن زراعت ہو سکتا تھا لیکن نہیں لکھا۔

"تارکان وطن کی لہر پر لہر بہتی تھی۔" لہر آ رہی تھی۔

"لیکن بعض حالتوں میں ان لوگوں کے اندر بھی خود ضبطی، ایثار اور خدمت گزاری کا قابل ذکر مادہ پایا جاتا ہے۔" خود داری سنتے ہیں۔ خود ضبطی تو کسی نے بھی نہ سنا ہوگا۔

"ماں کی تعلیم و تربیت اس کے نیک خصائل اور نیک چال چلن کا خاموش اثر چھوٹے بچوں کے دل پر ایسا گہرا پڑتا ہے۔" خاموش بھی خوب! پکارتا ہوا نہیں؟

"لاکلام دہلی و لکھنؤ کے شعرا نے اعلیٰ درجہ کی فارسیاتہ اردو لکھی ہے۔" فارسیاتہ اردو کی داد ہم ناظرین سے طلب کرتے ہیں۔

"نہ ان کے حالات کسی خود نوشت یا غیر نوشتہ سوانح عمری میں مذکور ہیں" Biography اور Autobiography کا ترجمہ غیر نوشت سوانح عمری اور خود نوشت سوانح عمری کیا گیا ہے۔ زباں داں حضرات پسند فرمائیں تو ہمیں کچھ عذر نہیں۔

"یہ سب باتیں واقعی تکلیف دہ اور شرمساری والانے والی تھیں" جس قدر داد دیجئے کم ہے۔

"یا ایشور! تو میری مدد کر" "یا" عربی زبان کا حرف ندا ہے۔ یا رب، یا الٰہی بالکل صحیح ہیں۔ یا خدا کہنا بھی درست نہیں۔ مگر یا ایشور کو دیکھئے۔

"اپنی اور اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق کتابوں کے جنگلستان و خارستان سے چیدہ چیدہ کتابیں اپنے اپنے مذاق کے موافق چن لو۔" جنگلستان، خوب کہا ہے۔ستان جہاں چاہا لگا دیا چنانچہ "تھوڑی سی مفید و منتخب لائبریری بمقابلہ بڑی کتابستان کے بہتر ہے۔" کتابستان بھی ملاحظہ ہو کیا لائبریری کے لئے کتاب خانہ کا لفظ نہ تھا۔

"لیکن سورج، چاند اور پانچوں سیارے جو ننگی آنکھ کو نظر آتے ہیں" ننگی آنکھ Naked Eye کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر بھدا اس سے بہتر تھا کہ بغیر دوربین وغیرہ کے نظر آتے لکھ دیا ہوتا۔

"اس کے پرائیویٹ حقوق و فرائض کو اس کے سرکاری حقوق و فرائض جانا جاتا ہے۔" پرائیویٹ کو خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔ خانگی کا لفظ اردو میں موجود تھا۔ حقوق و فرائض جانا جاتا ہے۔ جانے جاتے چاہئے۔

"چند سال یا کروڑ سالوں کے بعد دنیا بگڑ جاتی ہے۔" سال کی جمع سالوں خوب بنائی ہے۔

"جس نے ابتدا میں پانیوں کو جنبش دی۔" پانیوں پر تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

"اس کے مرنے میں کئی برسیں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اگرچہ کہ فی الواقع ایک ہی گھنٹہ گزرا۔" برسیں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں! واللہ زباں دانی کو بٹہ لگتا ہے۔

"جب تک ماں کے اخلاق اچھے نہیں ہوں لڑکوں کا اخلاق اچھا ہو نہیں سکتا۔" ایک ہی سطر میں اخلاق جمع بھی واحد بھی۔

"سچ پوچھو تو یہ جزر و مد نہیں ہے اس کو تلاطم اور امواج ہو جانا کہہ سکتے ہو۔" امواج موج کی جمع ہے۔

"پانی انسان کی مصروفیتوں کے کتنے بڑے شعبوں پر حاوی ہے۔" مصروفیتوں نئی جمع بنائی ہے۔

"سائنس کی دریافتوں کے لئے لازم ہے۔" دریافت کی جمع دریافتہا اردو میں مستعمل نہیں۔

"... کی تحقیق ... "



فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی مرحوم

"دہلی زمانۂ قدیم سے ہندوستان کا دار السلطنت رہا ہے۔" رہی نہ چاہئے۔

"یہ عمارت اپنی آپ ہی نظیر تھی اور اس معمار کی کاریگری کی سب سے اعلیٰ نمونہ تھی۔" اس معمار کی کاریگری کا سب سے اعلیٰ نمونہ تھی چاہئے کیونکہ نمونہ مذکر ہے۔

"تقدس مآب پوپ کا نیاز حاصل کر کے وہاں کے حالات شائع کئے۔" پوپ کا نیاز ملاحظہ فرمائیے۔

"گرد و غبار پیر نہیں پڑتا اور گھاس جمتا ہے۔" گھاس کو کہیں بھی مذکر نہیں کہتے ہیں۔

"اس قسم کی معاشرتی یا نسلی ایکسانیت پائی جاتی ہے۔" اسم فاعل یا اسم مفعول کے آخر میں یت لگا کر مصدر بناتے ہیں لیکن آجکل دیکھا جا رہا ہے کہ جس لفظ کے آخر میں چاہا ئیت لگا دیا اور کام نکال لیا۔ ملاحظہ ہو۔

"جو تعلق ویلیشن کو برطانیت کے جزو مرکزی سے ہے کیا وہی اور قریباً ویسا ہی تعلق ......."

"قدیم ہندوستان میں راجہ کو عام طور پر "دشم تی" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔" فعل مجہول میں 'کو' کس طرح آسکتا ہے؟ لیکن اکثر اصحاب اس میں غلطی کرتے ہیں۔

"رات کا ایک بجا ہوگا کہ مجھے جگایا گیا۔" بالکل غلط۔ رات کو ایک بجا ہوگا کہ میں جگایا گیا، چاہئے۔

اس کو مشتے از خروارے کی مثال سمجھئے۔ ایسی سیکڑوں غلطیاں ہوا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ نظم کے حصے پر تو کچھ بھی نہیں لکھا۔ انشا اللہ بشرط فرصت لکھا جائے گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ کوئی اور صاحب قلم اٹھائیں تاکہ نثر و نظم پر کچھ نہ کچھ تنقید ہو جائے۔

اب ہم ایڈیٹروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ توجہ فرمائیں۔ زبان کا خیال خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری تحریر خالی نہ جائے گی۔

محمد اسد اللہ

# فصیح الملک داغ دہلوی

نواب مرزا خاں داغ اُن مقدس اور قابل پرستش نفوس کی آخری یادگار تھے جو اپنے کمال کے زور سے دہلی کے افق سے طلوع ہو کر آسمان سخن پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور خاکدان ہند کو اپنی نورانی فکر کی شعاعوں سے منور کیا۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے صفحات آب حیات میں بہارستانِ اُردو کی جو نشاط انگیز تصویر دکھائی ہے وہ پانچویں دور پر آ کر ختم ہو گئی ہے لیکن اگر زمانہ مساعدت کرتا اور وہ اپنے تذکرے کی تکمیل پر قادر ہوتے تو یہ ایک یقینی امر ہے کہ اس دورِ آخر کے شعراء میں داغ کا ذکر نہایت جلی الفاظ میں کیا جاتا اور شہ نشین شاعری پر جو جگہ ذوق نے خالی کی تھی بلا شبہ داغ کے حصے میں آتی۔

اُردو شاعری کی کوئی مبسوط تاریخ موجود نہیں لیکن جو کچھ بھی معلومات مولانا آزاد کے رشحات قلم کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے اس پر سرسری غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک کئی نوع کے شعر گو ہمارے یہاں پیدا ہو چکے ہیں لیکن مجموعی طور پر داغ کا سا جامع خصوصیات شاعر آج تک اُردو میں نہیں گذرا۔ یہ خصوصیات کچھ تو ان کے کلام اور کمال سے متعلق ہیں اور کچھ ان کی ذات سے، اور ان سبھوں نے مل کر اُن کی شخصیت کو یقیناً ایک قابل رشک چیز بنا دیا تھا۔

حضرت داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء (مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ) کو مقام دہلی

پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں شعر و شاعری کا جو چرچا وہاں تھا اُس کے عجیب تذکروں سے باخبر اصحاب نا واقف نہ ہوں گے۔ بادشاہ و ولیعہد دونوں شعر گوئی کے دلدادہ تھے اور حکمرانوں کے اس شوق نے امرا اور متوسطین کے طبقے میں بھی شاعری کی روح پھونک دی تھی۔ داغ سن تمیز کو پہنچتے ہی اسی دیوی کے پرستاروں میں شریک ہو گئے لیکن خون لگا کر شہیدوں میں نہیں ملے۔ مبدء فیاض سے اُنھیں وجدانِ سلیم کا وافی حصہ ملا تھا اور فطرت نے اُنھیں ذہین، نکتہ رس، اور طباع بنانے میں بخل سے مطلق کام نہ لیا تھا۔ ممکن نہیں کہ انسان جس آب و ہوا میں پلے اُس سے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر رہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ جذب تاثیر کی قوت بھی درمیان میں کام کرتی ہو۔ اُس زمانہ میں قلعہ معلّی میں شاہی اہتمام سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ مخصوص اشخاص کو شرکت کی اجازت ملتی تھی۔ بادشاہ خود تشریف لاتے تھے۔ اساتذہ وقت کے علاوہ دوسرے مشہور شعراء کو بھی باریابی کا موقع ملتا تھا۔ جب کسی امیر و رئیس کے صاحبزادے بحیثیت شاعر اس جلسے میں آتے تو سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوتے اور پھر وہ اپنا کلام سُناتے۔ اسی حیثیت اور اسی صورت سے ہم داغ کو بھی بہ عالم نو عمری بادشاہ کے سامنے یہ غزل سُناتے دیکھتے ہیں ؎

نکالی اب تو سینے سے کہ جانِ پُرالم نکلے جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
خدا ہے حشر کے دن التجا تیری نہ مانوں میں مرے منہ سے نہیں نکلے ترے منہ سے قسم نکلے
مرے دل سے کوئی پوچھے شبِ فرقت کی بیتابی یہی فریاد تھی لب پر کہ یارب جلد دم نکلے
ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے
مبارک ہو یہ گھر غیروں کو، تم کو، پاسبانوں کو ہمارا کیا اجارا ہے، نکالا تم نے، ہم نکلے
سمجھ کر رحم دل تم کو دیا تھا ہم نے دل اپنا مگر تم تو بلا نکلے، غضب نکلے، ستم نکلے
وہم پرسش جو دیکھا اس نے سفاک کو مضطر عدو مضطر ہے دل تڑپے ہوئے گھبرا کے ہم نکلے
کہیں کیا دل میں کیا آیا کہیں کیا منہ سے کیا نکلا کبھی جو چلتے پھرتے ہم سوئے بیت الصنم نکلے

گئے ہیں رنج و غم اے داغ بعد مرگ ساتھ اپنے
اگر نکلے تو یہ اپنے رفیقانِ عدم نکلے

یہ غزل بادشاہ سلامت کے طرحی مصرعہ پر کہی گئی تھی۔ کسی شاعر کی ابتدائی کوششیں اس سے زیادہ بارور نہیں ہو سکتیں کہ سامعین سے قبولیت اور پسندیدگی کا سرٹیفکٹ لے لیں۔ داغ کا ایک ایک شعر اہل مجلس کو لطف بخش رہا تھا اور جب غزل تمام ہوئی تو بادشاہ بیساختہ کہہ اُٹھے کہ "کیا اچھی طبیعت پائی ہے"۔

لیکن یہ پہلا ہی موقع نہ تھا کہ داغ مشاعرے میں آئے ہوں۔ شاہی مجلس شعر و سخن کے علاوہ دہلی میں اُس وقت عام طور پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور اُن میں داغ اس سے کچھ پیشتر اپنی نازک خیالی کا ثبوت خاص و عام کے سامنے پیش کر چکے تھے۔ شاہی مشاعرے میں اُنھیں جو کامیابی ہوئی اُس نے اُن کے طایر شہرت کے پر لگا دئے اور اُس کے بعد پھر کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں مشتاقانِ فن کی نگاہ داغ پر خصوصیت سے نہ پڑتی ہو۔

تھوڑے ہی دن میں داغ کے کلام نے قبولیت کے وہ تمام مدارج طے کر لئے جو اکثر حالتوں میں معمولی شعراء کے لئے بہت دشوار بلکہ ناممکن ہوتے ہیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ اُستاد کی زندگی تک شاگرد کی نام آوری کا حلقہ بہت محدود رہتا ہے۔ اس کلیہ کا استثنا کچھ تو داغ کے اُستاد ذوق کے حالات میں پایا جاتا ہے جنھوں نے شاہ نصیر کی موجودگی ہی میں غیر معمولی ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی اور کچھ داغ کی سرگذشت میں کہ اُنھوں نے اپنے اُستاد کے سامنے اپنا نام چمکا لیا۔ ذوق کی کامیابی کا راز شاہی سرپرستی میں چھپا ہوا ہے لیکن داغ محض اپنے کلام کے زور سے مشہور ہوئے۔ غرض داغ کا ابتدائی رنگ اس قدر شوخ تھا کہ ہر کس و ناکس کی نگاہ اُس پر پڑتی تھی اور اس کے

ساتھ تاثیر کلام نے مل کر سونے میں سہاگے کا کام کیا کہ جن مشاعروں میں غالب، ذوق، شیفتہ، اور مومن وغیرہ معرکہ آرائیاں کرتے تھے وہاں داغ بھی اپنے کمال کے زور سے داد تحسین حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہے۔

داغ شیخ ابراہیم ذوق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے یقیناً ذوق کو ایسے سرمایہ ناز شاگرد کے وجود پر فخر رہا ہوگا لیکن ان دونوں کی پرائیویٹ زندگی اور ذاتی روابط کے وہ نقش و نگار معدوم ہیں جو غالب کے دور سے معلیٰ میں کھینچے گئے ہیں اور جن سے استاد اور شاگرد کے ارتباط و خلوص کی صحیح اور سچی کیفیت پیش نظر ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد نے ذوق مرحوم کے حالات میں اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے شاگردوں کا معمولی سا تذکرہ بھی نہیں کیا گیا ورنہ اس سے بہت سے ادبی فواید مترتب ہو سکتے تھے۔ بہرکیف ذوق کے شاگرد ہونے کا فخر خواہ داغ کے لئے ذاتی طور پر پایۂ نازش رہا ہو لیکن اُن کی عظمت و شہرت کی کفالت ان تعلقات سے نہیں بلکہ اُن کے کلام سے ہے۔ استاد کے فیضان صحبت سے داغ متمتع ہوئے ہوں گے۔ لیکن داغ کی ناموری اور اقبالمندی اُن کی ذہنی اور دماغی قابلیتیں تھیں اور اس لئے ہر دلعزیزی اور قبولیت عامہ کا تمام کریڈٹ خود اُن کی ذات کو ملنا چاہئے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں اور کس قدر صحیح فرماتے ہیں کہ

ہمارے ملک میں جو شاعری کے لئے ایک اُستاد قرار دینے کا دستور اور اصلاح کے لئے ہمیشہ اُس کو اپنا کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کے حق میں کوئی معتدبہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے اُستاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہے کہ کوئی گرامر کی غلطی بنادے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کردے لیکن اس سے نفس شعر میں کچھ ترقی نہیں ہوسکتی۔ رہی یہ بات کہ اُستاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کردے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنادے، سو یہ امر خود اُستاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے۔ اگر اُستادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملا نظامی ہم صاحبزادے کو یہ نصیحت نہ کرتے ؎

در شعر مپیچ و در فن او — چوں اکذب اوست احسن او

(سطر بالا کی بجائے ماخذ میں:) درشعر مجو بلند نامی — کایں ختم شد است بر نظامی

اور اگر کمال شاعری کے لئے کسی کا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی، نظامی، سعدی، خسرو، اور حافظ کے درجہ ایسے اُستاد نکلتے جن کی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو اُن کے برابر یا ان سے کمتر تو ہوتی۔

حضرت ذوق کے کمال سے انکار کرنے کی جرأت کس کو ہوگی لیکن اس جگہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ داغ ماں کے پیٹ سے ایک صحیح اور حقیقی شاعر بن کر پیدا ہوئے تھے اور خود اُن میں وہ صفات بوجہ احسن موجود تھیں جو کسی سخن گو کو "فطری شاعر" کا لقب دلا سکتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ قابل اُستاد کا ہونہار شاگرد کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے حکاک کو الماس کے ساتھ کہ وہ اُس میں جلا پیدا کرتا ہے لیکن اگر پتھر میں چمکنے کی قابلیت ہی سرتاپا مفقود ہو تو حکاک کیا کرسکتا ہے۔

الغرض داغ کی شہرت کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ قلعہ معلی میں اکثر شاہزادے بڑے بڑے اساتذہ کو چھوڑ کر اُن سے اصلاح سخن لینے لگے اور دلی کا کوئی مشاعرہ بارونق نہ سمجھا جاتا تھا جس میں داغ زمزمہ سنج نہ ہوں لیکن غدر ۱۸۵۷ء نے رنگ میں بھنگ کردیا مجلسیں برہم ہوگئیں جلسے منتشر ہوگئے نہ قدرداں رہے نہ قدردانی کے سامان۔ اسی حسرتناک سین کی تصویر پُر اثر الفاظ میں داغ نے یوں کھینچی ہے ؎

عجیب شکل گل و گلستان نظر آئی — پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژہ خونفشاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلعذار سمن برکے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلان خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

زمیں سے حال پر اب آسماں رقتا ہے ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ و ضعیف و جوان روتا ہے غرض بہار کے لئے اک جہان روتا ہے

جو کہئے جوشش طوفان نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

صحت واقعات اور تاثیر سخن کے لحاظ سے داغ کا یہ مسدس شہر آشوب مستقل دلچسپی کی چیز ہے۔ اور بھی شعراء نے دہلی کے مرثیے لکھے ہیں لیکن داغ کو کوئی نہیں پہنچا۔ معلوم نہیں داغ نے اس مسدس کا یہ آخری شعر ؎

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم

کس وقت اور کس دل سے کہا تھا کہ اُن کی یہ آرزو پوری ہو کر رہی۔ حضور جارج پنجم خلد اللہ ملکہ نے دہلی کو ہندوستان کا دار السلطنت قرار دیکر اس قدیم شہر کی عظمت وشان کی روایات کو زندہ کرنے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ کاش داغ اس وقت زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ اُن کی دعا بیکار نہیں گئی۔

دہلی کی بربادی گویا فصل خزاں تھی جس طرح بہار کے خاتمہ پر باغ کی ساری دلچسپیاں معدوم ہو جاتی ہیں اسی طرح غدر کے بعد دہلی بھی طرح تاراج اور ویران ہو گئی تھی کہ اور تو اور خود وہاں کے باشندوں کو بھی دلی کا قیام دوبھر تھا۔ اب یہاں کی زندگی میں وہ "چٹخارے" مفقود ہو چکے تھے جو حیوان مطلق کو بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیتے تھے۔ ذوق کا مقولہ کہ

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

عملی حیثیت سے بے معنی الفاظ کا مجموعہ بنا ہوا تھا اور غالب کے اس مصرعہ کی صداقت آفریں کیفیت دلوں پر طاری ہو رہی تھی ؎

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا

ذاتی ضروریات اور فکر معاش سے مجبور ہو کر کملاء دہلی کا مجمع منتشر ہوا اور جس کی جدھر بن آئی چلتا بنا۔ اُس زمانے میں ریاست رامپور علمی قدر افزائی کی وجہ سے مشہور ہو رہی تھی۔ امیر، امیر، تسلیم، جلال، قلق ایسے نامی گرامی شعراء کی ذات سے دربار کو زینت حاصل تھی۔ نواب مرزا داغ بھی بامید قدر دانی رامپور پہنچے۔ اس وقت نواب یوسف علی خاں ناظم مسند آرائے حکومت تھے۔ علم دوستی اور معارف پروری کا مادہ اُن کی خلقت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک طرح سے وہ داغ کے استاد بھی تھے کیونکہ ایک روایت کے مطابق داغ نے سکندر نامہ انھیں سے پڑھا تھا اُس وقت یہ دہلی میں تھے۔ داغ کو بہت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کہا۔ نواب کلب علی خاں کا زمانہ ولیعہدی تھا۔ یہ ان کے مصاحب مقرر ہوئے اور بالآخر داروغہ اصطبل کی خدمت ان کو تفویض ہوئی۔

داغ جب تک رامپور میں رہے بہت بے فکری اور آرام سے رہے۔ نواب کلب علی خاں جب حکومت پر پہنچے تو اُن کے وقت میں رامپور لکھنؤ بنا ہوا تھا اور وہ خود گویا آصف الدولہ تھے۔ امیر، داغ اور ان کے اکثر معاصرین اسی دریا دل نواب کے خوان کرم کے ریزہ چیں تھے۔ نواب کا دربار علمی و ادبی نکتہ خیال سے جلال الدین اکبر کا دربار تھا جس میں صاحبان فضل و کمال بجائے خود نورتن اکبری کے قائم مقام تھے۔

قیام رامپور کے زمانے میں داغ کی شہرت کا حلقہ اور بھی وسیع ہوتا گیا۔ وہاں آئے دن مشاعرے ہوتے تھے حکمران وقت خود شعر و سخن کا شیدائے خالی تھا۔ یہ امر عوام کی حوصلہ افزائی کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوا اردو شاعری کے آخری دور کے سارے قائم مقام گویا رامپور میں تھے پھر اُن مشاعروں کی گوناگوں دلچسپیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے جن میں امیر، داغ، تسلیم وغیرہ، ایسے جید شاعر طبع آزمائی کرتے ہوں۔ ان شعراء میں سے ہر ایک بجائے خود آسمان سخن کا ایک درخشندہ ستارہ تھا کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا ایک حد تک قرین انصاف نہ ہوگا لیکن

داغ کی زبان، اُن کا تخیل، اُن کا رنگ آغازِ شاعری سے ممتاز تھا اور یہ امتیاز رامپور میں اور پختگی حاصل کرتا گیا۔ جہاں اور بہت سے سخنگو نفس شاعری کے لحاظ سے یکرنگ اور یکساں تھے وہاں صرف داغ کی سب سے جداگانہ حیثیت تھی۔ اکثر شعرا کا کلام صرف مشاعرے تک محدود رہتا لیکن داغ کی غزلیں جو مشاعرے میں پڑھی جاتیں وہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ شہرت پذیر ہوجاتی تھیں۔ امیر مرحوم بجائے خود اُردو شاعری کے بہترین اُستاد تھے لیکن یہ بات اُن کے کلام کو بھی نصیب نہ تھی حالانکہ ذاتی جوہرِ کمال کے ماسوا نوابِ وقت کو مشورۂ سخن دینے کی عزت اُن کے کلام کی شہرت کا خاص اور موثر ذریعہ بن سکتی تھی۔

جب تک نواب کلب علی خاں زندہ رہے اہلِ دربار اُن کے قدموں سے لگے رہے۔ نواب کی ذات اُن لوگوں کی تقویت کا باعث تھی۔ کم از کم فکرِ معاش سے سبھوں کو نجات تھی۔ داغ اُن لوگوں میں تھے جو امیر کے بعد نواب کی قدرشناسی کے مرجح طور پر حقدار تھے۔ داغ بھی احسان فراموش نہ تھے۔ ان کے اولین دیوان میں جابجا اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مثالاً چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

رہے نواب گہربار فلک دریا بار  داغ برسات نئی آئی ہے برسات کے ساتھ

جس کو ہو داغ بہت حسنِ شجاعت پہ غرور  میرے نواب بہادر کے مقابل آئے

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغ  مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

ہر چند رامپور میں گھبرا رہا ہے دل  کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

نواب خلد آشیاں کے ساتھ انھیں بھی فریضۂ حج بیت اللہ ادا کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

ساتھ نواب کے حج کرکے پھرے ہم اے داغ

ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

غرضکہ نواب کلب علی خاں کی فیاضی نے داغ کو اوراقکار سے فارغ البال بنادیا تھا۔ پھر اُنھیں کہیں دریوزہ گری کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی صرف ایک مرتبہ کلکتہ کے سفر کا اتفاق ہوا تھا جس کی دلچسپ کیفیت سے مثنوی فریادِ داغ کے صفحے بھرپڑے ہیں۔ کلکتہ جاتے ہوئے عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے اور غالباً اُن کی یہ غزل ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

وہیں کی کہی ہوئی ہے جیسا کہ اس کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں

عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

پٹنہ میں داغ کی موجودگی میں مجلسِ مشاعرہ بھی منعقد ہوئی تھی افسوس ہے کہ اس کے متعلق تفصیلی حالات نہیں مل سکے ورنہ مستقل دلچسپی کی چیز ہوتے۔

ان کے کلام کا شہرہ مختلف اقطاعِ ہند میں پہنچ چکا تھا۔ کلکتہ کا ان نے ان کو سر آنکھوں پر لیا۔ دعوتیں ہوئیں۔ آؤ بھگت کی گئی۔ مشاعرے ہوئے غرض علمی طبقے میں ان کے جانے سے غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا تھا۔ مہمان پر بھی خاطر مدارات نے بہت اثر کیا، اور جب وہ کلکتہ سے واپس ہوتے ہیں تو عرصہ تک وہاں کی یاد دل سے محو نہیں ہوسکی۔ اسی کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے ؎

حسین یہ شہبیں یہ شہر ایسی لہر بہر

داغ کلکتے سے بزار دل داغ دل پر لے چلا

اس سفر کے مفصل حالات فریادِ داغ میں شاعرانہ انداز سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ جب ہم داغ کے یہ اشعار دیکھتے ہیں ؎

آئی ایسی ہوا سے کلکتہ  دل پکارا کہ ہائے کلکتہ

پیل پر دوستانِ نیک خصال  آئے اکثر برائے استقبال

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا  داغ آیا تو باغ باغ آیا

تو ذہن اضطراری طور پر غالب کے ان شعروں کی طرف

منتقل ہوتا ہے جن میں وہ اپنی غریب الوطنی کی حالت اور اہل کلکتہ کی ناقدری کا فوٹو یوں کھینچتے ہیں ؎

اسے رئیسان ایں سواد عظیم ۔۔۔ اے فراہم شدہ بہ ہفت اقلیم
ہمچو آمیدہ در ایں شہر ۔۔۔ بہر کارے رسیدہ زیں شہر
اسد اللہ بخت برگشتہ ۔۔۔ در جہاں ہیچ عجز سرگشتہ
گرچہ ناخواندہ مہمان شماست ۔۔۔ بے سخن ریزہ چین خوان شماست
بہ تفضل رسیدہ است اینجا ۔۔۔ بامید آرمیدہ است اینجا

.................. ..................

آں رہ و رسم کارسازی کو ۔۔۔ شیوۂ مہمان نوازی کو
ہا من ایں خشم و کیں دریغ دریغ ۔۔۔ من چناں تا چنیں دریغ دریغ

مصطفےٰ آباد یا رامپور میں جو بزم سخن نواب کلب علی خاں کی علم دوستی کی بدولت برپا ہوئی تھی وہ اُن کی زندگی تک قایم رہی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ، لیکن نواب نامدار کی آنکھیں بند ہوتے ہی گویا وہ بھی خواب و خیال تھی۔ افلاطون نے اپنی کتاب "ری پبلک" میں حکومت کے لئے شاعروں کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ رامپور میں بھی جب نواب کلب علی خاں کے بعد اصلاح کا کام جاری ہوا تو سب سے پہلے انھیں شاعروں کا گروہ فضول ثابت ہوا جو خلد آشیاں کے زمانہ میں اراکین دربار میں خصوصی حیثیت رکھتے تھے۔ داغ کا تعلق بھی ریاست سے جاتا رہا اور اُنھیں اپنی زندگی میں پھر ایک دفعہ اُن کلفتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے دلی کی تاراجی کے بعد سابقہ ہوا تھا۔ اُن کی یہ باعی اُس وقت کی دلی افکار کا آئینہ اور ان کی حقیقی حالت کا مرقع ہے ؎

نواب نے کی جو قدر دانی میری ۔۔۔ اے داغ گذر گئی جوانی میری
لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقت پیری ۔۔۔ مر مر کے کٹے گی زندگانی میری

لیکن یہ عام قاعدہ ہے کہ تکلیف کے بعد آرام اور رنج کے بعد خوشی میسر ہوتی ہے چنانچہ کچھ عرصہ تک خانہ نشین اور بیکار رہنے کے بعد داغ حیدرآباد پہنچے اور فرمانروائے دکن کی دریا نوالی اور فیاض منشی نے اُنھیں آخر اُس رتبے تک رہنمائی کی جس سے زیادہ کی امید وہ کبھی خود نہ کرسکتے تھے۔

حضور پُرنور میر محبوب علی خاں آصف کا دربار ہمیشہ سے مرجع اہل کمال رہ چکا ہے اور سلاطین اسلام کی علم دوستی اور معارف شناسی کی روایات اُن کی ذات بابرکات سے زندہ۔ حضرت داغ انھیں کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر ماہتاب بن کر چمکے، ورنہ اُن کی وقعت بحیثیت ایک شاعر ملک میں تو ہوتی لیکن اعزاز و جاہ کے یہ مراتب وہ کبھی نہ طے کرسکتے۔

۱۸۸۸ء میں داغ سب سے پہلے حیدرآباد گئے۔ پبلک نے نوبہات گرمجوشی سے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن باوجود متوسلین ریاست کی جانفشانیوں کے اُس زمانے میں ان کی رسائی حضور تک نہ ہوئی اور ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد آخر داغ گھبرا گئے اور نا امید ہو کر واپس چلے آئے لیکن جن لوگوں کو حیدرآباد کی زندگی کا تجربہ ہے اُنھیں معلوم ہے کہ وہاں کار برآری بہت دیر میں ہوتی ہے۔ داغ کا بھی یہی حال ہوا۔ ان کے واپس آجانے کے بعد بھی کچھ دنوں کوئی خبر نہ لی گئی تو یہ بالکل مایوس ہو گئے لیکن جس طرح گھٹا ٹوپ بادل سے سورج کی کرن ظاہر ہو جاتی ہے اسی طرح داغ کی مایوسی یکایک مبدل بہ شادمانی ہو گئی۔ برسوں کی آرزوئیں اور مہینوں کی دعائیں آخر پوری ہوئیں اور اُنھیں ایک معمولی شاعر کے طور پر نہیں بلکہ اُستاد السلطان کی حیثیت سے حیدرآباد جانا پڑا۔ داغ کی یہ کامیابی غیر معمولی تھی اسی لئے اس خبر کو تمام ہندوستان میں کسی قدر تعجب سے سُنا گیا تھا لیکن دربار آصف جاہی کے لئے یہ اعزاز و اکرام کوئی نئی بات نہ تھی۔

داغ کی پہلی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ مقرر ہوئی تھی لیکن پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار تک پہنچ گئی تھی۔ عطیے اور انعامات اس کے ماسوا ہیں۔ ان کے اہل خاندان میں سے اکثر کو بیش قرار وظائف معین تھے غرضکہ حیدرآباد جانا نہ صرف داغ کے لئے ذاتی طور پر بلکہ اُن کے

اعزا و اقارب کے لیے بھی نہایت کار آمد ہوا اور وہ آخر وقت تک عیش
مخلد میں بسر کرتے رہے۔

بیرون شہر افضل گنج حیدرآباد کا ایک مشہور محلہ ہے۔ اس میں ایک خاص حصہ محبوب گنج کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اجناس وغیرہ کی دوکانیں ہیں۔ عام طور پر یہاں لوگ سکونت پذیر نہیں ہیں لیکن داغ غالباً ۱۸۹۱ء تک یہیں ایک مکان میں جو بظاہر کچھ وسیع اور شاندار بھی نہ تھا رہتے تھے۔ میرے ایک دوست احمد اللہ قیصر حیدرآبادی مرحوم جو ایک نوجوان شاعر تھے اور داغ صاحب کے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے ان کے اکثر عزیزوں سے رسم اتحاد رکھتے تھے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ محبوب گنج کا قیام باوجود اس جگہ کی ناگوار آب و ہوا کے اس شگون پر مبنی تھا کہ اس مکان میں ٹھہرنے کے بعد ہی داغ صاحب کو حضور نظام کے پاس رسوخ حاصل ہوا تھا لیکن آخر میں وہ رزیڈنسی کے علاقہ میں ایک شاندار اور پُرفضا کوٹھی میں چلے گئے تھے اور پھر وہیں آخر دم تک رہے۔

حیدرآباد کے تعلقات نے داغ کی شہرت کو گویا پر لگا دیے اور واقعی حضور نظام مرحوم کی فیاضی اور جود کی بدولت انھیں وہ دنیاوی اعزاز نصیب ہوا جس کی مثال پچھلی تاریخ اُردو میں نہیں مل سکتی۔ سودا نے آصف الدولہ کے دربار میں اعزاز حاصل کیا۔ سید انشا نے سعادت علی خاں کی توجہات سے فائدہ اٹھایا۔ ذوق شاہنشاہ دہلی کے استاد تھے لیکن یہ باتیں اب پرانی ہو گئی تھیں۔ البتہ داغ کے مناصب و مراتب کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے لوگ ہندوستان میں عموماً اور دکن میں خصوصاً ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اب تک زندہ ہیں۔ انھیں نہ صرف شعر و سخن کی عزت حاصل تھی بلکہ دربار ی اشخاص میں بھی ان کو نمایاں فوقیت اور ترجیح تھی۔ استاد السلطان ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک جہاں استاد کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور یہ خطابات اس قدر مشہور ہوئے کہ ان کے تخلص کے بعد گویا ان کے اصلی نام کے مترادف بن گئے تھے۔

داغ کی موجودگی حیدرآباد ایشیائی شاعری کے فروغ کا خاص سبب ثابت ہوئی اور شروع شروع میں تو شعر گوئی کا وہ چرچا ہوا کہ معمولی الفاظ میں اس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ مشاعروں کی کثرت کے ساتھ شعراء کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ آج بھی جس قدر شاعر خاص حیدرآباد میں موجود ہیں اتنے ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں نکل سکتے اور ان میں سے اکثر نہایت خوش فکر واقع ہوئے ہیں۔

ابتدائی زمانے میں تو کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں داغ باوجود موانع کے شرکت پر مجبور نہ کئے جاتے ہوں لیکن آخر آخر میں وہ عام مجالس میں کم شریک ہوتے تھے۔ محمد ابراہیم صاحب خانساماں حضوری کے یہاں سالانہ محفل شعر و سخن منعقد ہوتی تھی۔ اس میں اعلیٰ حضرت حضور آصف جاہ مرحوم کی غزل بھی آتی تھی۔ داغ اسے پڑھتے تھے اس لئے اس مشاعرہ میں ان کی شرکت بالعموم ہو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح اور خاص خاص مشاعروں میں جایا کرتے تھے لیکن انحطاط عمر کے ساتھ بوجہ کبر سنی و ضعیف العمری یہ التزام بھی باقی نہ رہا۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں امیر مینائی مرحوم مغفور بامید سرفرازی حیدرآباد دکن اور داغ کے مکان پر فروکش ہوئے امید ہوئی تھی کہ اب حیدرآباد میں رامپور کا نقشہ کھنچے گا اور ان دونوں استادوں کی معرکہ آرائیوں کا لطف جس کا حال کتابوں میں پڑھا اور کانوں سے سنا تھا ذاتی طور پر اٹھانے کا موقع ملے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، امیر مرحوم کو حیدرآباد کی آب و ہوا کچھ ایسی ناموافق ہوئی کہ وہ ایک دن بھی اچھے نہ رہے۔ سرفرازی کا سلسلہ آخر کار موت پر منتہی ہوا اور شیدائیان سخن کی حسرت خاک میں مل گئی۔ اہل حیدرآباد کو آپ کے واقعہ ارتحال کا جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ غیر ممکن ہے۔ حضرت داغ کو بھی اپنے ایک پرانے رفیق اور ہم مشرب کی موت کا شدید قلق ہوا

امیر مرحوم کے انتقال کے تقریباً پانچ برس بعد داغ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۹ - ذیحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۴ - فروری ۱۹۰۵ء انکا روز وفات ہے، اور اب وہ بمقام حیدرآباد درگاہ حضرت یوسف شریف قدس سرہ العزیز کے احاطہ کے اندر امیر مرحوم کے پہلو میں آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ سچ کہا ہے

دو چیز آدمی را کشاں زور بزور بے آب و دانہ و دوم خاک گور

قدرت کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ کہاں دہلی اور کہاں حیدرآباد، لیکن داغ کے خمیر میں دکن کی مٹی تھی آخر وہیں پیوند خاک ہوئے اور شہود سخن کی یہ شمع اس طرح عالم غربت میں "کل من علیہا فان" کے ایک جھونکے سے گل ہو گئی۔

داغ کی موت معمولی موت نہ تھی بلکہ انکے مرنے سے ملک کا ایک باکمال شخص اٹھ گیا تھا اور بزم سخن سے ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی تھی جس کے پر ہونے کی اب صدیوں امید نہیں ہو سکتی۔ پبلک نے اس نقصان کو نہایت درجہ محسوس کیا۔ شعراء نے مرثیے لکھے اور تاریخیں نکالیں۔ اخبارات نے تعزیتی مضامین لکھے اور انجمنوں اور سوسائٹیوں نے انکے ماتم میں یادگاری جلسے منعقد کیے۔ ڈاکٹر اقبال جنھیں ابتدا میں داغ سے تلمذ بھی تھا انکا ''تاریخ'' ''نواب میرزا داغ'' معنوی خوبیوں، اختصار، اور برجستگی کے لحاظ سے سب میں ممتاز سمجھا گیا تھا۔ انکی ماتمی نظم بھی سوز و گداز کا ایک موثر مرقع ہے۔ جن دردناک الفاظ میں داغ کے تاسف خیز واقعۂ مرگ کا بیان کیا گیا ہے انکی کیفیت ان منتخب اشعار سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

چل بسا داغ آہ میت اسکی زیب دوش ہے — آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے — یعنی یہ لیلے وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی — آہ دل سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی تھی
لکھی جائینگی کتاب دل کی تفسیریں بہت — ہونگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون — اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون
اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں — تو بھی رو لے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں
وہ محل رنگیں ترا رخصت شان ہو ہوا — یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

ہز ایکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد نے جو حضرت آصف غفران مکان کے تلمیذ رشید ہونے کی حیثیت سے داغ ہی کے شجرۂ شاعری کی ایک سرسبز اور پربہار شاخ ہیں کس قدر سچی تاریخ انتقال نکالی ہے

دہلی کا چراغ بجھ گیا آہ
۱۳۲۲

اس میں شک نہیں کہ ایشیائی شاعری کی آخری رونق ہندوستان میں داغ کے دم سے تھی، اور جہاں تک ان کے مرنے سے نہ صرف دنیائے اردو کا ایک مایۂ ناز شاعر اٹھ گیا بلکہ اسی کے ساتھ دلی کے امتیاز و وقعت کی روایات بھی ہمیشہ کے لیے زمین کے نیچے دب گئیں۔

داغ حضرت ذوق کے تلمیذ رشید تھے لیکن دنیاوی جاہ و منزلت اور ذاتی شہرت کے اعتبار سے وہ کسی کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ انکے تمام اعزاز و مناصب انکی اکتسابی چیزیں تھیں۔ انکے کمال نے انھیں اس درجہ پر پہنچایا اور انکے کلام نے انھیں قبولیت عامہ کی سند دلوائی۔ کسی شاعر کے کلام کا اسکے عین حیات میں شہرت پذیر ہو جانا شاعر کے خاص فخر و مباہات کا سبب ہوتا ہے اور اس امر میں داغ سب سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے ہیں۔ انکی زندگی ہی میں انکی غزلیں تمام ہندوستان میں پڑھی اور گائی جاتی تھیں۔ اسوقت بھی کوئی مجلس نشاط داغ کے گرما گرم کلام کے بغیر رونق نہیں حاصل کر سکتی۔ سودا، میر، جرات، اور انکے علاوہ اور بھی اکثر شعرا کا کلام انکی زندگی میں مشہور ہو گیا تھا، بلکہ میر کی غزلیں تو لکھنؤ سے بطور تحفہ کے دلی جایا کرتی تھیں لیکن داغ کا شہرہ سب سے زیادہ وسیع اور پائدار ہوا ہے۔ اس زمانہ کے دو چار شاعروں کا کلام ایک حد تک مطبوع خلائق ضرور ہے مثلاً ریاض اور مضطر جو علی الترتیب شوخ بیانی اور معاملہ بندی میں خاص ملکہ رکھتے ہیں لیکن ان کی شہرت صرف چند غزلیات تک محدود ہے۔ امیر مینائی مرحوم کا بھی یہی حال ہے۔ آجکل انکی چند غزلیں کبھی کبھی محفل رنگ میں سننے میں آجاتی ہیں ورنہ انکی زندگی میں تو شاید انکا ایک شعر بھی ایسا نہ تھا جو خاص و عام کی زبان پر ہوتا۔ ان الفاظ سے انکی کسر شان مقصود نہیں

بلکہ اظہار حقیقت مقصود ہے۔ شہرت اور ہر دلعزیزی خداداد باتیں ہیں انمیں انسان کی کوشش کو مطلق دخل نہیں۔

داغ کی غزلیں جس سرعت کے ساتھ خاص و عام تک پہنچ جاتی تھیں انکا اندازہ ان سطور سے ہو سکتا ہے۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی [illegible] صوت والے مضمون میں جو بہ اقساط رسالۂ ادیب میں نکل چکا ہے فرماتے ہیں

ایک غزل انھوں نے (داغ نے) اپنی سنائی تھی تازہ فکر ہے سے

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے    اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

ساری غزل مرصع اور نہایت برجستہ تھی مگر اس شہرت عام کو دیکھیے کہ وہاں سے میں اٹھا تو راہ میں وہی غزل گائی جا رہی تھی......

اس شہرت عام اور مقبولیت کے اسباب جو کچھ بھی ہوں لیکن انکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ داغ کا کلام خواص اور عوام دونوں کے مذاق کے مطابق ہوتا اور اسپر زبان کی صفائی اور خیالات کا نیچرل اور موثر ہونا گویا سونے میں سہاگہ تھا۔ سامع کو روحانی سرور حاصل ہوتا اور اسکے دل و دماغ ایک خاص کیفیت سے متاثر ہو جاتے تھے۔ بعض خوش فہموں کی رائے ہے کہ داغ نے "چوما چاٹی" کے مضامین نظم کر کے عوام کے قلوب کو مسخر کر لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ اور جہاں تک طبقۂ عوام کا تعلق ہے داغ کی مقبولیت بہت کچھ اسی سبب سے ہے لیکن آخر خواص انکے کلام کے کیوں دلدادہ ہیں؟

اس بحث پر پہنچکر کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے لیکن ہم اپنا عندیہ ظاہر کرنے میں اختصار کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ (باقی آیندہ)

سید محمد فاروق

# کلامِ شاد

(از ہز اکسلنسی سر مہاراجہ بہادر راجۂ راجایان سرکشن پرشاد صاحب شاد یمین السلطنت جی سی آئی ای)

نہیں ہے تیرے سوا اور آشنا کوئی    نظر نہیں مجھے آتا ہے دوسرا کوئی
ترے ہی نور کا جلوہ ہے دیر و کعبہ میں    بس ایک تو ہے نہیں اور دوسرا کوئی
مثالِ گردشِ پرکار ذات ہے اُسکی    نہ ابتدا ہے کوئی اور نہ انتہا کوئی
کبھی ہیں دیر میں جاتے کبھی حرم میں مگر    ہمارے یار کا دیتا نہیں پتا کوئی
نصیب اور مقدر جدا ہے ہر اک کا    کوئی گدا ہے جہاں میں تو بادشا کوئی
اُسی کی دل میں تمنا ہے چاہتے ہیں اُسے    نہیں ہے اُسکے سوا اور مُدعا کوئی
غرض بُرے سے ہے ہمکو نہ ہے بھلے سے کام    کوئی بھلا ہو ہمیں کیا کہ ہو بُرا کوئی
جو مصلحت ہے خدا کی وہی ہے عینِ صواب    مجال کیا کرے چون و چرا ذرا کوئی
جسے کہ خواجۂ اجمیر کہتے ہیں اے شاد
ہے کائنات میں اُسکے سوا بھلا کوئی

# تنقید کتب

**کوکبۂ ملوکی و ملوکی** اس کتاب کے لیے جسے مختصر تاریخ کہنا چاہیے و جس میں "ہندوستان کے فرماں روایانِ ملوک و خلجی کے تاریخی کارنامے" کسی قدر دلچسپی کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، ملک کو مولوی سید ضمیرالدین احمد صاحب، آنریری مجسٹریٹ پٹنہ کا ممنون ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں تاریخی مذاق کا فقدان نہایت تاسف انگیز ہے حالانکہ مطالعہ تاریخ کے فوائد سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہم میں سے اکثر ناولوں اور فسانوں کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اُن مضامین سے متنفر پائے جاتے ہیں، جن سے ذہنی اور دماغی تربیت یقینی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس شکایت کو رفع کرنے کا شاید بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان طبائع کو زینہ زینہ سیدھے راستہ پر لانے کے لیے مختلف علوم و فنون کی مختصر کتابیں شائع کی جائیں۔ ان کے وسیلہ سے مذاقِ علمی میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے جس سے کارآمد نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم مولوی سید ضمیرالدین احمد کو اصولاً قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ہماری رائے ناقص میں "کوکبۂ ملوکی و ملوکی" کئی پہلو سے قابلِ اصلاح بھی نظر آتی ہے

اس کتاب میں، جس کی ضخامت کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات کی ہے، ملک قطب الدین ایبک (جسکے سر پر ہندوستان کا پہلا اسلامی تاجدار ہونے کا طرۂ امتیاز لگا ہوا ہے) سے لیکر سلطان قطب الدین خلجی تک کے مورخانہ حالات اس طرح قلمبند کیے گئے ہیں کہ اختصار کی خوبیاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پائیں اور تفصیلات بھی اس قدر مجمل نہیں رہیں کہ مطالب کی تشنگی کا الزام لگایا جا سکے۔

تاریخی مضامین، جن سے کوکبہ کے صفحات کو زینت دی گئی ہے وہی ہیں جو کم و بیش دوسری تاریخوں میں پائے جاتے ہیں۔ ترتیب اور طرزِ بیان میں بھی کوئی خاص جدت نہیں پائی جاتی، بلکہ بعض اوقات شعر آرائی میں شاعرانہ رنگ اس درجہ غالب آگیا ہے کہ تاریخی انداز قائم نہیں رہ سکا۔ ایک کمی یہ بھی ہے کہ واقعات کے ساتھ رائے زنی کا حصہ بہت کم ہے اور جو کچھ ہے بھی وہ استقامت و اصابت سے قطعی خارج ہے۔ مثلاً سلطانہ رضیہ کی بعض اُن کمزوریوں کا ذکر، جن پر مختلف مورخوں نے عجیب و غریب طور پر ایک چوکھا رنگ چڑھا رکھا ہے، اس طور پر کرنا کہ گویا انکی حقیقی وجہ اُسکا عورت ذات ہونا تھا، ہر پہلو سے قابلِ اعتراض ہے۔ حضرت مؤلف نے یہ بہت اچھا کیا ہے کہ واقعات کا ذکر زیادہ تر صاف صاف کر دیا ہے، ورنہ اس قسم کی جرح و تعدیل، جن کا جوڑ ایسی کتابوں سے، جو زمانۂ جدید کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تالیف کی گئی ہوں، بھونڈا معلوم ہوتا ہے، کتاب کی وقعت کو بہت گھٹا دیتی۔

بلاشبہ بعض مقامات خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ مثلاً سلطان علاءالدین خلجی اور علاءالملک کا مکالمہ، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راست گفتاری کیا چیز ہے اور جو منبرک نفوس اس صفت سے متصف ہوتے ہیں وہ اپنے نازک فرض کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستان کے اکثر مورخوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ خوں ریز لڑائیوں کے تذکرہ سے اپنی تاریخوں کو اس طرح پر کرتے ہیں کہ بقول علامہ شبلی انکا ایک ایک صفحہ "قصائی کی دوکان" نظر آتی ہے۔ مولوی ضمیرالدین صاحب کے "کوکبہ" میں بھی زیادہ تر انہیں معرکہ آرائیوں اور خانہ جنگیوں کا ذکر ہے لیکن شکر ہے کہ کہیں کہیں وہ اس دائرہ سے باہر بھی ہو گئے ہیں۔ اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ مقام غیر معمولی دلچسپی کی چیز ہے۔ مثلاً بعض رفاہ عام کاموں کا بیان۔ یا بلبن کی طرزِ معاشرت اور اخلاق و عادات پر جو تبصرہ لکھا گیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

"کوکبہ" میں اکثر قدیم جگہوں کے نام آئے ہیں۔ مثلاً لکھنوتی، تبرہند، وغیرہ انکی تشریح بذریعہ فٹ نوٹ ہونا ضروری تھی کہ یہ مقامات اس زمانہ میں بھی باقی ہیں یا نہیں اور بصورت اول انکا جدید نام اور محل وقوع لکھنا چاہیے تھا۔

بہرحال کتاب دلچسپی سے خالی نہیں۔ ترتیب واقعات کا قابل تعریف طور پر لحاظ رکھا گیا ہے اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے صاف اور سلجھی ہوئی زبان میں۔ کی قیمت عہ مناسب ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے :۔

سکرٹری صاحب مسلم لٹریری سوسائٹی۔ کرانی گھاٹ گیا

**کفایت شعاری** | ڈاکٹر اسمائلز کی اُن تصانیف میں، جن کی شہرت وہردل عزیزی اُنکے مفید و کارآمد ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے، اور جن سے نہ صرف باشندگان انگلستان کو بلکہ تمام اہل عالم کو اسوقت تک منفعت پہنچ چکی ہے، تھرفٹ (" THRIFT ") کا پایہ کسی دوسری سے کم نہیں۔ جس قدر و منزلت کا استحقاق ڈاکٹر ممدوح کی کتابوں نے جتایا ہے اُس میں ڈیوٹی، کیرکٹر، سلف ہلپ، وغیرہم کے ساتھ تھرفٹ بھی برابر کی شریک ہے۔ اسی کا ترجمہ "کفایت شعاری" کے موزوں و بامعنی نام کے ساتھ جناب سید مرتضیٰ صاحب سٹی مجسٹریٹ بھوپال نے عرصہ ہوا شائع کیا تھا۔ جسکی خوبیوں کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ اسوقت پہلے اڈیشن کی کوئی کاپی موجود نہیں بلکہ سنہ حال میں اسکو دوبارہ چھپوانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ زیر ریویو نسخہ دوسرے اڈیشن کا ہے۔

شروع میں جناب ارشد تھانوی نے ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر اسمائلز کی مشہور کتاب "کیرکٹر" کو "تدبیر" کے نام سے اُردو کا جامہ پہنایا اور بعدہٗ ۱۹۰۱ء میں تھرفٹ کا ترجمہ شائع کیا۔ اس لحاظ سے سید صاحب دنیائے اُردو کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ایسی کارآمد کتابوں کا ترجمہ اُن کی بے غرضانہ سعی سے اُردو میں ہوا۔

جن لوگوں کو اصل کتاب تھرفٹ کے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اگر "کفایت شعاری" کو مقابلۃً دیکھیں گے تو انھیں مضامین کے اعتبار سے کمی محسوس ہوگی۔ لیکن اسکی وجہ یہ ہے کہ جو ابواب ہندوستانی خصوصیات سے غیر متعلق ہیں انکو ترجمہ میں چھوڑ دیا گیا ہے اور غالباً یہ ترمیم قابل مواخذہ نہیں ہے۔ ترجمہ میں جو حصہ لیا گیا ہے اُسکی تفصیل یہ ہے :۔

پہلا باب - محنت

دوسرا باب - کفایت شعاری کی عادت

تیسرا باب - ناعاقبت اندیشی

چوتھا باب - بچت کے وسائل

اور ان چاروں مضامین میں جو مفید اور عملی ہدایات قلمبند کی گئی ہیں وہ ہر قوم، ہر طبقہ، اور ہر متنفس پر یکساں موثر ہیں اور اس اعتبار سے ہم "کفایت شعاری" سے وہی فوائد حاصل کر سکتے ہیں جو "تھرفٹ" کے وجود سے انگلستان میں ظہور پذیر ہوے اور جن پر عمل پیرا ہوکر مہذب ممالک کے باشندے اب تک ہزاروں اور لاکھوں اقتصادی نفعے حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر اسمائلز کی ہدایات اور انکے بیش بہا خیالات تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ اُنکی تصنیفات نے شہرت اور قدر و منزلت کے جو مراتب طے کیے ہیں وہ بجاے خود اس بات کی کافی شہادت ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی تصانیف کو انسانی زندگی کے کامیاب و مقصد ور بنانے میں کہاں تک دخل ہے۔ یہی صفت "کفایت شعاری" میں بھی بہمہ وجوہ موجود ہے۔ اسکا مطالعہ ہندوستان میں جس کثرت سے کیا جائے اچھا ہے اور اُن ہدایتوں کی، جو اس میں مندرج ہیں جس قدر بھی پابندی کیجائے بہتر ہے۔

حضرت مترجم نے ترجمہ میں اصل کتاب کی روانی عبارت، سلاستِ زبان، اور اسی قسم کی اکثر ادبی خوبیوں کا پورا پورا التزام رکھا ہے اور "کفایت شعاری" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اگر وہ مشق جاری رکھیں تو ایک کامیاب مترجم بن سکتے ہیں۔

اس کتاب کی قیمت آٹھ آنہ ہے۔ اور درخواست کرنے پر دفتر العصر لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

**افسانۂ بنگال** | یہ کتاب، جس کی ضخامت چھ جزو ہے، مشہور اہل قلم منشی تیرتھ رام صاحب کی سعی سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اس میں آٹھ

نہایت دلچسپ اور معنی خیز بنگالی قصوں کا ترجمہ اُردو میں شائع کر دیا ہے۔ اگرچہ مختصر افسانہ نگاری کا رواج اردو میں اب شروع ہو گیا ہے لیکن بلاشبہ اس امر خاص میں بنگالی زبان زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جا سکتی ہے۔ منشی تیرتھ رام صاحب نے بنگالی زبان کے چند قصص کا ترجمہ اردو زبان میں پیش کیا ہے جو اہل قلم و علم اس تالیف سے دلچسپی لینا چاہیں اُن کے لیے [illegible] و فروغ کے [illegible] کا ایک ذریعہ پیدا کر دیا ہے۔ [illegible] ہیں :-

مختصر افسانہ نگاری زمانہ موجودہ میں تمام ترقی یافتہ زبانوں کے [illegible] سمجھی جاتی ہے [illegible] قدر مفید نتائج اخذ ہو سکتے ہیں وہ نہ تو کسی طویل اور خشک فلسفیانہ مضمون سے حاصل ہونے ممکن ہیں نہ کسی ضخیم و بسیط ناول سے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے بعض سربرآوردہ رسائل میں کچھ عرصہ سے طرز جدید کی بعض کہانیاں درج ہونے لگی ہیں لیکن ان کے لکھنے والوں کی کوششیں اسوقت تک ایک تنگ دائرے میں محدود ہیں۔ اور اس چھوٹے سے حلقہ کے اندر بھی بعض مقامات اس امر کے واضح ثبوت ملتے ہیں [illegible] میں آ جاتے ہیں جنکا دور ہونا ہر چند کہ اُسوقت کچھ بھی مشکل نہ ہوگا جبکہ ملک کے بلند پایۂ انشا پرداز اس طرف اپنی توجہ مبذول کر لیں گے تاہم سردست ان کا وجود ضرور ہے ....."

انھیں نقائص کو دور کرنے کا سامان منشی تیرتھ رام صاحب نے اس کتاب میں مہیا کیا ہے کہ نامور اور مستند مصنفین بنگال کی چیدہ و منتخب کہانیوں کا ترجمۂ اردو میں شائع فرمایا ہے اور اُنکی یہ کوشش انصافاً مستحق مبارکباد ہے۔

جن مصنفوں کے قصے اس ترجمہ میں لیے گئے ہیں اُن میں دو چار نام نہایت ممتاز نظر آتے ہیں مثلاً بابو رابندرناتھ ٹیگور۔ مترجم کے حسن انتخاب کی بھی داد دینی کرنا چاہیے۔ اگرچہ یہ کہنے کی گنجایش پھر بھی باقی رہتی ہے کہ مزید کوشش سے بعض بہتر کہانیاں بنگالی زبان ہی سے مل سکتی تھیں۔

نفس ترجمہ کے متعلق، قابل مترجم کی محنت و سعی کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی اسکا اقرار افسوس سے کرنا پڑتا ہے کہ اکثر مقامات پر زبان کی نفاست اور روانی قائم نہیں رہ سکی۔ جہاں تک ان نقائص کا تعلق محاورات و تشبیہات وغیرہ سے ہے اس حد تک فاضل مترجم قابل معافی ہیں لیکن اس سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی بعض جگہ ایسے عیوب لسانی کثرت کے ساتھ قابل گرفت دکھائی دیتے ہیں جن کی موجودگی ایک ایسے اہل قلم کے ترجمہ میں جسکا نام متعدد کتابوں کے مصنف و مولف ہونے کی حیثیت سے لیا جاتا ہو خالی از حیرت نہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ان نقائص کی اصلاح آیندہ ایڈیشن میں باحسن الوجوہ کر دی جائے گی۔

زبان کی ان فروگزاشتوں کے علاوہ کتاب عمومی حیثیت سے بے عیب ہے اور یہ حق رکھتی ہے کہ اہل ملک اُسکے ساتھ اپنی قدر دانی کا ثبوت دیں۔ یہ کتاب بارہ آنے قیمت میں مسٹر [illegible] لال برادرس پبلشرز و بک سیلرز [illegible]، [illegible] روڈ، نولکھا، لاہور کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

**رموز الاطبا** | طب یونانی اور ویدک کی آج کل کساد بازاری پائی جاتی ہے۔ اول الذکر ایک غیر ملک سے تعلق رکھنے والی چیز تھی پھر بھی مسلمانوں نے یونانیوں سے اسکو اس طرح حاصل کیا کہ اپنا بنا لیا اور انھیں کے ساتھ ہندوستان آئی۔ فن ویدک کا تعلق سرزمین ہند ہی سے ہے اور علم طب کے ان دونوں شعبوں نے یہاں ایک زمانہ میں وہ عروج پایا جسکے وہ مستحق تھے۔ لیکن آج کل دور دورہ ڈاکٹری کا ہے۔ برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ رفاہ عام کے کام جس بڑے پیمانہ پر جاری ہوئے ہیں، اُسکی مثال ازمنۂ گذشتہ میں من وعن ملنا مشکل ہے۔ ان میں سے ایک کام شفاخانوں اور خیراتی اسپتالوں کا قیام و اجرا بھی ہے جس کی بدولت لاکھوں اور کروروں نفوس انسانی بروقت ضرورت ایک پائی خرچ کیے بغیر فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور گورنمنٹ کو دعا دیتے ہیں۔

یورپین طریق علاج کے روز افزوں رواج کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ طب یونانی اور ویدک کا دائرہ اثر محدود ہو۔ چنانچہ یہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ یہ دونوں اسلامی و ہندی تہذیب و تمدن کی نشانیاں

ہیں اور بسا اوقات یہی قدیم طریقے اہل ہند کے معالجہ میں آب و ہوا اور مزاج کی موافقت کی وجہ سے کامیاب ثابت ہوئے ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ انکے زندہ رہنے کے اسباب فراہم کیے جائیں۔

دہلی و لکھنؤ میں مدت دراز سے احیاء طب یونانی و ویدک کے لیے غیر معمولی عملی کوششیں کی جا رہی ہیں، جو چند سال سے جبی کانفرنس کی شکل میں مستقل طور پر صورت پذیر ہو چکی ہیں۔ لاہور بھی کچھ دنوں سے اس باب میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ "پنجابی اشتہاری حکما" نے پبلک کو اچھے اچھے اطبا سے بدظن کر دیا ہے اور اکثر پنجابی "حکیم" کا لقب استہزاءً بنظر تحقیر مستعمل ہونے لگا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ احاطۂ پنجاب میں بعض با قابل و حاذق اطبا اپنے فن شریف کی حفاظت و بقا کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں اور وہ اپنی کارگذاریوں کے اعتبار سے ہر نوع مستحق مبارکباد ہیں۔ اس سلسلہ میں حکیم محمد فیروز الدین صاحب کا نام شکرگزاری کے ساتھ لینا چاہیے جن کی مساعی جمیلہ سے اسوقت تک کئی مفید کتابیں فن طب کے متعلق نکل چکی ہیں، اور جن کی مشہور تالیف "رموز الاطبا" نہایت خوبی و اہتمام سے، حال میں، دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

"رموز الاطبا" کے غائر مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک عجیب دلچسپ چیز ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے اس میں یہ التزام کیا ہے کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر موجودالوقت اطبا اور ویدوں کے حالات جمع کیے ہیں بعض مشاہیر کے ہاف ٹون فوٹو بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ جن سے کتاب کی دیدہ زیبی اور نفاست کئی درجہ بڑھ گئی ہے۔ سب سے زیادہ کارآمد صفت اس کتاب کی یہ ہے کہ حالات کے بعد اطباء کے مجرب و آزمودہ نسخہ جات حاصل کر کے شامل کر دیے گئے ہیں۔ اور حقیقت میں یہی سب سے زیادہ مفید چیز ہے۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ ان نسخہ جات میں بعض بالکل بے سود ثابت ہوں لیکن اس قدر یقینی ہے کہ ان میں سے کئی "اسرار سینہ بسینہ" کے مترادف ثابت ہوں گے۔ حکیم مولوی محمد فیروز الدین صاحب مبارکباد کے لائق ہیں کہ ان کی یہ تالیف اس درجہ مکمل ہو کر نکلی ہے۔ ناکام انھیں اپنے معاصر اطبا کے سوانح فراہم کرنے میں غیر معمولی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور سب سے زیادہ دشواری انھیں ان نسخوں کے دستیاب کرنے میں پیش آئی ہوگی جن کے اس طرح افشا کرنے کی مشرقی طبائع مطلق عادی نہیں ہیں۔

حکیم صاحب نے جڑی بوٹیوں اور غیر معروف ادویہ کی تشریح بھی ایک فرہنگ کے ذریعہ سے کر دی ہے جس سے بہت امداد مل سکتی ہے۔

کتاب کی اصل قیمت بلا جلد ۶ر اور رعایتی قیمت ۴ر ہے۔ مجلد نسخہ کی ... غالباً ۸ر کے اضافہ پر حاصل ہو سکتی ہے۔ جلد نہایت نفیس ... انگریزی وضع کی ہے، اور ضخامت تقریباً ایک ہزار صفحات۔ اور اس لحاظ سے قیمت بھی کچھ گراں نہیں۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب دارالکتب رفیق الاطباء، موچی دروازہ، لاہور۔

"سید القلم"

## رُباعی

یہ عشرت و عیش و شادمانی کب تک
عشرت بھی سہی تو نوجوانی کب تک
گر یہ بھی سہی قیامِ دولت ہے کہاں
دولت بھی سہی تو زندگانی کب تک

انیس لکھنوی

# عصریات

موجودہ نمبر سے یہ جدید عنوان قائم کیا جاتا ہے اسکے تحت میں بالالتزام مفید علمی نوٹ درج ہوا کریں گے۔ یہ نوٹ عموماً مختلف علوم وفنون اور جدید انکشافات کے متعلق ہوں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ اپنے ناظرین کی خدمت میں ادبی، تاریخی، اور علمی مضامین پیش کرنے کے علاوہ اُن کے لیے تازہ معلومات کا ذخیرہ بھی فراہم کریں۔ اگر ناظرین نے اس عنوان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تو ہم اسکے صفحات کی تعداد میں اور اضافہ کردیں گے۔ (ایڈیٹر)

## پروفیسر جے۔ سی۔ بوس کی تحقیق

فیفر اور ہاربرلینٹ ( Pfeffer & Harberlandt ) نے جو نباتات کے علم افعال الاعضا کے ماہرین میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں مجتہدانہ طور سے بتایا تھا کہ مِموسا ( Mimosa ) ایسے پودوں پر تحریک کا اثر اس طرح نہیں ہوتا جس طرح حیوانات کے اعصاب پر ہوتا ہے۔ ان علماء کے مقتدر درجہ کی وجہ سے تمام دُنیا نباتات اور حیوانات میں علم فعال الاعضا کے نقطۂ نظر سے یہی مابہ الامتیاز سمجھتی رہی۔ مگر پروفیسر بوس نے ثابت کیا ہے کہ جس طرح حیوانات کے اعصاب میں حرکت ہوتی ہے اُسی طرح نباتات میں بھی ہوتی ہے۔ اس انکشاف میں ایک نو ایجاد آلہ کی مدد سے بہت کامیابی ہوئی ہے جس میں نہایت نفیس قوتِ حِس رکھی گئی ہے۔ اس قوت کی وجہ سے یہ آلہ خودبخود تحریک کا اثر اور اعصابی حرکت کی رفتار لکھتا جاتا ہے۔ یہ "صوت نگار" ( Resonant-Recorder ) سیکنڈ کا $\frac{1}{1000}$ حصہ تک بتا دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے معلوم کیا گیا ہے کہ پودے کو کسی خارجی صدمہ کے محسوس کرنے میں سیکنڈ کا $\frac{1}{10}$ حصہ درکار ہے۔ جس طرح حیوانات کا وقفۂ حساس حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اُسی طرح مِموسا کا وقفۂ احساس بھی مختلف حالتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ حرارت سے یہ رفتار بڑھتی اور سردی سے گھٹتی ہے نیز جس طرح حیوانات میں کیمیائی، برقی، اور حرارتی ذرائع سے حرارت تیز، کم، یا بالکل بند ہوسکتی ہے اُسی طرح مِموسا کی اعصابی حرکت پر بھی ان ذرائع کا اثر ہوتا ہے۔ مختلف زہریلی اور سُن کرنیوالی ادویات کا بھی اُسکے اعصاب کی حرکت کو سُست یا سلب کرنے میں اثر معلوم ہوا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس انکشاف سے بہت سے مفید نتائج مترتب ہوں گے۔

## ہماری دیسی زبانیں اور یونیورسٹیاں

سر تھیوڈور ماریسن نے حال میں انڈیا ہوس میں لیکچر دیتے ہوے اس مسئلہ کی تائید کی ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے ہونی چاہیے آپ نے فرمایا کہ "ہمیں ہندوستان میں ایسی یونیورسٹیاں بنانا چاہییں جو دیسی زبان میں تعلیم دیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انگریزی تعلیم ہندوستانیوں کے حق میں مفید ثابت ہوئی ہے، اور مغربی خیالات نے ہندستانیوں کے دماغ کو ایک مفید رستہ پر لگا دیا ہے، لیکن یہ اثر زیادہ مفید اور وسیع ہوتا اگر یہ خیالات مادری زبان کے ذریعہ سے شائع کیے جاتے۔ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے یہ نقصان ہوا ہے کہ ہندوستانیوں کے علم اور خیالات سے اگرچہ تمام دُنیا فائدہ حاصل کر رہی ہے مگر خود ہندوستان کی زبانیں اور دیسی زبانیں استعمال کرنے والے لوگ اس سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ طالب علم کے لیے ایک بڑی مشکل ترجمہ کی ہے، کیونکہ اکثر الفاظ کے ٹھیک معنی دوسری زبان میں ادا نہیں ہو سکتے۔ ہمیں یونیورسٹیوں میں دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ وہ ہندوستانیوں کے خیالات و جذبات کا صحیح ذریعہ بن سکیں۔" سر تھیوڈور کی یہ راے اس قابل ہے کہ ہمارے مُلک کی یونیورسٹیاں اسپر غور کریں۔

## منجمد تیل بطور ایندھن

یورپ میں یہ کوشش کیجارہی ہے کہ جہازوں میں بجاے ایندھن کے منجمد پٹرولیم استعمال کیا جائے۔ پٹرولیم کو جوش دیکر صابن، شراب، اور دیگر ادویات کی مدد سے منجمد کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ اسکو مربع اینٹوں کی شکل میں ڈھال لیتے ہیں جو ٹھنڈی ہونے پر گلیسرین صابون کی طرح شفاف رہتی ہیں۔ یہ اینٹیں بکھر بکھری یا ٹکڑوں نہیں ہوتیں، اور نہ ان پر موسم کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو اٹھانے رکھنے، یا لیجانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ یہ منجمد تیل بہت آہستہ جلتا ہے اور حرارت بھی اس میں کافی ہوتی ہے، ایک ٹن پٹرولیم کی حرارت ڈھائی ٹن کوئلہ کی حرارت کے برابر ہوتی ہے۔ برطانیہ کے بحری انجینیروں نے اس منجمد تیل کی بہت تعریف کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ جہاز رانی کے لیے اس انکشاف سے ایک عہد مستقبل مکمل گیا ہے۔

## انگلستان کا ملک الشعرا

بہت مدت سے، جو سنہ ۱۶۷۰ء میں انگلستان کا ملک الشعراء قرار دیا گیا تھا آج تک انگلستان میں یہ عہدہ نہایت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ کئی بار اس عہدے کے انتخاب میں حق تلفی بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہنری جیمس پائی کی نسبت، جو سنہ ۱۷۹۰ء سے سنہ ۱۸۱۳ء تک ملک الشعرا رہا، بائرن کو یہ کہنا پڑا کہ "پائی کی ہر بات نہایت قابل وقعت ہے، مگر نظم"۔ ملک الشعرائی کے مسئلہ پر ٹینی سن کے انتقال (سنہ ۱۸۹۲ء) پر بہت گرم بحث چھڑی تھی جو مرحوم الفرڈ آسٹن کے تقرر سے بہت جلد ختم ہوگئی۔ اس سال مسٹر الفرڈ آسٹن کے انتقال ہونے پر اُسی زور شور کے ساتھ یہ سوال پھر اٹھا۔ مگر اُس سرعت اور آسانی سے فیصل بھی ہوگیا۔ اس باب میں مسٹر آسکوئیتھ کی تدبیر قابل تعریف ہے۔ یہ عہدہ اب ڈاکٹر رابرٹ بریجز (Dr. Robert Bridges) کو دیا گیا ہے، جو پولیٹکل شاعر نہونے کی وجہ سے لبرل اور کنسرویٹو دونوں فرقوں سے الگ ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ انگلستان ایسے ملک میں بھی فن سخن کی کافی قدر نہیں کیجاتی۔ وہاں اس عہدے کے لیے صرف ۹۹ پونڈ سالانہ پنشن مقرر ہے۔

## نئی موت

علم افعال الاعضاء میں انٹرسلیولر لائف Inter-Cellular Life (یعنی وہ زندگی جو جسم کی اُن مفرد کوٹھریوں میں پائی جاتی ہے جو جسم کی اکائی مانی گئی ہیں) کا نظریہ بہت مدت سے شامل ہے۔ اسکی بنا پر کہنہ زخمیوں کا علاج تندرست جگہ کی کھال کا پیوند زخم پر لگانے سے کامیابی کے ساتھ ہوا ہے۔ ڈاکٹر کیرل کے تجربات سے معلوم ہوا تھا کہ جسم کے جو اجزا ظاہر میں مُردہ معلوم ہوتے ہیں، وہ حقیقت میں بہت مدت تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر کیرل کے جدید تجربات سے اب یہ ثابت ہوا ہے کہ بعض اعضاء ظاہری موت کے بعد بھی اپنا وہ اصلی فعل پورا کر سکتے ہیں جسکے لیے وہ مخصوص تھے۔ مثلاً معدہ کھانا ہضم کر سکتا ہے، پھیپھڑے سانس لے سکتے ہیں، وغیرہ۔ ڈاکٹر کیرل کا قول ہے کہ موت کوئی فوری تغیر نہیں ہے جیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اُمید دلائی ہے کہ ممکن ہے کہ ایک درجہ ترقی کا اور طے کرنے پر ہوش و حواس بھی دوبارہ قائم ہو سکیں۔ جلد کے نیچے پچکاری لگا کر کچھ عرصہ سے ڈاکٹر قلب کی حرکت حالت اصلی پر لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی ڈیوک کا واقعہ ہے کہ اُسکا انتقال دس بجے شب کو ہوا۔ بارہ بجے شب کو اُسکا بیٹا سن بلوغت کو پہنچتا۔ ان دو گھنٹے کی کمی کے باعث تمام جائداد قانونی عیبوں میں اُلجھ جاتی۔ فوراً جلدی پچکاریاں لگائی گئیں، دل حرکت کرنے لگا۔ سانس آنے جانے لگی۔ اس طرح از سر نو زندگی اُسے حاصل ہوئی اور وہ ضرورت سے پاؤ گھنٹہ زیادہ زندہ رہا۔

## اور اک حیوانی

آج کل جرمنی کے ایک بولنے والے کُتے کا بہت چرچا ہے۔ اس کُتے کا نام "ڈان" ہے۔ اسکو جرمنی زبان کے چند لفظ یاد ہیں۔ جب اُس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تمھارا کیا نام ہے؟ تمھارا کیا حال ہے؟ تو وہ کہتا ہے "ڈان" "بھوک"۔ اسی طرح چند اور سوالات کا جواب دیتا ہے۔ جرمنی کے فلسفیوں نے اس امر کی فلسفیانہ تحقیق کی ہے، اور اُنھوں نے نطق کی

تین قسمیں قرار دی ہیں :-

(۱) حلق سے ایسی آوازیں پیدا کرنا جس سے سامع اُس مفہوم سے واقف ہو جائے جس سے خود متکلم آگاہ ہے۔

(۲) حلق سے ایسی آوازیں پیدا کرنا جو دوسری آوازوں کی نقل ہوں مگر سامع ان کا مفہوم نہ سمجھتا ہو۔

(۳) ایسی آوازیں نکالنا جو نطق انسانی کی نقل نہ ہوں، مگر سامع کو ان با معنی کا دھوکا ہو۔

مسٹر فنگسٹ ( Pfungst ) نے ڈوان کے نطق کو تیسری نوع کے تحت میں رکھے ہیں۔ کیونکہ سوالات کی ترتیب بدل دینے سے وہ اپنے جوابات کی ترتیب نہیں بدلتا، گویا خود اپنے الفاظ کے معنی نہیں سمجھتا اُسکے لہجہ میں بھی تغیر نہیں ہوتا جو نطق کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مسٹر فنگسٹ نے اس مضمون پر جانوروں کے افعال دماغی سے بحث کرتے ہوئے، کارل کرال کی کتاب THINKING ANIMAL (سوچنے سمجھنے والے جانور) کا حوالہ دیا ہے جس میں دو گھوڑوں کے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم جاننے کا حال مذکور ہے :-

یہ گھوڑے جذر، جذر الکعب، جذر الربع، اور جذر الخمس تک بتا سکتے تھے۔ فرنچ فلاسفک سوسائٹی نے اس معاملہ پر بہت غور کیا تھا۔ بعض کی رائے تھی کہ کوئی شعبدہ یا لاگ ہے۔ مسٹر کونشن نے خود جذر الخمس کے سوالات کا جواب دینے میں نے کرال کو متعجب کیا اور بتایا کہ اس قسم کے جذر کے لیے ایسے عدد کی ضرورت ہے جس کا جذر پورا حاصل ہو، اور یہ کہ بیان کیا کہ جذر الخمس میں اصل عدد کی اکائی ہی جذر ہوگی۔ مثلاً ۳۲ کا جذر الخمس ۲ ہے، ۲۴۳ کا ۳۔ جذر الکعب کا قاعدہ بھی بتایا کہ ۱-۴-۵-۶-۹ کے مکعب میں اکائیاں بھی عدد ہیں گی۔ ۲-۳-۷-۸ کے مکعب کی اکائیاں ۸-۷-۳-۲ ہوں گی، اور جواب ۱۰ میں سے تفریق کرکے نکلے گا۔ مگر مسٹر کونشن نے کمال یقین و وثوق کے ساتھ نہیں کہا کہ کرال کے گھوڑوں کی ریاضی دانی کا بھی یہی راز تھا۔

مسٹر فنگسٹ کی راے ڈوان کے بابت بہت معقول خیال کی گئی ہے۔

## مُہلک تشنج پیدا کرنیوالے کیڑے

بہت مدت سے بخار، طاعون، ہیضہ، اور دق وغیرہ کے اجرام کا انکشاف ہو چکا ہے۔ ایک جدید کیڑا ٹیٹانس بکیلس ( *Tetanus Bacillus* ) دریافت ہوا ہے۔ اس کیڑے کے جسم میں داخل ہونے سے نہایت مہلک اور خوفناک علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلے بخار ہوتا ہے۔ پھر تمام جسم میں اعضا شکنی شروع ہو جاتی ہے، گردن اور پیٹھ کے عضلات پر سخت تشنج طاری ہوتا ہے۔ یہ مرض ۱۴-۳۶ گھنٹے میں مریض کا کام تمام کر دیتا ہے۔ یہ کیڑے عموماً کھیتوں اور شفاخانوں کی زمین میں پائے جاتے ہیں، اور زخم یا خراش کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ گذشتہ ششماہی میں ہندوستان میں اس مرض کی اموات کی تعداد غیر معمولی رہی ہے۔ ان میں اکثر پہلوان ہی تھے، اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہاتھ پاؤں میں خفیف خراش ہونے کی حالت میں اُنھوں نے اکھاڑے میں ورزش کی تھی۔

## تحقیقات کا مستقبل

ڈاکٹر بوس کا ایک مضمون حال میں بنگال ایجوکیشنل جرنل میں شایع ہوا ہے، جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے ساتھ تحقیق کی بھی نہایت ضرورت ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہماری یونیورسٹیوں کا منتہاے خیال صرف یہی ہے کہ وہ غیر ممالک کی یونیورسٹیوں کے لیے طلبا تیار کریں؟ کیوں یہ کوشش نہیں کیجاتی کہ بیرونی یونیورسٹیوں سے طلبا ہماری یونیورسٹیوں میں آیا کریں؟" اُنھوں نے بجا طور پر کہا کہ "علم مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ تعلیم اور تحقیق دونوں ساتھ ساتھ نہ ہوں۔ صرف لیبوریٹریوں سے کام نہیں چلتا، خواہ وہ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں۔ اصل چیز طلباء کے دل میں تحقیقات کی ایک دُھن پیدا کرنا ہے۔" آخر میں ڈاکٹر بوس نے چند وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں تحقیقات کا بہت شاندار مستقبل ہونے کی امید دلائی ہے اُنھوں نے بتایا ہے کہ

۱- جو سہولتیں ہندوستان کو گرم ملک ہونے کی حیثیت سے سائنس کی

ضروریات کی فراہمی میں حاصل ہیں وہ سرد ممالک کو حاصل نہیں۔

۲۔ ہندوستان کے طلبا کا دماغ تحقیقات اور تجربات کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔

۳۔ اُن میں صبر و استقلال، جفاکشی اور فہم بدرجۂ اتم موجود ہیں، اسلیے اگر وہ کوشش کریں گے تو دُنیا کے علوم میں معتد بہ اضافہ کر سکیں گے۔

## علم سکھانے کی مشین

اہل امریکہ عرصہ سے اِس امر پر غور کر رہے تھے کہ کس طرح انسانی دماغ میں تمام باتیں جو انسان پڑھتا یا سنتا ہے، محفوظ ہو جاتی ہیں، اور وہ کونسی طاقت ہے جو تمام دُنیا کے علم کو جذب رکھتی ہے۔ اسکا حال امریکہ والوں نے معلوم کر لیا ہے۔ ایک ایسے شخص کو جو بالکل ہی جاہل مطلق ہوتا ہے ناکر ایک کمرے میں بٹھا دیتے ہیں اور ایک برقی ٹوپی جو انگریزی ٹوپی سے بہت مشابہ ہے سر پر رکھ دی جاتی ہے اور خاص قسم کا بنا ہوا کپڑا ٹوپی سے لگا کر کمر تک لٹکا دیا جاتا ہے۔ اور بائیں ہاتھ کی جانب گراموفون رکھ کر بجاتے ہیں۔ اسکے ریکارڈ چھ فٹ قطر سے زیادہ ہوتے ہیں جنمیں مختلف علوم کی کتابی عبارتیں معمولی گانیوالے ریکارڈوں کی طرح محفوظ ہوتی ہیں۔ معمول غور سے کرسی پر بیٹھا ہوا لفظ بہ لفظ سنتا ہے اور سر کی برقی ٹوپی میں حرکت ہوتی رہتی ہے۔ جونہی ریکارڈ ختم ہوا معمول پر بیہوشی طاری ہو گئی۔ تھوڑے عرصہ تک اُسکے اوسان بجا نہیں رہتے، مگر بعد ازاں وہ اُس کتاب کو ابتدا سے انتہا تک حرف بحرف سنا دیتا ہے اور پھر کبھی نہیں بھولتا۔ گورنمنٹ امریکہ نے اِس امر کا فیصلہ کر دیا ہے کہ آئندہ یوں ہی تعلیم دی جائے گی۔ چنانچہ مقررہ کورس کے ریکارڈوں کی تیاری کے لیے پانچ لاکھ پونڈ کی منظوری دی گئی ہے۔ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی درجہ اسکول کی تعلیم سے لے کر کالج کی آخری تعلیم تک صرف چھ ماہ کا زمانہ صرف ہوگا، اور یوں امریکہ کی تمام آبادی دو سال کے اندر پوری لکھی پڑھی ہو جائے گی۔

## ستاروں کی حرارت

اس بات سے تقریباً سب لوگ واقف ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ٹمٹماتے ستارے دراصل سُورج ہیں، جو ہمارے سُورج کی طرح اپنے اپنے نظامِ شمسی کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اِن کے گرد اور چھوٹے سیارے، جو دُور ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے، گھومتے رہتے ہیں۔ حال میں جرمن کے ایک مشہور منجم، ڈاکٹر روزن برگ، نے ستر ستاروں کا تپ معلوم کر لیا ہے۔ اِن ستاروں کے درجۂ حرارت کا اندازہ سپکٹرم کے مختلف حصّوں کی شوخ رنگت سے ہو سکتا ہے۔ اُنکا بیان ہے کہ ہمارے سُورج کی حرارت ۴۹۵۰ سنٹی گریڈ ہے۔ اِن ستر ستاروں میں سے سب سے سرد ستارے کی حرارت ۱۲۵۰ درجہ ہے، اور ایک کی حرارت تو ۴۰۰۰۰ درجہ سے بھی زیادہ ہے۔

## پاگل حساب داں

ٹینس کے پاگل خانہ میں ایک پاگل ہے جو غضب کا شمار کنندہ ہے، یوں تو وہ حروف تہجی بھی بمشکل پڑھ سکتا ہے لیکن جس پھرتی سے وہ سوالات کے جواب دیتا ہے اُس سے سخت حیرت ہوتی ہے۔ ذکر ہے کہ ایک روز اُسکا اُس سے دریافت کیا گیا کہ ۹۳ سال ۵ ماہ ۱۲ دن کے کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں تو اس کا جواب اُس نے نصف منٹ سے بھی کم میں دے دیا۔ پھر اُس سے دریافت کیا گیا کہ ۴۰ سال میں کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں تو اسکا جواب اُس نے ۴ سیکنڈ میں دیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ دس ارب سیکنڈ کے کتنے سال اور مہینے وغیرہ ہوے تو اس کا جواب اُسنے ۴ سیکنڈ میں دیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ شخص دیوانگی کی حالت میں تندرستی کی نسبت زیادہ پھرتی سے جواب دیتا ہے۔ شاید کچھ دن بعد علماے سائنس اسکی وجہ بتا سکیں گے۔

## ہنسی

پیرس کے ایک ڈاکٹر جو علمِ صوت کے ماہر ہیں بیان کرتے ہیں کہ ہنسی سے انسان کے اطوار و خصائل معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی کی ہنسی میں آ کی آواز نکلتی ہو جیسے کہ لفظ ہاہا تو وہ شخص وفادار اور نڈر ہے۔ اگر ای کی آواز نمایاں ہو تو وہ سست اور مغموم ہوتا ہے۔ اگر او کی آواز پائی جائے تو وہ شریر گو خوش مزاج اور مخیر ہے۔ اگر ہی کی آواز نمایاں ہو تو بنی انسان کا دشمن و بدخواہ ہے۔

## فسانۂ عبرت

ایک دن شہرِ خموشاں میں ہوا میرا گزر حسرت و عبرت کے ساماں جا بجا آئے نظر
کھوپڑی بوسیدہ کفن آلودہ پڑی تھی خاک پر میں نے پوچھا اُس سے گزرا ماجرا با چشمِ تر

رو کے بولی میں حسینِ دلربا تھا کبھی
گلِ عذار و لالہ رو رشکِ صنوبر تھا کبھی

سنبلِ پیچاں سے بہتر تھے مرے پیچیدہ بال زلف و بو میں لالہ و گل سے فزوں تر تھے کمال
مشکِ چین و عنبرِ سارا سے بڑھکر خط و خال ماہِ کامل لوحِ پیشانی تو ابرو ناخنِ ہلال

شکل و صورت حسن و رعنائی میں کامل فرد تھا
مرہمِ زخمِ جگر داروئے اہلِ درد تھا

ایک عالم حلقۂ زلفِ دوتا میں تھا اسیر آستاں پہ جبہہ سا دونوں تھے سلطان و وزیر
ترکشِ چشمِ فسوں پرداز میں جادو کے تیر ماہِ کامل کوئی کہتا تھا کوئی بدرِ منیر

سیکڑوں مرتے تھے اعجازِ لبِ جاں بخش پر
سیکڑوں جیتے تھے میری شکل و صورت دیکھکر

ابرو تھا ارتھی محراب یا بانکی کماں موے مژگاں سیہ تھے نوکِ پیکانِ سناں
تھیں نشیلی سرمگیں آنکھیں کہ تیغِ اصفہاں موتیوں سے دانت پر برقِ درخشاں کا گماں

لعلِ لب سے حمرتِ لعلِ بدخشانی خجل
عارضِ تاباں سے نورِ ماہِ کنعانی خجل

قامتِ موزوں جوابِ سرو و شمشادِ جناں شوخیِ رفتار سے ہنگامۂ محشر عیاں
ناز و انداز و ادا چھل بل پہ صدقے جانِ جاں حسن و رعنائی پہ قرباں جانِ پاکِ قدسیاں

وہ حسیں تھا صانعِ قدرت کو جس پر ناز تھا
حسن و زیبائی میں یکتا شاہدِ طناز تھا

سر سے پا تک مثلِ شمعِ طور یکتا نور کا نور کے سانچے میں تھا سارا بدن میرا ڈھلا
خامۂ قدرت نے کھینچا وہ پری نقشہ مرا حسن انداز و ادا و ناز میں بے مثل تھا

دیکھکر صورت نہ اپنے ہوش میں مانی رہے
خامۂ بہزاد کو تا حشر حیرانی رہے

بن سنور کر جب کسی جانب گزر اپنا ہوا زیرِ پا عشاق نے رستے میں دل آنکھیں بچھا
کوئی صدقے چال پر گفتار پر کوئی فدا طالبانِ دید کا تھا چار سو میلہ لگا

سیکڑوں اُلجھے تھے دل گیسوئے عنبر فام میں
طائرانِ قدس پھنس جاتے تھے اپنے دام میں

جب ہوئی دشمن زمیں اپنی مخالف آسماں آئیں پیہم صرصرِ فوت و فنا کی آندھیاں
گلشنِ حسن و جوانی ہو گیا وقفِ خزاں لشکرِ غم نے کیا پامال مُلکِ جسم و جاں

زور و قوت مال و دولت سب اکارت ہو گیا
کیا ہرا بھرا چمن دم بھر میں غارت ہو گیا

گلشنِ جنت کو مرغِ جاں روانہ ہو گیا اُڑ گیا بلبل تو ویراں آشیانہ ہو گیا
درہم و برہم وہ سارا کارخانہ ہو گیا اپنے بیگانے بنے دشمن زمانہ ہو گیا

غیب کی صورت چھپایا لا کے کنجِ خاک میں
رہ گئے ارمان لاکھوں خاطرِ غمناک میں

تیرہ و تاریک پست و تنگ و ویراں مکاں روشنی کا اور ہوا کا دخل ناممکن جہاں
سیکڑوں کیڑے مکوڑے سانپ بچھو جانستاں ہیبت و دہشت سے جنگل کانپ جائے جسم و جاں

تھی سراپا ظلمت و وحشت شبِ تاریکِ گور
حسرت و عبرت جو مونس تھی تو ہمدم مار و مور

فاتحہ پڑھنے کو بھولے سے نہ آیا پھر کوئی مٹ گئی مرتے ہی اپنے سب وہ رسمِ دوستی
ہو گیا جھوٹا فسانہ ذکرِ حسن و عاشقی تیرگی چھائی مٹی وہ چار دن کی چاندنی

جز غم و اندوہ و حسرت مونس و غمخوار کون
جز خدا کی ذات تھا اپنا رفیق و یار کون

زیست میں تھے سیکڑوں اُلفت جتانے کیلیے ظلم و ایذا ناز اور غمزے اٹھانے کیلیے
کون لایا پھول تربت پر چڑھانے کیلیے ایک بھی آیا نہ دو آنسو بہانے کیلیے

رشتۂ مہر و محبت ہائے توڑا موت نے
چلتی گاڑی میں دیا اٹکا یہ روڑا موت نے

چشم و ابرو گوش و بینی فرق و دندان و دہاں    سینہ و ساعد و دوش و بازو و عارض و کام و زباں
پنڈلیاں نازک بھری رانیں وہ پتلی انگلیاں    عقل و ہوش و علم و تمکین و ہمت و تاب و تواں

کھا لیا کیڑوں نے سب بیکار اعضا ہو گئے
نور کی صورت سے اب مٹی کا پتلا ہو گئے

مٹ گیا سب نقشِ باطل کی طرح حسن و جمال    حسن و رعنائی ادا و ناز و غمزہ خط و خال
لٹ گئیں وہ عنبریں زلفیں مٹے وہ گل سے گال    راہ چلتے ٹھوکروں سے کیجیے پامال

سیکڑوں یوسف لقا دیں جان جن کی چاہ میں
حیف وہ سر ٹھوکریں کھاتا پھرے یوں راہ میں

ہستیِ موہوم پر نازاں نہ ہو انساں کبھی    چند روزہ عیش و عشرت کا نہ ہو خواہاں کبھی
دے نہ ان کافر بتوں کو دولتِ ایماں کبھی    جلوۂ رخسارِ خوباں پہ نہ ہو حیراں کبھی

رات دن دل میں خیالِ خالقِ اکبر رہے
ہر گھڑی لب پر ثنائے شافعِ محشر رہے

الفتِ گیسوئے عنبر فام کا سودا عبث    مہ رخوں کے عارضِ پرنور کا چرچا عبث
عشقِ قد میں ہر گھڑی محشر ہے برپا عبث    شوخیِ رفتار پہ انساں نہو شیدا عبث

کیوں گنوائے جان عشقِ شاہدِ طناز میں
کیا دھرا ہے عشوہ و غمزہ ادا و ناز میں

مٹنے والی چیز ہے عشق و محبت ہے فضول    دین کھو کر جستجوئے مال و دولت ہے فضول
کم ہوں جو طاقت میں ان پر زور و قوت ہے فضول    خاکساروں عاجزوں سے کبر و نخوت ہے فضول

لطف و خلق و حلم سے ملتا ہے اس باب سے
شانِ کوثر جانے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ آپ سے

کوثر خیرآبادی

## جوانی اور بُری صحبت

کچھ نہ پوچھو ہم نشیں مجھ سے کہ اس نے کیا کیا    اس جوانی نے زمانہ میں مجھے رسوا کیا
تو نے چھیڑا ہے سرِ محفل تو سن لے کیفیت    حسرت و ارماں نے اس طرح سے اندھا کیا
راہ چلتے چلتے اک بے مہر پر عاشق ہوا    سامنے احباب کے جب ذکر اس بت کا کیا
دشمنِ جاں ہو گئے افسوس وہ بن کر رقیب    مجھ سے برگشتہ اُسے اُن سب نے بہکایا کیا
نام لینے سے مرا اُسکو بھی نفرت ہو گئی    اُسکی صورت بزم میں حیرت سے میں دیکھا کیا
دردِ دل کہنے جو بیٹھا پڑ گئے چتون پہ بل    آہ کی میں نے تو اُسنے حشر اک برپا کیا
دن تو اس طرح سے کاٹا کیا شام و سحر    سامنے آیا کبھی۔ مجھسے کبھی پردا کیا
رفتہ رفتہ عشق میں اُسکے ہوا مجھکو جنوں    بڑھتے بڑھتے اسکی الفت نے مجھے رسوا کیا
رات بھر آتی نہ تھی مجھکو شبِ فرقت میں نیند    بسترِ غم پر کبھی لوٹا کبھی تڑپا کیا
بنکے سودائی چلا آخر میں جنگل کیطرف    وادیِ وحشت میں مجھ کو بیکس و تنہا کیا
میں اسی حالت میں پھرتا تھا کہ جاگے تھے نصیب    حق نے اُس جنگل میں مردِ غیب اک پیدا کیا
دیکھ کر حالت مری رویا وہ بیٹھے زار زار    کیا کروں تدبیر اپنے دل میں وہ سوچا کیا
چھوڑ کر تنہا مجھے بستی کی آخر راہ لی    اور میانِ جہاں کو غور سے دیکھا کیا
ناگہاں آئی نظر اسکو وہ شکلِ دلفریب    حسن نے جسکے تھا عالم میں مجھے اندھا کیا
میری خاطر سے بڑھایا اسنے اُس سے ربط و ضبط    رفتہ رفتہ بزم میں بھی یار کی جایا کیا
ایک دن تنہا اسے پا کر یہ اُس نے عرض کی    ایک بیکس پر ستم کیوں آپ نے ایسا کیا
لے گیا جنگل سے مجکو تب کے رہبر بزم میں    وہ مجھے دیکھا کیا اور میں اُسے دیکھا کیا
کچھ محبت کی نظر تھی کچھ اداؤں میں شرم تھی    سر جھکائے سوچتا تھا وہ کبھی یہ کیا کیا
چھیڑ کی باتیں ہوا کیں دیر تک شکوے رہے    بعد اسکے پھر تو شغلِ ساغر و مینا کیا
چاندنی شب میں کبھی صحنِ چمن میں جشن تھا    اُسکے کہنے سے کبھی خیمہ لبِ دریا کیا
کامیابی دیکھ کر یہ پھر طبیعت چل پڑی    پھر بُری صحبت نے میرے دلمیں گھر پایا کیا
رات دن احباب سب رہتے تھے میرے ساتھ ساتھ    راہ چلنے میں حسینوں کو سدا گھورا کیا
ایک تو جوشِ جوانی دوسرے صحبت خراب    سر پہ جن کے یا پری نے خلق میں سایا کیا
جس طرف جاتا تھا سودائی مجھے کہتے تھے لوگ    دوستوں نے دوستی کا حق ادا اچھا کیا
ابتدائے عشق کا یہ واقعہ تھا ہم نشیں    نوجوانی کی بدولت عمر بھر رویا کیا
کوئی دنیا میں نہ چھوٹا حیف تھے فعلِ قبیح    جو نہ کرنا تھا زمانہ میں تنِ تنہا کیا
ابتدا میں کس لیے سوچا نہ میں انجامِ عشق    ساتھ اپنے غیر کو بھی میں نے کیوں رسوا کیا
چشم سے جاری نہ ہوں اشکِ ندامت کس طرح    حیف ہی دل میں نہ میں نے کچھ غمِ فردا کیا

روسیاہی کیا کہوں اپنی وہ اک طوفاں ہے    شرم دامنگیر ہے ہر فعل نے ایسا کیا
کانپ جاتا ہوں جو یاد آتی ہے اپنی سرگزشت    ہو کفِ افسوس ملتا ہوں میں نے کیا کیا
سخت حیرت ہے کہوں کیا حسنِ کردار نے کیا    جسنے دنیا میں مجھے انسان نیا پیدا کیا
چُپ ہوا گر میں تو یہ اعضا کہینگے نیک و بد    عمر جیسے کاٹی منہ کر کس سے ہو کالا کیا

باپ تو بہ ہے کھلا کہتے ہیں یہ موئے سفید
جلد تو بہ کر اسے جو کچھ کیا اچھا کیا

ماہر کنتوری

## جان لیوا ہار

اندومتی راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری تھی۔ کسی قصور پر اس کو یہ سزا دی گئی تھی کہ تو قالبِ انسانی اختیار کرے گی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اگر تیرے جسم سے کوئی آسمانی شے مس کرے گی تو تو فوراً اپنی اصلی حالت پر آ جائیگی۔ اندومتی قالبِ انسانی اختیار کر کے راجہ آج کی رانی ہوئی۔ راجہ اور رانی دونوں باغ میں محوِ عیش و عشرت تھے کہ اتفاق سے نارد منی کا ہار اندومتی پر گر پڑا (نارد منی آسمان پر پرواز کر رہے تھے)۔ ہار کے مس ہوتے ہی اندومتی کی روح پرواز کر گئی، جسے دیکھ کر راجہ آج کے حیرت اور رنج و ملال کی کچھ انتہا نہ تھی۔ ذیل کی نظم اسی قصہ سے تعلق رکھتی ہے۔

---

ہار تو آہ تو نہیں، قہرِ خدا اگر ہے تو    ہار تو آہ تو نہیں، برقِ بلا اگر ہے تو
ہار تو آہ تو نہیں، تیغِ جفا اگر ہے تو    ہار تو آہ تو نہیں، دامِ قضا اگر ہے تو

زہر اثر میں اُف، تری نکہتِ خوشگوار ہے
حلقۂ خوشنما ترا حلقۂ جسمِ مار ہے!

گرتے ہی تیرے چرخ سے ہائے یہ کیا غضب ہوا!    تیرا نزول، باعثِ رنج و غم و تعب ہوا
تجھ ہی سے آج ستم نصیب خستہ و جاں بلب ہوا!    اندومتی کی موت کا، حیف! تو ہی سبب ہوا

آ کے شگفتگی ایسی کچھ تونے ہوائے باغِ خلد
راہیِ خلد ہو گئی ایک فدائے باغِ خلد

ہائے یہ کیوں حجاب ہے؟ اندومتی کہاں ہے تو    گو ہے نظر کے سامنے پھر بھی تو اُف نہاں ہے تو
حیف کہ اب بھی باعثِ حیرتِ قلب و جاں ہے تو    تو ہی بتا زمیں پہ یا برسرِ آسماں ہے تو؟

وہم سے کیا عذاب ہے، زیست ادھر محال ہے
خوف اُدھر ہے مرکے بھی پھر نہ ترا وصال ہو!

اب بھی تو باغِ حسن میں تیرے وہی بہار ہے    اب بھی وہی ادائے مست سلبِ سکونِ قرار ہے
اب بھی وہی ہے آن بان اب بھی وہی نکھار ہے    اب بھی تو شانِ دلبری شکل سے آشکار ہے

یہ تو ہے سب، مگر دریغ! تجھکو مری خبر نہیں!
نالۂ دلخراش کا دل پہ ترے اثر نہیں!

بن نہ پڑی تھی مجھسے کیا ہائے جو تو مکر گئی    تو مرے حالِ زار سے حیف ہے بے خبر گئی
اپنے ہی ساتھ لیکے تو تابِ دل و جگر گئی    جان کو کھو کے نیم جاں مجھکو بھی آہ کر گئی!

ہے یہ غضب کہ نرم دل ہو کے تو سنگدل بنے!
حیف کہ تجھسا دل نواز ظالم و جاں گسل بنے!

سوہانِ کے تیری شوخیاں قلب کو اضطراب ہے    دیکھ تری صفائے جسم، چشمِ غمیں پُر آب ہے
دست بسر ہائے سراو، غمِ شباب ہے    موت سے تیری ہائے ہائے جان پر اک عذاب ہے

تھی جو یگانۂ زماں حسن کی آب و تاب میں!
حیف کہ تو ہی آگئی چرخ کے انتخاب میں!

تیرہ نظر میں ہے جہاں، غیرتِ ماہ! تجھ بغیر    منظرِ قدرت آج ہے، حیف سیاہ تجھ بغیر
ہیچ ہیں سب یہ دولت و حشمت و جاہ تجھ بغیر    لطف و کشش کسی میں بھی اب نہیں آہ تجھ بغیر

دردِ دروں کی تجھ بغیر، ہائے کوئی دوا نہیں
عشق میں جز کنارِ دوست اور کہیں شفا نہیں!

چشمِ فسونگرِ صنم بالکحل کے دکھا کمال تو    نورِ طرب سے دور کر تیرگیِ ملال تو
لے لبِ جانفزائے یار، ہو متبسّم چال تو    نغمۂ پُر اثر سے پھر تازگی دل میں ڈال تو

اندومتی! اگئی جو تو عہد وفا کو توڑ کر
پھینک دے آج رشتۂ جور و جفا کو توڑ کر

ہار! تری تو شکل سے مجھکو بس اب ہراس ہے    دشمنِ عقل و ہوش ہائے تیری یہ بو و باس ہے
ظلم سے تیرے جان زار گو کہ رہین یاس ہے    پھر بھی ہے کچھ سکوں، یہ دیکھ کے اب تو میرے پاس ہے

ڈھونڈوں ہزار میں تجھے، مجکو بھی کچھ اثر دکھا
ہجر و الم سے دے نجات، وصل و خوشی کا کھو دکھا

اقبال ورما سحر

## چشم بد دور

نقشِ رُخِ بشر کے لیے ہے نگار آنکھ　ہر رنگ ہر چمن میں ہے گویا بہار آنکھ
اظہارِ راز میں کسی صورت نہیں ہے بند　ہے بے زباں مگر ہے بڑی ہوشیار آنکھ
تعبیر مدعا جہاں صحیح ہو یا غلط　جو ہر کھلے اُٹھی جو ذرا ایک بار آنکھ
شرمائے اس سے کیوں نہ مکدر ہو آئینہ　رکھتی نہیں ہے دل کی طرح سے غبار آنکھ
باغ و بہار و خشکی و تر و کوہ و سبزہ زار　ہے ذوقِ سیر کے لیے بس انتظار آنکھ
دوری کو منزلوں کی نہ طے کس طرح کرے　برقِ نظر فرس ہے تو ہے شہسوار آنکھ
دنیا کی سیر کھیل تماشے اسی سے ہیں　دنیا کی زندگی میں ہے ذی اختیار آنکھ
ہے فرق اسی کے سامنے شیر و شراب میں　ہے معرفت میں اس سے فزوں ہوشیار آنکھ
بڑھتا ہے ذوقِ جذبۂ دل اسکی دید سے　بنتی ہے روح و جان ہمہ تن انتظار آنکھ
بند آنکھ ہو خیال میں تو دل کا حال دیکھ　رکھتی ہے اک نگاہ میں رنگت ہزار آنکھ
پہچان اسکے روپ سے ہے خوب و زشت کی　آرائشِ جہاں کے لیے ہے سنگار آنکھ
شہرے اسی کی دید کے مشہور عام ہیں　طبعِ خیال و ہنر میں ہے اشتہار آنکھ
رُخ کو کوئی چھپائے جو تو بہ کی آڑ میں　پڑتے ہی اک نگاہ بتا دے خمار آنکھ
آنکھوں کے نور سے ہے اُجالا جہان میں　آنکھیں نہوں تو کس سے کرے کوئی چار آنکھ
اللہ ایک تل میں سمائی پہاڑ کی　کس طرح ہو نہ قدرتِ پروردگار آنکھ

بندہ ہے رکھ نہ چشم امیدِ کرم صمیم
غربت میں تجھ سے پھیر نہ لے روزگار آنکھ

صمیم بلند شہری

## کتاب

اے مری تنہائی کی مونس، رفیق و غمگسار　تیری دلداری و غمخواری پہ ہوں دل سے نثار
تو رہا کرتی ہے ہر دم رنج و راحت کی شریک　صبحِ راحت کی ہے ہمدم شامِ غربت کی شریک
جدولیں ہیں لوح پر یا سبزۂ رخسار ہے　یا نشاط انگیز یہ پھولا پھلا گلزار ہے
نورِ ارشاد و ہدایت کا بھی سرچشمہ ہے تو　نیکی و پاکیزگی کا ایک سرمایہ ہے تو
علم کی تو کان ہے اخلاق کی تو جان ہے　اور فرع و اصل و نقل و عقل کا بستان ہے
عقل تیری ضوفشانی سے پُر نورانی ہوئی　یا شعاعِ مہر سے پیدا درخشانی ہوئی
اشرف المخلوق تجھ سے عالمِ خاکی ہوا　ہم کو تیری ہی بدولت رتبۂ عالی ملا
جلوۂ قدرت ہوا ہے تیرے دم سے آشکار　گلشنِ ہستی میں ہے تجھ سے بہارِ لالہ زار
ہر جگہ چرچے ہوا کرتے ہیں علم و فضل کے　ہر طرف دانائیوں کے تجھ سے شہرے ہیں مچے
جلوہ آرائی بھی تیری کیا ہی دل آویز ہے　مصحفِ رُخ کی زیارت بھی مسرت خیز ہے
بے مثال و بے نظیر و بے بہا تحفہ ہے تو　ہر بشر کے واسطے اک گوہرِ یکتا ہے تو
باغِ ہستی میں گلِ اخلاص سے تو ہی بسی　عطرِ الفت میں تری ہر سطر ہے ڈوبی ہوئی
تو ہے لیلائے معانی اے مری دلکش کتاب　تیرا دلدادہ ہے یہ اوج حزیں خانہ خراب

تیرے ہی دم سے ہے وابستہ میری زندگی
تو نہ ہو گر ساتھ تو کیسی کہاں کی زندگی　(ماخوذ)　اوج گیاوی

## تصویر کی قدردانی

خان خاناں کے زمانہ میں مصوّر کوئی　لایا اک نادر و نایاب بنا کر تصویر
دیکھ کر حکم دیا پانچ ہزار اسکو دو　اور سجادو کہیں موقع سے اٹھا کر تصویر
تب مصور نے کہا قدر ہے سرکار کی یہ　ورنہ ہے تیرۂ و تاریک مکدّر تصویر
سچ اگر پوچھیے دو تین سے زائد کی نہیں　ابھی اچھی کہیں اس سے بھی بن جائے گی تصویر
ہاں یہ ہے عرض اگر آپ کو ہے قدرِ کمال　تو بتا دیجیے کیونکر ہے یہ بہتر تصویر
تب یہ فرمایا کہ ہاں غور کیا ہے ہم نے　بے سبب ہی اسے سمجھا نہیں برتر تصویر
اک گل اندام حسینہ و جمیلہ ہے کہیں　اس کی لایا ہے تو محنت سے بنا کر تصویر
لطف یہ ہے کہ نہا کر وہ اٹھی ہے گویا　اور کھنچوائی ہے انداز و دکھا کر تصویر
خادمہ ہاتھ میں جھانواں لیے بیٹھی ہے کوئی　پانوں ملتی ہے وہ پیروں کو بتا تصویر
گر گدی جھانویں کے لنے سے جو کلفت ہوئی　تو نے دکھلائی ہے نایاب بنا کر تصویر

لی پھریری جو گُل اندام نے اُسدم کوئی  منقش ہو گئی تصویر میں بنکر تصویر
قدر اس واسطے ہے یہ کہ تو ہے اہلِ کمال  ورنہ لیتی ہیں بہت شکل مُصَوِّر تصویر
جب مصور نے سنا یہ تو کہا قدموں پہ  اور اب دل میں تعجب ہوا بنا کر تصویر

آج وہ بات کہاں آئے ماں قدر شناس
چند پیسوں میں اب ہوتی ہے بیشتر تصویر

اشک بلند شہری

## رُباعیاتِ طالب

کہتے تھے جوانی میں۔ جہاں گزریگی  مستی میں، مسرت میں، وہاں گزریگی
طالب یہ نہ سمجھے تھے کہ آگے چل کر  ہستی بھی ضعیفی میں گراں گزریگی

---

طفلی میں یہ کہتے تھے جواں ہونگے ہم  آرام جہاں ہونگے، جہاں ہونگے ہم
پیری میں یہ اندیشہ ہوا اے طالب  دُنیا سے گئے بھی تو کہاں ہونگے ہم

---

ہر اپنے بیگانے کی یہی راہ ملی  دولت کے لیے پیار ملا، چاہ ملی
ہر دوسری یا تیسری کو بیوی نے  پوچھا تو یہ پوچھا "تمھیں تنخواہ ملی؟"

---

تہذیب برتنے کے لیے سوٹ لیا  کالر لیے، نکٹائی لی، اور بوٹ لیا
تتلی کی طرح بڑھ کے کٹے پر طالب  فیشن کی ترقی نے ہمیں لوٹ لیا

---

ہم زر کے لیے ضاربِ زرگر بھی بنے  رہزن بھی بنے، ہادی و رہبر بھی بنے
رستے جو لگائے تو کچہری بھی چڑھے  لیڈر بھی بنے، اور پلیڈر بھی بنے

---

دم بھر ہمیں دُنیا میں نہ آرام ملا  جو کام ملا مقصد ناکام ملا
جب نشۂ پندار میں سرشار ہوئے  جب جا کے کہیں جم کی طرح جام ملا

---

## باغبان

کس مزے سے عمر کٹتی ہے تری اے باغباں  بلبل و گل کی ہے ہر دم یاد تجھکو داستاں
ہے جو ہر اک گل کو فکرِ آمدِ فصلِ خزاں  بیٹھی جاتی ہیں چمن میں ڈالیوں سے ڈالیاں

تیرے ہی دم سے ہیں سارے عیش و عشرت کے مزے
تجھکو حاصل ہیں عجب نیرنگِ قدرت کے مزے

صبح کا سناٹا وہ گلشن اور کلیوں کی چٹک  شوقِ نظارہ میں نرگس کی نہ جھپکی آنکھ پلک
شور اک بلبل کا ہے زمیں سے تا فلک  دمبدم آتی ہے بھینی بھینی پھولوں کی مہک

باغ کی ہے زندگی اور کس مزے کی زندگی
پھولوں ہی میں کٹتی ہے از بسکہ تیری زندگی

تو نہ ہو تو یہ گل و بلبل کی چاہت پھر کہاں  رات دن آپس میں یہ شکوہ شکایت پھر کہاں
چہچہے کی جس میں زیب و زینت پھر کہاں  ہلکی ہلکی وضع کی پھولوں میں رنگت پھر کہاں

کس قرینے سے لگائے گل چمن میں چار سو
مختلف پھولوں کی صورت مختلف پھولوں کی بو

نرگس بیمار کو ہے باغ میں بیٹھا پسند  بلبلِ ناشاد کو گلشن کی ہے ہر جا پسند
گل کھلاتا ہے نئے انساں کرے کیا کیا پسند  کوئی شے ایسی نہیں جو ہو کسی کو ناپسند

گو نہیں زیبا ہے یہ شانِ نفاست کے لیے
تو نے کانٹے بھی لگائے تو حفاظت کے لیے

تجھسے کیا بلبل گئے ہیں بنتے بنتے ہیں  سب سنا جاتے ہیں آکر اپنی اپنی بولیاں
اپنے اپنے قصے خوش ہو ہو کے کرتے ہیں بیاں  داد پا کر تجھ سے ہو جاتے ہیں کیسے شادماں

ایک تو ہے اور سارے باغ کا ہے اہتمام
دے رکھا ہے تجھکو کیا قدرت نے حُسنِ انتظام

ماہ عظیم آبادی

## تازہ غزلیں

### سید الشعراء حضرت قسیم بلند شہری

کھلیگا راز سارا ضبطِ الفت کے نہ ہونے سے  تمھاری آبرو جاتی رہیگی میرے رونے سے

بیان غم چمن میں ہوں زبان خار صحرا ہوں
فقیر آزاد ہوں کانٹے پھولوں کے چبھونے سے

ستایا اس قدر دیدہ کو ضبط محبت نے
اندھیرا چھا گیا آنکھوں میں میرے دل کے رونے سے

پس غم جان دینگے گو رہی ساقی تہی ہوگی
اٹھینگے زندہ روز حشر مینا کے کونے سے

جوانی ڈھل چلی اب آنکھ کھولو ہوش میں آؤ
خمار اترا ہوا چکرا نہ دے غفلت کے سونے سے

کوئی طعنہ تمہارا ناوک دلدوز ہی کیا ہے
کچوکے بھی تمہارے کم نہیں نشتر چبھونے سے

پڑیں سو سو بھی تو کیا ہے ابھو جم کی نکہت
کوئی داغ محبت چھوٹ نہیں سکتا ہے دھونے سے

حقیقت عشق کی ہم جانتے ہیں کوہکن کیسا
کہاں فرہاد کی شان تیشہ سر پہ ہونے سے

ارادے ہیں نگاہیں تیرے پیکاں اشکوں سے ہنس ہنس کر
گلے کا ہار ہو جاؤ نگاہوں موتی پرونے سے

تم اور اغیار کا پہلو ہم اور اغیار کے طعنے
بڑی ہی خیر گزری رہ گئی تکرار ہونے سے

بتوں پر مرنے والے سے کوئی اتنا نہیں کہتا
اے مرد خدا کیا فائدہ ہے جان کھونے سے

ہماری چپ کی داد اللہ دیگا ہم دکھا دینگے
پڑیگا صبر اپنا غیر پر خاموش ہونے سے

قیامت تک نہ یہ کشت عمل سرسبز دیکھیگا
لیگا کچھ نہ پھل اے مدعی کانٹوں کے بونے سے

نظر تصویر قاتل اب کسی صورت نہ آئے گی
کہ پردہ پڑ گیا ہے میری آنکھیں بند ہونے سے

صمیم ناز کا یہ وائے دل ہے آپ کیا جانیں
تقابل آئینہ میں کیجیے پھولوں کے دونے سے

(دیگر)

زخم گہرے ہیں کھنچاوٹ کے اثر کہتے ہیں
ٹوٹ جائیں نہ کہیں تار نظر کہتے ہیں

جھوٹے موتی ہی سہی اشک مری آنکھوں کے
دامن گل میں بھی شبنم کے گہر کہتے ہیں

مٹ گئے دل تو دلوں میں تری صورت اتری
جلوہ افروز جہاں تو ہے وہ گھر کہتے ہیں

حسن کا راز دہن ہے تو کھلے گا یہ ناز
وہم تو یہ ہے کہ انداز نگہ کہتے ہیں

پھل وفاؤں کا زمانہ میں کسی کو نہ ملا
آج تک نخل محبت کے ثمر کہتے ہیں

ہم نہیں وہ جو کریں ضبط محبت کا گلہ
انکا رونا ہے کہ جو دل کے بشر کہتے ہیں

وہ جو ٹوٹا تو ادھر پھوٹ کے روئے یہ بھی
دل کے چھالے کی طرح دیدۂ تر کہتے ہیں

چاہیے منزل مقصود کی لئے یار تلاش
ورنہ سارے یہ ترے عزم سفر کہتے ہیں

دیکھ ٹھکرا کے نہ چل ٹوٹ نہ جائیں ساقی
یہ بھی ساغر کی طرح کاسۂ سر کہتے ہیں

جو نظروں کے چلے ہیں کہ ہے آفت کا نچوڑ
تیر کے توڑ ہیں یہ سینہ جگر کہتے ہیں

دو سنیں مجھ سے ذرا میری تباہی کا بیان
کہنے والے تو مصیبت کی خبر کہتے ہیں

تو گرفتار کہاں جائیں گے تیرے اڑ کر
کچی کلیاں ہیں ابھی تو ابھی پر کہتے ہیں

روز اک رنگ حسینوں پہ جتا ہوں صمیم
کیا ہوں ہائے وہ کانوں کے گہر کہتے ہیں

## سید نظیر حسین صاحب نظیر

بیقراری کی بلا میں خود پڑی کا ہچکی تھی
بڑی آخر آہ و سوز اس سے لڑی کا ہچکی تھی

ہجر کی ساعت میں ہم جیتے رہے شان اللہ
الاماں روز قیامت تھا گھڑی کا ہچکی تھی

خود مصیبت سے مصیبت مانگتی ہے اب پناہ
تیرے دیوانہ کے سر آخر پڑی کا ہچکی تھی

آئی تھی لینے کو میرے آ گئے تم پھر گئی
ورنہ بالیں پر اجل آ کر کھڑی کا ہچکی تھی

حضرت موسی کا دل کیونکر نہ ہوتا محو شکر
اس قدر اونچی جگہ قسمت لڑی کا ہچکی تھی

ہجر کی شب نالہ تن کرتے کرتے بچ گیا
کیسے اک طوفان اشکوں کی جھڑی کا ہچکی تھی

دیکھنا تھا ناخن عقدہ کشا کی شان کا
بے سبب نہ گرہ دل میں پڑی کا ہچکی تھی

جم گیا تھا رنگ وہ میرے ہی دود آہ کا
اس لب نازک پہ مستی کی دھڑی کا ہچکی تھی

دل کی حالت دیر دیر سے یا لکھتا اس طرح
اپنے قابو میں طبیعت اس گھڑی کا ہچکی تھی

بے گمان داغ دل عاشق کا گلدستہ تھا وہ
پھول سے ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑی کا ہچکی تھی

ہم صفیرو یوں خزاں نے باغ کو لوٹا تھا آہ
کوئی پتا کوئی گل یا پنکھڑی کا ہچکی تھی

تو ہی کہہ ساقی نہ تھا دلکش مرا حسن شباب
پھر بھلا بنت العنب پیچھے پڑی کا ہچکی تھی

کی نہ تھی جب تک محبت دل کو راحت تھی نظیر
درد کی شدت یہ ہے دم ہر گھڑی کا ہچکی تھی

## قاضی مولوی مظہر الاسلام صاحب طالب (میرٹھی)

کھینچ لائی ہے یہاں تک مجھ کو یا فانی مری
تو ہی رکھ لے شرم اے گرد بیابانی مری

عمر بھر کرتی رہی ہے یہ نگہبانی مری
کیوں نہ پیاری ہو مجھے زنجیر زندانی مری

میں یہاں جس پہلوئے تربت میں ورا ابتک ہاں
ڈھونڈھتی پھرتی ہے مجکو خانہ ویرانی مری

بانی جور و ستم ہو ظلم کے خوگر ہو تم
رحم کی امید تم سے کی یہ نادانی مری

توڑ کر زنجیر جاؤں گا نہ میں زنداں سے اب
پاؤں پڑتی ہے مرے زنجیر زندانی مری

اس بھری محفل میں دل تھلے ہوئے پھر آگیا — دیکھئے تم کے محشر میں پریشانی مری
تم نے دیکھا؟ بس یہی نقشہ مری حیرت کا ہے — ہو بہو آئینہ ہے تصویرِ حیرانی مری
دل لگا بیٹھا بتوں سے ہائے میں نے کیا کیا — حشر تک بیجا نہیں سکتی پشیمانی مری
ہوتے جاتے ہیں وہ رسوائے جہاں نامِ خلق — راز افشا کرتی جاتی ہے بد اوسانی مری
ذبح کر جلدی بس اے صیاد شرمندہ نکر — دیکھ صورت تک رہے ہیں مرغِ بستانی مری
یا الٰہی یہ نیا صدمہ ہے میری جان پر — آرزو میری ہوئی ہے دشمنِ جانی مری
فصلِ گل پھر آئی پھر مجکو ہوا جوشِ جنوں — پھر وہی وحشت وہی ہے چاک دامانی مری
اُنکے در کی جبہہ سائی بھی نہ کی تو کیا کیا — ہائے پھر کس کام آئے گی یہ پیشانی مری
یار کی شرم و حیا نے پانی پانی کر دیا — حشر کے دن آبرو ہو ہو گئی پانی مری

طالب اس قابل تھا میں وہ تو یوں کہئے ہاں
دامنِ رحمت نے رکھ لی شرمِ عریانی مری

## منشی محمد عبدالحمید صاحب حمید (میرٹھی)

بڑھا کر دوستی وہ دشمنِ جاں ہوتے جاتے ہیں — مری قسمت سے بربادی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
طبیعت انکی مائل ہو رہی ہے خوشخرامی پر — فراہم میری پامالی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں
اُدھر وہ شوخیوں سے ترکِ الفت پر ہیں آمادہ — ادھر بیچین میرے دل کے ارماں ہوتے جاتے ہیں
چلے آتے ہیں رنج و غم ہمارے خانۂ دل میں — الٰہی جمع کیوں ناخواندہ مہماں ہوتے جاتے ہیں
نہیں دل کی پریشانی کا اب باقی نہیں شکوہ — وہ خود زلفِ پریشاں سے پریشاں ہوتے جاتے ہیں
بہار آئی ہے سودائی تھا ہی زلفِ مشکیں کے — چمن میں بوئے گل بنکر پریشاں ہوتے جاتے ہیں
سلامت اے تغیر راس آئی بیخودی مجکو — مبارک اے تحیر وہ بھی حیراں ہوتے جاتے ہیں
جنوں کا ہے عمل حکمِ اسیری پھر ہوا نافذ — گنہگارانِ الفت پا بجولاں ہوتے جاتے ہیں

کہا میں نے حمید ان سے خفا کیوں ہوتے جاتے ہو
تو کس انداز سے بولے کہ ہاں ہاں ہوتے جاتے ہیں

## سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی

بلبل ہوں اے صبا گلِ رخسارِ یار کا — پھیکا ہے جس سے رنگ عروسِ بہار کا
وہ قصد کر رہے ہیں اگر لالہ زار کا — آئیں کھلا ہے باغ دلِ داغدار کا
زلفیں ہیں یہ گھٹا نہیں چھائی ہے باغ پر — مُو بافت کھل گیا ہے عروسِ بہار کا
ناصح خیال تو ہے لیکن میں کیا کروں — مجبور ہوں کہ ہے ابھی موسم بہار کا
ہاں چل یہ میکدے میں نہیں آج بے سبب — تقوے ہے تو تپا کسی پرہیزگار کا
اپنے حنائی ہاتھوں کی مٹھی کو کھولیے — کچھ کچھ پتا چلا ہے دلِ بیقرار کا
خالق کو بھول کر ابھی بت پوجنے لگے — واعظ جو حسن دیکھ لے میرے نگار کا
تختے کھلے ہوئے نہیں پھولوں کے باغ میں — جوبن نکھر رہا ہے عروسِ بہار کا

کس چشمِ سرگیں نگاہ میں کشتہ ہوں اے رسا
آہو طواف کرتے ہیں میرے مزار کا

## منشی عبدالرحمٰن محمد محسن صاحب خوشتر منگرولی

اب تو ہم آنکھ حسینوں سے لڑا بیٹھے ہیں — مرغِ دل دامِ محبت میں پھنسا بیٹھے ہیں
شمع رو جائیں کہاں اٹھکے تری بزم سے ہم — دل کو پروانہ کے مانند جلا بیٹھے ہیں
کچھ ٹھکانا ہے بھلا انکی زبردستی کا — صاف انکار ہے اور دل کو دبا بیٹھے ہیں
شربتِ وصل ہے بیمارِ محبت کا علاج — چارہ گر کیوں لیے بالیں پہ دوا بیٹھے ہیں
منتظر موت کے ہیں ہم جو نہیں آتے وہ — سر جھکائے ہوئے مشتاقِ قضا بیٹھے ہیں
جستجو میں تری منظور یہ گمنامی ہے — اپنی ہستی کو ہم اے شوخ مٹا بیٹھے ہیں
مہرباں پاکے انھیں دور کی سوجھی ہے ہمیں — مدعائے دلِ بیتاب سنا بیٹھے ہیں
ہو کے مایوس تمنا نہ رکی ہائے زباں — کرکے اُن سے گلۂ جور و جفا بیٹھے ہیں
کیوں نہ قربان کریں نقدِ دل و جاں عشاق — بن سنور کر وہ بہت نامِ خدا بیٹھے ہیں
شاد کیوں ہو نہ مرا دل کہ دکھا کر آنکھیں — تیر دشمن کے جگر پر وہ لگا بیٹھے ہیں

کوئی غیرت یا دیکھو تو ذرا اے خوشتر
آج ہونے کو وہ انگشت نما بیٹھے ہیں

---

### رُباعی امیر مینائی مرحوم

بالفرض حیاتِ جاودانی تم ہو — بالفرض کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم کو نہ ملو تو خاک سمجھیں تم کو — لیں نام نہ پاس کا جو پانی تم ہو

# فہرست کتب

## موجودہ

## منروا پبلشنگ کمپنی لکھنؤ (اودھ)

اس فہرست مین صرف چیدہ و منتخب کتابین شامل ہین جن کے مطالعہ سے طبائع پر کسی قسم کا ناگوار اثر نہین پڑ سکتا۔ ان کے علاوہ اور ہر قسم کی کتابین بھی روانہ ہو سکتی ہین۔ براہ عنایت فرمائش کے وقت اپنا نام نامی و پتہ صاف و خوشخط تحریر فرمایئے۔ محصول ڈاک و دیگر اخراجات روانگی ہر حالت مین ذمہ خریدار ہون گے۔

جملہ فرمائشین پتہ ذیل پر ارسال کی جائین:

سکرٹری منروا پبلشنگ کمپنی۔ لکھنؤ (اودھ)

## تصنیفات علامہ شبلی نعمانی

**المامون مع الجزیہ**۔ مامون رشید کی زندگی کے واقعات اور اُس زمانہ کے طرز سلطنت و معاشرت کے مفصل حالات نہایت دلچسپ پیرایہ مین بیان کیے گئے ہین۔ .. .. .. .. قیمت عہ

**سیرۃ النعمان**۔ امام ابو حنیفہ کے حالات اور اخلاق و عادات نیز مناظرات تحریر ہین۔ .. .. .. .. قیمت عہ

**الغزالی**۔ امام غزالی کے سوانح حیات۔ .. قیمت عہ

**الفاروق**۔ حضرت عمر فاروق کے حالات۔ اس کتاب کی تکمیل کیلیے مصنف نے ممالک اسلامیہ کا سفر اور بیشمار تاریخون کی ورق گردانی کی تھی۔ اسے برسون کی جانکاہی اور محنت کا نتیجہ سمجھیے۔ .. قیمت ے

**سفرنامہ روم و مصر و شام**۔ تعریف نام سے ظاہر ہے۔ قیمت عہ

**رسائل شبلی**۔ اسمین مولانا ممدوح کے وہ مضامین درج ہین جو انھون نے وقتاً فوقتاً کسی علمی یا تاریخی مسئلے پر لکھے ہین۔ .. قیمت عہ

**سوانح مولانا روم**۔ مولوی جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری مع تقریظ و تبصرہ۔ .. .. .. قیمت عہ

**شعر العجم**۔ مولانا ممدوح کی تازہ تصنیف۔ شعرائے فارس کے کلام پر تفصیلی و تنقیدی نظر۔ قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ۔ جلد سوم عہ جلد چہارم .. .. .. .. .. عہ

**الکلام**۔ مولانا کی مشہور تصنیف ہے۔ .. قیمت ہر دو جلد عہ

**مثنوی صبح امید**۔ مولانا کی یہ اُردو مثنوی نہایت پر تاثیر ہے۔ قیمت ہ

**موازنہ انیس و دبیر**۔ تعریف نام سے ظاہر ہے۔ قیمت عہ

**اورنگزیب عالمگیر**۔ غلط افواہون کی تردید۔ .. قیمت ہ

## تصنیفات مولانا محمد حسین صاحب آزاد

**دربار اکبری**۔ جلال الدین اکبر بادشاہ اور اُس کے دربار کے امرا جلیل القدر کے نہایت مفصل اور دلچسپ حالات۔ شروع کتاب مین مصنف کا عکسی فوٹو شامل ہے۔ .. .. قیمت ے

**آب حیات** - مولانا آزاد کی مشہور تصنیف جسمین اردو زبان کے شعرا کے نہایت مفصل اور دلچسپ حالات بیان کیے ہین اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے اور زبان اردو کی عہد بعہد تبدیلیوں کی تاریخ لکھی ہی - مع تصویر مصنف قیمت …

**سخندان فارس** - اسمین بتایا گیا ہو کہ دنیا مین زبانین کسطرح پیدا ہوتی ہین کس طرح جیتی اور مرتی ہین - فارسی کا آغاز کیونکر ہوا - اس نے کیا کیا اٹھے بیٹھے کھائے - فارسی زبان اور سنسکرت مین کیا تعلق ہی - نہایت دلچسپ کتاب ہے - قیمت …

**نیرنگ خیال** - اسمین استعارہ کے مضامین درج ہین - دنیا کی ابتدائی حالت سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار وغیرہ مطالب پر خیالات کو وسعت دی ہے - .. .. قیمت …

**قند پارسی** - فارسی زبان کی تحصیل کے لیے یہ ایک مفید رسالہ اور زمانۂ حال کی فارسی کا بہت اچھا نمونہ ہے - .. .. قیمت …

**نظم آزاد** - مولانا آزاد کی دلکش و لاجواب نظمونکا ایک نادر مجموعہ قیمت …

**نصیحت کا کرن پھول** - اس کتاب کے ذریعہ سے مصنف ممدوح نے تعلیم نسوان کے متعلق ایک نہایت دلچسپ قصے کے پیرایہ مین اپنے عالمانہ اخلاقی خیالات ظاہر فرمائے ہین - .. .. قیمت …

**مکتوبات آزاد** - مولانا آزاد کے مختلف اور پر مطلب خطوط کا مجموعہ - قیمت …

**دیوان ذوق** - ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کا کلام جسکو مولانا آزاد نے استاد مرحوم کے قلمی مسودات سے مرتب کیا مع سوانح عمری - قیمت …

## تصنیفات مولانا الطاف حسین حالی

**حیات جاوید** - سرسید مرحوم کی مفصل و مبسوط سوانح عمری جو … صفحات پر دو جلدونمین ختم ہوئی ہی - کامل دس برس کی محنت اور بے انتہا کوشش سے یہ کتاب تکمیل کو پہنچی ہے - .. .. قیمت … جلد …

**حیات سعدی** - شیخ سعدی کی زندگی کے حالات اور تصنیفات پر محققانہ ریویو - اپنی طرز کی سبسے پہلی اور سب سے عمدہ کتاب ہے - .. قیمت …

**دیوان حالی** - مولانا حالی کا بے نظیر دیوان جسمین قدیم و جدید دونون طرز کی شاعری کے نمونے پائے جاتے ہین - شروع مین ایک بسیط مقدمہ شامل ہی جسمین حقیقت شاعری پر فلسفیانہ بحث کیگئی ہی قیمت قسم اول … قسم دوم …

**یادگار غالب** - غالب کے سوانح - .. .. قیمت …

**مجموعہ نظم حالی** - اسمین مولانا حالی کی چودہ بے نظیر نظمین شامل ہین قیمت …

**تحفۃ الاخوان** - مشہور ترکیب بند .. .. قیمت …

**رباعیات حالی** - مع تصویر مصنف - .. .. قیمت …

**مسدس حالی** - قابل دید قومی مسدس - .. قیمت …

## تصنیفات مولانا نذیر احمد

| | |
|---|---|
| مراۃ العروس - ... قیمت … | بنات النعش - ... قیمت … |
| توبۃ النصوح - ... قیمت … | محصنات - .. قیمت … |
| ایامی - .. .. قیمت … | ابن الوقت .. قیمت … |
| رویائے صادقہ - .. قیمت … | مبادی الحکمۃ - .. قیمت … |
| نظم بے نظیر (مجموعہ نظم) قیمت … | منتخب الحکایات - قیمت … |

**تاریخ دربار تاجپوشی** (سنہ ۱۹۱۱ع) اس کتاب کا ترجمہ بایمائے گورنمنٹ آف انڈیا مولانا ممدوح نے کیا تھا - والیان ملک احکام اعلی مقام اور مقامات دربار کی تصاویر بھی اسمین شامل ہین - حجم سات سو صفحات سے زائد - قیمت …

## تصنیفات پنڈت رتن ناتھ سرشار

**فسانۂ آزاد** اردو ناولون مین نہایت دلچسپ مقبول عام فسانہ قیمت چار جلد …

**سیر کوہسار** - ایک رئیس کی بیوقوفیان اور مصاحبین کی الٹ پھیر بیان اس انداز سے درج ہین کہ بادر و شاید - .. .. قیمت …

**الف لیلہ** - (بطرز ناول) اسمین قصص راتون کی ترتیب سے نمبروار درج ہین - طرز تحریر نہایت دلچسپ ... .. قیمت ہر دو حصہ …

فدائی فوجدار۔ ڈوان کوگزات کا ترجمہ ہنستے ہنستے لوٹ جائیے قیمت ہر حصہ ۶/

جام سرشار۔ نہایت پُرمذاق ناول ہے۔ .. .. قیمت عمہ/

کامنی۔ نہایت دلچسپ و پُرمذاق ناول ہے۔ .. .. قیمت عہ/

بچھڑی ہوئی دولھن۔ ایک مختصر دلچسپ ناول۔ .. قیمت ۸/

## تصنیفات حکیم محمد علی

عبرت۔ جان دھنوریہ کا لطیف قصہ بمثل ناول۔ قیمت ہر حصہ …

اختر و حسینہ۔ مستورات کی تعلیم کس قدر چاہیئے۔ عمدہ پیرایہ مین نتائج تعلیم .. .. .. قیمت ہر دو حصہ …

جعفر و عباسہ۔ ہارون رشید کے زمانے کا قصہ۔ بے پردگی کے بُرے نتائج قیمت …

نیل کا سانپ۔ ملکہ حسن "کلیوپیٹرا" کی پُر درد داستان۔ ع کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے۔ .. .. .. قیمت …

حسن بُسر۔ زور سے تھیلے جانے کے نقصانات لطیف طرز ادا کے ساتھ قیمت ہر حصہ …

گورا۔ عقد بیوگان کی ضرورت پر بمثل ناول۔ .. .. قیمت …

دیول دیوی۔ اسلام کے ایک جاہل فاتح علاؤالدین سکندر ثانی کا طرز حکومت و حسن انتظام وغیرہ .. .. قیمت …

مسیحائے عالم۔ قیمت ۸/ اہرام مصر .. قیمت ۲/

## تصنیفات مولانا محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی

جنید بغدادی۔ حضرت جنید کے حالات .. .. قیمت عمہ/

ابوبکر شبلی۔ حضرت شیخ شبلی کے حالات .. .. قیمت عمہ/

تاریخ سندھ۔ سندھ کی مکمل تاریخ دو جلد۔ قیمت جلد اول عمہ/ جلد دوم …

حروب صلیبیہ۔ مصنفہ منشر کا کس کا ترجمہ مع نوٹس۔ قیمت عہ/

تاریخ بغداد۔ مرکز خلافت عباسیہ .. .. قیمت ۶/

ملکہ زنوبیہ۔ ایک عربی نژاد ملکہ .. .. قیمت ۲/

الحکم الرفاعیہ۔ مصنفہ شیخ احمد رفاعی کا ترجمہ .. .. قیمت ۲/

آغائی صاحب۔ رئیس لکھنو مرحوم کے حالات .. .. قیمت عمہ/

سکینہ بنت حسین۔ جناب سکینہ کے حالات .. .. قیمت ۶/

زوال بغداد۔ سب سے نیا دلچسپ اور تاریخی ناول .. قیمت …

غیب دان دولھن۔ پاکدامن اور عفیفہ اور قابل بی بی کی برکتیں اسکی حیرت انگیز غیب دانی .. .. .. قیمت عمہ/

ماہ ملک۔ مولانا کا نیا اور اچھوتا ناول .. .. قیمت عہ/

یوسف و نجمہ کامل۔ جگ بیتی نہین آپ بیتی .. قیمت …

شوقین ملکہ۔ پہلی اور دوسری صلیبی لڑائیان .. قیمت …

فتح اندلس۔ اسپین پر عربون کا حملہ .. .. قیمت …

مقدس نازنین۔ ایک لڑکی کا پوپ بنجانا .. .. قیمت …

ملک العزیز ورجنا۔ تیسری صلیبی لڑائی .. .. قیمت …

ایام عرب۔ جاہلیت عرب کے حالات (ہر دو حصہ) قیمت …

فردوس برین۔ جیتے جی جنت کی سیر .. قیمت عمہ/

حسن انجلینا۔ روم و روس کی لڑائی .. .. قیمت …

منصور موہنا۔ ایک عربی خاندان سندھ .. .. قیمت …

شہید وفا۔ اسپین مین مسلمانون کی پامالی .. قیمت عمہ/

درگیش نندنی۔ ایک بنگالی ناول اردو مین .. قیمت عمہ/

دلچسپ۔ مصنف کا پہلا ناول .. .. قیمت ہر دو حصہ …

دلکش۔ طالب علمی اور عشق .. .. قیمت ہر دو حصہ …

میوۂ تلخ۔ رضامندی اور نارضامندی کی شادیان .. قیمت ۸/

بدرالنساء کی مصیبت۔ سفر مین جوروؤن کا بدل جانا۔ قیمت ۶/

افسانۂ قیس۔ مجنون عامری کی الالف جو از سر نو مکمل کی گئی ہے۔ قیمت ۲/

قیس و لبنیٰ۔ مشہور عاشق عرب قیس بن ذرغدری اور اسکی معشوقہ لبنیٰ کے حالات کو ایک نہایت دلچسپ ناول کا لباس پہنایا گیا ہے۔ قیمت …

**حسن بن صباح**۔ بانی فرقۂ باطنیہ کے حالات زندگی اُسکی تعلیمیں اسکا علم و فضل اور اُسکے سرکیت فدائی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۶/

**عصر قدیم**۔ ایک نہایت مکمل لکھی ہوئی تاریخ جسمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کی تمام قومون اسرائیلیون۔ مصریون۔ اسیریا و بابل والون۔ ایرانیون یونانیون۔ مقدونیہ والون۔ رومیون وغیرہ کے اجمالی حالات ہین۔ قیمت عـہ/

**خواجہ معین الدین چشتی**۔ خواجہ چشتی کے حالات و کمالات۔ ۔ ۔ قیمت ۶/

**آغا صادق کی شادی**۔ لکھنؤ کے اگلے دور شاہی کی ایک بامذاق تصویر کس کی دولہن کس کے ساتھ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۱۰/

**فلورا فلورنڈا**۔ اندلس کا اسلامی دور دلچسپ و تاریخی ناول۔ قیمت عـہ/

**فلپانا**۔ مولانا شرر کا بہت ہی پرانا تاریخی ناول ارض طرابلس الغرب پر صحابۂ کرام کا حملہ حضرت عثمان غنی کا دور صحابہ کی پاکبازی و بےنفسی شہزادی فلپانا اور عبداللہ بن زبیر ۔ ۔ ۔ قیمت عـہ/

## متفرق کتب

**تاریخ جلسۂ قیصری**۔ یعنی تاریخ دربار ۱۹۰۳ء مع ۵ اعدد فوٹوگراف مطبوعۂ گورنمنٹ پریس۔ سابق مین اسکی قیمت ۵۰ تھی صرف چند جلدین موجود ہین جلد طلب فرمائیے۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۸/

**مغربی تبت**۔ اسمین باشندگانِ تبت کے دلچسپ چال ڈھال، طرزِ معاشرت، مذہبی عقائد، توہماتِ باطلہ، رسوم شادی و غمی، تجارت وغیرہ، مفصل و مکمل حالات درج ہین۔ مع تصاویر۔ ۔ ۔ قیمت للعہ/

**تواریخ راجگان اودھ**۔ مع تصاویر فوٹوگراف۔ ۔ ۔ قیمت للعہ/

**خمخانۂ جاوید**۔ شعرائے ماضی و حال کا مکمل تذکرہ۔ مرتبۂ لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے۔ دہلوی۔ ۔ ۔ قیمت جلد اول للعہ/ جلد دوم ہے/

**معلم السیاست**۔ "پولیٹکل اکانومی" مصنفۂ جان اسٹوارٹ مل کا ترجمہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر شخص کے زیر مطالعہ رہے۔ ۔ ۔ قیمت عـہ/

**تاریخ فرشتہ**۔ اسی نام کی فارسی تاریخ کا مکمل اُردو ترجمہ قیمت ہر جلد عـہ

**انسان کامل**۔ شائقین علم تصوف حضرت مولانا عبدالکریم جیلانی کی اس مشہور و معروف کتاب کی خوبیون سے واقف ہین۔ یہ کتاب ایسی جامع و کامل اور اسرار و رموز علم باطن سے ایسی معمور ہے کہ کوئی شخص جو اس علم کی باریکیون سے واقف ہونا چاہتا ہے اسکے مطالعہ سے پوری واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ مولوی ظہیر احمد صاحب ظہیر سہسوانی نے اسکا بامحاورہ و سلیس ترجمہ اردو مین کیا ہے، اور ساتھ ہی مصنف کا مختصر تذکرہ اور مقاصد کتاب کو بوجہ احسن بیان کر دیا ہے۔ بڑی تقطیع، کاغذ اور چھپائی عمدہ قیمت۔ ۔ ۔ ۔ ہر دو جلد عـہ/

**فلسفۂ ازدواج**۔ بقول مولانا حالی "ہر شخص کا فرض ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک بار بار پڑھے اور اسکی ہدایتون پر عمل کرے" قیمت عـہ/

**اسرار رنگون**۔ باشندگان رنگون کی معاشرتی و اخلاقی حالت کا آئینہ عـہ/

**معدن تہذیب**۔ مصنفۂ مرزا حبیب حسین صاحب بی۔ اے۔ عـہ/

**عقل و شعور**۔ لڑکون، لڑکیون، مردون، عورتون کی تعلیم کیلیے دلچسپ افسانہ کے پیرایہ مین نصائح حکیمانہ و فلسفیانہ۔ بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہین چاہتا عـہ

**تاریخ بغاوت ہند**۔ غدر ۱۸۵۷ء کے مفصل حالات۔ قیمت عـہ/

**قیصر التواریخ**۔ مشتمل بر حالات شاہان اودھ۔ ۔ ۔ قیمت ہر جلد عـہ/

**فسانۂ برطانیہ**۔ انگلستان کی مکمل و مفصل سوانح عمری۔ قیمت عـہ/

**زندگانی بے نظیر**۔ شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی کی جامع و مکمل سوانحعمری مرتبۂ پروفیسر شہباز ۔ ۔ ۔ قیمت عـہ/

**آئینۂ اودھ**۔ اودھ کے متعلق اُردو کی نہایت ضخیم و مبسوط و مستند تاریخ قیمت عـہ

**اخلاق عزیزی**۔ اردو ترجمہ "مارکس آرن سینیکا"۔ اسکی مقبولیت کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ گورنمنٹ صوبجات متحدہ ممالک متوسط و پنجاب نے اسکو پسند فرما کر کئی سو جلدین خریدنے کے علاوہ اسکولون اور مدرسون کی انعامی کتابون مین داخل کیا۔ ترجمہ بامحاورہ اور پاکیزہ ہے۔ ۔ ۔ قیمت ہر جلد عـہ

**محاربات نسلی**۔ یعنی تاریخ جنگ روم و یونان، کامل۔ قیمت ۱۲؍
**ترکون کی معاشرت**۔ "ہسٹاری آف لے ٹرک" کا اُردو ترجمہ قیمت عا؍
**تزکِ امیری**۔ سوانح عمری امیر عبدالرحمن خان والی کابل۔ قیمت عما؍
**تاریخ اسلام**۔ آنریبل جسٹس سید امیر علی سابق جج ہائی کورٹ (کلکتہ) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ۔ .. .. .. قیمت عہ؍
**تاریخ اسپین**۔ مولوی سید محمد احمد خان صاحب جج سیتاپور نے انگریزی سے اُردو مین ترجمہ کیا ہے۔ .. .. قیمت للعہ؍
**اُردوے معلّی**۔ قیمت عہ؍ } حضرت غالب مرحوم کے مکتوبات کا دلکش مجموعہ
**عودِ ہندی**۔ قیمت عہ؍ } جنکو جدید طرز تحریر کا بیمثل نمونہ کہنا چاہیئے۔
**مکتوبات امیر** منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے خطوط کا مجموعہ مع حالات و تنقید کلام عہ؍
**دبدبۂ امیری**۔ امیر عبدالرحمن خان والی کابل کے دلچسپ حالات مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی ۱۲؍
**سیر برہما**۔ ملک برہما کے تاریخی حالات۔ .. .. قیمت ۸؍
**میزان سخن**۔ علم عروض مین مستند رسالہ ہے۔ .. قیمت ۶؍
**حدیقۃ الشعر** از مولوی مستجاب خان مشتاق۔ مکاتیب مین اس سے بہتر کتاب اُردو مین شائع نہین ہوئی۔ .. .. قیمت ۸؍
**گلزار سرور**۔ از رجب علی بیگ سرور۔ مطالعہ عقل و عشق جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۰؍
**دستور الشعراء**۔ تذکیر و تانیث مین مستند کتاب ہے۔ قیمت ۸؍
**کادمبری**۔ مشہور سنسکرت قصے کا اُردو ترجمہ۔ .. قیمت ۸؍
**افادۂ تاریخ** از جناب جلال لکھنوی۔ اسمین تاریخگوئی کے قواعد درج ہین قیمت ۸؍
**نپولین اعظم** مترجمہ سید معین الدین صاحب۔ یہ کتاب عمدہ دبیز کاغذ پر چھپی اور پانچ جلدون مین ختم ہوئی ہے اسکی عمدگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے اُسکو چھاپا ہے۔ نپولین اعظم کے اوصاف، فوق العادت تھے۔ اِسکے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی خداداد قابلیت سے کس درجہ کو پہنچتا ہے۔ پانچون جلدون کا حجم ۲۲۰۰ صفحات ہے۔ .. .. .. قیمت للعہ؍
**عریضۂ طاہرہ بیگم**۔ سراپا تربیت۔ عمدہ اخلاقی کتاب ہے .. قیمت عمر؍

**پریکٹیکل ٹرانسلیشن**۔ مصنفہ سید محمد رضی صاحب بی اے۔ یہ کتاب اُردو دانون کو بلا مدد انگریزی سکھانے کی ضامن ہے۔ قیمت ہر دو حصہ عہ؍
**مستقبل اسلام**۔ پروفیسر ویمبری کی معرکۃ الآرا تصنیف کا قابل دید ترجمہ از مولوی ظفر عمر صاحب بی۔ اے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے دلچسپ ثابت ہوگا۔ .. .. .. قیمت عما؍
**افسانۂ نادر جہان**۔ مصنفہ کے خود نوشت حالات مستورات کے پڑھنے کے قابل ہے۔
**پیاری سہیلی**۔ دلچسپ زنانہ طرز کے خطوط۔ .. قیمت ۸؍
**محبوب الاخلاق**۔ یعنی ترجمہ اخلاق محسنی۔ .. قیمت ۸؍
**جامع الاخلاق**۔ یعنی ترجمہ اخلاق جلالی۔ .. قیمت ۶؍

سوانحعمری اورنگزیب قیمت ۱۲؍
" شہنشاہ اکبر۔ قیمت ۱۰؍
" لارڈ کلایو۔ قیمت ۱۲؍
" مہاراجہ رنجیت سنگھ قیمت ۶؍
} یہ چارون کتابین انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہین۔

**بُستان حکمت**۔ ترجمۂ انوار سہیلی۔ .. .. قیمت عمر؍
**حدائق البلاغۃ**۔ اُردو۔ علم عروض مین بہت عمدہ رسالہ ہے قیمت ۸؍
**معاشرت**۔ ایک اعلیٰ درجہ کی اخلاقی کتاب۔ انگریزی کی گلستان یعنی سر جان لبک کی "یوز آف لائف" کا ترجمہ۔ .. .. قیمت عا؍
**اتالیق بی بی**۔ میان کے افعال پر بی بی کی مزیدار نکتہ چینیان۔ قیمت ۱۲؍
**تاریخ تمدن**۔ بکل کی ہسٹری آف سیولیزیشن کا قابل دید ترجمہ جو مرحوم منشی احمد حسین صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی کی قدرت انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے قیمت عمر؍
**تاریخ ابوالبشر**۔ امریکہ کے پروفیسر رڈپاتھ کی تاریخ عالم کا ترجمہ جسمین آغاز نوع انسانی کی کیفیت حسب تحقیقات جدیدہ نہایت دلچسپ پیرایہ مین لکھی گئی ہے عبارت کا زور قابل دید ہے۔ .. .. قیمت عمر؍
**اثبات مُحیب الوجود**۔ فلسفہ و سائنس نے متشککین و منکرین کا ایک بڑا گروہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کتاب انکے خیالات باطلہ کی تردید اور اصلاح کی غرض سے لکھی گئی ہے قیمت عمر؍

**قوتِ خیال۔** کیرکٹر کی درستی اور عمدہ اخلاق کی تعلیم کا بہترین معلم۔ نوجوانوں اور مستورات کے لیے اس کا مطالعہ بیحد سود مند ہوگا۔ .. قیمت ۸ر

**تحقیق سخن۔** مصنفہ مولانا شفق عماد پوری عیوب سخن قیود سخن اور محاسن سخن پایسا جامع اور مختصر رسالہ پہلے نہیں لکھا گیا نہایت مفید و کار آمد ہے۔ ۸ر

**مرقع اودھ۔** اودھ کی مختصر تاریخ۔ قیمت ۶ر } مصنفہ مولوی حسن حنیف صاحب بی اے۔

**شباب لکھنؤ۔** تعریف نام سے ظاہر ہے قیمت ۸ر

**کفایت شعاری۔** "تھرفٹ" مصنفہ اسمائلز کا خلاصہ۔ .. قیمت ۸ر

**آئینہ ہارمونیم۔** مصنفہ پروفیسر نندلال صاحب ہارمونسٹ۔ ہارمونیم سیکھنے والوں کے لیے بہترین رہنما۔ .. قیمت ہر دو حصص عہ

## اساتذہ کے دواوین وغیرہ

**نظم نگارین۔** حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا چوتھا دیوان۔ قیمت عہ

**دفتر فصاحت۔** دیوان خواجہ وزیر۔ .. .. قیمت ۱۲ر

**ریاض سحر۔** دیوان شیخ امان علی سحر۔ .. قیمت ۶ر

**دیوان بحر۔** دیوان شیخ امداد علی بحر۔ .. .. قیمت ۱۲ر

**غنچۂ آرزو۔** دیوان میر وزیر علی صبا۔ .. .. قیمت ۶ر

**دیوان طاہر۔** مولوی محمد طاہر علی طاہر فرخ آبادی کا کلام۔ قیمت ۱۱ر

**ریاض ماہ۔** کلام مرزا عنایت علی بیگ ماہ۔ .. قیمت ۱۲ر

**سخن بےمثال۔** دیوان شیخ محمد جان شاد۔ .. قیمت ۸ر

**دیوان شیفتہ۔** کلام نواب مصطفیٰ خان شیفتہ۔ .. قیمت ۱

**دیوان مجروح۔** کلام میر مہدی مجروح دہلوی۔ .. قیمت عہ

**مرآۃ الغیب۔** کلام حضرت امیر مینائی۔ .. قیمت ۱۱ر

**گلزار خلیل۔** کلام میر دوست علی خلیل۔ .. قیمت ۱۲ر

**کلیات تسلیم** منشی امیر اللہ تسلیم کا دیوان اول و دوم۔ دو جلد۔ قیمت [illegible]

**دفتر شنگرف** دہلی کے مشہور خوشگو شاعر حضرت نسیم کا مکمل دیوان۔ قیمت ۱۲ر

**دیوان ذوق۔** مرتبہ پروفیسر آزاد۔ .. .. قیمت عہ

**مثنوی عالم** مصنفہ ملکۂ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل نہایت عجیب مثنوی ہے۔ ۱۲ر

**کلیات ظفر** آخری بادشاہ دہلی کا مجموعہ کلام۔ .. قیمت ہر چار جلد [illegible]

**دیوان ناسخ۔** کلام شیخ امام بخش ناسخ۔ .. قیمت ۱۲ر

(کلام فصیح الملک نواب مرزا خان داغ دہلوی)

**مہتاب داغ** مع ضمیمہ یادگار داغ۔ قیمت ۷ر

**گلزار داغ۔** .. .. .. قیمت عہ

**یادگار داغ۔** .. .. .. قیمت عار

**آفتاب داغ۔** .. .. قیمت ۱۱ر

**انتخاب داغ۔** (منتخب کلام) .. قیمت عہ

**فریاد داغ۔** (مثنوی) .. قیمت ۱۲ر

**دیوان مہر۔** دیوان مرزا قاسم علی بیگ مہر۔ .. قیمت عہ

**دیوان شاہ تراب۔** مشہور عارف باللہ کاکوروی کا کلام۔ قیمت ۱۱ر

**دیوان رند۔** کلام نواب سید محمد جان رند۔ .. .. قیمت ۱ر

**دیوان سخن دہلوی** کلام مولوی فخرالدین حسین سخن دہلوی قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]

**دیوان غالب۔** کلام مرزا اسداللہ خان غالب دہلوی۔ قیمت ۸ر

**کلیات نظم غالب۔** فارسی۔ .. .. .. قیمت [illegible]

**دیوان مومن۔** حکیم مومن خان دہلوی کا مجموعۂ کلام۔ .. قیمت ۹ر

**دیوان آتش۔** کلام خواجہ حیدر علی آتش (لکھنوی)۔ .. قیمت ۱۰ر

**دیوان میر تقی میر۔** مکمل مجموعہ۔ .. .. قیمت [illegible]

**دیوان سودا۔** مرزا محمد رفیع سودا کا مجموعۂ کلام۔ .. .. قیمت [illegible]

**دیوان انشاء۔** کلام سید انشاء اللہ خان انشاء۔ .. .. قیمت عہ

**دیوان نظیر اکبرآبادی۔** مرتبہ پروفیسر شہباز مرحوم۔ .. قیمت عار

**بیاض عشاق۔** زوجہ آخری شاہ اودھ کا کلام۔ .. قیمت ۸ر

**دریائے تعشق۔** (مثنوی) قیمت ۴ر } از نواب واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ

**مثنوی خاقان سرور۔** قیمت ۴ر

کلیات مراثی میر نفیس - مع سلام و رباعیات - ہر چہار جلد قیمت ۱۲؍
کلیات مراثی مرزا دبیر - ہر دو جلد .. .. قیمت ۱۱؍
کلیات مراثی میر مونس - ہر سہ جلد .. .. قیمت ۱۵؍
کلیات مراثی و سلام میر عشق ہر دو جلد .. .. قیمت ۸؍
مجموعہ مراثی ضمیر - (استاد دبیر) ۴۹ مرثیہ .. قیمت ۱۲؍
مجموعہ مراثی دیگر - ہر سہ جلد .. .. .. قیمت ۷؍
گلزار نسیم - مشہور و معروف مثنوی - چوب قلم .. قیمت ۱۲؍
رشک گلزار - قصۂ شکنتلا اردو نظم میں - .. قیمت ۸؍
غنچہ نوبہار - سید حسن مرتضیٰ صاحب شفق عماد پوری کا مجموعہ رباعیات - قیمت ۴؍
نبی جی کی خوشی - زنانہ میلاد شریف لڑکیوں اور بی بیوں کے پڑھنے کے قابل ۱؍
حسن تخیل - یعنی منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی کی مقبول عام نظموں کا مجموعہ کتاب کے شروع میں ایک دیباچہ (از شاکر میرٹھی) ہے جو بجائے خود دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - کاغذ لکھائی چھپائی قابل تعریف - .. قیمت ۸؍
جذبات نادر - منشی نادر علیخاں صاحب نادر کاکوروی (مرحوم) کی دلکش نظموں کا مجموعہ -
قاسم و زہرہ - حضرت شوق قدوائی کی ایک باضافت و بے مثل نظم - قیمت ۱۲؍
عالم خیال - ” ” - شروع میں ایک محو خیال عورت کی نادر تصویر جو خاص اسی کے لیے مصور نے بنائی ہے - .. .. قیمت ۶؍

## ناول و قصے

سیتا - میڈوز ٹیلر کے اسی نام کے انگریزی ناول کا ترجمہ جسمیں ہندو مستورات کی وفاداری اور سچی محبت کا افسانہ غدر ۱۸۵۷ء کے تاریخی حالات وغیرہ درج ہیں - نہایت دلچسپ کتاب ہے - .. .. قیمت ہر دو حصہ ۲؍
افسانۂ دلپذیر - ”ٹیلز فرام شکسپیئر“ کا اردو ترجمہ - .. قیمت ۱۲؍
رنج و راحت - لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل - جمیلہ کی سرگزشت - ایک پُرلطف اور دلگداز کہانی - .. .. .. قیمت ۸؍

قصۂ گلاب چنبیلی - مستورات کیلئے ایک مہذب مفید اور مزیدار قصہ - قیمت ۸؍
تسخیر - ولیم رگولڈ اسمتھ کے ڈراما ”سی اسٹوپس ٹو کانکر“ کا ترجمہ - قیمت ۱۲؍
جذبۂ عشق - انگریزی ناول ”ڈ رائف آف لو“ کا ترجمہ - ایک یونانی لڑکی نے کیونکر اپنے حسن تیز سے ایک وحشی کو مہذب بنایا - .. قیمت ۸؍
شاہد طرار - ایک فرنچ ناول کا ترجمہ - .. .. قیمت ۸؍
عصمت - ترجمہ ”مائی فرینڈس وائف“ .. .. قیمت ۸؍
فریب حسن - رینالڈس کے مشہور و معروف ناول ”فاسٹ“ کا اردو ترجمہ قیمت ۱۲؍
الہ دین و لیلیٰ - مصنفہ ایضاً ”اسٹار آف منگریلیا“ کا اردو ترجمہ .. قیمت ۱۲؍
سوزن عشق - ترجمہ ”سمسٹرس“ .. .. .. قیمت ۱۲؍
حاجی بابا اصفہانی - مصنفہ کپتان موریر مشہور سیاح ایران - قیمت ۱۲؍
روز الیمبرٹ - اسی نام کے انگریزی ناول کا ترجمہ - قیمت جلد اول ۸؍ جلد دوم ۱۲؍
نورالنسا - اسی نام کے انگریزی ناول کا ترجمہ - .. .. قیمت ۱؍
طلسم خیالات - بابو رمیش چندر دت کے بنگالی ناول ”بنگ بجیتا“ کا ترجمہ قیمت ۸؍
اسرار - رینالڈس کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ - .. .. قیمت ۸؍
انجام بخیر - جارج شیلڈن کے ایک ناول کا ترجمہ - .. قیمت ۱۲؍
شہید حجاب - ترجمہ ”برائڈ آف لیمرمور“ مصنفہ سر والٹر اسکاٹ - .. قیمت ۱۲؍
ہم خرما و ہم ثواب - مصنفہ منشی نواب رائے صاحب بنارسی - قیمت ۶؍
ناشاد - مصنفہ حضرت ریاض خیرآبادی - .. .. قیمت ۸؍
فسانۂ لارنس ورتھ - رینالڈس کے اسی نام کے انگریزی ناول کا ترجمہ - قیمت ۱؍
بنگالی دولھن - بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناول ”دیوی چودھرانی“ کا اردو ترجمہ ۱۲؍
روہنی - ایک دلچسپ بنگالی ناول کا اردو ترجمہ - .. .. قیمت ۸؍
مار آستین - بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناول ”بشا برکشا“ کا اردو ترجمہ - .. قیمت ۸؍
مرنالنی - ایک دلکش بنگالی ناول کا ترجمہ - .. .. قیمت ۱؍
حسن معاشرت - ایک اخلاقی ناول از مولوی بشیرالدین احمد دہلوی مستورات کے پڑھنے کے قابل ۱؍
عروس نہرن - حضرت نادر کاکوری (مرحوم) کا بے مثل ناول - قیمت ۸؍

**امراؤجان ادا**۔ مصنفہ مرزا رسوا۔ بی اے۔ ۔ ۔ قیمت عہ

**ذات شریف**۔ مصنفہ ،، ،، ،، قیمت عہ

**اندرا**۔ ایک دلکش بنگالی ناول کا ترجمہ۔ ۔۔ ۔۔ قیمت ۲ر

**بروگ**۔ ،، ،، ،، ،، ،، قیمت ۸ر

**میٹھی چھری**۔ قیمت ۸ر
**پیاری دُنیا**۔ قیمت ۸ر
**کایا پلٹ**۔ قیمت ۸ر
**حاجی بغلول**۔ قیمت ۸ر
**طلسمی فانوس**۔ قیمت عہ

یہ پانچون ناول منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ کی تصنیف سے ہین جنمین ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہی۔ زبان کا لطف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

**رزم بزم**۔ مصنفہ منشی اَبوالعلی صاحب۔ دو حصے۔ ۔۔ قیمت عہ

**مظفر ورامابائی**۔ مصنفہ سید عاشق حسین صاحب لکھنوی قیمت عہ

**دردِ فراق**۔ نواب سید نظیر حسین صاحب نظیر۔ قیمت ۲ر

**کشتہ ناز**۔ نہایت دلچسپ ناول ہے۔ ۔۔ ۔۔ قیمت عہ

**ڈاکو کی دولھن**۔ ترجمہ از انگریزی۔ ۔۔ ۔۔ قیمت ۶ر

مندرجۂ ذیل ناول تاریخی، علمی، فلسفی ہین۔ اگرچہ ان مین حسن و عشق کی چاشنی دیگئی ہے مگر انکی اصل غرض ناظرین کے علمی، اخلاقی اور روحانی مذاق کو سُدھارنا اور ترقی دینا ہے۔

**زینونی**۔ مصنفہ لارڈ لٹن۔ اس ناول کا نہ صرف ملک فرانس کے ملکی انقلابات سے خاص تعلق ہی بلکہ اسمین انسان کے اعلیٰ دماغی نشو و نما اور بالائے قدرت طاقتون کا ذکر کرکے بہت سے صوفیانہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہی۔ روحانی ناول ہے۔

**پاتال کی سیر**۔ فرانس کے مشہور و معروف ناولسٹ اور سائنس دان جولس ورن کی تصنیف ہے جسمین زمین کی تہ کے نیچے کا حال بیان کرتے ہوئے علم الارض (جیالوجی) کے بڑے بڑے مسئلون کو حل کیا گیا ہی اسکے عجیب غریب حالات پڑھکر الف لیلہ کے علاء الدین اور اُسکے عجیب و غریب چراغ کا مزہ آتا ہی۔ عہ

**سمندر کی سیر**۔ ناول بھی فرانس کے مشہور ناولسٹ جولس ورن کی تصنیف ہے۔ اسمین سمندر کی تہ کے عجائبات کو ایسے دلچسپ طور سے بیان کیا ہی کہ گویا چشم دید واقعات معلوم ہوتے ہین۔ سمندر کے عجائب غرائب کے سامنے عقل حیران ہوتی ہے اور پرستان کی سیر کا مزہ آجاتا ہی! ور لطف یہ ہو کہ ساری باتین درست اور سائنس کے مسلمہ واقعات کے عین مطابق ہین۔ قیمت ہر دو حصہ عہ

**دوجہان کی سیر**۔ مصنفہ میری کوریلی۔ عالی دماغ مصنف نے ایک بالکل نئے خیال کو دُنیا مین فروغ دینے کی کوشش کی ہی اور نیا مذہب اور فلسفے کی حقیقت کو ایک نئے اُصول پر کھولنا چاہا ہی۔ نہایت دلچسپ ناول ہو جسقدر پڑھتے جاتے ہین اُسی قدر شوق بڑھتا جاتا ہی اور دل و دماغ پر جادو کا کام کرجاتا ہے۔ قیمت عہ

**روح لیلیٰ**۔ یہ کتاب میری کوریلی کی تصنیف ہے اسمین ایک دوسرے روحانی مسئلے کو حل کرنیکی کوشش کی ہی۔ ایک شخص ایک مردہ لڑکی کی روح کو اسکی وفات کے وقت ایسا محبوس کر دیتا ہو کہ وہ جسم کے ساتھ وابستہ رہتی ہے اور وقتاً فوقتاً اسکو زندہ کرکے اُسکے ذریعہ سے بہت سے کام نکالتا ہو۔ یہ ایک نہایت ہی عجیب قصہ ہو۔ عہ

## کتب لغت

**منتہی الارب**۔ عربی لغت کا ترجمہ فارسی زبان مین بہت مشہور لغت ہو ہر دو جلد عہ

**جامع اللغات**۔ اسمین عربی، فارسی، ترکی، اُردو کے لغات بڑی تصریح کے ساتھ درج ہین۔ اُردو فارسی کے روزمرہ محاورات اور طبی اصطلاحات کے بھی محل استعمال و معنی بتائے گئے ہین۔ بڑی تقطیع۔ دو جلد ۔۔ قیمت سے

**بہارعجم**۔ فارسی لغات مین یہ نہایت مشہور ہی۔ جابجا اساتذہ کے کلام کی سند دیگئی ہی۔ عہ

**غیاث اللغات**۔ رت چراغ ہدایت و نقشۂ کرۂ زمین (فن لغت مین یہ نہایت مشہور و مروج اور رائج الوقت کتاب ہو۔ عہ

**اشرف اللغات**۔ اسمین تقریباً پچیس ہزار لغات درج ہین۔ عہ

**لغات کشوری**۔ فارسی زبان کی یہ سب سے پہلی ڈکشنری ہی جو بلحاظ اپنی صحت و جامعیت و طرز بیان کے خاص خصوصیت رکھتی ہی۔ معنی اُردو مین لکھے ہین۔ طلبا کے کام کی چیز ہی قیمت عہ

**افسر اللغات**۔ اس لغت کو راجہ راجیشور راؤ بہادر نے نہایت محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے

## [illegible] کتاب کا اعلان

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] محصول

[illegible] مطبوعہ [illegible] نظام المشائخ [illegible]

[illegible] مقامات [illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible] قیمت [illegible] محصول [illegible]

## مہتمم رسالہ نظام المشائخ دہلی

## [illegible] تحفۂ تذکیر

[illegible] کے ساتھ [illegible] جاتا ہے اگر تندرستی حاصل [illegible]

[illegible] اور ہمیشہ

[illegible] کامل شاستر سے بلا قیمت [illegible]

[illegible] بنگالی [illegible]

[illegible] گولیاں [illegible]

[illegible] گولیاں آ سکے

[illegible] کی خرابیوں کو دور

[illegible] استعمال [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

[illegible] بنگالی [illegible]

## [illegible] لوہے کی مال [illegible] ہو کر دونوں [illegible]

### [illegible] یا بالی کی دوا

[illegible]

[illegible] وقت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] فروخت [illegible]

[illegible] سال قیمت [illegible] آنہ [illegible]

[illegible] قسم [illegible]

### [illegible] کی دوا

[illegible] سال [illegible] دولت [illegible]

[illegible]

[illegible] کی تعریف [illegible]

[illegible] سال قیمت [illegible]

### [illegible] والی [illegible]

[illegible] فروخت [illegible]

[illegible] جاپانی [illegible]

[illegible] مشہور [illegible] سال قیمت

دو روپیہ [illegible]

### ایک [illegible] سینے کی مشین

وہ مشین ہے کہ [illegible] ہر شخص [illegible]

[illegible] کپڑے [illegible]

[illegible] آسانی [illegible] اور مستورات [illegible]

[illegible] مشین [illegible]

[illegible] کام [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

### نہایت [illegible] سلائی کی مشین

[illegible] مشین [illegible]

[illegible] فروخت کی ہیں اور [illegible] چلانے

کی ایسی سہل ترکیب ہے کہ مستورات [illegible]

[illegible] چلا سکتی ہیں [illegible]

مشین [illegible] بھیجی جاتی ہے

قیمت [illegible]

### [illegible] ہے کہ گرمان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قسم [illegible]

[illegible] سال

### [illegible] والی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سال قیمت [illegible]

### [illegible] والی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سال قیمت [illegible]

### [illegible] کی دوا

[illegible]

[illegible] چہرہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

### جادو کا [illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

[illegible] قسم [illegible]

[illegible] قیمت ایک روپیہ چار آنہ

### [illegible]

دو [illegible] ساخت [illegible] نہایت

[illegible] بہت ہی باریک مانند آب رواں [illegible]

[illegible] طول [illegible]

[illegible] فی جوڑہ [illegible]




# دنیا مین ایک لاثانی ایجاد :

ولایت کے ماہرین عالی دماغ انجینرون کے گوشۂ خاطر مین اس خیال کی تخم ریزی ہوی کہ انجن کے مطابق قابلیت کا دو عالم نمایان ہو جس سے کم سرمایہ کے صرف سے موجودہ معروجہ کی نسبت زیادہ طاقت پیدا ہو اور اس طاقت کا وجود مالکان کارخانہ تجارتی اصحاب کے لیے مفید ثابت ہو کر تجارتی کاروبار کو اور بھی ہر طرح زیادہ دلکش صورت کا لباس پہنائے تاکہ عوام بلا کسی قسم کے خطرے کے کمال اشتیاق سے کارخانون کو نصب کریں آخرش کلفش تحقیقات اور کوشش کامیابی کا بر لائی اور کروڈ آئیل انجن وجود مین آیا یہ انجن معمولی مٹی کے تیل پر چلنے والے آئیل انجن کی نسبت ۵۰ فیصدی کم صرفہ پر چلتے ہین۔ ان انجنون مین جسکو کچا تیل کہتے ہین جلایا جاتا ہے جو کلکتہ بمبئی مین ۱۱ ر فی من (۴۲ گیلن) کے حساب سے فروخت ہوتا ہے قیمتین و مفصل حالات بذریعہ خط و کتابت معلوم ہو سکتے ہین۔

ہم اعلیٰ کاریگرون کے گیس ایشیم انجن و بوائلر ہر وقت اپنے کرانچی گودام مین تیار رکھتے ہین اور فوراً مہیا کیے جا سکتے ہین۔

نیز آٹا۔ چاول۔ تیل کھانڈ برف کی مشین و پانی نکالنے کے پمپ ہم نہایت عمدہ قسم کے اپنے کارخانہ بادامی باغ مین تیار کرکے مہیا کرتے ہین ہکوالہ آباد نمایش مین ۷ عدد تمغہ سرکاری انجینرون نے امتحان کرکے عطا کیے ہین جو کہ ہماری مشینون کے اعلیٰ ہونے کی زبردست شہادت ہے۔

المشتہر

راجا اینڈ کمپنی کوٹھی نمبر ۸ ٹھنڈی سڑک کانپور۔ تار کا پتہ "راجا" کانپور

جلد ۴ نمبر ۴ و ۵ — ادبِ اُردو کا ماہوار باتصویر رسالہ — نومبر و دسمبر ۱۹۱۳ء

# العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر میرٹھی

## کچھ اپنی نسبت

میری پریشانیون سے معاونین العصر مطلع ہو چکے ہین۔ ضرورت نہین کہ اب پھر ان باتون کا اعادہ کرون۔ البتہ اس بات کا یقین دلاتا ہون کہ میری موجودہ پریشانیون کی وجہ سے العصر کی شان مین کچھ فرق نہ آنے پائے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ معاونین مطمئن رہین۔

نومبر و دسمبر کے پرچے ارسال ہین۔ جنوری کا پرچہ بھی مطبع کو جا چکا ہے، اور فروری نمبر کی کتابت ہو رہی ہے۔ غرض مین کوشش کر رہا ہون کہ بہت جلد گزشتہ مہینون کے پرچے شائع کر کے سلسلۂ اشاعت درست کر لون۔ لیکن چونکہ کئی ماہ تک العصر بند رہا، لہٰذا ناممکن ہے کہ جلد یہ کسر پوری ہو جائے، اور اس بات کو مین پسند نہین کرتا کہ ایک نمبر چھاپ کر اسی کو کئی ماہ کے نام سے شائع کر دون۔

ان تمام احباب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہون جنھون نے میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی فرمایا ہے۔ مگر صرف زبانی ہمدردی سے کام نہین چلتا۔ اس وقت عملی ہمدردی سے کام لیجیے۔ اگر تمام معاونین دو دو نئے خریدار عنایت فرمائین تو یقین جانیے کہ العصر کی کایا پلٹ ہو جائے۔ پھر آپ ملاحظہ فرمائین گے کہ باوجود میری مالی پریشانیون اور دقتون کے العصر کیا کچھ ترقی کرتا ہے۔ امید ہے کہ تمام معاونین اس ناچیز درخواست کو قبول فرما کر اپنی قدردانی و عملی ہمدردی کا ثبوت دین گے۔

منتظرِ عنایات
خادم پیارے لال شاکر (میرٹھی)

قیمت سالانہ [illegible] (محصول علیحدہ) — شاکر میرٹھی نے دفتر العصر لکھنؤ سے شائع کیا — (قیمت ماہانہ [illegible])

# العصر - نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۱۳ع

تصاویر - ۱- شاہجہان کا بستر مرگ (رنگین) ۲- شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد خان (مرحوم) ۳- شاہجہان و بیگم ممتاز محل ۵- مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور

## فہرست مضامین

### نومبر سنہ ۱۹۱۳ع



### دسمبر سنہ ۱۹۱۳ع

# العصر

## ہر ماہ کے اخیر مین دفتر العصر لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے

قسم اول: سالانہ للعہ - ششماہی عہ - فی پرچہ ۷ ر
قسم دوم: سالانہ صے ر - ششماہی عہ - فی پرچہ ۵ ر
ممالک غیر سے صہ اور ے سالانہ علی الترتیب

(یہ شرح صرف عوام کے لئے ہے۔ خواص بنظر ہمدردی جو کچھ عنایت فرمائین)

چندہ بہ پیشگی ارسال کیا جائے۔ مابعد کا حساب نہین۔

نمونہ کے لئے مقررہ قیمت بھیجنا چاہئے بمفت ارسال نہو گا۔

خط و کتابت مین نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا آدھ آنہ کا ٹکٹ آنا چاہئے۔

## قلمی معاونین سے التماس

(۱) کاغذ کے ایک جانب لکھین۔

(۲) مضامین صاف تحریر فرمائین کہ پڑھنے مین دقت نہو۔

(۳) مضمون تحریر فرماتے وقت نصف صفحہ سے کچھ کم حاشیہ چھوڑ دیا کرین۔

(۴) جو مضامین معاوضہ کی غرض سے ارسال کئے جائین انکے متعلق صاف طور پر اطلاع دینا چاہئے ورنہ بعد اندراج معاوضہ کے متعلق گفتگو کرنا فضول ہوگا۔

(۵) جس مضمون کے ساتھ تصویر وغیرہ کی ضرورت ہو اُسکا خود انتظام فرمائین۔

(۶) معاوضہ صرف اعلیٰ علمی و ادبی مضامین کے لئے دیا جائے گا اسمین بھی اوریجنل مضامین کی تخصیص ہے۔

اگر سب حضرات ان ہدایات کو ملحوظ رکھین تو ایڈیٹر کا بہت سا وقت جو رائگان جاتا ہے بچ رہا کرے گا۔

جملہ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونا چاہئے

**پیارے لال شاکر (میرٹھی) ایڈیٹر رسالہ العصر لکھنؤ**

# جدید الطبع کتابین

**(۱) حدیقۃ الاخلاق** — کانوی آف ہومین لائف کا اُردو ترجمہ اس کتاب کی نصیحتین موتیون مین تولنے کے قابل ہین۔ تقریباً تمام مہذب زبانون مین اسکا ترجمہ ہوا ہے۔ صرف انگریزی زبان ہی مین اسکے صدہا ایڈیشن شائع ہو چکے ہین۔ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی نے اسکا اُردو ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم کیا ہے سب سے بڑی سفارش اس کتاب کی یہ ہے کہ قابل مترجم نے اس ترجمہ کو اپنے بچون کے نام منصوص کیا ہے قیمت ۱۲ ر

**(۲) عالم خیال** — مولوی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی کی ایک بے اضافت و بے بدل اُردو نظم جو پبلک سے خلعت قبول حاصل کر چکی ہے۔ چار رنگون کے ساتھ چار عالمانہ ریویو بھی شامل ہین۔ نیز منشی پیارے لال صاحب شاکر (میرٹھی) نے بھی ایک دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ شروع مین ایک محو خیال عورت کی نادر تصویر چھاپی گئی ہے جو نہین نظرون کے لئے ایک چابکدست مصور نے بنائی ہے۔ قیمت ۰۶ ر

**(۳) اکسیر سخن** — مہا کوی کالیداس کی موسمی نظمون (رتو سنہار) کا اردو ترجمہ نظم۔ شروع مین ملک کے مشہور فسانہ نویس بابو پریم چند صاحب نے ایک دلچسپ مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم کے نام نامی پر یہ کتاب معنون کی گئی ہے اور آپکی تصویر بھی شامل ہے۔ نیز ان نظمون کے مترجم منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی تصویر بھی کتاب کے شروع مین لگائی گئی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہاتھون ہاتھ خریدی جائے قیمت ۱ ر

**روزنامچہ سیاحت** — آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب بی اے ال ال بی کا سفرنامہ جسمین عراق، حجاز، عجم وغیرہ کے مختلف قطاع کی سیاحت کا حال درج ہے۔ نہایت دلچسپ و کار آمد کتاب ہے۔ حجم تقریباً ۰۰ صفحات قیمت .. .. .. .. .. .. .. ۸ عہ

**المشتہر سکریٹری منرو ایبلنگ کمپنی، لکھنؤ (اودھ)**

## کیا آپ نے [illegible] توسیع اشاعت کے متعلق اپنا فرض ادا کیا؟

اگر نہیں تو اب جلد [illegible] کا موقع عنایت فرمائیے یاد رکھئے توسیع اشاعت ہی پر رسالہ کی ترقی منحصر ہے یہ میوچوال ہیلپ (باہمی امداد) ہے جب تک دونوں فریقین ہم [illegible] نہ ہوں کوئی کام درستی کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا۔

ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں، آپ اپنا فرض ادا کیجیے!

## دنیا مین کوئی شئے نہین اولاد سے بہتر

جن اصحاب کو اولاد کی تمنا ہو وہ مشتہر سے خط و کتابت کرین ہمارے اصول علاج کے مطابق، جو خالص سائنٹیفک ہے، آپ ۱۲ ماہ کی مدت مین گھر بیٹھے صاحب اولاد بن سکتے ہین فیس جسکی مقدار بہت قلیل ہے، بوقت کامیابی لی جاتی ہے بشروع مین صرف اخراجات اقرار نامہ و خط و کتابت لئے جائین گے۔

نیز اگر آپکی یہ خواہش ہو کہ آپکا بچہ بڑا ہوکر کسی خاص پیشہ مثلاً وکالت طبابت تجارت وغیرہ مین نام پیدا کرے تو یہ بھی ممکن ہے اسکی فیس علیحدہ دینا ہوگی مفصل کیفیت بذریعہ خط و کتابت دریافت کیجئے

**المشتہر۔ پروفیسر الیف۔ ای میرل۔ وکٹوریہ گنج، لکھنو**

## ادب اُردو مین تنقید العالیہ

دیکھنی ہو تو نقاد کا ایک پرچہ نمونتاً منگا کر ضرور ملاحظہ فرمائیے جسنے نقاد سالگرہ جاری ہوکر اُردو جرنلزم مین ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور اپنے دلکش و دلپذیر مضامین اور تنقیدی مباحث کی وجہ سے ملک مین نہایت ہر دلعزیز و مقبول ہوگیا ہے نثر شاعری آپکو نقاد کے سوا کہین اور نہ ملیگی مشاہیر اہل ادب اسکے معاون ہین جو اپنے بہترین دماغی افکار سے زبان اردو کو مالامال کر رہے ہین علاوہ ظاہری و باطنی خوبیون کے جسکا اعتراف تمام معزز ملکی اخبارات و رسائل نے نہایت حوصلہ افزا الفاظ مین کیا ہے نقاد ہمیشہ وقت پر ماہوار شائع ہوتا ہے اور یہ مبالغہ نہین امر واقعہ ہے کہ اسکا ہر نمبر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نکلتا ہے۔ نمونہ کی قیمت ۸۔ اور قیمت سالانہ صرف ۳ ہے۔

**خادم منیجر نقاد آگرہ**

## سال جدید کا علمی تحفہ
### یعنی
## علمی لٹریری تاش

علمی تاش کے ذریعہ لڑکے اور لڑکیون کو کھیل ہی کھیل مین پڑھا لو۔ بچے ذرا سی کوشش سے بغیر کتاب کے حروف شناخت کرنے لگتے۔ پھر جوڑنے لگتے۔ حتے کہ عبارت پڑھنے کے قابل ہوجاتے ہین۔ باتصویر اور اسقدر خوبصورت کہ بچے چھین کر لے جائین۔

**کھیل بھی کھیلا جاتا ہے** علمی تاش یا علمی پکبک کے ذریعہ نہایت دلچسپ اور علمی کھیل بھی کھیلا جاتا ہے: جو ترقی معلومات کا ذریعہ ہے لطف یہ کہ یہ تاش بچون۔ عورتون۔ اور طلبا سے لیکر علما و فضلا تک کے لیے دلچسپ ہے۔

قیمت قسم اول فی سٹ ۱۰/ - درجہ دوم ۸/

نوٹ ۱۔ کھیل کے لیے ایک سے زیادہ سٹ طلب کرین۔

نوٹ ۲۔ نقشہ حروف تہجی مفرد اردو باتصویر بچون کو ابجد سکھانے کے لئے قیمت سادہ فی عدد ۲/ - روغنی و دولدار ۶/ - منگانے کا پتہ

**منیجر کارخانہ علمی پکبک دہلی**

## نوشتۂ تقدیر

اپ ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور تاریخ پیدایش یا پوسٹ کارڈ لکھنے کی تاریخ اور وقت لکھکر بھیجدیجئے۔ ہم آپکو آیندہ بارہ مہینے کے پیش آنیوالے حالات و واقعات، یعنی خوشی و غم، کس ماہ مین کس تجارت سے نفع ہوگا! روزگار کے متعلق ترقی، تبدیلی، موقوفی، علالت، کیا اولاد ہوگی، وغیرہ جملہ باتون کا خلاصہ ۱۲ ورق مین بذریعہ ویلو پی ایبل ارسال کرینگے۔ نامطابق ہونے پر قیمت بلا عذر واپس ہوگی۔ اگر امتحان مدنظر ہو تو صرف ۲ کے ٹکٹ ڈاک ارسال کرکے ہم آپکو آپکی گزشتہ زندگی کے خاص تین واقعات لکھکر بھیجدین گے۔ اس سے ہمارے اشتہار کی اصلیت ظاہر ہوجائے گی۔ جنم پترا وغیرہ بھی تیار ہوتا ہے فیس ۵ تا ۵ مختلف سوالات کا جواب بھی دیا جاتا ہے فیس فی سوال ۲ [نوٹ۔ اگر تاریخ پیدائش معلوم نہو تو عمر کا اندازہ ضرور تحریر کیجیے

**المشتہر۔ پروفیسر الیف۔ ای میرل وکٹوریا گنج۔ لکھنو**



Passing of Shahjehan.

# العصر

## بھاکا کی شاعری

(از ہز اکسلنسی سر مہاراجہ بہادر راجۂ راجایان راجہ سر کشن پرشاد صاحب شاد یمین السلطنت جی سی آئی ای)

بھاکا کی شاعری بھی ایک عجیب با اثر اور صبر شکیب ہے اور اسکا پتا دیتی ہے
که سنسکرت کی شاعری کے آفتاب کو کیا شرف حاصل ہے۔ تشبیہات، استعارات،
صفائی، جدتِ مضامین، ندرتِ بیان، توحید و معارف کی باریکیاں جو سنسکرت
میں ہیں، ممکن ہے کہ اسکا جواب کسی اور زبان کی شاعری بھی دے سکے مگر سوز و گداز،
حسرت و یاس، بیوگ، عاشقانہ رنگ، جو بھاکا کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ
بے مثل ہے۔

بھاکا اصل میں برج (متھرا) کی زبان ہے جو کنہیا جی کا مسکن ہے، اور
بقول "تیغ چوں بشکست عنبری شود" سنسکرت سے بگڑ کر بنی ہے۔ مگر ایسی دلکش
دل فریب اور پیاری زبان ہے کہ اہلِ ہند کے دل سے کبھی اسکا نقش مٹا نہیں
سکتا۔ گو اب نیا کلام دیکھنے سننے میں نہیں آتا اس لیے کہ بھاکا کی شاعری کا
مشغلہ اب نہیں ہے، مگر پچھلے شاعروں کے کہے ہوے اشعار جب کان میں
پڑ جاتے ہیں تو دل میں اثر کر کے نشتر کا کام کرتے ہیں۔ یہ دل آویز شاعری
برج تک محدود نہیں رہی بلکہ تیغ زبان کے جوہر نے اکثر مقامات ہند پر اپنا
قبضہ کیا اور اکثر بلاد میں اپنا عمل دخل پیدا کر لیا۔ لطفِ زبان کے ساتھ ترجمانِ دل
بننا اور دلی کیفیات کا اصلی فوٹو کھینچکر دکھانا اسی کا حصہ ہے۔ اگرچہ اور زبانوں
نے بھی اسکی تقلید کی۔ مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ۔ اکثر مقامات پر بھاکا کے اچھے
شاعر ہوے اور آفتاب بنکر چمکے، مثلاً تلسی داس، کبیر داس، اور انکے علاوہ اور
بہت سے سخنور، جادو زبان مشہور ہیں جن کے اشعار آج تک دلوں کی اقلیم پر
اپنا پورا تسلط کیے ہوے ہیں۔ بعض مقاماتِ ہند کو اس شاعری سے خاص
مناسبت تھی۔ پدماوت جو بھاکا میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف مانی جاتی ہے اُسکے
مصنف اودھ کی خاک سے پیدا ہوے۔ اور اس زمانہ میں کہ پیا (وزیر مرزا)
کی ٹھمریاں اور مختلف چیزیں جو مقبولِ عالم ہو رہی ہیں وہ بھی اودھ بلکہ خاص
لکھنؤ کے نواب زادے تھے۔ اس وقت تک اودھ کے قصبات و قریات میں عوام
کی زبان وہی ہے جو برج کی زبان (بھاشا) کہلاتی ہے۔ اس سے اس بات کا
ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان [illegible] ہونے سے قبل سرزمین اودھ
[illegible] اس بامزہ زبان اور شاعری

سے صرف آشنا ہی نہ تھے بلکہ اُن میں خاص اسکا مادہ اور ملکہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالسلطنت دہلی سے اُردو کی شاعری جب اودھ میں پہنچی تو اُردو کو اپنا رنگ جمانے اور پھولنے پھلنے میں کچھ دیر نہیں ہوئی۔ یوں تو اُردو کے قدم تمام مقامات پر پہنچے، اور اسکے قدموں کی برکت سے سرسبزی ہر طرف پھیل گئی، اور ایسی پھیلی کہ ہر ایک مقام کو نہال کر دیا، مگر لکھنؤ نے اس میں زیادہ حصہ لیا۔ یہ مضمون اسکا بھی ثبوت دیتا ہے کہ بھاکا اور اُردو چونکہ دو زبانیں نہیں ہیں تھوڑے سے تغیر سے بھاکا اُردو ہو گئی ہے۔ اگر اُردو شعر میں فارسی عربی کے الفاظ گھل مل کر شیر و شکر نہ ہوں تو وہ شخص جسکی زبان بھاکا ہے اس سے وہی لذت اُٹھائے گا جو ہم خالص بھاکا کی شاعری میں پاتے ہیں۔ بھاکا کی شاعری میں جن الفاظ سے ہم کو بیگانگی ہوتی ہے وہ دراصل ناگ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ ہیں۔ اس امر سے ہند کے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بھاکا کے لفظ لفظ میں قدرت نے شیرینی کے کوزے گھول دیے ہیں۔ اُردو کا جو شعر تڑپا دینے والا ہوتا ہے اُس میں غور کیجئے تو زیادہ تر وہی الفاظ ہوتے ہیں جو بھاکا سے لیے گئے ہیں۔ بھاکا کے اشعار میں الفاظ کی نشست اور ترکیب نرالی ہوتی ہے۔ اسکی ہی تشبیہ و مثل کی پھبن، اور ایجادوں کا بانکپن، فصاحت اور سادگی، اُس پہ طرہ شوخی، نئی نئی تشبیہیں، شگفتہ استعارے، خوش ادائی، خوش نمائی، صفائی کا رنگ، ظرافت کا ڈھنگ اِس زیورِ حُسن سے اور کوئی زبان آراستہ و پیراستہ نظر نہیں آتی۔ اسی مضمون کو اُردو میں ادا کیجیے تو وہ بات باقی نہیں رہتی اور تھوڑے سے الفاظ بھاکا کے بہت سے معانی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک حسینہ و جمیلہ اَلھڑ پنے سے بال کھولے ہوئے کوٹھے پر جا کھڑی ہوئی اور اُسوقت اُسکا جو عالم تھا خود اُسنے اُسے نظر کی اور اپنی اس ادا اور ناز سے خدا جانے کیا خیال اُسکے دل میں پیدا ہوا کہ شرمائی ہوئی آواز میں اُسکی زبان سے یہ الفاظ نکلے :۔

لٹ کھولے اٹریا پہ ٹھاری۔ مورے راجہ تُن پہ بیتی مارڈ ہیں۔

شبِ وصال کا خاتمہ او ... ، حسرت اُردو فارسی میں ہم رات دن کیا کرتے ہیں۔ مگر یہی مو ...

کس قدر پُر اثر کر دیا ہے۔ کیسا وہ اس بیان سے ٹپک رہا ہے :۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر و کہ بھور کبھو نہ ہوئے

ایک فراق زدہ جو مدت سے جمالِ یار کا ترسا ہوا ہے اُسکو اسکی اُمید نہیں کہ دوست سے ملاقات ہو۔ وہ قاصد بھیجنا چاہتا ہے مگر حسرتِ دیدار اُسپر ایسی چھائی ہوئی ہے کہ کوئی پیام اُسکے خیال میں نہیں آتا۔ وہ اپنے شوق سے مجبور ہو کر مرغِ نامہ بر کو مخاطب کرتا اور کہتا ہے :۔

کاگا نین نکاس دوں پیا پاس لیجا ہے

پہلے درس دکھائے کے پاچھے لیجو کھائے

ایک دُور اُفتادہ سراپا حسرت و ارمان آرزومندِ دیدارِ یار، جس کے پاس نہ پیام و سلام کا کوئی ذریعہ ہے نہ معشوق کا پتہ معلوم نہ اپنے آپ میں محبوب تک پہنچنے کی طاقت پاتا ہے، نہ اُسکے آنے کی اُمید، ہلال کو دیکھ کر جو آسمان پر نمودار ہوا ہے، اپنے مایوس دل کو یوں سمجھاتا ہے کہ ماہِ نو کو سارا جہان دیکھتا ہے۔ ضرور ہے کہ اسوقت میری طرح میرے معشوق کی نگاہ بھی اِسپر پڑ رہی ہوگی، تو گویا عاشق و معشوق کی نگاہیں یکجا ہو گئی ہیں۔ یہ بالکل نیا اور عجیب پُر لطف مضمون ہے :۔

آج چند ساں دوج ہے جگ چتوت چوندھ اور

مورے اور وا متر کے نین بھئے اک ٹھور

دُو دوہے اور ہم لکھتے ہیں جن میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں مضمون کی جدت طبیعت کو پھڑکا دیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ شاعری اسکا نام ہے :۔

مُکتا وا کے کان میں کہ کارن کنپا ہے

ترچھی چتون سے ڈرے کہ پھر نہ بیدھا جائے

مُکتا موتی۔ کہ کارن کس واسطے۔ کنپاے کانپتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ معشوق کے کان میں جو موتی لٹکتا ہے اُسکے کانپنے کا سبب کیا ہے کہ ترچھی چتون سے ڈرتا ہے کہ ایسا نہو میرے جگر کو برماے جیسا ایک بار بیدھا جا چکا ہے۔

دوسرا دوہا جو بہت مشہور ہے یہ ہے :-

امین ہلاہل مدہ بھرے سیت سیام رتنار

جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اکبار

امین آبِ حیات - ہلاہل زہر - مدہ شراب - سیت سفیدی - سیام سیاہی - رتنار سُرخی - اس میں لف ونشر دو صورتوں سے آیا ہے، اور تشبیہیں ایسی ہیں کہ گویا شاعر نے شاعری ختم کر دی - مصرعۂ اولیٰ کا لف ونشر یہ ہے کہ چشم معشوق میں جو سفیدی ہے وہ آبِ حیات ہے اور سیاہی زہر ہے اور جو سُرخی کی جھلک ہے وہ شراب کی مستی ہے - اب دوسرا لف ونشر اور مناسبات شاعری ملاحظہ ہوں - معشوق جسکو ایک بار دیکھ لیتا ہے تو بیاضِ چشم کے اثر سے جو آبِ حیات ہے وہ مرتا ہو تو جی اُٹھتا ہے، اور سوادِ چشم کے اثر سے جو زہر ہے مردہ کی کیفیت ہو جاتی ہے اور سرخی کے اثر سے جو شراب کی مستی ہے متوالوں کی طرح جھک جھک پڑتا ہے -

**شاد**

# کیا قدرت ظالم ہے؟

ڈاکٹر رسل والس اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "دُنیا ے زندگی" یعنے The World of Life میں حسب ذیل لکھتے ہیں "بہت سے آدمی جن کے خیالات اور معلومات اور درجے کے ہیں، کائنات کے اندر جان داروں کی مار دھاڑ دیکھ کر بہت رنج اور تکلیف محسوس کرتے ہیں، اور جب سے ارتقاے نامیہ (Organic Evolution) بذریعہ بقاے بہترین (Survival of the Fittest) قدرت کا قانون مسلم ہُوا ہے انکا درد اور زیادہ بڑھ گیا ہے، اور جانوروں کی مار دھاڑ اور آپس کی خونریزیا ایک راز سربستہ بن گئی ہے - ڈاروِن کے مسئلہ کی تشریح سے تعلیم یافتہ لوگوں پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ کائنات کے اندر وحشیانہ جانور ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں، زورآور کمزوروں کو ہڑپ کر جاتے ہیں، اور یہ معرکہ آرائی ترقی کا بہترین وسیلہ ہے، اور اسی کشاکش کی وجہ سے جان دار اپنے نواحی حالات کے مطابق اپنی حالت بنا لیتے ہیں جو ذی اعضا ہستیوں کی ترقی اور بہتری کے لیے بہا ضروری ہے"

یہ مسئلہ ہمیں اُسوقت معلوم ہُوا ہے جبکہ دُنیا میں انسانیت اور شایستگی ایک اعلیٰ مرحلۂ ترقی پر پہنچ گئی ہے، اور ہر قسم کی بیرحمی و خوں ریزی سے نفرت اور اپنے ہم جنس کو قتل کرنا گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے - یہ خیال بہت قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ قدرت ابتدا سے لیکر آج تک جان داروں کی بربادی پر قائم ہوا ہے یعنے زورآور جانور کمزوروں کی زندگی پر بسر اوقات کرتے چلے آتے ہیں - بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں سے پیٹ بھرتی ہے جسکی قابلیت اُسے قدرت نے عطا کر رکھی ہے اس خیال کی اس مسئلہ سے کیسے تطبیق ہو کہ اس عالم کا خالق قادرِ مطلق حکمت اور نیکی کا مصدر ہے - اہلِ مذہب اسے ایک راز، اور اہلِ مادہ اسے اپنے خیال کی تصدیق سمجھتے ہیں کہ "عالم آپ سے آپ پیدا ہوا ہے، اور کوئی ذی عقل ہستی اسکی خالق نہیں ہو سکتی"

مَیں نہیں جانتا کہ ڈاروِن نے اس مسئلہ پر کبھی غور کیا ہے - مگر وہ اپنی کتاب "اوریجن آف اسپیشیز" ("Origin of Species") کے اخیر میں لکھتا ہے :- "قدرت کے اندر ہر وقت خوفناک جنگ جاری رہنے قحط اور مری سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے جان دار پیدا ہوں" اسی کتاب میں ڈاروِن "جہد الحیوٰۃ" (Struggle for Existence) کے اخیر میں لکھتا ہے :- "جب ہم اس کشاکش پر غور کرتے ہیں تو ہمارے دل کو اس امر سے پوری تسلی حاصل ہوتی ہے کہ قدرت کی معرکہ آرائی مسلسل نہیں ہے [illegible] کہ جانوروں کو اس سے خوف [illegible] وحشت [illegible] نہیں ہوتی بلکہ انکی موت [illegible] اور [illegible] نصیب [illegible] معرکہ میں کامیاب

ہوتے ہیں"۔ پروفیسر آرتھر جے۔ ٹامسن (متعلقہ ایبرڈین یونیورسٹی) لکھتے ہیں: "ڈارون کے اصول کے رُو سے جانور جہد الحیوٰۃ سے آگے بڑھتے ہیں، اور بعض دفعہ اپنے ہم جنسوں کی نعشوں کو روندتے ہوئے اگلے مرحلہ پر پہنچتے ہیں۔ بعض دفعہ خون خواری کے ہجاوز سے، اور بعض دفعہ مکر وفریب اور خون ریزی سے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ آگے بڑھنے کی تمنا میں وہ اپنے ساتھیوں کو برباد کرنے میں دریغ نہیں کرتے"۔ ہکسلے نے کہا تھا "سبزی پر بسر اوقات کرنے والے جانوروں کی بشیار پشتوں کو گوشت خور ہلاک کرتے رہے۔ گویا دونوں بڑھاپے، بیماری، اور کثرتِ اولاد کی آفتوں کے تابع رہے"۔ اس قسم کی غلط بیانیوں کی وجہ سے جو اخبارات ورسائل میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں وہ ہیکل کے اس خیال کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ "عالم کا کوئی خالق نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ سے اسی طرح چلا آتا ہے اور جانوروں کی کشاکش باہمی اور مار دھاڑ کا سلسلہ غیر متناہی اور دائمی ہے"۔

مگر ان عالموں نے یا کسی اور عالم ارتقا نے کبھی اس مسئلہ کی اصلیت پر غور نہیں کیا ہے کہ دُکھ اور مار دھاڑ ارتقا کا کیوں ضروری جزو ہے اور یہ کہ عالم حیوانات میں دُکھ ایک خاص فائدہ اور مقصد سے موجود ہے، اس وجہ سے جان کی حفاظت کے لیے جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں ہوتا۔ ہم اسی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کریں گے لیکن اس امر کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جب جان دار پہلے پہل نمودار ہوے تھے تو کیا حالت تھی۔

اب سب سے پہلے ادنیٰ ترین قسم کے جان دار لو۔ مسٹر ڈبلیو۔ بی۔ ہارڈی نے پچھلے سال رائل انسٹیٹیوشن میں "زندگی کے طبعی اصول" پر بحث کرتے وقت تجربات کی بنا پر پیرامیسیم (Paramecium.) کی بابت بیان کیا تھا کہ وہ کتنی جلدی بڑھ جاتا ہے۔ یہ ننھا سا کیڑا ایک انچ ہوتا ہے۔ تین روز میں اس نوع کے اجرام کا شمار دوگنا ہو جاتا ہے۔ اسکی ایک سو پشتوں کی نشو ونما مشاہدہ کی گئی ہے۔ اگر حالات موافق ... اور پیرامیسیم ساڑھے تین سو پشتوں تک بڑھتا چلا جائے، جسکے لیے دو سال ... کہ ان کے رہنے کے لیے یہ عالم کافی نہ ہوگا۔

پیرامیسیم ایک سل والے نہایت ننھے جان داروں کا نمونہ ہے، جو "پروٹوزوا" (Protozoa) کہلاتے ہیں۔ ان ایک سل (Cell) والے جان داروں اور پودوں کی ہزاروں انواع موجود ہیں۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ جان داروں کی دنیا اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ بڑھتے چلے جائیں تو یہ کرۂ ارض ہزاروں قسم کے ننھے کیڑوں اور پودوں سے آباد ہو جائے اور پھر انکی جگہ رفتہ رفتہ اعلیٰ قسم کے جان دار پیدا ہوں جو ادنیٰ جانوروں پر بسر اوقات کریں گے اس سے ظاہر ہے کہ جب پہلے پہل نباتی سل ہوا کی کاربانک ایسڈ گیس اور پانی سے کاربن حاصل کرکے اسے پروٹوپلازم (Protoplasm) میں تبدیل کرنے کے قابل ہوئی تو پہلے حیوانی سل پیدا ہوے۔ اور نباتی حیوانی سلوں نے مختلف صورتیں اختیار کر لی ہونگی تاکہ پانی ایک نوع کے حصہ میں نہ آجائے اس سے اعلیٰ جانور پیدا ہونے سے رُک گئے۔ پس ظاہر ہوا کہ تغیر اور انتخاب (Variation and Selection.) شروع ہی سے ضروری ٹھہرا تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی ادنیٰ قسم کے جان داروں سے تمام عالم بھر جائے۔ چونکہ ادنیٰ جان دار شمار میں زیادہ بڑھتے تھے اسلیے ارتقاء کی رفتار زیادہ تیز رہی۔

زندہ ہستیوں کے ارتقا سے ظاہر ہے کہ ادنیٰ جان دار اعلیٰ جانوروں کی خوراک بہم پہنچاتے ہیں اور یہ سلسلہ عالم حیوانات میں جاری ہے۔ یہ قانون شان دار کامیابی کے ساتھ کائنات میں کامیاب رہا ہے کیوں کہ اسکا انجام "انسان" ہے، جو عالم حیوانات کی خوب صورتی اور گوناگونی کی قدر کرنے کے قابل ہے، اور اس سے اپنے حسب منشا کام لے سکتا ہے۔ عالم مادہ، عالم حیوانات، اور اقلیم عقل کی بابت جو چاہو خیال کرو، مگر اس نتیجہ سے ظاہر ہے کہ یہی طریقہ سود مند اور کارگر ہو سکتا ہے۔ اگر ہم وحدت الوجود (مادی) کے امیوں کے خیال کو قبول کریں کہ قدرت کی اندھی قوتوں کے عمل پیارینہ سے

انسان پیدا ہوا ہے تو بھی اُنکے خیال کے مطابق یہ ظاہر ہے کہ آزمائش اور خطا کی گذشتہ ابدیت سے انسان وجود پذیر ہوا ہے۔ اگر برعکس اسکے جیسا کہ میں مانتا ہوں، یہ عقل اعلیٰ کے مقررہ قانون سے وجود میں آیا ہے تو بھی یہ ظاہر ہے کہ یہی طریقہ بہترین ہو سکتا ہے جو بیشمار زمانوں کے دوران میں رائج رہا اور آخر کار ایک ایسا مخلوق پیدا ہوا جو اس طریقہ اور قانون کو کچھ سمجھکر اسکی قدر کر سکتا تھا۔ انسان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ اس عالم کے بھید اور اسکی وسعت کو سمجھنے میں ترقی کر رہا ہے۔ پھر کوئی محقق کیونکر یہ مان سکتا ہے کہ انسان اور باقیماندہ جانوروں میں صرف "درجہ" کا فرق ہے۔ یعنی یہ کہ وہ باقی حیوانات سے چند درجے بہتر ہے۔ جیسا جرمنی کا عالم ارنسٹ ہیکل فطرت انسانی کو دودھ پلانیوالے جانور کے مساوی مانتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عمل عالم ابتدائی ہستیوں، خاصیتوں، اور قوتوں پر مبنی ہے جس کے ظاہری نتائج "قوانینِ قدرت" کے نام سے موسوم ہیں اور ذی اعضا جان داروں کی دُنیا میں ان ہی سے ارتقا واقع ہوتا ہے۔ اسکا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کوئی عضو اور کوئی قوت جب تک اُسکی ضرورت نہ ہو پیدا نہیں ہوتی، اور نہ حس پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شروع میں جان داروں کی زندگی بہت کوتاہ ہوتی تھی اس لیے انکی حس بھی بہت ہی کمزور تھی، لہٰذا اُنھیں درد بھی بہت کم محسوس ہوتا تھا۔ چونکہ انکی زیست کا مقصد اعلیٰ تر جان داروں کی پرورش بنا تھا اس واسطے موت ان کے لیے تکلیف دہ نہ تھی۔ وہ اس سے گریز نہ کر سکتے تھے اور اُنکی ہستی کا مقصد بھی اس سے بچنا نہ تھا۔ اس وجہ سے موت راحت معلوم ہوتی تھی۔ پہلے کچھ گرمی کا احساس ہوتا پھر ہوش غائب ہو جاتے، اس طرح گویا "نیند اور فراموشی" سب کچھ غائب ہوگیا۔ دُکھ اور موت کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ اور زیادہ کامل ڈھیر کے جانوروں کی جان کی حفاظت ہو تا وقتیکہ وہ اپنی نسل پیدا کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو جان دار بڑے بڑے جانوروں کا شکار بنتے ہیں اُنکے اندر دُکھ درد کا احساس بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ ... بہت جلد بڑھتا ہے۔ گو چونکہ یہ اور جانوروں کی خوراک بنتے ہیں اس وجہ سے انکی آبادی بڑھنے نہیں پاتی، جب دوسرے جانور ان پر جھپٹتے ہیں تو انھیں بہت تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ انکی ہستی کا اصل مقصد دوسرے جانوروں کی خوراک بنا کر دردنا آشنا جان داروں میں آبی جان دار (مچھلیاں وغیرہ) بھی شامل ہیں۔ پھر حشرات الارض اور ملیکہ (جنکے بدن پر گھونگے یا چھلکے ہوتے ہیں) کیڑے، اور رینگنے والے اس طبقہ میں شامل ہیں۔ شروع میں بھی یہ تھے اور اب بھی ہیں جس سے درد تکلیف کا حلقہ بہت محدود ہوگیا ہے۔

بعض جانوروں کے ناخنوں اور پنجوں کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ انکے شکار کو بے حد تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ مگر نہیں۔ دانت اور پنجے چھوٹے جان داروں کو پکڑنے کے لیے قدرت نے عطا کیے ہیں۔ اس سے تکلیف کم ہوتی ہے۔ یہی اصول چھوٹے جانوروں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ قدرتی حالت میں انھیں حوادث سے کم تکلیف ہوتی ہے حالانکہ ہمیں بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ پرندے، چوہے، گلہریاں، وغیرہ جانور گر کر اپنے بازو اور اعضا نہیں توڑتے، وہ اپنی بساط سے آگے نہیں بڑھتے۔ ہاں البتہ بجلی، ژالہ باری، اور جنگلی آگ وغیرہ سے کبھی انھیں کچھ تکلیف ہوتی ہے، یا کبھی آپس میں لڑ مرتے ہیں۔ مگر جنھیں ایسے اسباب سے گزند پہنچتا ہے اُنکا شمار بہت ہی تھوڑا ہے اور اُنکے زخم بھی بہت جلد اچھے ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے اُنکا درد بہت قلیل ہوتا ہے۔

جو جانور بھاری بھرکم اور چلنے والے ہوتے ہیں اُنھیں درختوں اور چٹانوں کے گرنے، آتش فشاں پھٹنے، یا سیلابوں سے ضرر پہنچتا ہے مگر بالعموم بہت سے جانور ان سے بچ نکلتے ہیں اور بعض فی الفور مر جاتے ہیں، اس وجہ سے انھیں دُکھ بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے۔ البتہ جب جنگلی جانور آپس میں لڑتے ہیں تو انھیں سب سے زیادہ دُکھ پہنچتا ہے مگر یہ شاذ و نادر ہوتا ہے اور تکلیف بہت تھوڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ ... زنبور، ... اب ... وغیرہ زہریلے جانوروں سے ... گ ... ... لے زہریلے جانور ...

مینڈھک، چوہے وغیرہ بے ہوش ہو جاتے ہیں، انھیں درد نہیں ہوتا۔ یہ بات تجربہ میں آچکی ہے کہ شیر، بھیڑیے، جنگلی بلی، گیدڑ، چیتے، وغیرہ جن جانوروں کو ہلاک کرتے ہیں اُنھیں بہت تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ انکی جھپٹ سے شکار وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ تیز ناخن اور دانت سے نظام اعصاب کا تمام احساس مُردہ ہو جاتا ہے اس لیے درد نہیں ہوتا۔ جنگل کے درندے دوسرے جانوروں کو پیٹ پالنے کے لیے مارتے ہیں اپنا دل بہلانے کے لیے نہیں۔ جو آدمی شیر کے پنجے میں پھنس چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس قدر کم جسمانی یا ذہنی صدمہ محسوس ہوتا ہے۔ اپنی تیز حسوں کی بنا پر سب جانوروں کو ویسا ہی ذکی الحس سمجھنا سخت غلطی ہے۔ جس طرح اخلاقی اور ذہنی قوتوں میں انسان وحوش وطیور سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اُسی طرح وہ دُکھ درد کے احساس میں بھی اُن سے بالا و بہتر ہے۔ ہمیں درد اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہماری جلد پر چھلکے یا اور قدرتی حفاظت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے صدموں کی پیش بندی ہو سکے۔ بال اسکے اُسی وقت جھڑ گئے جب سے انسانیت کا جامہ پہنا، یعنی روح جسم کے اندر آئی۔ اس سے وہ بہت ذکی الحس بن گیا، اور اسی کی بدولت اُسنے تمدن میں ترقیاں کیں۔ عقل بھی اسی وجہ سے بڑھنے لگی۔ اس نے خود کو ہزاروں آفتوں کے درمیان پایا اور اُن سے بچنے کے لیے طرح طرح کی تجاویز اور اختراعات کیں جس سے شائستگی اور علوم و فنون میں اس قدر ترقی ہوئی ہے۔ وحشی اور شائستہ انسان کی حسّوں میں بھی بہت فرق ہے۔ سیّاح بیان کرتے ہیں کہ جن اذیتوں کو وحشی باشندے بغیر دَم مارے برداشت کر لیتے ہیں ہم اُنھیں عذاب سمجھتے اور اُنکی صورت سے بھاگتے ہیں۔ مثلاً مجرم سردار قبیلہ کے سامنے لایا جاتا ہے، مظلوم کے رشتہ دار آتے ہیں، یکے بعد دیگرے اُسکے ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ لیتے ہیں، مگر وہ چُپ چاپ ہے دَم نہیں مارتا۔

انسان کو دُکھ درد کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ مسئلہ ارتقا کے رُو سے یہ مانا جاتا ہے کہ زندگی قائم ر ... تبدیلیاں، خوبیاں اور لطافتیں رہی ہیں جو بہت قدر و قیمت رکھتی ...

ضروری شئے ہے جو ہمارے فائدہ اور بہتری کے لیے ہے۔ دوسرے حیوانوں کو اسکی ضرورت نہیں ہے، اس وجہ سے انکے درد کا احساس بہت گھٹیا درجے کا ہوتا ہے۔ یوں کہنا بجا ہوگا کہ اگر وحشی انسانوں میں مہذب آدمیوں کی نسبت روپیہ میں آنہ ڈیڑھ آنہ درد ہوتا ہے تو جانوروں میں وحشیوں کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔

اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ درد اور دکھ دنیا میں بہت تھوڑا ہے، اور جس قدر ہے وہ غیر ضروری نہیں ہے۔ دُکھ کا احساس جانوروں کو اتنا نہیں ہوتا جتنا انسان کو ہوتا ہے۔ جتنا چھوٹا کوئی جانور ہوتا ہے اُتنا ہی کم درد کا احساس رکھتا ہے۔ جب بڑے جانور چھوٹے جانوروں پر جھپٹتے ہیں تو اُنھیں درد بہت ہی کم محسوس ہوتا ہے۔ مگر ارتقائی عمل اور جانوروں کے طبعی نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ قادرِ مطلق، دانا، اور محبت کرنے والے خدا نے مخلوقات کو دُکھ درد میں پھنسا دیا ہے، سراسر غلطی ہے۔

ڈاکٹر والس "پیر فرتوت اقلیم سائنس" کی رائے پیچھے دی گئی ہے جس میں قدرت کے جور و ظلم اور بےرحمی کی حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔ اب ایک اور عالم مسٹر ہرسٹ کی شہادت پیش کی جاتی ہے:۔ "جو لوگ شیر، چیتے، سُوَر، ریچھ، وغیرہ کا شکار کھیلتے ہیں، اُنھیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ گولی کھائے اور جھلائے ہوئے درندوں کے چنگل میں پھنسے اور صحیح سلامت بچ گئے۔ انکا تجربہ اور خیال یہ ہے کہ نہایت رقیق القلب آدمی اسکے سوا اور کسی قسم کی موت کو پسند نہیں کر سکتا۔ اُس وقت کوئی دُکھ درد نہیں معلوم ہوتا۔" فزیالوجی کے ماہر خواہ اسکی کچھ اور وجہ بتائیں مگر اصل یہ ہے کہ خالق نے اپنے رحم و فضل سے جان داروں کے مرتے وقت کا دُکھ درد اِس طریقہ سے گھٹا دیا ہے کہ وہ درندوں اور تُند خو جانوروں کے ہاتھ سے ہلاک ہوتے اور انکی پرورش کا وسیلہ بنتے ہیں۔ گویا گوشت خور جانور غریب جان داروں کے لیے رحم دلی اجل کا ... دیتے ہیں۔"

چند سال ہوئے ڈاکٹر ہڈسن نے رائل کروسکوپکل سوسائٹی کے سامنے ایڈریس دیتے ہوئے فرمایا تھا:- "عالم حیوانات کے اندر کیسی راحت اور خوشحالی پائی جاتی ہے! وہاں آسایش، قناعت، خوشی، اور ایک شان نظر آتی ہے ان ننھے پتنگوں اور بھنگوں کو دیکھو کس دلربائی اور ادا کے ساتھ اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان کی حالت میں بے فکری، راحت، اور ایک شان نظر آتی ہے؛ گویا انھوں نے ابدی زندگی اور شادمانی کا قبالہ لکھوا لیا ہے۔ وہاں قدرت کے وسیع دسترخوان پر جو انکے لیے بچھایا گیا ہے، دھینگا مُشتی، سینہ زوری اور کشاکش نہیں ہوتی۔ وہاں ایک کو دوسرے کے ظلم و زیادتی کا خوف نہیں۔ وہ اپنے حسب منشا خوراک پھولوں اور پتّوں سے حاصل کرتے ہیں، اور مزے سے قدرت کے باغوں میں پھرتے ہیں۔ نہ بھوک کا غلبہ ہے، نہ دشمن کی مار دھاڑ کا خدشہ"

اور بہت سے علما کے خیالات قدرت کے ظلم اور انتظام الٰہی کی بے رحمی کے متعلق پیش کیے جا سکتے ہیں مگر ہمارے مطلب کے لیے یہی کافی ہیں۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کسی معاملہ کی اصلیت پر غور نہ کیا جائے حقیقت سے انسان بے بہرہ رہتا ہے، اور سطحی نظر رکھنے والے کی رائے معتبر سمجھنا سخت غلطی ہے۔

جے۔ آر۔ رائے

# داراشکوہ کے آخری ایام

تاریخِ ہند میں اکبر سے زیادہ ذی شہرت اور دلپذیر شخصیت کا شاید ہی کوئی بادشاہ گزرا ہو۔ اُسکو اپنے باپ ہمایوں سے وراثتاً ایک ایسی سلطنت ملی تھی جو مستحکم و منتظم ہونے کی اُمید سے کوسوں دُور تھی۔ شمالی ہند پٹھانوں کی چھوٹی چھوٹی لیکن پُر قوت سلطنتوں میں منقسم تھا، جن سے خدشہ تھا کہ اگر یہ باہم متحد ہو جائیں گی تو نوزائیدہ حکومت مغلیہ کا قلع قمع کر دیں گی۔ اس قسم کے نازک مواقع پر تمام موروثی سلطنتوں کی خوش قسمتی صرف ایک ایسے شخص کے پیدا ہونے پر منحصر ہوا کرتی ہے جس میں موقع و محل کے لحاظ سے تکمیل ضروریات کا مادہ موجود ہو۔ اکبر قدرتی طور پر ایسا ہی آدمی تھا۔ خوش نصیبی سے اُسکو غیر معمولی دل و دماغ مبدأ فیاض سے عطا ہوا تھا، جبکی اِن حالتوں میں عام طور پر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اُسنے اپنے فوجی جوہر کو سیاسی قابلیت کے ساتھ ترتیب دیا اور اُسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف اُسکی جنگی مہمات کا سلسلہ بیرونجات میں قائم رہا اور دوسری طرف اندرونِ ملک کے فتنہ و فساد کا قلع و قمع ہوتا رہا۔ قانونِ فرماں روائی کے اصول سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا اور اُسکی عاقلانہ حکومت کا یہ اثر ہوا کہ جو اقوام بزورِ شمشیر مفتوح ہوئی تھیں وہ بھی اُسکے زیرِ سایہ مطمئن و ساکت تھیں۔ اُس نے رشتہ مندانہ تعلقات کے توسط سے راجپوتوں کو حکومت کے استحکام میں دلچسپی لینا سکھائی اور اپنے آزادانہ خیالات اور معتدل حکمت عملی کے زور سے رعایا کے تمام طبقوں میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ مختصر یہ ہے کہ اُسکی سیاسی فراست کچھ ایسی تھی کہ اُسنے باشندگانِ ہندوستان کو، جن میں اختلافِ عقائد و مذاہب کی وجہ سے لامرکزی کا ایک عجیب عالم تھا، متحد و متفق کر کے ایک کر دیا۔ اور جسوقت اُسکا انتقال ہوا ہے تو اُسنے اپنے پیچھے ایک عظیم الشان سلطنت چھوڑی اور وہ بھی اسقدر مستحکم حالت میں، کہ اندرونی خرخشوں اور بیرونی حملوں کا خوف مطلق نہ تھا۔ اُسکے دو جانشینوں، یعنی جہانگیر و شاہجہان، نے محض اس وجہ سے امن کے ساتھ حکمرانی کی کہ وہ اپنے باعظمت پیش رَو کے نقشِ قدم پر چلنے میں نہایت سختی سے قائم رہے۔

حکمرانِ وقت کے آخری ایام کا اولاد کی بغاوت سے تلخ ہونا شاید خاندانِ تیموریہ میں کوئی بد دُعا تھی۔ شاہجہان نے بزمانۂ شاہزادگی اپنے باپ کے مقابلہ میں علمِ بغاوت بلند کیا اور اسکے عوض اُسے اپنے لڑکوں کے ہاتھوں اُس سے بھی [illegible] میں نہایت سخت بیمار ہوا [illegible] نے خیال کیا کہ

اسکا آخری وقت آگیا ہے، ہر ایک نے دہلی کی طرف کوچ کیا اور اس طرح بھائیوں میں حصول تخت کے لیے ایک خونریز جنگ کا پایہ پڑگیا۔

اُن ممالک میں، جہاں توریثِ سلطنت کے انضباط کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون نہیں ہے۔ بادشاہ وقت کی علالت یا وفات کا ثمرہ خانہ جنگیوں کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ متنازعہ فیہ جانشینی کی بیشمار مثالوں کا تاریخ سے پتہ چلتا ہو کہ کسی فردِ خاندان نے پہلے تو اپنی لیاقت، قوت، یا خوش قسمتی کی بنا پر حکومت کا درجہ حاصل کیا ہے اور پھر اس خیال سے کہ اس میں کوئی رخنہ انداز نہ ہو دوسرے تمام دعویداروں کو یا تو قتل کرا دیا ہے یا کوئی اور صورت اس خدشہ کے رفع کرنے کی نکالی ہے۔ محمد ثالث سلطان ترکی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُسنے اپنے انیس بھائیوں کو قتل کرا دیا اور اپنے باپ کی بارہ حرموں کو، جنکے حاملہ ہونے کا خیال تھا، دریا میں غرق کرا دیا۔ تاہم خانہ جنگیوں، خرابیوں کے ساتھ بھلائی کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے۔ ایک طرف اگر ان کے سبب سے اہلِ خاندان کو بربادی، تباہی، دائمی غلامی، یا موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف انھیں کے اثر سے عنانِ حکومت خاندان کے بہترین ولائق ترین رُکن کے ہاتھ آجاتی ہے۔ گویا "بقاے بہترین" کی تھیوری کی صداقت اُس سے آشکارا ہوتی ہے۔ سلاطین مغلیہ نے، جن میں بابر سے لیکر اورنگزیب تک شامل ہیں، ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ تک محض اس سبب سے شاندار حکومت کی کہ اُن میں سے ہر ایک نے جنگ آزمائی کے ذریعہ سے فیصلہ کر کے تخت پر قابو پایا تھا اور وہ اپنے ذاتی اقتدار کے زور سے تمام مدعیوں کی آنکھوں کے سامنے اُسپر قابض رہے۔ جب تک یہ انتظام قائم رہا، تاج اُسی سر کی زینت بنا رہا جو خاندان میں سب سے زیادہ فضیلت رکھتا تھا اور حکومت بھی انکے زمانہ میں نہایت عروج پر رہی۔ لیکن جب یہ طریقہ ٹوٹ گیا تو شاہنشاہی کا منصب کمزوروں کو ملنے لگا۔ حریص ندما اور خود غرض مصاحب، اپنی مصلحت کے مطابق جسکو چاہتے بادشاہ بنا دیتے تھے اور جسکو چاہتے تخت سے علیحدہ کر دیتے۔ قابل لیکن غیر انجام بیں کارپردازوں کے ہاتھوں میں بمنزلۂ کٹھ پتلی کے تھے انکا قدم تخت پر اُس وقت تک رہتا تھا جب تک کارپردازوں کی کوئی غرض اُن سے وابستہ ہوتی تھی اور اسکے بعد وہ اپاہج کر دیے جاتے تھے۔

سررشتۂ بیان ہاتھ میں لینے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ شاہجہاں کے چاروں بیٹوں کے خصائلِ ذاتی پر روشنی ڈالی جائے جنھوں نے جنگِ حصولِ سلطنت میں حصّہ لیا۔ چونکہ اس وقت ہمیں زیادہ واسطہ پہلے اور تیسرے بیٹے سے ہے اس لیے نسبتاً انھیں کے حالات زیادہ تشریح اور تفصیل کے محتاج ہیں۔ داراشکوہ جو سب میں بڑا تھا، اُسکی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ وہ خلیق، متواضع، بے تکلف، اور آزاد منش تھا۔ اُسکا تقرب سہل الحصول، اور اُسکی طبیعت معنی فہم واقع ہوئی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ تھا، اور اس لیے اُسکے تمام کاموں سے ذکاوت و شفقت کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ چستی، چالاکی، ہمت، اور جوش سے بھی وہ عاری نہ تھا اور بذاتہ وہ ایک دلیر آدمی تھا۔ کامیاب زندگی کا عادی ہونے کے باوجود جب اُسپر کوئی مصیبت آجاتی تو وہ بیدل نہ ہوتا۔ اور اگرچہ کسی صفت سبب الاسبابی کا قائل نہ تھا تاہم حادثاتِ زندگانی کو اُسی صبر و تحمل سے برداشت کرتا تھا گویا کہ تقدیر کا نوشتہ یہی تھا۔ پبلک لائف پر نظر کی جائے تو اُس میں بعض اوقات کی ترش مزاجی گاہے گاہے کی غضبناکی اور دائمی ضد اور غرور کا پتہ چلتا ہے۔ اُسے اپنی رائے پر اس درجہ بھروسا ہوا کرتا تھا کہ دوسروں کے مشورہ کو صبر و تحمل سے نہیں سُن سکتا تھا اور اپنے شناساؤں اور ماتحتوں سے عاجلانہ تعمیل حکم کا متوقع رہا کرتا تھا۔ اُسکے مزاج میں مہربانی اور ہمدردی انسانی بھی تھی۔ اُسکا غیظ تباہ کن نہیں تھا بلکہ تھوڑے وقفہ کے بعد اُسکا اثر بھی دل سے زائل ہو جاتا تھا۔ خانگی زندگی کے اعتبار سے اُسپر کسی پہلو سے کوئی الزام نہیں عاید ہو سکتا شفیق باپ، وفادار شوہر اور فرماں بردار اولاد کی سہ گونہ خوبیاں اُس میں موجود تھیں۔ شاہجہان کی سخت علالت کے زمانہ میں وہ اکثر ساری ساری رات تیمارداری کرتا رہا۔ جب یہ ہوا کہ اب بادشاہ کا اخیر وقت ہے تو وہ یقیناً

گریہ وزاری کرنے لگا۔ اسکی اشکباری مصنوعی نہ تھی۔ اسی طرح جب حالات میں تخفیف ہوئی اور بادشاہ سلامت کا مزاج کسی قدر رُو باصلاح پا یا گیا تو اُسکے چہرے سے آثار مسرت خود بخود نمایاں تھے۔ اور جب رات کو وہ اپنے بال بچوں میں آیا تو اُسکی صورت دن کی طرح مغموم وملول نہ تھی بلکہ خوشی سے چمک رہی تھی۔ اُسوقت اُسنے جو کچھ بھی کہا سُنا اُس سے غیر معمولی فرحت وانبساط کا پتہ چلتا تھا۔ اصولاً اگرچہ عیش وتفریح کا مخالف نہ تھا لیکن نیک کاموں سے بالطبع زیادہ رغبت تھی۔ اُسکے اوقات فرصت، بجائے اُن غارت گن عیاشانہ مشاغل کے جن کا اثر ہمارے مشرقی شاہزادوں کو ضعیف وبزدل بنا دیا کرتا ہے مطالعہ کتب میں صرف ہوتے تھے۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے دیکھیے تو دارا، اکبر کا متبع نظر آتا ہے۔ وہ ذی علم تھا اور آزاد خیال، وہ ہندوؤں کا دوست تھا اور یورپیوں کا ایک فراخ دل معاون، اسکے منتخب درباریوں میں یہ دونوں عنصر موجود تھے۔ اُسکی مصاحبت میں متعدد راجپوت رئیس رہا کرتے تھے اور کئی یورپین افسر اُسکے یہاں تعلیمات اور توپ خانہ کے عہدوں پر ممتاز تھے۔ تین واعظ مذہب جیسوئیٹ کے تھے ایک ان میں سے نیپلز کا باشندہ تھا جس کا نام مالپکا تھا۔ ایک پرتگالی، جیکز ڈی ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ملک فلینڈرس کا رہنے والا۔ ہنری بوزی تھا۔ جسکا ذکر فرانس کے مشہور ومعروف سیاح برنیر نے اس طرح کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسکا اثر شاہزادہ دارا پر جید تھا۔ برنیر ہی کا بیان ہے کہ شاہزادہ موصوف کے پاس ویدوں کے ماہر، چند برہمن رہا کرتے تھے۔ جنکو گراں قدر وظائف ملتے تھے۔ اُس نے کئی برہمنوں کو بنارس سے بلواکر، اُن سے اُپنشد کا فارسی ترجمہ کرایا اور کہا جاتا ہے کہ اُسکا مقدمہ خود دارا نے اپنے قلم سے لکھا تھا۔

یہ تمام باتیں صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ اُس نے اکبر کو اپنے سامنے نمونہ بنا کر رکھ چھوڑا تھا، اور کوشاں تھا کہ اگر اس سے آگے نہ بڑھ سکے تو کم از کم برابر ہو کر رہے۔ لیکن تقدیر کی نیرنگی عجیب چیز ہے کہ جن کٹر کی خصوصیات سے ایک سلطنت کو استحکام پہنچا انھیں کی بدولت دوسرے کو نہ صرف تخت بلکہ اپنی عزیز زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اسکی وجوہ تلاش کر لینا چنداں دقت طلب نہیں۔ اکبر نے اپنے نو ایجاد اور مجتہدانہ خیالات کا افشا اُسوقت کیا کہ تاج شاہی سر پہ زیب پا چکا تھا۔ برخلاف اسکے یہ دارا کی حماقت اور غیر انجام بینی تھی کہ تخت پر قابض ہونے سے پہلے ہی اُسنے اپنے جد کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھہرائی۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ اُسکا ایک خوفناک حریف، خود اُسی کے بھائی اورنگ زیب کی شخصیت میں موجود ہے۔ مسٹر کین کہتے ہیں کہ "حصول جانشینی سے پیشتر ہی اکبر کے رنگ میں ظاہر ہونے کی کوشش غیر مآل اندیشی کا نتیجہ تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے اپنی عزیز جان سے کنارہ کش ہونا پڑا۔"

شجاع جو بنگال کا صوبہ دار تھا، اپنے بڑے بھائی (دارا) سے کئی باتوں میں مماثلت رکھتا تھا لیکن وہ نسبتاً زیادہ فریس، خاموش طبع اور ۔ ۔ ۔ اپنے خیال واقع ہوا تھا۔ ہندو رؤسا و اُمرا کو رشوت دیکر اپنا بنا لینے کا گر اُسے خوب یاد تھا بلکہ اُسنے اپنے معاملہ میں ذی اقتدار ایرانی امیروں کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے شیعہ بن جانے میں بھی باک نہیں کیا۔ لیکن اُس میں ایک زبردست کمزوری تھی، وہ حرم کی عیاشانہ دلچسپیوں اور تفریحوں پر مٹا ہوا تھا۔ خوبصورت اور نیم برہنہ خواتین سے قصر عالی کی زیب وزینت بڑھانے میں اُسکا روپیہ اگر پانی کی طرح بہتا تو بھی وہ پروا نہ کرتا اور جب اُنکی صحبت میں شریک ہوتا تو اسکی حالت راجہ اندر کی سی ہوتی۔ رات رات اور دن دن بھر رقص وسرود اور شراب وکباب میں کٹ جایا کرتے تھے۔

اورنگ زیب، فرزند ثالث، دکن کا گورنر تھا۔ اُسکی کیفیت بالکل جداگانہ تھی۔ وہ بہادر بھی تھا اور سمجھدار بھی، مصیبت میں منتشر نہ ہوتا اور ہمیشہ تدابیر میں محو رہتا۔ عقائد وعبادات میں وہ یکتائی تھا۔ اوائل عمر سے اس میں زہد و اتقا کی صفات موجود تھیں اور وہ کہا کرتا تھا کہ مجھے دنیاوی جھگڑوں اور نمائشوں سے بیزاری ہے اور میری تو دلی تمنا ہے کہ مکہ معظمہ جاکر اپنی بقیہ زندگی خداوند کی عبادت میں بسر کروں۔ طبیعت کا خاموش لیکن متین تھا۔ شاہجہان نے اس کے متعلق

ایک دفعہ کہا تھا کہ اُسکا مزاج حد سے زیادہ شکی واقع ہوا ہے اور مشکل کوئی آدمی ہوگا جس پر وہ بھروسہ کرتا ہو۔ یہ پیشین گوئی غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوئی۔ اورنگ زیب نے کسی متنفس پر بھی اعتماد نہیں کیا۔ خفائے حقیقت میں اُسے کمال حاصل تھا۔ کرنل ڈو کہتے ہیں کہ

"انکار معمولی کاموں میں بھی اس کا قاعدہ عمل سکوت آمیز و میانہ روی اور ثابت بینہ تھا۔ تو ہمیشہ ملکی رازونیاز کی پردہ داری کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، اُسپر اورنگ زیب نہایت سختی سے قائم تھا۔ اسی کے زور سے اُس نے کمزور طبیعتوں کو دھوکہ میں ڈالا اور اسی مدد سے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی مغلوب کرکے اپنی عزت و احترام پر مجبور کردیا۔ انسانی ہمدردی اور رحمدلی کے وہ جذبے اگرچہ وہ مشہور نہیں ہے لیکن خونریزی میں بھی اُسے مزا نہیں آتا تھا۔ ہوا و ہوس البتہ اُسکا ایک محبوب جذبہ تھا اور اسی کی وجہ سے انکی ترجیحات جلدی زائل ہوگئی تھیں۔ جو لوگ اس کے ارادوں کے خلاف ہوتے انکی مخالفانہ آرا کے دبا دینے کا اس میں ایک خاص ملکہ تھا اور اُسکی شاطرانہ چالیں دشمن کے حق میں تلوار سے زیادہ خوفناک تھیں۔"

اگر کوئی چیز اورنگ زیب کے خصائل میں خصوصیت سے قابل ذکر نظر آتی ہے تو وہ یہ صفات تھیں۔ خوف کے وقت بردباری و اطمینان کا قائم رکھنا، دوسرے مذہب کے ساتھ اسکا مستقل اور ناقابل تغیر تعلق۔ ایک مرتبہ وہ ازبک قوم کے مقابلہ میں صف آرا تھا، دشمن اُسکو چار طرف سے محصور کیے ہوئے تھے، اتنے میں آفتاب غروب ہوا اور مغرب کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ گھوڑے سے اُترا اور نماز میں اس اطمینان سے مشغول ہوا گویا کہ جامع مسجد دہلی میں ادائے فریضہ کر رہا ہے۔ اس منظر کا اثر حکمران ازبک کے دل پر بہت پڑا اور بیساختہ اُسکی زبان سے نکل گیا کہ "ایسے آدمی سے لڑنا اپنے ہاتھوں ہلاک ہونا ہے"۔

عام اس سے کہ رقاصہ عورتوں کو تقاریب شاہی میں شریک ہونے کی ممانعت ہو، یا رقص و سرود کی بندش، جزیہ کا از سر نو رواج ہو یا ہندوؤں کی تکلیف رسانی یا اُنکے معابد کا انہدام، مختلف العقیدہ اور مے نوش بھائیوں کی تخت سے محرومی ہو یا شیعہ سلاطین دکن کے مقابلہ میں غیر مختتم لڑائیوں کا وجود، یہ تمام کام وہ محض اس لیے کرتا تھا کہ احکام شریعت کے مطابق ہیں۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ اُس نے کیوں نہیں اکبر کے غیرت پسند فلسفہ سے فائدہ اُٹھایا؟ یا جہانگیر کی سی خوش باشانہ، یا شاہجہان کی سی راحت بخش زندگی بسر کرنا کیوں نہیں قبول کیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ صرف اسی وجہ سے کہ اُسکو اپنے ضمیر کے خلاف کوئی فعل کرنا گوارا نہ تھا۔ اورنگ زیب کے حقیقی کیرکٹر کی منزلت دریافت کرنے کا محض یہی ایک راستہ ہے ورنہ کسی اور معیار سے اُسکو جانچنا گویا نہ جانچنے کے برابر ہے۔

مراد جو اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، گجرات کا صوبہ دار اور طبعاً خوش مزاج اور جلد باز تھا۔ کام کی طرف زیادہ رغبت نہ ہونے سے وہ اپنا وقت زیادہ تر لہو و لعب میں کاٹتا تھا۔ وزرا کے ساتھ سازش کرکے کامیاب ہونے کے عوض وہ شجاعت و مردانگی سے مطلب برآری کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ہنسی اور مذاق میں وقت گذاری کرتا اور سمجھتا کہ اوقات عزیز اچھے کٹ رہے ہیں۔ میدان جنگ میں وہ ایک خوفناک چیز تھا۔ اچھے اچھے جنگ آوروں میں اُسکا شمار ہوتا تھا۔ اُسکا بیان تھا کہ "تخت سلطنت کا باپ کی عنایت یا حق وراثت کے وسیلہ سے حاصل کرنا ایک عالی وقار شہزادے کے شایان شان نہیں، اور اگر بھائی نے سلطنت کے لیے تیغ آزمائی کا سامان نہ کیا ہوتا تو میں اُسکی طرف رُخ بھی نہ کرتا"۔

یہ تھے تخت شاہجہانی کے حریف، اُس موقع پر کہ بادشاہ سلامت کی علالت نے قصر شاہی کے بھرے ہوئے ہوائے سلطنت کے آتشگیر مادہ میں گویا آگ لگادی، جس کی وجہ سے آخرکار اسکے شعلے سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشتعل ہوگئے۔

سنہ ۱۶۵۶ء سے بعض ایسے مصائب کا آغاز ہوا جسکی نظیر زمانہ گذشتہ میں

ملہ یہ ضرور نہیں کہ ان باتوں کے بعض نتائج فی مسائل اور معاندانہ آرا سے جنکا اظہار جا بجا ہوا ہے مترجم کو بھی اتفاق ہو۔

نہیں تھی۔ پہلی مصیبت، جس کی وجہ سے سلطنت مغلیہ کو ناقابل تلافی نقصان اُٹھانا پڑا، وزیر اعظم سعد اللہ خاں کا واقعۂ ارتحال تھا۔ یہ ایک ہندو نو مسلم تھے، اور انکی نسبت یہ عام خیال تھا کہ عہد اکبری کے بعد سلطنت کو انکا سا نائب اور مشیر مدبر نہیں نصیب ہوا۔ ٹھیک بارہ مہینہ کا عرصہ منقضی ہونے پایا تھا کہ علی مردان خاں کا انتقال ہوگیا، یہ ایرانی اُمرا سے تھے۔ انھوں نے بزمانۂ جنگ و بحالت امن سلطنت کی نمایاں خدمات کی تھیں۔ دہلی کی مشہور نہر انھیں کی تعمیر کردہ ہے جس کے سبب سے انکی ایک دائمی اور تشکر آمیز یادگار دلوں میں مدت العمر قائم رہے گی۔ ان واقعات پر طرہ یہ کہ خود بادشاہ سلامت کا مزاج اُسی سال (۱۶۵۷ء) اگست کے مہینہ میں ناساز ہوگیا۔ جگر وہ کی یکایک بیماری کے ساتھ حبس بول کی شکایت پیدا ہوگئی تھی، جسکے باعث سے وہ بیٹھنے اُٹھنے سے بالکل معذور ہوگیا اور حالت اس درجہ نازک ہوتی گئی کہ زندگی کے آثار مفقود ہوگئے" (کرنل ڈو) ایسی حالت میں انصرام مہمات حکومت کی گراں بار ذمہ داری قدرتی طور پر دارا شکوہ کے سر پڑی تھی۔ کاروبار سلطنت کی انجام دہی کے علاوہ بادشاہ سلامت کی تیمارداری بھی کرنا پڑتی تھی اور یہ آخری فرض وہ غایت درجہ کی پسرانہ محبت کے ساتھ ادا کیا کرتا۔ بادشاہ کی طبیعت قدرے رُو با صلاح ہونے کے بعد دارا کے ساتھ اُسکی محبت اور زیادہ بڑھ گئی جسکا ثبوت کئی صورتوں میں دیا گیا۔ شصت ہزاری منصب ملا، ۱۵ لاکھ کے جواہرات، ۲۰۰ راس اسپ عربی، متعدد ہاتھی معہ مغرق جھولوں کے مرحمت ہوئے، ۳۰ لاکھ کی جاگیر عطا کی گئی، شاہ بلند اقبال کے خطاب سے سرفراز ہونے کے علاوہ بادشاہ سلامت کے حضور میں طلائی کرسی پر بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو خاندانِ شاہی میں کسی اور کے حصہ میں نہ آیا تھا۔ فرمان جاری ہوا کہ احکام سلطنت دارا شکوہ کے دستخط سے جاری ہوا کرینگے۔ شاہجہان کہتا تھا کہ "جو شخص اپنے عمر باپ کی زندگی کو تخت ہندوستان کے مقابلہ میں قابل ترجیح سمجھے اُسکی سعادت مندانہ روش کا بدلہ دینا غیر ممکن ہے۔" غرض کہ اسی طریقہ سے گویا بادشاہ سلامت نے اپنے قول و فعل سے دارا کے ولیعہد ہونے کا اظہار اہل دربار کے سامنے کر دیا تھا۔ اور اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ دارا کے فرزند مہین سلیمان شکوہ کو منصب دہ ہزاری مرحمت کیا اور پسر ثانی سپہر شکوہ کو صوبۂ بہار کی گورنری پر ممتاز کیا۔ جسونت سنگھ، جو دارا شکوہ کے مقربین میں تھا، اُسکے اعزاز و منصب میں بھی مناسب اضافہ کیا گیا۔

بادشاہ سلامت کی علالت نے سلطنت کے اندر ایک غیر معمولی ہلچل پیدا کردی تھی دارا اس کوشش میں تھا کہ یہ خبر دور دراز مقامات میں نہ پھیل سکے۔ خبر رسانی کا سلسلہ بالکل بند کردیا، مشتبہ خطوط کے روکنے کا بندوبست ہوا، جن عہدہ داروں پر دور دست صوبجات میں پیغام رسانی کا شبہہ ہوا وہ نظر بند کردیئے گئے۔ ہر سہ شاہزادگان (شجاع، مُراد، اورنگزیب) سے رسل و رسائل کی ممانعت اور اسکے خلاف عمل درآمد کرنے والے کے لیے سزائے موت قرار دی گئی۔ اُنکے متوسلین جو دربار میں تھے وہ قید اور انکے متعلق جتنے کاغذات اور احکام تھے وہ سارے کے سارے ضبط ہوگئے۔ حکم جاری ہوا کہ افواج شاہی نبرد آزمائی کے لیے کیل کانٹے سے تیار رہیں۔ اسکے بعد جو کچھ وقوع میں آیا اُس کا انکشاف برنیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

مغل کی علالت نے تمام ممالک محروسہ کو خوف و مضطرب کردیا۔ دارا نے آگرہ اور دہلی میں جو حکومت کے ممتاز شہروں میں تھے، زبردست فوجی جمعیتیں اکٹھا کریں۔ بنگال میں سلطان شجاع کی جانب سے اسی قسم کی تیاریاں غایت زور و شور سے عمل میں آئیں۔ اورنگزیب دکن میں تھا اور مراد گجرات میں۔ ان دونوں نے بھی بقدر حاجت فوجی اجتماع کا انتظام کیا۔ چاروں بھائیوں نے اپنے اپنے یاروں اور مددگاروں کو اپنے گرد جمع کیا۔ خطوط لکھے گئے، وعدے وعید ہوئے، اور اس طرح مختلف اوضاع کی سازشیں مرتب ہوگئیں۔ بعض خطوط جو انھیں ہاتوں سے تعلق رکھتے تھے دارا نے ہاتھ [illegible] پیش کرکے

[illegible]

بادشاہ کی طبیعت دائرۂ اعتدال سے پھر متجاوز ہونے لگی اور یہ خبر مشہور ہو گئی کہ بادشاہ سلامت نے انتقال کیا۔ اہلِ دربار میں پریشانی کا عجیب عالم تھا۔ آگرے کا طبقۂ عوام حواس باختہ ہو رہا تھا۔ کئی دن تک دوکانیں مقفل بند رہیں [illegible] اس شاہزادگانِ والا تبار نے گویا یہ اعلان کر رکھا تھا کہ باہمی اختلافِ عظیم کے تصفیے کے لیے ثالث بالخیر کا کام تلوار دیگی۔ سو وقت مصالحت باہمی یا تنازعِ خصومت کا موقع حقیقۃً قدرت سے نکل جا چکا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے تو تیغ سے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات تھی کہ [illegible] سلطنت زندگی [illegible] بازی تھی جس میں سوائے "سلطنت" یا "موت" کے کوئی تیسرا درجہ ہاتھ آنے والا نہ تھا۔

باوجودیکہ دارا نے حفظ ماتقدم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، تاہم صورت معاملات چھپانے نہ چھپ سکی۔ بادشاہ کی وفات کی خبر آتش مشتعل کی طرح پھیلی اور دور دراز مقامات میں پہنچ گئی۔ شجاع نے سب سے پہلے بہار کی طرف پیش قدمی کی اور آگرے کی طرف کوچ کر دیا۔ دارا نے وقت کو ضائع نہیں جانے دیا۔ بلکہ شاہزادۂ سلیمان کو بمعیت راجہ جے سنگھ والیِ امبیر بعجلت تمام شجاع کی مزاحمت کی غرض سے روانہ کیا۔ شجاع کو جو بالکل عالمِ بیخبری میں تھا شکست فاش حاصل ہوئی اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔ راجہ جسونت سنگھ کی ماموری بہمراہی قاسم خاں، مراد کے مقابلہ پر ہوئی تاکہ اسکی جمعیت، دکن والے چالاک و شاطر بھائی کی فوج سے متحد نہ ہونے پائے۔

اورنگ زیب یکایک میدان میں نہیں اترا۔ بلکہ اُسنے سب سے پہلے اپنی تمام اعلیٰ دماغی قوتوں سے اپنی پوزیشن کو مستحکم اور اپنے حربہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ آگرے میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے اُنکی رتی رتی خبر اُسکے ماموں شایستہ خاں اور بہن روشن آرا کی معرفت اُسے پہنچتی رہتی تھی۔ جس شخص سے دارا سب سے زیادہ خائف تھا وہ اورنگ زیب کی ذات تھی۔ اور اسی لیے اُسنے کوئی سعی، جس سے مؤخرالذکر کو صدمہ پہنچنے کی خفیف سی بھی امید تھی، اٹھا نہیں رکھی۔ اُسنے بادشاہ کے نام سے میر جملہ اور دیگر افسر[ان]

کہ وہ فوراً دارالخلافہ کو روانہ ہو جائیں۔ آگرے میں شایستہ خاں کی بُری گت بنائی گئی۔ اور عیسیٰ بیگ، جو دربار شاہجہانی میں اورنگ زیب کے وکیل کی حیثیت رکھتا تھا اُسکے ساتھ بدسلوکیاں کی گئیں۔ امین پسر میر جملہ کو نظر بند کر دیا گیا۔ اورنگ زیب کو، جو میر جملہ ایسا مدبر ہنرمند و ذی اثر سپہ سالار ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا، اس موقع پر ایک پُرفریب طرزِ عمل اختیار کرنا پڑا۔ اُسنے نمایشی طور پر میر جملہ کو مقید کر دیا۔ اس سے اتنا تو ضرور ہوا کہ دارا کے پاس اب کوئی معقول بہانہ میر جملہ کے اہلِ خاندان سے توہین کرنے کا باقی نہ رہا۔

یہ سیاسی حکمتِ عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ اور اس طرح میر جملہ کی فوج کے ساتھ اُسکی دماغی قوتیں بھی اورنگ زیب کے تصرف میں آ گئیں۔ اُسکی برافروختگی کا سامان دارا کی جانب سے پورا پورا ہوا تھا لیکن اورنگ زیب، صبر و تحمل سے کام لے کر، دارالسلطنت کی طرف، نہایت خاموشی سے اس طرح روانہ ہوا کہ کسی کو اُسکے منشا کی اطلاع تک نہ تھی۔ شجاع و مراد کو اُسنے اپنے حال پر چھوڑا کہ علانیہ مخاصمت کے نتیجے بھگتیں اور دارا سے جنگ آزمائی کرکے اپنی متفرق قوت کو اور کمزور کریں۔ البتہ وہ اسکے بعد اس تدبیر میں ضرور تھا کہ مراد کو اپنے حصول مطلب کا ذریعہ گردانے۔

اُس نے نہایت مؤثر و محبت آمیز لہجہ میں اُسے خط لکھا جس میں تخت نشینی کی مبارکباد دیتے ہوئے تحریر تھا کہ میں تمھاری مدد کو ہر وقت موجود ہوں۔ آخر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جب تختِ سلطنت تمھارے قبضہ میں آ جائیگا تو اسکے بعد میری اور کوئی خواہش سوائے اسکے نہ ہوگی کہ دنیائے ناپائدار سے کنارہ کش ہو کر بیت اللہ ہجرت کر جاؤں، اور وہاں اللہ اللہ کیا کروں۔ اُسکی یہ تمام باتیں اس قدر بناوٹی اور پُرفریب تھیں کہ سوائے مراد کے جو ذاتی طور پر فراخ دل ہونے کے علاوہ دوسروں کو بہ نگاہ شک دیکھنے کا مطلقاً عادی نہ تھا، اُنکا یقین کسی کو مشکل آتا۔ اُسی خط میں ایک جگہ لکھا تھا کہ "دارا لامذہب ہے اور شجاع بے دین، اور اس لحاظ سے یہ دونوں حکمرانی

کے قابل نہیں۔ اپنے متعلق لکھا تھا کہ میں نے بہت دنوں سے اپنے آپ کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کر رکھا ہے، میری صرف یہ خواہش ہے کہ اطمینان قلب کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہوں۔ تاہم اپنی عاجزانہ امداد کے ساتھ تمہاری معاونت کو ہر وقت آمادہ ہوں کہ عصائے شاہی تمہارے ہاتھ میں آئے، جو اہلِ ہند نے اپنی متفقہ خواہشات کی بنا پر پہلے ہی سے تمہارے لیے رکھا ہے۔ اسکے بعد اگر تم سے ہو سکے تو میرا خیال کرنا اور میرے لیے انتظام کر دینا کہ کنج عزلت میں بیٹھکر زندگی کے چند انفاس عبادت و ریاضت میں گذار دوں۔"

غیر قرین قیاس ہے کہ مراد کو اس قسم کے ناقابل اعتبار بیان کا یقین آ گیا ہو لیکن اس شاطرانہ چال پر ایک لاکھ روپیہ نقد ہدیہ کا بہت بڑا اثر ہوا تھا جو اورنگ زیب نے اپنے صادقانہ جذبات کے ثبوت میں بطور پیشکش بھیجا تھا۔ غرضکہ اس طرح سادہ لوح مراد کے حلق سے یہ تلخ دوا، جسکی طلائی آب و تاب دلکشی کی شان رکھتی تھی، اُتار دیگئی۔ اور مراد نے اسکے جواب میں لکھ بھیجا کہ وہ مع اپنی فوج کے اورنگ زیب کا ساتھ دینے اور احمد آباد کی طرف کوچ کرنے پر ہمہ تن تیار ہے۔

مارچ ۱۶۵۸ء کے آخر میں اورنگ زیب برہان پور سے چل کر نربدا کنارے خیمہ زن ہوا، جہاں چند دنوں کے بعد مراد بھی اُس سے آ ملا۔ اس جگہ انھیں یہ معلوم کر کے حیرت و استعجاب کے ساتھ مایوسی کا بھی سامنا کرنا پڑا کہ جسونت سنگھ بعد فتح اُجین، انکی مزاحمت کے لیے موجود ہے۔ اگر راجہ جسونت سنگھ نے غنیم کی فوج پر اُسی روز حملہ کر دیا ہوتا جس دن وہ لبِ نربدا اُتری تھی تو چونکہ تکان سفر سے وہ ماندہ و شکستہ ہو رہی تھی اس لیے بہت آسانی سے اُسکو ہزیمت دے سکتا تھا، لیکن اُسکے اندر راجپوتی غرور و تبختر کا اس درجہ اثر تھا کہ اُسنے ایک ہی وقت میں دونوں شاہزادوں کی متحدہ افواج کو شکست پہنچانے کا ارادہ کیا اور اس طرح ایک کامیاب حملے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسی اثناء میں اورنگ زیب نے کچھ ایسا کیا کہ افواجِ شاہی میں مخالفت باہمی کا بیج بو گیا اور اُسنے قاسم خاں کو یہ کہہ کر کہ ہم مذہبوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو

بجائے خود کفر ہے، اپنی طرف توڑ لیا۔ پہلا مقابلہ شاہی رسالہ سے ہوا لیکن اسے شکست ملی۔ اسکے بعد راجہ جسونت سنگھ نے اپنے بہادر و شجاع راجپوتوں کو لے کر حملہ کیا اور باقی تمام فوج معرکۂ کارزار سے کنارہ کش رہی۔ عین اُسی وقت مراد میدان جنگ میں اُترا۔ اور قاسم مع دوسرے مسلمانوں کے راجہ جسونت سنگھ سے علیحدہ ہو کر ادھر چلا آیا اور غریب راجپوتوں کو خوں ریز لڑائی کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اُنھوں نے نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ اٹھارہ ہزار میں سے صرف ۶۰۰ جانیں باقی رہ گئیں۔ جسونت سنگھ کو اس ہزیمت سے اس درجہ انفعال ہوا کہ وہ اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

اس جگہ ایک موثر واقعہ کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہا جا سکتا جسکا تعلق روایات راجستان سے ہے۔ جس وقت راجہ اپنی عفت مآب و باغیرت رانی کے پاس پہنچا تو موخرالذکر کو اسکی شکست کی پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی لیکن اُسنے بجائے اسکے کہ راجہ کی مع الخیر واپسی پر خوش ہوتی یا تسکین و تشفی آمیز کلمات کہہ کر اُسکو ڈھارس دیتی، محل کے پھاٹک بند کرا دیے اور کہنے لگی کہ میں ہزیمت خوردہ شوہر کا مُنہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ راجہ نے کہلوایا کہ اگرچہ مجھے شکست ہوئی ہے لیکن اسلاف کی بہادری کا نمونہ میں نے لڑائی میں دکھا دیا ہے، جسکی شہادت مقتولین کی تعداد سے مل سکتی ہے۔ لیکن رانی نے اسکو قبول نہیں کیا بلکہ اُسنے جواب میں کہا کہ

مرنے والے تو مر گئے اور شکست کھانا بھی راجوں مہاراجوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں لیکن شکست کھانے کے بعد بھی زندہ رہنا البتہ نئی بات ہے۔ خواہ کسی طرف سے اور اس لحاظ سے بھی کہ جسونت کو اُن باعظمت بزرگوں کے گھر میں داماد بن کر آنے کی عزت حاصل ہوئی تھی اُنھوں نے گویا اپنے ناموس کا کفیل جسونت کو بنا دیا تھا لیکن اُس کے میدان جنگ سے بھاگنے کی وجہ سے اُس پر تمام پانی پھر گیا اب میرے شوہر کا صرف کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنی فوج کی ہزیمت کی داستان لوگوں کو خود سنائے اور لوگوں کو بتائے کہ گویا وہ [illegible] ... لیکن اب میرا خاوند ہر کہاں وہ وہ سنگھ میرے [illegible] اب ہمیشہ کو

مرگیا۔ راجاؤں کی زندگی، عظمت، شہرت کے ضائع ہو جانے کے بعد قائم نہیں رہتی۔

شجاعت و دلیری کے متعلق یہ عظمت اور قابل فخر جذبات تھے جو اس راجپوت خاتون کے دل میں جاگزیں تھے! راجہ نے آخرش اقرار کر کے رانی کو پھاٹک کھولنے پر راضی کیا کہ وہ ایک نئی فوج مرتب کر کے گنوائی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کریگا۔ مسٹر ایلفنسٹن یوں فرماتے ہیں کہ

رانی کا راجہ سے بالآخر راضی ہو جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ چتوڑ کے غیور خاندان کی لڑکی ہونے کے باوجود وہ پھر بھی عورت ذات تھی۔

جسونت سنگھ کی شکست سے دارا نہایت غضبناک ہوا۔ اس نے باپ کے مشورہ پر کان رکھا نہ سلیمان کا انتظار کیا۔ بلکہ بذات خود مقابلہ کے لیے فوج لیکر، جس کی تعداد اور جس کا تزک و احتشام گویا اس امر کی ضمانت تھی کہ اسکے آگے کوئی نہ ٹھہر سکے گا، دریائے چنبل کے کنارے پر وارد ہوا۔ اورنگ زیب اس سے پہلے ہی اس دریا کو پار کر چکا تھا۔ شاہی چوکیاں وہاں تعینات تھیں لیکن غدار شایستہ خاں نے دو رہبر ایسے بھیج دیے تھے جن کی رہنمائی میں اورنگ زیب پہاڑیوں میں سے ہوکر ایک غیر معروف راستہ سے نکل گیا۔ برنیر کے قول کے مطابق چمپٹ کو جو اس ملک کا راجہ تھا رشوت دیکر اس امر پر راضی کر لیا گیا تھا کہ وہ شاہزادے کو ندی کے پایاب حصہ سے گزر جانے دے مختصر یہ کہ اس طریقہ سے ہندوستان کے آیندہ شاہنشاہ نے ندی کو طے کیا اور یلغار کرتا ہوا آگرے کی طرف بڑھا۔ دارا نے نہایت جانکاہی اور مشکل کے بعد اسکو روک کر طرح جنگ ڈالنے پر مجبور کیا۔ ۷۔ جون ۱۶۵۸ء کو بمقام سامو گڑھ۔ جو آگرے سے بجانب جنوب مشرق چند میل کے فاصلے پر واقع ہے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا[۵]۔ آگرے کی سی فرمایشی گرمی پڑ رہی تھی اور تپش کی یہ شدت تھی کہ تمازت آفتاب سے آدمیوں کی جان نکل رہی تھی۔ اس اثنا میں شاہجہاں نے ولیعہد (دارا) کو متعدد مرتبہ لکھا کہ سلیمان کے پہنچنے تک جنگ ملتوی رکھی جائے۔ لیکن دارا کے جوابات سے اسکی غیر ضروری عجلت اور ناعاقبت اندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ غیر مآل اندیش شاہزادے نے لکھ بھیجا کہ تین دن کے اندر میں اپنے باغی بھائیوں کو پا بزنجیر و دست بستہ حضور میں آخری فیصلہ کے واسطے لاکر پیش کرتا ہوں۔ اور اس عریضہ کی روانگی کے بعد اس نے جنگ کا انتظام شروع کر دیا۔

باقی دارد

# فلسفۂ اخلاق

انسان کو کھانا کھانے کی خواہش نہ پیدا ہوتی اور وہ بھوک سے بیتاب نہ ہو جاتا تو یہ خیال کہ غذا جسم انسان کی پرورش کے لیے ضروری ہے، کبھی انسان کو جسم کی نگہداشت اور بدل ما یتحلل مہیا کرنے کی طرف مستعدی سے رجوع نہ کرتا، اور انسان کا جسم روز بروز نحیف ہوتا جاتا۔ اگر ماں باپ کو بچہ کی محبت فطری نہ ہوتی اور وہ ایک بیکس بچہ کی پرورش پر طبعاً مجبور نہ ہوتے تو صرف اس خیال سے کہ نسل انسان کی حفاظت دنیا کی آبادی اور رونق کا موجب ہے، غریب اور بیکس بچوں کی پرورش و حفاظت کی تکالیف اور مصارف بہت کم برداشت کرتے۔ اور شاید نسل انسانی دنیا میں باقی نہ رہتی۔ اسی طرح اگر انسان کی تمام حاجتیں صرف سمجھ اور عقل کی خبرگیری ہی پر منحصر ہوتیں اور علم و دولت، آزادی و شہرت، دوست و احباب کا حاصل کرنا فقط اسی کے ایما سے ہوتا تو انسان کی زندگی طرح طرح کی مشکلوں اور پیچیدگیوں کا جال بنجاتی لیکن قدرت کا قانون اس سے بالکل جدا ہے۔ قدرت نے انسان کے دل میں خواہش

---

[۵] آگرہ۔ اگر سامو گڑھ وہی مقام ہے جس کو مسٹر بنٹ نوٹ مضمون اصل اب فتح آباد کہتے ہیں تو اسکا آگرہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہونا از روئے جغرافیہ غیر صحیح ہے۔ فتح آباد آگرہ سے چند میل کے فاصلہ پر البتہ واقع ہے۔ ... حسب معمول ... جغرافیہ ہی پر ... ہوا۔ (مترجم)

پیدا کی ہے جو اُن تمام اشیا اور حالتوں اور کیفیتوں کو طلب کرتی ہے جو انسان کے لیے ضروری اور نافع ہیں اور خواہش انسانی سے وہ کام لیتی ہے جس سے وہ اشیا یا وہ حالتیں اور کیفیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جس قدر زیادہ اہم کام ہو اُسی قدر قوی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اسی قدر زائد اُس کے حصول سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس سبب سے خوراک، مکان، لباس اور ضروریات کا مہیا کرنا یا تمدن کی طرف مائل ہونا انسان کسی عقل کی پیروی یا مصلحت اندیشی سے نہیں کرتا بلکہ خواہش فطرتی اُس سے ان تمام کاموں کا سرانجام کراتی ہے۔ بقائے نسل کی خواہش انسان میں اس قدر قوی ہے کہ اسکی تعمیل انسان بہ اتباع عقل و دور اندیشی کرنا تو درکنار اکثر خلاف عقل و مصلحت بھی کر بیٹھتا ہے۔ اسی طرح دولت جمع کرنے کی خواہش بخیلوں میں مآل اندیشی کی راہ سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اُن نتائج اور فوائد کو بھی جو دولت سے حاصل ہونے چاہییں دولت جمع کرنے پر قربان کر دیتے ہیں، اور اُس سے کوئی حقیقی نفع نہیں اُٹھاتے۔ اسی طرح انسان کی تحریکات طبعی اُسکی صحت و بقائے جسم کی رہنمائی کرتی ہیں، اور تحریکات سے وہ تعلقات پیدا ہوتے ہیں جن پر انسان کی دنیوی راحت اور حفاظتِ جان و مال منحصر ہے۔ منزل اور شہر کا انتظام باضابطہ اور باقاعدہ رکھنے کے لیے ضرور ہے کہ لوگوں کا چال چلن ایسا عمدہ اور منصفانہ ہو کہ وہ دوسرے لوگوں پر ظلم و زیادتی نہ کریں، اور جس طرح اپنے حقوق اور فوائد کا خیال مدنظر رکھتے ہیں اُس طرح دوسروں کے حقوق اور فوائد کا بھی خیال کر کے اُن کو پامال نہ کریں تاکہ سررشتۂ انتظام تمدن جس پر اسکی بہبودی کا انحصار ہے باہمی برتاؤ سے درہم برہم نہ ہو جائے۔ اس ضرورت نے انسان کی طبیعت میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کی خواہش پیدا کی جس سے نہ اپنے تئیں کسی طرح کا نقصان پہنچے اور نہ دوسروں کو۔ اس خواہش کا نام اخلاق ہے۔ لیکن انسان کی طبیعت میں اخلاقی مادہ موجود ہونے پر بھی ہزاروں آدمی اسکے احکام کی پوری پوری تعمیل نہیں کرتے اور تقریباً ہر شخص سے خلاف اخلاق کچھ نہ کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایک قوم اور ایک فرقہ جن امور کو داخل حسنات سمجھتا ہے دوسری قوم اور دوسرا فرقہ اُسکو افعال قبیحہ سے تعبیر کرتا ہے مثلاً غارت گری ایک ٹھگ کے لیے مذہبی فعل ہے اور ایک مہذب شخص کے لیے گناہ عظیم۔ بات یہ ہے کہ فقط اخلاقی تحریک ہی پر منحصر نہیں ہے، ہر خواہش کی یہی کیفیت ہے کہ انسان اُسکے اقتضاء کی کماحقہ تعمیل میں غلطی کرتا ہے۔ غذا بقائے جسم کے لیے ضروری ہے، اور بھوک اور قوت ذائقہ اُسکا تقاضا کرتے اور اُسکو خوشگوار بناتے ہیں۔ لیکن انسان اکثر ایسی غذا کھاتا یا اسقدر کھا جاتا ہے کہ بجائے نفع اسکو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ محبت اولاد کا اقتضا بچوں کی پرورش اور تربیت ہے لیکن انسان اُس میں ایسی غلطیاں کرتا ہے کہ بچوں کے قوائے جسمانی اور دماغی دونوں کو اکثر اوقات نقصان پہنچ جاتا ہے۔ محبت کے اقتضا کے خلاف دختر کشی کی رسم مدت تک اکثر قوموں میں جاری رہی ہے، جو محض پابندی رسم اور اقتضائے رواج سے تھی نہ کہ اخلاقی تحریک سے۔

اخلاقی تحریک

اخلاقی تحریک کا اثر اکثر اور اُسکا ظہور مختلف طبیعتوں میں مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ ہر شخص ایک ہی شے کے اُس پہلو کو اختیار کرتا ہے جس سے اُسکو خوشی اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً بخیل شخص جزرسی اور انتہائی کفایت شعاری کے پہلو کو اختیار کرتا ہے اور اُس میں جہاں تک اُس سے ہو سکتا ہے مبالغہ کرتا ہے اور فضول خرچ اسراف بے جا کو اختیار کرتا ہے۔ ان میں سے پہلا شخص روپیہ جمع کرنے کو اور دوسرا خرچ کرنے کو کار خیر سمجھتا ہے۔ پس کسی شے کو اچھا سمجھ کر اُسپر کاربند ہونے کی خواہش کرنا اور جس کو برا جاننا اُس سے نفرت کرنا ہی اخلاق کی بنیاد ہے۔ رہی یہ بات کہ آیا نتائج بھی اُس سے عمدہ اور بہتر نکلتے ہیں یا اسکے خلاف برے اور مضر، اخلاق کی عدم موجودگی ظاہر نہیں کرتی بلکہ اگر کسی ایسی شے کو جو فی الحقیقت مضر ہے عمدہ سمجھ لیا ہے تو یہ قوتِ تمیز کا قصور ہے اور اسکے لیے عقل و علم کی حاجت ہے۔ انسان کی طبیعت میں یہ استعداد ہے کہ وہ اجسام کی پیمائش کر سکتا ہے۔ وہ کسی شے کے حدود و ارجہ ... کو معلوم کرتا اور اُنکا اندازہ کر سکتا ہے لیکن اُسکی ... ہی اکتفا کر کے ابعاد ثلاثہ یا رقبہ وغیرہ

کا اندازہ کرے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اندازہ صحیح ہو بلکہ انسان نے اسکے واسطے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ وضع کرکے بہت سی ایسی اشکال علمی دریافت کی ہیں جن کی مدد سے خطوط، زاویوں، مربعوں، دائروں اور تمام اشکال ہندسہ کے خواص معلوم ہوجاتے ہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ انسان ان تمام نتائج کو حاصل کرنے کے لیے، جنھیں وہ قواعد ہندسہ کے استعمال سے حاصل کرتا ہے، فقط اپنی عقل ہندسی پر بھروسا کرتا اور صحیح نتائج معلوم کر لیتا۔ اسی طرح صرف طبیعت میں تحریکیہ اخلاق موجود ہونے سے تمام نیک اخلاق نہیں ہوجاتے ہیں بلکہ بہت سی غلطیاں رہ جاتی ہیں جیسے اصول علم ہندسہ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح تحریکات اخلاق کا کام یہ ہے کہ اصول اخلاق وضع کیے جائیں اور وہ غلطیاں جو صرف تحریکات اخلاق کے اندھا دھند استعمال سے پیدا ہوتی ہیں دور ہوجائیں۔

**علم اخلاق** | علم اخلاق ایسا ضابطۂ قانون ہے جس پر عمل کرنے سے ہر شخص انسان کامل بنجاتا ہے۔ جو شخص جسقدر قانون اخلاق کا زیادہ پابند ہوگا وہ اسی قدر کمال تہذیب کے زینہ سے قریب ہوگا۔ علم اخلاق کا موضوع اعلیٰ درجہ کی راست کرداری ہے اور اسکا مقصد ایسے تعلقات قائم کرنا ہے جن پر تمام انسان باہمدگر قائم رہکر فلاح و بہبود حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ اصول اخلاق کی خلاف ورزی بیان نہیں کرتا۔ مثلاً وہ بیان کرتا ہے کہ قرضہ ادا کرنا فرض ہے، لیکن یہ کہ آیا قرضہ ادا کیا جائے یا نہ کیا جائے، اخلاق کے قانون سے باہر ہے۔ علم اخلاق صرف اسقدر کہیگا کہ قرضہ نہ ادا کرنے سے اخلاق کا ایک قانون ٹوٹ گیا جو ایک خرابی پیدا کرنے والا ہے۔ ایک مہندس کسی مسئلہ ہندسی کو اسی صورت میں حل کرسکتا ہے جبکہ خط نقطہ دائرہ زاویہ وغیرہ انھیں تعریفات کے مطابق ہوں جو علم ہندسہ میں مقرر کی گئی ہیں۔ اگر اس سے ایسا سوال کیا جائے جس میں یہ چیزیں اپنی تعریفات کے مطابق نہ ہوں تو وہ صاف جواب دیگا کہ یہ حل نہیں ہوسکتا۔ یہی حال فلسفۂ اخلاق کا ہے۔ مثلاً وہ یہ بیان کرتا ہے کہ ایک

کس طرح پیش آتا ہے اور کامل انسان کس طرح ایک قوم یا گروہ بناتے یا ایک تمدن قائم کرتے ہیں۔ علم الاعضاء سے جسم کے مختلف اعضاء کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر اس میں یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ جسم کا ہر ایک عضو کامل صحت کی حالت میں ہے اور وہ اپنا کام پوری طاقت اور قوت سے کر رہا ہے۔ وہ یہ نہیں بیان کرتا کہ بیماری کی حالت میں یہ عضو کیسا کام کریگا۔

**اخلاقی خرابیوں کی وجہ** | تمام اخلاقی خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ جسم اپنی مناسب حالت میں نہ ہو۔ اگر کوئی درخت کسی زمین میں مرجھا جائے یا روشنی نہ پہنچنے کے سبب پژمردہ ہوجائے یا شدت سرما سے ٹھٹھر جائے تو اسکی یہ وجہ ہے کہ درخت کی طبیعت اور حالات خارجی میں توافق اور مناسبت نہیں رہی ہے۔ ہر ایک تکلیف و حادثہ یا بیماری کا واقعہ جو انسان کو پہنچتا ہے خواہ وہ خفیف دردسر ہو یا مرض موت، ذراسی موچ یا کوئی ایسا حادثہ جو مرگ مفاجات پیدا کردے، سب کا سبب یہی ہے کہ جسم ایک ایسی حالت میں ہوتا ہے جسکے لیے اسکی قوت مناسب نہ تھی۔ یہی حال تمام قسم کی خرابیوں کا ہے کہ امکانات طبعی اور انکے حلقۂ عمل کے درمیان تناسب و توافق نہونے کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔ یہی حال تمدنی اور معاشرتی خرابیوں کا ہے کہ جب لوگوں کا چال چلن اور رویہ قانون اخلاق کے موافق نہوگا تو ان میں خلفشار پیدا ہوگا۔ تمدن میں سکون اور اطمینان رہنے کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کی خواہشیں اس حد تک محدود رہیں کہ دوسرے لوگوں کے امن اور انکی جائز خواہشوں کے پورا کرنے کی قابلیت میں خلل نہ پڑنے پائے اگر ہر شخص کی خواہشیں ایسی محدود نہ ہونگی تو یا سب لوگوں کی سب خواہشیں پوری ہوے بغیر رہ جائیں گی یا بعض لوگ اپنی خواہشیں من مانی پوری کرینگے اور دوسرے محروم رہ جائیں گے۔ تہذیب کا مادہ انسان میں اکتسابی نہیں بلکہ فطرتی ہے۔ جو اصلاحیں انسان کی حالت میں ہوچکی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں وہ اس قانون فطرت کا نتیجہ ہیں جو تمام انسانوں میں مخفی ہے۔ ہماری تمدنی حالت میں یہ اصلاحیں اسوقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ

انسان کمال کے درجہ تک نہ پہنچ جائے۔

**عدالت** | تمدنی حالت میں ہر شخص کا حق اور دائرۂ عمل محدود ہے اور تمدن کی تمام و کمال برکتیں حاصل کرنے کے لیے ضرور ہے کہ ہر شخص اپنے ہی حق اور دائرۂ عمل میں اپنی خواہشات کو پورا کرے اور دوسروں کے حقوق پامال نہ کرے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص یا بہت سے لوگوں کی حق تلفی کیے بغیر اپنی خواہش کو پورا نہیں کر سکتا تو یا وہ خود اس کا اس خوشی سے محروم رہیگا جو تمدن میں اُسکا حصہ تھی یا ایک یا زیادہ آدمیوں کو اُس خوشی سے محروم رکھے گا۔ ایسی حالت میں پورے تمدن کی حالت ویسی اعلیٰ اور عمدہ نہوگی جیسی کہ چاہیے۔ لہذا ہر شخص کو اپنے حقوق کے دائرہ پر قناعت کرنا اور دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا اخلاقاً واجب اور فرض ہے اور اسی کا نام عدالت ہے۔

**اخلاق و تمدن** | انسان کی طبیعت میں اخلاق کی بنیاد اُسکے متمدن ہونے کی وجہ سے قائم ہوئی۔ جہاں تمدن نہ ہو وہاں اخلاق ایک بےمعنی لفظ ہے جب انسانوں میں باہم مل کر رہنے کی عقل آئی اور ان میں اتنا تمدن پیدا ہو گیا کہ وہ بچوں کی پرورش کرنے اور گروہ بنا کر رہنے لگے تو اُنکے دل میں اخلاقی تحریک پیدا ہو گئی، کیونکہ تمدن کی خواہش کے ساتھ اپنے ابنائے جنس میں شامل ہونے کی خوشی حاصل ہوتی ہے اور اُنکے ساتھ دل میں ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے

دوئم۔ جب قوائے عقلی زیادہ کامل ہو جاتے ہیں تو تمام گذشتہ افعال و حرکات کی تصویریں ہر شخص کے دماغ میں گزرتی رہتی ہیں اور اگر یہ معلوم ہو کہ کسی وقت کوئی عمدہ فعل جسکا فائدہ قیام پذیر تھا اس سبب سے ترک ہوا یا کما حقہ ادا نہ کیا گیا کہ کوئی دوسری ایسی خواہش یا جذبہ جو فی نفسہٖ ویسا عمدہ اور نتیجہ خیز نہ تھا جیسا کہ وہ ترک شدہ فعل اور جسکی لذت و منفعت بہت ناپائدار تھی اُسپر غالب آگیا تو طبیعت کو ملال ہوتا ہے۔

سوم۔ جب نطق کی قوت پیدا ہو گئی اور سوسائٹی کے ضروریات اور جذبات

کا اظہار کیا جانے لگا تو یہ رائے کہ سوسائٹی کے ہر ممبر کو کس طرح عمل کرنا چاہیے کہ عموماً سب کو اُس سے فائدہ اور راحت پہنچے تمام جذبات پر غالب آگئی، اور اسکا انسان کے افعال و اعمال پر اثر پڑنے لگا۔ مگر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ پبلک کی رائے کی خواہ کسی قدر وقعت و عزت کیوں نہ کیجائے دوسروں کی راحت رسانی کی اصلی بنیاد ہمدردی کا فطرتی مادہ ہے اور وہی تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔

چہارم۔ عادت کو بھی انسان کے اعمال کی راہ نمائی میں بہت بڑا دخل ہے۔ امور معاشرت و تمدن کے انجام دینے کی قابلیت بھی دوسری استعدادوں کی طرح عادت سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے اور انسان خود بخود سوسائٹی کی ضروریات کا تابع ہو جاتا ہے۔

**اخلاق اور قانون** | قانون کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے جو علم اخلاق کا ہے اور اگرچہ ان دونوں علوم کی غایت ایک ہی ہے مگر انکی وسعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کے تمام افعال پر خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اخلاق کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن قانون کی دسترس انسان کے تمام افعال پر نہیں ہے اور بعض افعال میں باوجود علم کے بھی مداخلت نہیں کر سکتا۔ بہت سی بُرائیاں اور خرابیاں اس قسم کی ہیں کہ اخلاق اُنکو منع کر سکتا ہے لیکن قانون اُنکی نسبت کوئی حکم نہیں دے سکتا۔

اخلاق اور قانون کا مرکز ایک ہی ہے لیکن ان دونوں کے محیط میں بہت بڑا فرق ہے، اس فرق کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ قانون کا لوگوں کے رویہ پر بلا واسطہ کوئی اثر نہیں ہے بلکہ انکا تمام اثر سزا کے خوف میں ہے۔ سزا فی نفسہ ایک بُرائی ہے اور اُس وقت تک اور اُس حد تک جائز ہے جبکہ اُس سے بہ نسبت بُرائی کے بھلائی زیادہ صادر ہو۔ قانون کی تعمیل کے زیادہ ذرائع اختیار کرنا سوسائٹی میں خوف و دہشت پیدا کرتا ہے جو بجائے خود ضرر رساں ہے، اخلاق کی یہ کیفیت نہیں، اُسکے اثر سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بعض جرائم ایسے ہیں کہ قانون اُنکو جرم کی تعریف میں داخل نہیں کر سکتا مثلاً سنگدلی، ناشکرگزاری، بیوفائی وغیرہ [illegible] جب تک اُنکی تعریف ایسی صحیح اور واضح [illegible] نہ کی جائے اُس وقت تک وہ

قانون کے احاطے سے باہر ہیں۔

**اخلاق کے اثر کی وسعت** | اخلاق کا اثر انسان کے تمام افعال پر خواہ اُسکی ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسروں سے پڑتا ہے۔ جو افعال انسان اپنی ذاتی نفع رسانی کے لیے کرتا ہے وہ ذاتی حقوق کہلاتے ہیں۔ اور جو دوسروں کو آرام دینے یا اُنکی خدمت گزاری کے لیے انجام دیتا ہے وہ حقوق بنی نوع کہلاتے ہیں۔ دوسروں کو فائدہ اور راحت پہنچانے کے دو طریقے ہیں ایک تو ایسے افعال اور امور کا اجتناب کرنا جو دوسروں کے لیے باعث تکلیف ہوں دوسرے ایسے کام کرنا جو دوسروں کے لیے نفع رساں اور راحت بخش ہوں۔

اپنے ذاتی نفع کا خیال انسان کو فطرتاً ہوتا ہے اگر اس میں سکونا کامی ہوتی ہے تو عمداً نہیں بلکہ اسکی عقل کے قصور سے۔ اور اگر وہ اپنے تئیں کوئی ضرر پہنچاتا ہے تو کسی نہ کسی غلطی کی وجہ سے۔ بلکہ ہمیشہ وہ یہ احتیاط رکھتا ہے کہ اُسکی ذات کو کوئی رنج و تکلیف نہ پہنچے۔ اس لیے قانون کو ضرورت نہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کسی سزا کی دھمکی دے۔ لیکن حق بنی نوع کی حفاظت قانون کا فرض ہے اور اسکے لیے دوسروں کی حق تلفی کی سزا قانون نے سخت سے سخت مقرر کی ہے۔

**اخلاقی حالات کی درستی کے اسباب** | اخلاقی حالت کی درستی میں بہت ضروری ہے کہ بد اخلاقی کے تخیلات فاسدہ کو دور کیا جائے اور نیکی و پرہیزگاری کے خیالات کو دل میں جمایا جائے۔ انسان کی یہ قوت کہ وہ اپنے حرکات و سکنات کو اپنے قابو میں رکھے اور خیالات کی تصحیح کر کے اعمال حسنہ کا مرتکب ہو اخلاقی ترقی کا ذریعہ ہے۔ خوف و غم، غصہ، ہمدردی، رنج، خوشی کے تمام اثرات اپنی مقدار اور اُس طریقہ کے مطابق جس میں ظاہر ہوتے ہیں اخلاقی یا خلاف اخلاق ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بے انصافی کے خلاف غصہ کرنا اخلاق میں داخل ہے اور بلا قصور کسی پر خفا ہونا خلاف اخلاق ہے۔ ادب اور عظمت کا خیال خوف پیدا کرتا ہے جسکی انتہائی ترقی خداوند تعالیٰ کی پرستش اور عبادت کرنا ہے۔ ہمدردی ترقی پا کر بے غرض محبت حب وطن اور بنی نوع انسان کی خیر اندیشی بنجاتی ہے۔

انسان کے لیے ادائے فرض کا خیال اور حیا کا اثر ایسا ہے جو اُسکے تمام اخلاق کی بنیاد ہے اور وہ جانتا ہے کہ مجھے ہر وقت ایک خاص کام کرنا ہے۔ انسان کی اعلےٰ درجہ کی اخلاقی قابلیت اُس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ تکلیف یا نقصان کی دھمکی کے باوجود اپنے فرائض ادا کرنے اور احقاق حق سے باز نہ آئے۔

ناپسندیدہ افعال سے شرم کا احساس بھی اُسکو بداخلاقی کے افعال سے باز رکھتا ہے۔ اُسکا دل نہیں چاہتا کہ لوگ اُسکو نظر حقارت سے دیکھیں، اسی وجہ وہ افعال شنیعہ سے باز رہتا ہے۔

**حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی**

# نور یا روشنی

**نور کی اہمیت اور ضرورت** | اُن ضروریات میں سے جو انسانی زندگی کے لیے نہ صرف بلکہ اجزاء لاینفک ہیں نور یا روشنی بھی ایک ہے۔ اگر سچ پوچھو تو انسانی زندگی کے تمام حظوظ اور دیگر اقسام کے کاروبار نور کے بغیر بیکار ہیں۔ زندگی کے اگر تمام کاروبار پر اور جو تعلق اُن سے انسان کو ہے غور کیا جائے تو یہ بات بالکل حق ثابت ہوتی ہے کہ "آنکھ گئی تو جہان گیا"!

اگر انسان کے جسم سے یہ نور جاتا رہا تو اُسکا تعلق بیرونی دُنیا سے ایک گونہ بالکل قطع ہوگیا۔ انسان نور کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ذرا رات کے وقت ہی پر غور کیجیے۔ انسان کے جسم میں تندرستی، خوبصورتی، طاقت، لیاقت، طبیعت سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ گھر میں تمام اسباب راحت و انبساط کافی بلکہ با افراط مہیا ہوتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوتے ہیں۔ مگر "دمڑی کے لعل"

بغیر ساری چیزیں بے مصرف ہوتی ہیں۔ اُس وقت یہ انسان ضعیف البنیان باوجود اپنی کامل صحت اور طاقت و خوب صورتی کے شل بُت کے ایک جگہ مقید بیٹھا رہتا ہے۔ وہ اُس وقت نور کا کیسا محتاج نظر آتا ہے۔ ہر شئے کی قدر و قیمت اُسکی ضد کی موجودگی سے پہچانی جاتی ہے، اسی طرح نور کی اہمیت و ضرورت تاریکی سے امتیاز ہوتی ہے نور کے بغیر انسان تمام بہجت افزا و مسرت بخش اشیا سے کچھ بھی فائدہ اور حظ اٹھا نہیں سکتا۔ پیاروں کے خوب صورت چہرے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور دل انکی نا دید سے بیقرار ہوتا ہے۔ غرضیکہ انسان کا کوئی کام ہو، سب کے سب نور کے بغیر بے لطف ہوتے ہیں۔ نور انسان کے لیے نہایت ہی ضروری، مفید اور دلکش ہے۔

نور جس طرح انسان کے لیے لابُدی اور ضروری ہے اسی طرح حیوانات نباتات اور جمادات کے لیے بھی لازمی ہے۔ انکی زندگی اور روئیدگی اور بالیدگی سب کا انحصار نور ہی پر ہے۔ عالم کی پیدایش، پرورش، اور نشوونما اور تمام خوبصورتیاں نور ہی سے ہیں۔ اسی لیے توریت شریف میں حضرت موسیٰ نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آفرینش عالم کی ابتدا میں سب سے اول نور پیدا کیا۔ اور اسی نہج سے سائنس نے بھی بتایا ہے کہ موجودہ صورت میں منجمد ہونے سے پیشتر آفتاب اور سیارے روشن ہیولے کی صورت میں موجود تھے۔ یہی ہیولے وہ نور یا اُجالا ہے جس کو خداوند عالم نے سب سے پہلے خلق کیا۔ نور ہر شئے کے اندر مخفی و مستتر تھا جسکو خالق نے ظاہر کیا۔ اور اب بھی ہر شئے میں موجود ہے جو رگڑ یا کسی اور کیمیاوی ترکیب سے پردہ کتم سے منصۂ ظہور پر آجاتا ہے۔ اگر نور کو کل اشیا کا ست یا روح کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نور کی اہمیت اور قدر و منزلت اس طرح پر بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ہر مذہب اور ملت میں بیان ہوا ہے کہ وہ نور ہے اور نور میں رہتا ہے، وہ اور اُسکے فرشتے سب نوری ہیں۔ وہی ذات الٰہی نور اور نور کا مخرج ہے تمام انوار اُسی سے ضیا پاتے ہیں۔ اُس میں تاریکی کا سایہ تک نہیں ہے۔ اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو نور ازلی اور ابدی ہے۔ جب سے خدا ہے تب سے نور ہے۔ اگر نور نہوتا تو اس عالم کا ظہور بھی نہ ہوتا۔

نور اگرچہ ایک ہے تو بھی اپنے طبعی اخلاقی اور روحانی معنی کے لحاظ سے مختلف اقسام کے کہلاتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس جگہ نور طبعی پر غور کرنے کا ہے۔

**نور کی بابت قیاسات**

نور کی تحقیقات میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نور کیا ہے؟ نور کے بیان میں متفرق قیاسات ہیں۔ مگر سب سے زیادہ مشہور اور مروج دو قیاس ہیں۔ پہلا قیاس یہ ہے کہ روشن اجسام ہر سمت میں ایک مادہ اپنے اندر سے نکالتے رہتے ہیں اُس میں غایت درجے کے لطیف ذرات مشتمل ہیں۔ یہ ذرات نہایت ہی سرعت کے ساتھ سیدھی سطروں میں برابر پھیلتے رہتے ہیں اور آنکھوں کے اندر جاکر "ریٹینا" پر اپنا اثر کرتے ہیں اور اُس اثر سے ہم میں وہ احساس پیدا ہوتا ہے جس سے نظر بنتی ہے۔ اس قیاس کو قیاس شعاع نور کہتے ہیں۔ اس قیاس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ روشنی کے ذرات منور اجسام سے ایسے طور پر متواتر اور نہایت عجلت کے ساتھ ناشکستہ سلسلے میں لگاتار نکلتے رہتے ہیں۔ اس قیاس کا رواج سر آئزک نیوٹن صاحب کی زبردست تائید کی وجہ سے مدت دراز تک سائینٹفک عالم میں جاری رہا اور اب بھی ایک بڑا زبردست فرقہ سائنس دانوں کا ایسا موجود ہے جو اس قیاس کا بڑا حامی ہے۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ تمام اجسام اور خلا، سماوی نہایت ہی درجہ کے لطیف اور لچکدار مادہ سے مملو ہیں جسکو روشن ایتھر کہتے ہیں۔ اور اجسام اس لیے منور ہوتے ہیں کہ انکے ذرات خلا میں انتہائی درجہ کی سُرعت اور تیزی کے ساتھ تھرتھراتے رہتے ہیں، اور جب وہ ایتھر میں مل جاتے ہیں، تو دائرہ نما لہروں کی شکل میں ہر سمت پھیلتے رہتے ہیں اور یہ تھرتھراہٹ ریٹینا پر پڑکر احساس نظر پیدا کرتی ہے۔ اس قیاس کو قیاس تموج نور کہتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ خط مستقیم میں رواں نہیں ہوتی بلکہ ایسے طور پر چلتی ہے کہ قائمۃ الزاویے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ اُس روانی کے مشابہ ہے جو اُس وقت [illegible] رسّی کو ایک سرے سے پکڑ کر آہستہ [illegible] موج میں ذرات کی کسی حرکت کا

نمو مشتمل نہیں ہے بلکہ ذرات کی بے قراری کی ایک حالت ہوتی ہے جو جسم منور سے ظہور میں آتی ہے۔ اسکی مثال عین پانی کی لہروں کی سی ہے۔ قیاس تموج نور کا سب سے پہلا محقق ہوجنس ہے اور اسکے بعد یولر نے اس قیاس کی بڑی حمایت کی اور اسکو رواج دیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر ینگ اور فرنیزل اسکے بڑے حامی گزرے ہیں۔ قیاس تموج سے نہ صرف ظہورات نورانی کی توضیح ہوجاتی ہے بلکہ اس سے وہ علاقہ بھی منکشف ہوجاتا ہے جو روشنی اور حرارت کے تموجات کے درمیان نہایت قرب میں واقع ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ تموجات نور اور ظہورات صدا میں کیسی پوری مشابہت موجود ہے۔

نور کے مخارج | نُور کے سلسلہ بیان میں دوسری بات اُسکے مخارج کا بیان ہے۔ اگرچہ نُور دُنیا میں کثرت سے موجود ہے، خواہ ظاہر ہو یا باطن، تاہم نور کا اصل منبع سائنس دانوں کی نظر تحقیقات سے مخفی ہے۔ ظاہر طور پر جہاں تک عام مشاہدہ اور سائنسی تجربات ومشاہدات کی رسائی ہوئی ہے وہاں تک یہی نتیجہ نکالا اور بتایا گیا ہے کہ نور یا روشنی سورج، ستاروں، حرارت، کیمیاوی ترکیب، بجلی، شہابوں اور اُن اشیاء سے نکلتی ہے جن میں فاسفورس ہوتا ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ انکے اندر نُور کہاں سے آیا جو ہر وقت کسی نہ کسی ترکیب یا ذریعہ سے ظاہر ہوجاتا ہے؟ تو سائنس اسکا جواب دینے سے عاری ہے۔ البتہ موسیٰ نے پیدائش کی کتاب کے شروع میں اشارۃً ظاہر کردیا ہے۔ وہ بیان قرین عقل اور قابل تسلیم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حرارت و روشنی کا نہایت ہی قریبی اور لابدی تعلق ہے۔ جہاں حرارت ہے وہاں نور۔ یہ بات اور ہے کہ کیا نور ہمیشہ ظاہری رہتا ہے یا باطن، مگر تجربہ اور مشاہدہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ حرارت میں نور ہے۔ خدائے تعالیٰ نے عین ابتداءِ پیدائش عالم میں سب سے پہلے مادہ کے اندر حرارت ڈالی۔ اور اس حرارت کے ساتھ ہی جو "خدا کی روح" کے "پانیوں پر جنبش کرنے" سے خارج ہوکر مادہ کے اندر گئی نور بھی اُسکے ساتھ ہی مادہ کے اندر پہنچا، اور جب خدا نے فرمایا کہ "اُجالا ہو" تو فوراً ہی مادہ زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور اس حرکت [ ] کا ظہور ہوا۔ نُور کا یہ ظہور سب سے پہلے نبولے کی صورت میں ہُوا۔ ڈاکٹر کینس نُور کی پیدائش کا بیان یوں کرتے ہیں اور موسیٰ کی رؤیا میں نُور کے ظہور کا نظارہ اس طرح پر دکھاتے ہیں کہ جب موسیٰ کوہ طور پر حق تعالیٰ کے روبرو عالم رؤیا میں اس دُنیا کی پیدائش کا سارا واقعہ مسلسل طور پر دیکھ رہا تھا تو اُس نے "اپنی آنکھیں اوپر اُٹھا کر اُن بادلوں کو دیکھا جو اُسکے گرداگرد گھوم رہے تھے (وہ کیا دیکھتا ہے کہ) فوراً ایک کالا بادل اُسکے سر پر چھایا ہُوا ہے۔ اور جبکہ وہ اس نظارہ کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتا اور غور کر رہا تھا کہ اسکے کیا معنی ہیں تو اُس نے خدا کی وہی آواز سُنی کہ "اُجالا ہو جا" اور فوراً ہی سارا خلا ہر قسم کی شکلوں کے نورانی نبولوں سے معمور ہوگیا۔ وہ حیرت کی نگاہوں سے تاکتا ہے۔ اور وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ نبولے منجمد ہوگئے اور آسمان کے کل سامنے میں سُورج (بصیغۂ جمع) اور ستارے جگمگا اُٹھے" (موزس اینڈ جیالوجی صفحہ ۱۰۹)

اور پھر لکھتے ہیں (صفحہ ۲۰) "اگرچہ فی الحال ہم نہیں بتا سکتے کہ کن قوانین سے نبولے بنے اور انکو یہ روشن خاصیتیں عطا ہوئیں تاہم یہ ایک بدیہی امر ہے کہ نور بلا کسی معلومہ مرکزی منبع اشعاع کے موجود تھا۔ پس موسیٰ کا بیان بالکل درست ہے کہ آفتاب سے پیشتر روشنی موجود تھی"۔ موسیٰ کے بیان اور سائنس کے ساتھ اسکا مقابلہ کرنے سے بخوبی پتہ لگتا ہے کہ اصل منبع اور مخرج نور کا وہی قادر متعال بے چون و بے مثال ہے۔ پانی پر اُسکی روح کے جنبش کرنے سے مادہ میں حرارت و نور داخل ہوئے۔ اُسکے فرمانے سے مادہ بڑے زور کے ساتھ متحرک ہُوا۔ اور قسم قسم کی شکلوں کے روشن اور گرم نبولے (سحاب) متشکل ہوگئے اور نور فضا میں پھیل گیا۔ پھر یہ نبولے رفتہ رفتہ منجمد ہوتے گئے اور انھوں نے سورجوں اور ستاروں کی شکلیں اختیار کریں جو نُور کے مخارج ثانی ہیں۔

سُورج ایک منجمد نبولا ہے جو بذاتہٖ روشن ہے اور چاند کی طرح کسی غیر فلکی جرم سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق اُس میں اُن بے شمار جلتے ہوئے شہابوں

سے بلوئڑ روشنی پیدا ہوتی ہے جو حرکت کرتے ہوئے سورج کے اندر آ پڑتے ہیں۔ کیونکہ تمام لاتعداد شہابی گولے جب ماہ آفتاب میں آ جاتے ہیں تو وہ ہر ایک مخفی زاویہ پر آکر ایک دوسرے کا تقاطع کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے بعض شہاب آگے جاتے اور بعض پیچھے ہٹتے ہیں اس لیے وہ بالضرور آپس میں لگاتار ٹکراتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اجسام ناگہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ اور ان سے غایت درجہ کی حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور وہ آفتابی گولے میں آگرتے ہیں اور اس طرح اس میں متواتر نئی نئی حرارت اور روشنی پہنچاتے ہیں" (ایضاً ۲۹۵ صفحہ) یہ سورج کی روشنی کا حال ہے۔

حرارت سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ اس وقت نظر آتی ہے جب اشیا (ٹیٹ صاحب کے بیان کے مطابق) ۵۰۰ سے ۶۰۰ درجے تک گرم ہوتی ہیں اور اس درجے سے آگے جوں جوں حرارت کی مقدار بڑھتی جاتی ہے روشنی بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

فاسفورس ایک ایسی شئے ہے جو اکثر اقسام کی چیزوں میں موجود ہے اور جب وہ چیزیں کسی خاص حالت میں رکھی جاتی ہیں تو خود بخود روشن ہو جاتی ہیں۔ اور بعض نباتات اور حیوانات میں بھی یہ خاصہ پایا جاتا ہے مثلاً نور شب چراغ (جگنو) میں بہت تیز ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی انکی مرضی کے مطابق ظاہر اور پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ سمندروں میں بھی بہت سی ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو راس السرطان اور جدی میں ہیں انکے بدن سے روشنی برابر نکلتی اور سمندر کو روشن کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی اشیا ہیں جن سے روشنی نکلتی ہے اور انسان و حیوان انسے اکتساب نور کرتے ہیں۔ اور وہ نور میں اپنے سارے کام کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔ یہاں تو انسان محتاج ثانی سے نور حاصل کرتا ہے مگر موت کے بعد جب آرام اور خوشی کی حالت میں جائیگا تو اصل منبع سے نور اور خوشی حاصل کریگا۔

**نور کی تیز رفتاری** | یوں تو نور کا ہر ایک پہلو قابل ذکر اور اسکا بیان نہایت مفید اور دلکش ہے مگر ہم طوالت کے خوف سے صرف نور کی تیز رفتاری کا ذکر کرینگے جو نہایت دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والا مگر سریع الفہم ہے۔ روشنی اس قدر سرعت اور تیزی کے ساتھ چلتی ہے کہ عام مشاہدہ کے مطابق سطح زمین پر کسی نورانی ظہور اور آنکھ کے احساس کے درمیان کوئی قابل قدر فاصلہ نہیں ہوتا۔

یہ سرعت رفتاری سب سے پہلے علم نجوم کے مشاہدات کے ذریعہ سے معلوم کی گئی ہے۔ سب سے پہلے رومر نامے ایک ڈنمارک کے منجم نے ۱۶۷۵ء میں جوپیٹر کے پیچھے خادم تارہ کے گہن کے مشاہدہ سے روشنی کی تیز رفتاری دریافت کی تھی۔ نتیجہ اسکے تجربہ اور مشاہدہ کا یہ ہے کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۹۰۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ ایک اور بیان کے مطابق روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل مسافت میں دوڑ جاتی ہے۔

**نور کی ترکیب** | ایک عجیب بات یہ ہے کہ روشنی کے اندر سات رنگ پائے جاتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ نور سات رنگوں سے بنا ہے۔ سرخ۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ نیلا۔ زعفرانی۔ بنفشئی۔ ان میں سے سرخ بہت ہی مدھم ہے اور بنفشئی نہایت ہی انتشار پذیر ہے۔ یہ سر آئزک نیوٹن کے تجربہ کا نتیجہ ہے۔ مگر ڈاکٹر ینگ اور فرینل نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ایک رنگ مسلسل تموج یا لہروں سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ان موجوں یا لہروں کی لمبائی کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک انچہ سرخ روشنی میں ۴۰۹۶۰ لہریں ہوتی ہیں۔ اور چونکہ روشنی تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل ایک سکنڈ میں طے کرتی ہے لہذا جب ہم سرخ گلاب کے پھول کیجانب دیکھیں گے تو ہماری آنکھ کا ٹینیا ایک سکنڈ میں ........۴۷۴ بار تھرتھرائیگا۔ بنفشئی کرنوں میں لہریں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انچہ روشنی میں ۶۰۰۴۰ لہریں۔ پس جب ہم بنفشئی رنگ کے گچھے کی جانب دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھ کی ٹینیا کی تھرتھراہٹ ۷۵۰......... دفعہ ہوتی ہے۔

نور کے بیان سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نور انسان کے لیے کس قدر ضروری چیز ہے کہ بغیر اسکے انسان کسی قسم کا فائدہ یا حظ نہیں ... [illegible] ... ورنہ روشنی کی طرح ظاہر ہے۔

تمدانش نور کی ترکیب میں کیسی اعلیٰ اور کامل دانائی اور حکمت رکھی ہے کہ اس سے دل اور دماغ کو تازگی اور روح کو فرحت ملتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ نور کا منبع اور مخرج خود وہی خدائے ذوالجلال ہے سورج اور ستاروں وغیرہ کے انوار اور لوامع اسی بے درنگ کے ذاتی انوار کے پرتو ہیں۔ یہ نور ہی ہے جو ہم کو اس لایزال نور کا اندرونی احساس دلاتا ہے اور اس نور کی تحصیل کا ذوق و شوق ہم میں پیدا کرتا ہے اے خدا! تو جو نور ہے اور نور میں رہتا ہے، جس طرح تو نے ہمیں اس دنیاوی نور سے منور کیا اسی طرح اپنی تجلی کے نور سے ہمارے باطن کو منور کر اور ہماری موت کے بعد اپنے چہرے کے ذاتی نور کی تجلی سے سرفراز فرما! - آمین ثم آمین۔

پی۔ کیول سنگھ

# فصیح الملک داغ دہلوی (مرحوم)

اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو شاعری کی بنیاد ہی عشق و عاشقی پر رکھی گئی ہے۔ انسانی فطرت و صحیفۂ قدرت کا مطالعہ ہمارے شعراء نے گویا کیا ہی نہیں۔ اور اگر نظر کو اس سے وسیع کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ غزل اسی قسم کے مضامین کے لیے ابتداءً موضوع بھی بنی تھی۔ لیکن ازمنۂ وسطیٰ میں اس کی یہ خصوصیت قائم نہیں رہی بلکہ عشق و محبت کے ساتھ معرفت، توحید، اخلاق، تصوف، غرض کئی رنگ اس پر چڑھا دیے گئے ہیں۔ لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ یہ صنف زیادہ تر عشقیہ مضامین ہی کے لیے موزوں ہے۔ متقدمین میں سے اکثر نے ان جذبات کو قلمبند کیا ہے جن سے عشق حقیقی مترشح ہوتا ہے لیکن کثیر التعداد شاعروں نے عشق مجازی کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ان کے دیوان گواہی دے سکتے ہیں کہ اس بیان میں صداقت کا عنصر کتنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ معمولی عشقیہ باتوں کو کھینچ تان کر معرفت کا لباس پہنانے کی طرفدارانہ کوشش کی جائے۔ اس بات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ متقدمین نہیں معاملہ بندی کو پسند کرتے تھے یا خلوت و وصل کے بے تکلفانہ واقعات کا ذکر کھلے الفاظ میں کرنے سے رکتے تھے۔ لیکن متوسطین نے یہ التزام قائم نہیں رکھا۔ میر نے غزلیات کو جس رنگ میں لکھا تھا اسے جرأت نے نہایت شوخ کر دیا تھا اور داغ مرحوم کے قلم نے تو بعض اوقات تنہائی میں بھی ان کا مطالعہ ناظر کو عرق عرق کر دیتا ہے مثلاً یہ اشعار اعتدال اور متانت سے بہت دور ہیں۔ ان میں سے بعض صاف گوئی کا تاریک پہلو بخوبی دکھا سکتے ہیں ؎

مزا ہو وصل کی شب اس طرح ہوں پیار کی باتیں
ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

زلف برہم عرق آلودہ جبیں، دامن چاک  کس کے آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا

یاد ہے کہنا وہ کسی وقت کا  ہوش میں آؤ تمہیں کیا ہوگیا

نکلکر مرے گھر سے یہ جان لو تم  نہ ہوگا کسی گھر گذارا تمہارا

سنا ہے کسی اور کو چاہتا ہے  وہ دشمن ہمارا وہ پیارا تمہارا

بنا ہو یہ کہیں غیر کے سر کا تکیہ  مسکراتے ہیں وہ کیوں دیکھ کے زانو اپنا

بعض اشعار میں سوقیانہ طرز تکلم کی جھلک پائی جاتی ہے مثلاً

کہہ دو سمجھ کے جائیں وہ کوئے رقیب میں  اک رشک آشنا کا ہے مردہ پڑا ہوا

ہوگیا پرتو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ  میں نے منہ چوم لیا اس کے تماشائی کا

کیوں صرف نگاہ مری جان ہوگیا  اک تیر اور میں ترے قربان ہوگیا

بیشک اس قسم کے خیالات سخت قابل اعتراض ہیں اور خصوصاً آج کل جبکہ تعلیم کی اشاعت کے ساتھ انسانی دل و دماغ کی جلا ہوتی اور نیک و بد کی تمیز آتی جاتی ہے، یہ اشعار کون پسند کریگا؟ لیکن جو لوگ

داغ کے تمام دواوین کو اسی قبیل کے مضامین سے مملو بتاتے ہیں وہ یقیناً بے خبر ہیں اور محض ایک عام قیاس کی بنا پر کہ داغ "چوما چاٹی" کی تصویر بہت دلکش الفاظ میں کھینچتے ہیں بلا امتیاز اُنکے سارے کلام کی تضحیک کرنے لگتے ہیں۔ وہ ٹھنڈے دل سے دیکھیں کہ تمام مجموعۂ کلام میں اس قسم کے کتنے شعر نکلتے ہیں اور پھر کوئی فیصلہ کن رائے قائم کریں۔ بڑی سے بڑی غزل میں بھی ایک دو سے زیادہ ایسے شعر نہ ملیں گے۔ جب حقیقت حال یہ ہو تو معترض خود انصاف کرے کہ اُسکا فعل کس حد تک بیجا ہے۔

بدنام کرنے کا ارادہ کر لینا اور بات ہے لیکن کیا داغ کے علاوہ کسی اور شاعر نے واقعات حُسن و عشق نظم کرنے میں بے اعتدالی نہیں کی؟ بدر منیر، گلزار نسیم، زہر عشق، یہ تمام مثنویاں میانہ روی کے اصول سے کوسوں دُور ہیں۔ ان میں بعض بعض مقامات پر ایسے سین دکھانے کی فخریہ کوشش کی گئی ہے جس کا نظارہ غیرت پسند طبائع کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ اسکے باوجود اُنکے نئے ایڈیشن چھاپے جاتے اور تنقیدی دیباچے لکھے جاتے ہیں اور اُنکے مسلمہ عیوب کی پردہ پوشی کرنے کے لیے خون اور پسینہ ایک کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا کیا جاتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ کیونکہ ان کتابوں میں بہت سے ادبی محاسن بھی ہیں جن کی وجہ سے ان میں مستقل دلچسپی کی شان موجود ہے۔ بعینہٖ یہی حال داغ کے کلام کا ہے۔ وہ ایک باغ ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ اِن کانٹوں سے کسی کا چمن خالی نہیں۔ اگر داغ کا طرز بیان واقعی ایک کانٹا ہے تو انصاف پسند نظروں میں امیر مرحوم کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" جس میں اسلوب تحریر اور زبان کے اعتبار سے داغ کے تتبع کا رنگ نمایاں طور پر موجود ہے سراپا خارستان ثابت ہوگا۔ مگر ہم اِسکے بھی خلاف ہیں۔ یہ سب یک طرفہ رائیں ہوسکتی ہیں اور منصف مزاجی اور راست بازی سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔

یہ امر بزرگان لکھنؤ کی علمی قدر دانی کی گذشتہ روایات کے سراسر خلاف ——— سعادت شعار ہے کہ جہاں تمام ہندوستان نے کلام داغ کی مناسب عزت و توقیر کی، وہاں اہل لکھنؤ کی زبان سے کوئی حوصلہ افزا لفظ کبھی نہ نکلا۔ لیکن انھوں نے اپنے گریبان میں منھ ڈال کر نہ دیکھا کہ واسوخت امانت اور دیوان جان صاحب کے مالک بننے کے بعد انھیں داغ پر خردہ گیری کا حق کیا ہے۔ مولوی علی حیدر صاحب ایسے فاضل نقاد بھی جہاں کہیں داغ کا ذکر کرتے ہیں تو تعریفی الفاظ میں تعریض کے پہلو نکال لیتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے بزرگ سے ہم کو کوئی شکایت نہیں ہوسکتی کیونکہ آخر کچھ خدا لگتی بھی کہہ دیتے ہیں اور اُنکی علمیت، قابلیت اور تحقیق انھیں اس قسم کی رائے زنی کا مستحق بناتی ہے خواہ اُنکے خیال سے صریحاً اتفاق نہ کیا جائے لیکن الناظر بابت ماہ جون ۱۹۱۲ء میں ایک پردہ نشین مضمون نگار نے اپنی قوتِ فیصلہ کا ثبوت عجیب طور سے بہم پہنچایا ہے۔ کہاں شمشیرِ ہستانی سبزہ زار اور کہاں داغ و امیر کا قضیہ! معزز خاتون کے الفاظ یہ ہیں :-

منشی امیر احمد صاحب مرحوم اور داغ مرحوم کا تذکرہ چلا۔ جب کوئی ان دونوں کا مقابلہ کرتا ہے تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ میں داغ کو بڑا نہیں کہتی وہ شاعر تھے لیکن منشی صاحب اور داغ کا مقابلہ کیا۔ داغ شاعر تھے اور امیر اُستاد....

اسے پڑھ کر ہمنے مضمون نگار صاحبہ کے تبحر علمی اور وسعت نظری کا جو اندازہ لگایا تھا وہ افسوس ہے کہ اُسی مضمون کے خاتمہ پر پہنچکر غلط ثابت ہوگیا۔ آپ لکھتی ہیں :-

خیالات نے بڑھتے بڑھتے بچپن کا زمانہ پیش کر دیا۔ کیا زمانہ تھا کیا معصومیت تھی۔ سچ یہ ہے کہ بچپن کا زمانہ انسان کی زندگی کا بہترین حصہ ہے۔ مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ داغ مرحوم کی ایک رباعی مجکو بہت پسند ہے اور وہ یہ ہے ؎

گئے بڑھنے جب سے کہ ہو شر و خرد ۔۔۔ لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر ۔۔۔ دلا دے وہ بچپن کی نادانیاں

چہ خوش گفت ست سعدی در زلیخا

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

کی خندہ آفریں یاد آجاتی ہے۔ جو آدمی زبان و قلعہ اور داغ اور حالی کو ایک سمجھتا ہو وہ اپنی واقفیت کے لحاظ سے کسی علمی و ادبی مسئلہ کا تصفیہ کیا خاک کر سکتا ہے۔ ہاں اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تحریریں سوسائٹی کے اندرونی جذبات کا اظہار البتہ کر سکتی ہیں۔ بزرگان لکھنؤ نے داغ کے کلام کا صرف تاریک رخ خود دیکھا اور اوروں کو دکھایا ہے۔ ان میں حضرت امیر مرحوم ایسے انصاف پسند لوگوں کی مثال شاذ ہے جنھیں یہ کہنے میں کوئی چیز مارج نہیں ہوئی کہ ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

ہماری ذاتی رائے ہے کہ کلام داغ مجموعی حیثیت سے عیاشانہ جذبات کا مظہر ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر اس میں کئی چیزیں قابل گرفت نظر آئیں گی تو بہت سی لائق تعریف بھی ملیں گی۔ یہ کہنا کہ متین اور ستھرے جذبات ان کی غزلیات میں مفقود ہیں، غلط ہے۔ اگر ان کے تمام مجموعۂ کلام کا انتخاب اس طریقہ سے کیا جائے کہ قابل اعتراض شعر ایک بھی نہ رہنے پائے تاہم حصۂ منتخبہ کی ضخامت کئی کئی دیوانوں کے برابر ہوگی۔ ہم اوپر کچھ اشعار جو کسی نہ کسی حیثیت سے گرفت کے لائق قرار پا سکتے ہیں لکھ چکے ہیں، اب ان کے بالمقابل یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

قاصد یہاں سے برق تھا پر نصف راہ سے — بیمار کی ہے چال قدم ناتواں کے ہیں

کیسا جواب حضرت دل دیکھیے ذرا — پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

---

کھو گیا ہوں اس کے پتہ نامہ بر کو میں — کوجاؤں اتنی کہ حسر کو میں

مجھکو تباہ چشم مروت نے کر دیا

جاکر در قبول پہ جبہ کی گئی دعا — سر خم کر اب چاہ کہ در پاک اثر کو میں

---

اس چمن میں گو برنگ سبزۂ بیگانہ ہوں — گل ہے رنگیں ہو یہ اپنے رنگ کا دیوانہ ہوں

مجھ سے اے گبر و مسلماں کس لیے اتنا بگاڑ — قابل کعبہ و دیر کو نئی بت خانہ ہوں

---

یاں دل میں خیال اور ہے واں مد نظر اور — ہے حال طبیعت کا ادھر اور ادھر اور

ٹھہرا ہے وہاں مشورۂ قتل ہمارا — لو حضرت دل ایک سنو تازہ خبر اور

---

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں — صوفی ہے بت کدہ میں صنم خانقاہ میں

آنکھیں چھپائیں ہم تو صدر کی بھی راہ میں — پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

اس تو بہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر — جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

کیا نظارہ کس کا اشارہ کہاں کی بات — سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں

کون کہہ سکتا ہے کہ اور اسی قسم کے ہزاروں اشعار کا مطالعہ وجدان صحیح پر گراں گزر سکتا ہے؟ البتہ اگر ان میں بھی ؎

اٹھا پائی میں ہنچتے جانا — کھلتے جانے میں دعا پہنچا نا

کا وہمی منظر کسی کے آگے محض اس وجہ سے آجائے کہ یہ داغ کے شعر ہیں تو اور بات ہے ورنہ کیا خیالات کی نفاست، جذبات کا ستھراؤ، زبان کی صفائی، مفہوم کی بلندی، یہ تمام صفات ان میں بدرجۂ غایت موجود ہیں اور داغ کے یہی اشعار سنجیدہ طبیعت والوں کو اپنی طرف متوجہ اور طبقۂ خواص کو مسخر کرتے ہیں اور سب سے بڑا سبب داغ کے کلام کی خاص و عام دونوں قسم کے افراد میں مقبولیت کا یہی ہے۔

ہم ذیل میں کچھ اور شعر درج کرتے ہیں ان سے پتہ چل سکتا ہے کہ داغ نے سوسائٹی کے اعلے طبقہ کی ضیافت طبع کے لیے کیسی کچھ لطیف حالی غذائیں تیار کی ہیں ؎

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا   کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

داغ وہ بہتر ہے جو مرہم بنا   درد وہ اچھا جو دوا ہو گیا

حسرتے جو جا کریں تو محو ہو بیٹھے   اللہ رے اللہ رے سرکار محبت

ہم نا شکیبا لے کے دامن تم تیغ قاتل سے   کہ زخم گریہ کہتا ہے جگر کے زخم بھرتے ہیں

مزہ عشق کا کچھ وہی جانتے ہیں   کہ جو موت کو زندگی جانتے ہیں

کیا ڈبوئے گا ترے عشق کا قلزم مجھکو   موج ساحل ہے سفینہ ہے تلاطم مجھکو

عمر دراز خضر کو کیوں ہو گئی عطا   یہ تو مجھے کسی کی محبت میں چاہیے

لذت ایذا طلبی کس سے کہیے   درد آرام ہوا جاتا ہے

مندرجہ بالا انتخاب میں خصوصیت سے ایسے شعر لیے گئے ہیں جن میں کسی نہ کسی پہلو سے حُسن و عشق کا پہلو نکلتا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ یہ جذبات اعلیٰ قسم کے ہیں یا ادنیٰ درجے کے؟ جو لوگ کہیں کہیں اس طرح کے شعر ؎

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دیکھ کر تعمیم و تخصیص کا درمیانی فرق قائم نہیں رکھتے اور کہنے لگتے ہیں کہ داغ کا عشق بازاری ہے وہ غور فرمائیں کہ داغ کے گلدستہ میں کانٹوں سے پھول بہت زیادہ ہیں۔ یہ غزل دیکھیے کس انداز میں کہی گئی ہے ؎

ثبات بحر جہاں میں اپنا فقط مثال حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین آیا نہ خواب پایا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اُسکی آنکھوں کے صدقے جس نے یہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکر دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

سرور عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سُنا جو کانوں سے تھا نہ جس نے وہ آنکھ سے انقلاب دیکھا

شراب غفلت سے داغ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

اسی طرح سیکڑوں اور ہزاروں متفرق شعر ایسے مل سکتے ہیں جو اخلاقی اور روحانی فوائد سے مملو ہیں یا جن میں معرفت و تصوف کے نکات کی موشگافی کی گئی ہے۔ جہاد اکبر کی تعریف داغ کے الفاظ میں یوں ہے ؎

مارا دل کا سمجھتا ہوں جہاد اکبر
وہی غازی ہے بڑا جس نے یہ کافر مارا

حرص کا کارآمد ہونا کس خوبی سے ثابت کیا ہے ؎

یہ نہ کہیے کہ نہیں کام کی حرص
اور جو کافر کو ہو اسلام کی حرص

مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کی حرص بھی اچھی ہے۔ انسانی طاقت کا غیر محدود اور پھر مجبور ہونا کتنے عام فہم طریقہ پر ذہن نشین کیا ہے گویا جبر و قدر کا مسئلہ حل کر دیا ہے ؎

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

فنا فی الذات و فی الصفات کی کیفیت دیدنی ہے۔ کہتے ہیں ؎

نہ بت تلاش کہ سرگرم جستجو ہو کر
ملا ہوں رنگ میں رنگ اور بو میں بو ہو کر

عیش و غم کا توام ہونا کس خوبی [illegible] بیان کرتے ہیں ؎

[illegible] ہوتے ہیں
[illegible] ماتم بھی ہوتے ہیں

صلح کل زندگی بسر کرنے کی ہدایت اس طرح کی ہے ؎

دشمنوں سے دوستی غیروں سے یاری چاہیے
خاک کے پتلے ہے تو خاکساری چاہیے

ان اشعار کا رنگ ملاحظہ ہو۔ یہ غزل کی غزل مرصع ہے اور ایک ایک شعر معنوی خوبیوں کا مجموعہ بنا ہوا ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے　　دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
ہم نکمے ہوئے زمانے کے　　کام ایسا سکھا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے　　دل بے مدعا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے　　کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو　　بے غرض جو دیا، دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی　　اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب　　نقشہ اپنا جما دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا　　تو جہنم کو کیا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

اسی طرح یہ شعر کس قدر کیفیت انگیز ہیں ؎

کشتۂ یاس ہوں مقتول تمنا ہوں میں　　اور اس زندگی عیش پہ مرتا ہوں میں
کچھ خبر ہی نہیں اللہ ری مری بےخبری　　کس کا مشتاق ہوں میں کون ہوں کیا ہوں کیا
نظر آتا نہیں ہے جوشِ سرشک پاشاں سے　　کشتیِ نوح نہیں ہوں کہ ابھرتا ہوں میں

---

خاک میں مل جائے دل گر مدعا پیدا کروں　　جب مٹا لوں ایک کو تو دوسرا پیدا کروں
آفرینش سے مری کچھ اور تو مطلب نہ تھا　　مدعا یہ تھا کہ پیدا آرزو پیدا کروں

---

حرم سے دیکھنے رنگِ ظہور ہم آئے　　ہزار جس کے لیے اتنی دور ہم آئے
مدینہ چھوڑ کے پھر رامپور ہم آئے
یہ خوفِ اہلِ وطن تھا کہ دشتِ غربت میں　　وطن سے بچتے ہوئے دور دور ہم آئے

---

طرزِ قدسی میں کبھی شیوۂ انساں میں کبھی　　ہم بھی اک چیز تھے اس عالمِ امکاں میں کبھی
رنج میں رنج کا، راحت میں راحت کا شریک　　خاک ساحل میں کبھی موج ہوں طوفاں میں کبھی

---

دامن پہ ترے گی ہے خاک　　اتنا ہی مرا نشاں بہت ہے
کونین کے لطف کس سے اٹھیں　　مجھ کو غمِ دو جہاں بہت ہے

ناظرین اندازہ کریں گے کہ پاکیزگی جذبات اور حسنِ تخیل کی یہ مثالیں کیسی کچھ دلفریب ہیں۔ سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل بیان کیے ہیں لیکن زبان کی سادگی جو داغ کا خاص انداز ہے ہاتھ سے جانے نہیں پائی۔ متقدمین اور متاخرین میں سے بھی اکثر نے انھیں مضامین کو باندھا ہے لیکن انکا اسلوب بیان اس قدر صاف و شستہ نہیں بلکہ مغلق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے مطالب اکثر عسیر الفہم ہوگئے ہیں۔ داغ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان سی آسان زبان میں ادا کر دیتے ہیں اور غزل میں اسی قسم کی صاف و شستہ بندشوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

داغ کی زبان کی بابت زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ مضامین کے اعتبار سے خواہ کوئی شخص انکے مذاقِ سخن کو ادنیٰ درجے کا سمجھے لیکن انکے معترضین کو بھی اسکا اعتراف ہے کہ جو سادگی اور صفائی اردو میں انھوں نے پیدا کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ فصیح الفاظ، عام فہم ترکیبیں، برجستہ محاورے، سلجھی ہوئی بندشیں، روزمرہ کی صفائی، ان تمام اعتبارات سے انکا طرزِ بیان بے نظیر ہے۔ انکا ہر ایک دیوان اسالیب بیان کی خوبیوں اور زبان کے محاسن سے لبریز ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انکی زبان میں صناعی کو مطلق دخل نہیں بلکہ "انھوں نے محاورے اور چٹکلے بجنسہ اسی طرح نظم کر دیے ہیں جس طرح روزمرہ کی گفتگو میں بولے جاتے ہیں" لیکن انصاف

سے دیکھیے تو اسکی ضرورت بھی تھی۔ غزلوں کی زبان جس قدر صاف و شستہ اور عام گفتگو کے قریب ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی وجہ سے سوداؔ کے بالمقابل میرؔ کی غزلیں اصولاً بلند پایہ سمجھی گئی ہیں اور اسی لیے جرأتؔ و انشاؔء و مصحفیؔ و ظفرؔ کا کلام جہاں تک اسکا تعلق غزلیات سے ہے صفائی و شستگی کے اعتبار سے قابل تعریف خیال کیا جاتا ہے۔

ہمیں مسٹر چکبست ایسے سخن فہم و نکتہ شناس کے ان الفاظ پر بے حد حیرت ہوتی ہے کہ

وہ جوہر عالی جو شاعرانہ زبان کی جان ہے داغؔ کی زبان میں موجود نہیں۔ وہ جوہر ہے جو ہر زبان میں الفاظ سے صناعی کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ صناعی سے میری مراد تصنع نہیں ......

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال کسی حد تک صحیح ہے لیکن جہاں تک اسکا تعلق غزل سے ہے اُسکے خلاف واقع ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ تجربہ اور مشاہدہ دونوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غزلیات میں خصوصیت کے ساتھ صفائی اور سادگی کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرؔ کی غزلیں کبھی سوداؔ کے مقابلہ میں مقبول عام نہ ہوتیں۔ ان دونوں اُستادوں کے کلام کا موازنہ جب کبھی اور جس کسی نے کیا، غزل گوئی میں میرؔ کو اور قصیدہ نگاری میں سوداؔ کو ترجیح دی ہے۔ اگر زبان کی صناعی کا بار غزلیات اُٹھا سکتیں تو کبھی یہ شعر ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کے آگے سرسبز نہ ہو سکتا ؎

سوداؔ کی جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اصل یہ ہے کہ تغزل کا رنگ کچھ سلاستِ زبان ہی سے زیادہ نکھرتا ہے مثلاً سوداؔ کا ایک شعر ہے ؎

کیفیتِ چشم اُسکی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مضمون کے بلیغ اور لطیف ہونے میں شک نہیں۔ لیکن دیکھیے یہی مضمون میرؔ کس انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

یاد آئی کسی کی چال ہمیں ہمنشیں ہم چلے سنبھال ہمیں

دونوں شعر بجائے خود قابل تعریف ہیں لیکن پہلے میں شکوہ الفاظ سے کام لیا گیا ہے اور دوسرے میں ایک خاص حالت کا اظہار سادہ الفاظ میں اس طرح کیا گیا ہے کہ سننے والوں کے قلوب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے یہی حال غالبؔ کی اُن غزلوں کا ہے جو صاف اور سادہ زبان کی بہترین مثال قرار پا سکتے ہیں۔ اُنکے یہ اشعار ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

سامع کے دل و دماغ کو جن کیفیات سے لبریز کرتے ہیں وہ مندرجۂ ذیل اشعار سے پیدا ہونا ناممکن ہے ؎

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
نکوہش مانع بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

مسٹر چکبست آتشؔ لکھنوی کے ان اشعار کو صناعی کی دلپذیر مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں ؎

وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گورِ غریباں پر ہوا ہے چرخِ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
تراشا تجھ کو جس بُت ساز نے اے بُت قیامت کی بنایا شیشہ سے نازک مزاج سنگِ خارا کو
چمن میں جا کے ہوئے شبنم دل گرا ہا تھا کیا کی گل سے بلبل حیلۂ دردِ گلو برسوں

لیکن ہمیں انکے ساتھ متفق نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اگر یہی صناعی ہے تو تصنع اور مبالغہ کس چیز کا نام ہے؟ حق تو یہ ہے کہ صناعی بجائے خود تصنع کا پہلا زینہ ہے اور اس سے شاعر کا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ گویا جب اُسے ایسا مضمون نہیں ملتا جو جدت رکھتا ہو تو وہ معمولی مضمون کو خوبصورت الفاظ سے زینت دیتا ہے تاکہ سامع انکے لفظوں میں محو ہو کر معانی و مطلب پر نہ پا سکے [illegible] شعر کی [illegible] میں کچھ ایسی دقت پسند

ہوتی ہیں کہ وہ ایک سیدھے مضمون کو بھی پیچیدہ طریقہ پر باندھتے ہیں۔ غالب کے اردو دیوان کا ایک حصہ اسی قبیل کا ہے اور مومن بھی اسی طرزِ خاص کے پیرو تھے۔ لیکن اس قسم کے اشعار کو زبان کی صناعی کا نمونہ کہنا درست نہیں لیکن اگر بہ فرضِ محال منشر کیفیت کی برائے تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی صناعی، تصنع، اور پیچیدہ طرزِ بیان کی تمیز اُنکے مقررہ معیار کے مطابق بہت مشکل ہے۔ وہ ایک طرف مومن کے اس شعر کو ؎

دشنام یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

مرصّع زبان کی خوبیوں سے مالامال سمجھتے ہیں اور امیر مرحوم کے اس شعر میں ؎

ہے چیں جبیں پہ یہ ابرو سے [illegible]
کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکپن میں

اُنھیں خمیدگی کا لفظ ثقیل اور مغلق معلوم ہوتا ہے۔ بہرکیف ہم اس افراط و تفریط دونوں کے خلاف ہیں اور ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ غزلیات میں اب کا رنگ وہی پسندیدہ ہو سکتا ہے جو میر، جرأت، اور سب سے آخر داغ اختیار کر چکے ہیں اور جو خاص و عام سے قبولیت اور ہردلعزیزی کی سند پا چکا ہے۔

زبان کی طرح داغ نے حسبِ ضرورت تشبیہات و استعارات سے جہاں کام لیا ہے میانہ روی کو مدِنظر رکھا ہے اور شاعر کو اس بارے میں عموماً نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جب طبیعت کو اسکا چسکا پڑ جاتا ہے تو صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ اور اُسے صرف الفاظ ہی الفاظ کا طلسم تیار کرنے کی لگی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تشبیہات اور استعارے زبان کا زیور ہیں لیکن زیور بھی جب حد سے بڑھ جاتے ہیں تو بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ خاتونانِ فرنگ بھی زیورات کا استعمال کرتی ہیں اور ہندوستان کی عورتیں بھی جو سیروں سونے چاندی کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہیں اور اپنی مزدورانہ حالت پر خوش ہیں، یہ صرف ناواقفی اور تنگ خیالی کا سبب ہے۔ یہی حال زبان اور صنائع و بدائع کا ہے۔ بعض اسی میں کمال پیدا کرنے کو منتہائے شاعری سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ زبان [illegible] ع سے آگاہی رکھتے ہیں اُنھیں معلوم ہے کہ صاف اور سیدھی زبان کا حسن تصنع سے جاتا رہتا ہے۔

داغ کے متعلق یہ اعتراض کیے جاتے ہیں کہ وہ پھیکی اُفتادہ تشبیہات و تلمیحات کے عادی تھے۔ لیکن انصاف پسند نظروں میں یہ صحیح نہیں سمجھے جا سکتے۔ داغ کی صاف اور فصیح زبان بعید از خیال استعاروں اور عسیر القیاس تشبیہوں کی کبھی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اُنکے لیے وہی استعارے اور تشبیہیں موزوں کہی جا سکتی ہیں جنکا ادراک سامع کی طبیعت پر بجائے کاوش پیدا کرنے کے شگفتگی پیدا کرے۔ داغ کی زبان میں ایک سادہ رُو حسین کی سی کیفیت ہے جسکی ناک میں نیم کا ایک تنکا دل فریبی کی وہ شان رکھتا ہے جو ہزاروں اور زیوروں میں نہیں ہو سکتی۔

اسوقت تک ہم کئی پہلوؤں سے داغ کی شاعری پر بحث کر چکے ہیں دو ایک معمولی باتیں اب بھی رہی جاتی ہیں لیکن بخوفِ طوالت ہم اُنھیں نظر انداز کرتے ہیں اور اب داغ کے کلام پر عمومی حیثیت سے ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں اُن کے اشعار کی کسی خاص نوعیت سے تعلق نہ ہوگا بلکہ ہر صنفِ کلام پر سرسری تنقید کرینگے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ داغ اپنے رنگ کے موجد اور مالک تھے۔ اُنکی دیکھا دیکھی اور بھی شاعروں نے اُن کی تقلید کی لیکن نقل میں اصل کا رنگ نہ آ سکا۔ متقدمین میں جرأت کا رنگ داغ سے ملتا ہوا ہے لیکن داغ جس منزل پر پہنچے ہیں جرأت کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی، اور صفات کے ماسوا سب سے بڑی خصوصیت داغ کے کلام کی یہ ہے کہ اُنکے جذبات و محسوسات بالکل نیچرل ہیں اور اسی وجہ سے تاثیر سے دست و گریباں ہیں۔ کلام کی شوخی، طرزِ بیان کی جدت، خیالات کی برجستگی، یہ تمام باتیں داغ کے اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ عشق و محبت کے رمز و کنائے، محاورے، چٹکلے، روزمرہ، یہ چیزیں داغ کی خاص ملکیت ہیں۔ یہ خصوصیات اور شعراء کے کلام میں بھی ایک حد تک موجود ہیں لیکن داغ نے ان پر جدت کا ایسا گہرا رنگ چڑھایا ہے کہ گویا یہ اُنھیں کا

خاص ایجاد ہے۔

حشو و زوائد اور تقریباً عیوبِ شعری سے اُن کا کلام عموماً پاک و صاف ہے اور اُن کا ایک ایک شعر نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا نمونہ ہے۔ اُن کے خیالات میں تازگی ہے اور اسلوبِ بیان اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ باید و شاید۔ کوئی خیال اور کیسا ہی مضمون کیوں نہ ہو اُسے اس طرح ادا کر دیں گے کہ اُس کی نزاکت اور شگفتگی دوبالا ہو جائے گی۔

نظر بندی اور مبالغہ اُن کے تخیل کے حدود سے باہر ہیں۔ جو بات کہتے ہیں اس قدر سادہ اور سچی ہوتی ہے کہ دل پر اثر کرتی ہے۔ علمی دقائق اور فلسفیانہ نکات اُنھوں نے حل نہیں کیے لیکن جو کچھ بھی کہا ہے مؤثر طریقہ پر کہا ہے۔

میر تقی کے حال میں مولنا آزاد مرحوم فرماتے ہیں

انکا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے۔

یہی کیفیت داغ کی غزلیات کی ہے کہ پڑھنے والا اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق اس میں دلچسپی کا سامان پا سکتا ہے۔ اگر ایک شاہد باز اُن کے اس شعر سے

کسی کی شرم آلودہ نگاہوں میں یہ شوخی ہے  اسے دیکھا اُسے دیکھا اِدھر تاکا اُدھر جھانکا

کو پڑھ کر مزا لیتا ہے تو اصحابِ ذوقِ سلیم اس کے لطف سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں کہ سے

فلک پر وہ بنا اہلِ زمیں کی پردہ داری کو  مگر اس دشمنِ جاں نے کسی کا عیب کب ڈھانکا

یہ غزل اُسی طرح میں کہی گئی جسے ناسخ، آتش، غالب، امیر سب روند چکے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں میں پھولنا پھلنا شاعر کے پختہ کار ہونے کی دلیل ہے۔ داغ کے یہ چند اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں سے

مزا ہر ایک کو تا زندگانی ہے عشقِ جاناں کا  نگہ کو دیدِ کا لب کو فغاں کا دل کو ارماں کا

یہ کیا ہے آج غیروں سے مری تعریف ہوتی ہے  یہ کیا ہے خود بیاں ہوتا ہے اپنے جورِ پنہاں کا

مریضِ جاں بلب دیکھے ہیں پر ایسے نہیں دیکھے  خدا حافظ نہیں ہوتا ترے بیمارِ ہجراں کا

سرِ محفل مجھی سے تجھ کو ظالم پردہ کرنا تھا  پھر اُس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے منہ ڈھکنا

ان اشعار کی کیفیت کچھ اور ہی ہے سے

سرِ تنگ تلخ کی تلخی گوارا ہے تو مجھ کو ہے  زمیں پیتی نہیں آنسو بلا ہے چشمِ گریاں کا

بنا کر اپنا دیوانہ الگ بچ کر نکل جانا  ترے دامن سے لینا ہے ہمیں بدلہ گریباں کا

وہ چشم آلہ بھی ہے کے قابل ہوئے وحشت  نظر میں جس کی پہلے چبھ گیا کانٹا بیاباں کا

غالب کی یہ غزل بہت مشہور ہے سے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اس زمین میں بھی داغ اپنا جداگانہ انداز قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں سے

جوشِ گریہ سے یہ آنکھیں ابرِ نیساں ہو گئیں  اب مری بیتابیاں مشہورِ دوراں ہو گئیں

رازِ الفت چھپ سکا ہے نہ اُس کے روبرو  صاف دل کی حسرتیں منہ پر نمایاں ہو گئیں

اب کسی سے دل لگا کر ہم نہوں گے پائمال  جو خطائیں ہو گئیں لے چرخِ گرداں ہو گئیں

وہ نہ آئے جب شبِ وعدہ نہ آئی مجھکو نیند  آرزوئیں دل کی سب خوابِ پریشاں ہو گئیں

داغ اب یوسف کہاں لیلی کہاں شیریں کہاں
جو حسیں شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں

یہ غزل بھی غالب کی طرح پر کہی گئی ہے سے

قول تیرا شوق میرا چاہیے  جھوٹ سچ کے واسطے کیا چاہیے

اس میں یہ چند شعر بیت الغزل ہیں سے

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی  اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں  آج تو کوئی سہارا چاہیے

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر  دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

اسی طرح میں ایک اور مختصر سی غزل زمانہ امیر کی [illegible] رہے۔ دیکھیے [illegible] کا تماشا

سب متاعِ دین و دُنیا چاہیے ۔ اے ہوس تجھکو بھی کیا کیا چاہیے
اُڑ گیا بادِ خزاں سے آشیاں ۔ تجھکو تنکے کا سہارا چاہیے
اب تو دیکھی ہے بُری حالت مری ۔ پھر بھی دیکھیں گے وہ دیکھا چاہیے

آتش کی غزل ہے ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لا خیر کا مقام نہیں ۔ ہمارے گنجفے میں بازیِ غلام نہیں

اسیر ناسخ نے بھی خوب کہا ہے۔ مگر داغ کا رنگ سب سے نرالا ہے۔ کہتے ہیں ؎

کبھی فلک کو پڑا دلجلوں سے کام نہیں ۔ اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں ۔ اگر نہیں تو کسی بات پر قیام نہیں
الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا ۔ کچھ ان کی ذات سے دُنیا کا انتظام نہیں
پیوں پلاؤں تجھے دُور ہی سے ترساؤں ۔ یہ روزِ عید ہے زاہد مہِ صیام نہیں

داغ کا یہ رنگ وہی ہے جو عام پسند کہلاتا ہے لیکن جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں صرف یہی انداز اُن کی شہرت کا ضامن نہیں۔ اکثر مقامات پر اُنکا طرزِ کلام آزادانہ ہوتا ہے لیکن نازک خیالی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں ۔ آدمی دنیا سے خوش بیٹھے اگر کچھ بھی نہیں
آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے ۔ سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
امکاں میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے ۔ یکبیں ہیں تو اُدھر ہوں کہ ادھر کچھ بھی نہیں

ہمنے اب تک اساتذہ کے کلام سے صریحی موازنہ کرنے سے عمداً اجتناب کیا ہے لیکن اسکی دو ایک مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سے کسی شاعر کا نقص کمال ظاہر کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اور شعراء کے ساتھ داغ کی کیا حالت ہے اور اُن کے اور اِن کے تخیلات میں کون امتیازی فرق نمایاں ہے

آتش ؎ سمجھتے ہیں مرے دل کی وہ کیا نہ فہم و نادان ہیں
غرورِ شمع ہے ... ہے

امیر ؎ ہماؤں اُستخوانِ سوختہ پر میرے گرتا ہے
تڑپ کر شمع پر جیسے کوئی پروانہ آتا ہے

داغ ؎ تڑپتا لوٹتا اُڑتا جو بے تابانہ آتا ہے
یہ مرغِ نامہ بر آتا ہے یا پروانہ آتا ہے

داغ نے پروانہ کا قافیہ ایک اور باندھا ہے اور نازک خیالی وجدت طرازی کی ایسی مثال پیش کی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ کہتے ہیں ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھکر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

میر ؎ برقع کو اُٹھا چہرے سے وہ بت اگر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

سودا ؎ اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ بر آئے
بجلی کو دمِ سرد سے جسکے حذر آئے

داغ ؎ جب آسکے مقابل مرے داغِ جگر آئے
خورشیدِ قیامت کو بھی تارے نظر آئے

نظر کا قافیہ داغ نے ایک اور بھی بہت اچھا باندھا ہے ؎

حُسن آئینۂ عشق ہو عشق آئینۂ حُسن ۔ میں تجکو نظر آؤں مجھے تو نظر آئے

امیر و داغ کا جھگڑا ایک مدت تک رہ چکا ہے۔ ہم اُس آگ پر تیل ڈالنا نہیں چاہتے جو اِن دونوں باکمالوں کی موت سے سرد ہو چلی ہے۔ قصداً ان دونوں کے ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار لکھے نہیں گئے لیکن اگر اں کا امتیازی رنگ دریافت کرنے کی ضرورت ادبی دلچسپی کے اعتبار سے مسلم ہو تو ہم صرف ان دونوں اُستادوں کا ایک ایک شعر لکھنے پر اکتفا کریں گے جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک ہی خیال کو ایک ہی پیرائے میں دونوں اپنی اپنی جگہ کس طرز پر ادا کرتے ہیں ؎

امیر ؎ کبھی سمجھا نہ آگے کیا ہم اُس خود سر کو سمجھاتے
سمجھ جاتا اگر تا کسی تصویر کو سمجھاتے

داغؔ سے : سمجھا عمر گذری اُس بُتِ خود سر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

مندرجۂ بالا سطور سے ناظرین اندازہ کریں گے کہ داغؔ کی طبیعت کس قدر مستقیم اور اُنکا رنگ کتنا پختہ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اُنکا شعر سنکر بے اختیار سامع کو داغؔ کے اندازِ بیان اور لطفِ خیال کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہ صفت صرف اُس شخص کے کلام میں پائی جاتی ہے جو "بدو فطرت سے ایک خداداد طبیعت لیکر آیا ہو"۔ داغؔ کا کلام ہندوستان کے ہر طبقہ میں اس قدر ہر دل عزیز ہے کہ اُسکا نمونہ پیش کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں۔ اُنکی غزلیات کا ایک حصہ اوپر گذر چکا ہے اور کچھ جستہ جستہ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں جن سے اُنکی زبان اور بیان کے ساتھ قوتِ تخیلہ کی سحر کاریوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ طوالت کا خیال نہ ہوتا تو اس بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جاتا۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا    جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دیکھا ہے بتکدہ میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ    ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

شکر کرتا ہوں کہ شکوہ نہیں لب پہ آیا    دیکھ تو کون وہ اے داورِ محشر آیا

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا    کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا
دل کا کوئی مامی دمِ بسمل نہیں ہوتا    کمبخت کلیجہ بھی تو شامل نہیں ہوتا

اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا    دوسرا نام ہے یکتائی مری تنہائی کا

مرے ہی واسطے بیٹھا ہے پاسبان در پر    ملے جو راہ میں کہتے ہیں آئیے گھر پر

ناز کرنے والے ناکام بُرے ہوتے ہیں    کہ بُرے کاموں کے انجام بُرے ہوتے ہیں

ذبح کیجے نہ مجھے میں تو یونہی مرتا ہوں    آپ کیوں لیتے یہ الزام بُرے ہوتے ہیں

باغ میں گل کھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں    انگلیاں سرو اُٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

نہیں منظور جو جینا تو دم چارہ گری    ہم مسیحا کو ڈراتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں    ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے تو کچھ دور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے    صاف کہہ دیجیے ملنا ہمیں منظور نہیں

پوشیدہ جب ہو راز کہ گستہ میں زباں نہ ہو    ہم بات بھی کریں تو بغیر از فغاں نہ ہو

میرے پہلو سے وہ اُٹھے غیر کی تعظیم کو    بندگی کو بندگی تسلیم ہے تسلیم کو

مقتضائے وقت کا پابند ہر حالت میں ہوں    میں زمیں پستی میں ہوں تو آسماں فوقت میں ہوں

جہاں ہوں جس جگہ ہوں ہمدم ہمتا کامل ہوں    نظر آنکھوں میں ہوں منہ میں زباں ہوں سینہ میں دل ہوں

خدا نے خیر کر دی بچ گئی دامن سے عزت    یہی کہنا پڑا کچھ مانگنے آیا ہوں سائل ہوں

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی    اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

میرا یہ دعوے سوا تیرے کوئی دل میں نہیں    اُسکا یہ الزام اچھی قید تنہائی ہوئی

کچھ بھی الفت نے تری دل میں نہ چھوڑا باقی    رہ گئی ایک تمنا ہی تمنا باقی

مرے یاد کرنے سے یہ مدعا    نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

موجود ہر جگہ ہے نہیں بے نشاں کہیں    وہ ہر کہیں ہے ڈھونڈھیے اُسکو جہاں کہیں

میں غیر کی نگاہ میں تم میرے دل میں ہو    میرا مکاں کہیں ہے تمہارا مکاں کہیں

غور بے طور ہوئے جاتے ہیں    وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں
اب تو بیمارِ محبت تیرے    قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں
کچھ خبر بھی ہے محبت میں داغؔ    کیا ترے اور ہوئے جاتے ہیں

فرشتے کو پکڑ رکھیں ترے دامن ایسے ہیں    خدا سے بھی نہیں ڈرتے یہ بے ایمان ایسے ہیں

اگر تو بھی نکالے گا نکلیں گے نہ نکلیں گے    مرے ارمان اتنے ہیں مرے ارمان ایسے ہیں

رقیبوں کو محبت کا ہے دعوے اے تری قدرت    یقیں ہے تمکو وہ بھی خدا کی شان ایسے ہیں

یہ سر کے ساتھ جائیں گے یہ دم کے ساتھ جائیں گے    ہمارے سر پہ آسمفجاہ کے احسان ایسے ہیں

رگِ جاں سے نزدیک ہے میری جاں تو    مگر پھر جو دیکھا کہاں میں کہاں تو

حقیقت میں ہے ماسوا چیز ہی کیا    اِدھر تو اُدھر تو یہاں تو وہاں تو

حیا و شرم سے چپ چاپ کب وہ آ کے چلے    اگر چلے تو مجھے سیدھیاں سُنا کے چلے

خبر نہیں کہ کوئی تاک میں بھی بیٹھا ہے    یہ جھوٹ ہے میں کہاں آپ منہ چھپا کے چلے

کر چکے آہ سحر بھی نالۂ شبگیر بھی    جتنے دیکھا چوکتے یہ تیر بھی وہ تیر بھی

چھوڑ کہنے کہ نہ ہوں چیز ... آتے آتے چہرہ ... کی کھنچوائی فقط تصویر بھی

... کرنا تو پھر سدان خالی ہے

کدورت دل سے جو فریاد کرنے میں نکالی ہے	وہ کہتے ہیں محبت پر ہماری خاک ڈالی ہے
ہوا ہے چار چھ دن پر یہ دعوی زاہد و تم کو	خدا نے کیا تمہارے ہاتھ جنت بیچ ڈالی ہے
بجا تھا برق دم صرصرے پشکل آشیاں دیا	نظر صیاد کی اب چپے چپے ڈالی ڈالی ہے

تاک کر دل کو وہ فرماتے ہیں دل اچھا ہے	یہ خدا کی قسم اندازِ سوال اچھا ہے
یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے	ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے
وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو	آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

آپ پچھتائیں نہیں جور سے [illegible] شکریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

داغ ایک فطرتی شاعر تھے اور اُنکا رنگ خداداد تھا۔ ان کی غزل قصیدہ، رباعی، قطعے [illegible] ایک ہی شانِ تخیل کے مُظہر ہیں۔ قصیدہ کی بابت ہمیں کچھ زیادہ لکھنا نہیں کیونکہ ہماری عاجزرائے میں میر کی طرح اُنکی شہرتِ کمال کا ذریعہ اُنکی غزلیں ہیں اور میدانِ تغزل ہی اُنکا مارا ہوا ہے۔ قصیدے اُنھوں نے متعدد لکھے اور اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو قصیدہ نگاری کے معیار پر بھی پورے اُترتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف خاص میں ان کے ہمعصر منشی امیر احمد مرحوم امیر مینائی اُن سے کئی منزل آگے ہیں۔ بیشک قصیدوں میں داغ کی خصوصیات کلام، با حسن الوجوہ موجود ہیں اور تشبیب و تمہید و مدح کی دشوار گزار گھاٹیاں اُنھوں نے بہت خوبی سے طے کی ہیں۔ اُنکا اندازِ بیان اور تاثیرِ کلام غزلوں کی طرح قصائد میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ مثلاً یہ تمہید سے

نہاں وہ عقدۂ لاحل کہاں وہ سخت دشواری	ہوئی پابند آزادی سے اب میری گرفتاری
شگفتہ دل مرا اتنا کہ جتنا تنگ دل غنچہ	مجھے وہ خواب راحت جس قدر گل کو بیداری
طبیعت میں مری ایسی نزاکت ہے لطافت ہے	کہ مضمونِ میانِ یار بھی زنجیر ہے بھاری

مدحیہ اشعار:- سے

ترقی بزم طرب انگیز و عشرت خیز ایسی ہے	تماشا کی کرتے ہیں پری رویانِ فرخاری
[illegible] کیا جانے کو نزادوں کی گھاتوں کو	تمنو را جا ہے ان باتوں [illegible]

سخن فہم و سخن گستر سخن دان و سخن پرور	تجھی سے حسن کو رونق تجھی سے حسن شاری

اس بات کے شاہد ہیں کہ غزل کا رنگ قصیدہ میں بھی قائم رکھا ہے گھوڑے کی تیز روی کی تعریف کرتے ہیں تو عاشق کی آہ رسا سے تشبیہ دیتے ہیں سے

ترے اسپ پری پیکر کی چالاکی کا کیا کہنا	نہیں آتی تصور میں بھی جس کی تیز رفتاری
وہ پہنچے اس طرح اک جست میں مشرق سے مغرب تک	کہ جیسے آہ عاشق ہو رسا تا چرخ زنگاری

غرض ہماری رائے ناقص میں داغ کے قصائد بجائے خود اصولی اور قابل تعریف ہیں۔ ہاں شکوہ الفاظ اور شوکت مضمون کا طلسم اُنھوں نے نہیں تیار کیا اور اسی لیے معیار مقررہ کے مطابق سودا، انشا، اور ذوق کے قصیدوں سے اُنکا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ امیر مینائی بھی اس معرکہ میں اُن سے سر برآ ہو گئے ہیں۔ لیکن ان اساتذہ سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو داغ اس فن میں بھی بیسیوں سے اچھے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ جو کیفیت اُنکی غزلوں کی ہے وہ شان قصیدے کی نہیں۔

رباعیات بھی داغ نے اپنے رنگ میں خوب کہی ہیں۔ ہم مثالاً چند رباعیاں نقل کرتے ہیں سے

بیگانہ یہاں ہر اک یگانہ دیکھا	اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض کا اپنی	دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

---

دنیا میں کب انسان کی حاجت نکلی	حسرت ہی رہی نہ کوئی حسرت نکلی
جیتے تھے قیامت کی توقع پر ہم	خود وقت کی محتاج قیامت نکلی

---

کہتے تھے نہ عشق بت خود کام کرو	پہلے ہی سے اندیشۂ انجام کرو
بیتابیٔ دل کی ہے شکایت ناحق	اے داغ بس اب قبر میں آرام کرو

---

دن کیوں نہ بڑھتے نماز کیوں کم ہو ... روزوں کے عوض کھاتے ہیں یہ راتوں کو
اخلاقی مضامین کے عوض زیادہ تر عشقیہ باتوں کی کھپت رباعیوں میں
کی گئی ہے۔ اگر شیخ اول کی طرف توجہ کرتے تو علمی طور پر ان سے وہی فائدہ
مترتب ہوتا جو رباعیاتِ حالی سے ہوتا ہے اور یقیناً اردو زبان میں یہ ایک
قابل قدر اضافہ ہوتا۔

داغ کی زندگی میں اُن کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے گلزارِ داغ،
آفتابِ داغ، مہتابِ داغ۔ پہلا اُن کے اولیں کلام کا مجموعہ ہے اور یہ اُس
وقت شائع ہوا ہے جب وہ رامپور میں تھے۔ آفتابِ داغ میں کچھ غزلیں
رامپور کے زمانہ کی ہیں کچھ اُسکے بعد کی۔ مہتابِ داغ حیدرآباد سے نکلا
... وفات کے بعد غیر مطبوعہ کلام کا ایک اور مجموعہ یادگارِ داغ کے نام سے
... ہوا ہے جس کا ضمیمہ ... سال میں لالہ سری رام صاحب ایم اے دہلوی
نے ... اس میں وہ غزلیں اور متفرق اشعار ہیں جو اوپر کے چاروں
... میں چھپنے سے رہ گئی تھیں غرض کہ داغ کی ساری زندگی کی یہی
... ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اولاد معنوی قیامت تک اُن کا نام
... لکھنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ ایک مختصر
... فریادِ داغ بھی ہے جس میں اُنھوں نے اپنی ایک سرگذشت قلمبند کی
... واقعہ کی نوعیت اور ... حسن و قبح پر غور کرنا فرائضِ تنقید
... سے باہر ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ اصولاً فریادِ داغ کس پایہ کی ہے۔
یہ کتاب جو ۷۵ صفحوں پر ختم ہوئی ہے سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ
چلتا ہے کہ علمی نقطۂ خیال سے وہ بدرِ منیر وغیرہ کے پہلو میں جگہ نہیں پا سکتی
... سے کسی خاص وقت کی سوسائٹی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے نہ کوئی
واقعاتی منظر ایسا ہے جو نیچرل کہا جا سکے۔ معنوی اعتبار سے بھی مثنوی کچھ
... نہیں۔ البتہ چند امور جو قابلِ توجہ ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ واقعات
... میں کسی مافوق العادت قوت سے کام نہیں لیا گیا۔ زبان نہایت
... صحیح ہے۔ بیان کا تسلسل قابلِ تعریف ہے۔ فارسی ترکیب
اور ثقیل الفاظ مطلق نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے بیٹھے باتیں
کر رہے ہیں۔ مثلاً نواب رامپور کی مدح میں یہ اشعار کس قدر سادہ
اور فصیح ہیں ؎

مدحِ نواب نامدار کروں    جان قربان دل نثار کروں
حامیِ دین و ... آگاہ    شاہ درویش خوئے ظل اللہ
وہ دلاور رئیس اختر ہند    وہ مخاطب مشیرِ قیصرِ ہند
اس سخی کا ہے کام دینے کا    ایسے دینے سے نام دینے کا
کیا خزانہ ... پایا    دل خزانہ سے بھی بڑا پایا
سو ہنر ایک بات میں دیکھے    سو ہنر ایک ذات میں دیکھے
مسند آرا رہے رامپور رہیں    تا قیامت مرے حضور رہیں
ہے عجب شہر مصطفےٰ آباد    اسکو رکھے مرے خدا آباد
سب اسے رامپور کہتے ہیں    ہم تو آرامپور کہتے ہیں

خیر تو آپ کی سناتے ہیں
جسکا کھاتے ہیں اُسکا گاتے ہیں

اسی طرح کلکتہ سے واپسی کا تذکرہ قابل دید ہے ؎

میری رخصت کے دن تمام ہوئے    عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے
جلد حاضر ہو یہ پیام آیا    اور سر پہ مرے پیام آیا
پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا    دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا
اس طرح کس طرح ٹھہر جاتے    ہوئے باون برس نمک کھاتے
گر نمک خوار حید گر نکلے    تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے

واپسی کے بعد اندوہ فرقت کی کیفیت کسی قدر سادہ مگر موثر پیرائے
میں دکھائی ہے ؎

مرض غم سے کب افاقہ تھا    دن کو روزہ تو شب کو فاقہ تھا
سحری اک زمانہ کھاتا تھا    رمضان مجھکو کھائے جاتا تھا
صدمۂ ہجر و کاوشِ غم سے    عید بدتر ہوئی محرم سے

شادیانے کا شور ہم ہے    میں سمجھتا ہوں میرا ماتم ہے

× × × × × × × × × × × × ×

کھانے پینے سے مجھکو نفرت ہے    عید کو روزہ کیا قیامت ہے

اے جب زہر بھی نہ پائیں ہم    کیا کلیجہ بڑوں کا کھائیں ہم

غرض فریادِ داغ میں سلاستِ زبان اور روانیِ کلام کی وہی صفتیں کھنچی ہوئی ہیں جو داغ کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ اسکے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ غالباً داغ نے بھی اسے پبلک کے لیے مرتب نہیں کیا بلکہ ایک ذاتی سرگذشت کو نظم کا جامہ پہنانے سے یہ مقصود رہا ہوگا کہ دل کا بخار نکل جائے۔

اس مضمون کے آخر میں داغ کے ملکۂ تاریخ گوئی کا سرسری تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کے لیے یہ لابدی نہیں کہ وہ تاریخ گو بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بھی ایک کمال ہے۔ ناسخ و ذوق وغیرہ کے اکثر تاریخی مادّے جو خاص مواقع پر نی البدیہہ کہے گئے بہت مشہور ہیں۔ مہتابِ داغ میں داغ کے متعدد تاریخی قطعات ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انھیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ سب سے بڑی خوبی اُن کے تاریخی جملوں میں یہ ہے کہ اُن سے اُس واقعہ کا لفظاً اظہار ہوتا ہے جس سے وہ متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً حضور نظام کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنے اور باریابی پانے کی تاریخ کہی تھی

یہ کہدو ملے داغ سلطان سے

۱۳۰۸ھ

ایسے ہی جب اُن کے آقائے ولی نعمت نے انھیں ایک گھڑی انعام میں دی تو اسکی تاریخ یہ کہی

مرصع منور گھڑی شاہ نے دی

۱۳۱۱ھ

سونے کا توڑا ملا تو اسکی یہ تاریخ ہوئی

یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا

۱۳۱۲ھ

حضورِ غفراں مکان نے تلواریں مرحمت کیں تو یہ تاریخی فقرہ موضوع ہوا

لکھدو اے داغ    عنایت ہوئیں تلواریں آج

۱۳۱۳ھ

تاریخی مادّوں کے علاوہ دو ایک سہرے بھی داغ کی تصنیف سے بہت اچھے ہیں غرض داغ ایک مکمل شاعر تھے۔ ایسے جامعِ خصوصیاتِ اہلِ کمال ملک کی عام قدردانی کے حق دار ہیں اور ضرورت ہے کہ ان مشاہیر کی مستقل یادگار قائم کرنے کی صورت پیدا کی جائے

سید محمد فاروق

## کلامِ شاد

بحرِ فنا شمار نہ اہلِ حیات را    آئینۂ وجود بداں کائنات را

واللہ ہیچ نیست بجز ذاتِ کبریا    جائے کہ جمع کردہ اسما صفات را

نقشیست بستہ صورتِ امواجِ بحرہا    ساحل مجوے قلزمِ رنگِ ثبات را

یک دو نفس بس است اگر زندگی خوش ست    خواہم نہ از خضر گہے آبِ حیات را

ہر چند اختلافِ صور نقشِ کثرت است    لیکن بہ یک وجود ببیں ممکنات را

دریائے ذاتِ اوست کہ پیدا کنار نیست    دانم حبابِ ہستیِ ایں کائنات را

بیداریست و خواب و گر ہیچ نیست شاد    ایں دو صفت بداں تو حیات و ممات را

# حیات النذیر

مولنا مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کی ذات والاصفات عجیب و غریب خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ہندوستان کے اُن تمام مشاہیر میں جنکی خدمات علمی و ادبی نمایاں اعزاز کا استحقاق رکھتی ہیں مرحوم کا درجہ نہایت بلند اور بہ غایت ارفع تھا۔ آپ کے قومی کارنامے اگر ایک طرف آپکو ملک و قوم کا حقیقی بہی خواہ ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی قلمی خدمات اور ادبی کارگزاریاں آپ کو ادب اُردو کا ایک بے لوث، بے غرض، اور بے لاگ سرپرست ظاہر کر رہی ہیں۔ اُردو لٹریچر کی آج سے دس بیس برس پہلے کیا بساط تھی۔ فسانۂ عجائب اور اسی قماش کی چند کتابیں ہمارے خزانۂ ادب کی گویا بیش بہا پونجی سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن دعا دینا چاہیے اُن بابرکت نفوس کو جنھوں نے اُردو کو اپنی مساعی جمیلہ سے اس قابل کیا کہ آج وہ بھی معاصر السنہ سے آنکھ ملانے کا دعوے رکھتی ہے اور بجا رکھتی ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا شمار اُسی مقدس طبقہ میں ہوتا ہے جس کے افراد نے اُردو کو قعرِ ذلت سے نکال کر اوج رفعت پر چڑھانے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اس بابرکت جماعت میں لحاظ اپنے کام کے وہ بہت سوں سے آگے ہیں لیکن پیچھے کسی سے نہیں۔ اُنھوں نے اُردو کی دستگیری اس حالت میں کی کہ اُسکی کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ نونہال اُردو کے پروان چڑھانے کی کوشش آج خواہ کسی صورت میں ہو رہی ہو اور اسکے اطمینان بخش نتائج آگے چلکر خواہ کچھ ہی کیوں نہ نکلیں لیکن اِس نونہال کی پرورش جس زمانہ شناس اور علم دوست پارٹی نے ابتداءً کی اُسکا احسان کوئی بھول نہیں سکتا اور بلا شبہہ علمی حیثیت سے مولنا نذیر احمد کو اس پارٹی میں غیر معمولی نام و نمود حاصل تھی۔ ان تمام وجوہ سے اُردو زبان سب سے زیادہ بد قسمت اور اُردو کے موجود الوقت اہل قلم محسن کش سمجھے جانے کے مستحق تھے اگر مولنا کی سوانح عمری خود اسی زبان میں مدون نہ ہوتی جس کی فلاح و اصلاح کی دُھن میں اُنکی ساری زندگی نذر ہوئی تھی۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب نے اُردو کو اس بدنصیبی سے اور اہل قلم طبقہ کو اس الزام سے "حیات النذیر" تالیف کرکے صاف بچا لیا ہے۔

حیات النذیر، جیسا کہ نام سے آشکارا ہے، مولنا نذیر احمد مرحوم کی مفصل، مدلل، اور مشرح لائف ہے جسکی تدوین کا امتیازی فخر سید افتخار عالم صاحب کو حاصل ہوا ہے۔ اسکا ملال ضرور ہے کہ باوجودیکہ اسکی ترتیب کا آغاز صاحب سوانح کے حین حیات ہو چکا تھا لیکن بعض موانع اُنکی زندگی میں اسکی اشاعت میں حارج رہے۔ اور مولنا کے انتقال کے تقریباً ۸ مہینے بعد یہ شائع ہوئی ہے۔ اس تعویق کے لیے حضرت مولف خود متاسف و عذر خواہ ہیں اور اُن مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوے جو معمولی سی معمولی کتاب کی تیاری میں بھی بالعموم پیش آیا کرتی ہیں سید افتخار عالم صاحب پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا، جنھوں نے "حیات النذیر" ایسی ضخیم و مطول تالیف کی گراں قدر ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ قدر دانان علم و فن کو خوش ہونا چاہیے کہ اُن کے حلاوت اندوز ہونے کا سامان سید صاحب نے نہایت محنت و جاں کاہی سے فراہم کیا ہے اور سید صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے اپنی غیر معمولی تلاش و جستجو سے وہ کام لیا ہے جس کی انجام دہی ہر ایک کے احاطۂ امکان سے قطعی خارج ہے جس دلچسپی سے اُنھوں نے یہ فرض ادا کیا ہے اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود مولنا مرحوم سید صاحب کی اس کوشش کو غیر مستحسن سمجھتے تھے اور آپ نے کسی قسم کی بھی امداد دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا لیکن سید صاحب دُھن کے پکے اور خیال کے پورے تھے۔ تمام مشکلات کا سامنا جواں مردی سے کیا۔ گل چینی میں کانٹوں کی خلش بخوشی گوارا کی

اور بالآخر "حیات النذیر" کی شکل میں منتشر و پراگندہ پھولوں کو جمع کر کے ایک ایسا گلدستہ تیار کر دیا جسکی دلکشی و دلفریبی دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی صلاحیت بخوبی رکھتی ہے۔

اس مقام پر حیات النذیر کی تقسیم و ترتیب کا اجمالی تذکرہ غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ شروع میں، فہرست مضامین کے بعد جناب حاجی محمد حمید اللہ خان صاحب بہادر، اے۔ ڈی۔ سی، فرزند اصغر علیا جناب بیگم صاحبہ بھوپال کی شبیہ ہے جن کے نام نامی پر اس کتاب کو معنون ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ پھر اُس زبردست ہیرو کا عکسی فوٹو ہے جس کے زبردست کارنامے اس ضخیم و جسیم سوانح عمری میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے سب سے اول مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ اور اُسکے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو مقدمہ نگاری کا فی الواقع ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ اسکے بعد مولانا شبلی، خواجہ حالی، اور مفتی انوار الحق وغیرہم کے وہ ریویو شامل کر دیے گئے ہیں جو ان فضلاء نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تحریر کیے تھے۔ پھر مصنف کا خاص دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب کے مطالب شروع ہو گئے ہیں جن کی تقسیم باعتبار مدارجِ حالات و ترتیب واقعات سات حصوں پر اس طرح کی گئی ہے کہ

حصۂ اول میں پیدائش سے لیکر قبل ملازمت کے واقعات ہیں

حصۂ دوم میں ابتدائے ملازمت سے اُس زمانہ تک کے واقعات ہیں کہ مولانا حیدرآباد نہیں گئے تھے

حصۂ سوم میں حیدرآباد کی ملازمت اور تعلقات کا تذکرہ ہے

حصۂ چہارم میں مولانا کا حلیہ، اخلاق و عادات، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

حصۂ پنجم میں اُنکی تصانیف و تالیفات و تراجم پر ایک مبسوط تبصرہ ہے

حصۂ ششم میں اُنکے مذہبی اعتقادات و تلقینات کا پہلو دکھایا گیا ہے

حصۂ ہفتم میں چند ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کئی اس قابل تھے کہ انھیں اصل متن میں جگہ دیجاتی تو انسب تھا۔

سطور بالا سے سرسری طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ لائق سوانح نگار نے اپنی تصنیف کو مکمل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ نہ کوئی پہلو جس سے مولانا نذیر احمد کی لائف پر روشنی پڑ سکتی ہو نظر انداز ہونے پایا ہے اور سچ یہ ہے کہ ایسے زبردست شخص کے حالات اسی کے مستحق تھے کہ اسی تفصیل و تکمیل کے ساتھ لکھے جاتے جس کی صدہا "حیات النذیر" کے صفحات میں کھنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مولانا نذیر احمد غیر معمولی شخصیت کے بزرگ گزرے ہیں اور اُن کے اوصاف کی گوناگونی انھیں اقران و اماثل میں ممتاز درجہ دلانے کی شدو مد سے سفارش کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے واقعات زندگی خصوصیت سے دلچسپ و سبق آموز ہیں۔ مولانا کا شمار بجا طور پر دنیا کے اُن مشاہیر میں ہونا چاہیے جنھوں نے نہایت چھوٹی ابتدا سے بالآخر کامیابی کے مدارج طے کیے ہیں اور اس امر خاص میں وہ کسی غیر کے نہیں بلکہ اپنی ہی سعی و جاں فشانی کے رہین منت ہو سکتے ہیں۔ فرینکلن کا مقولہ ہے کہ "اولوالعزم آدمی، خواہ اُسکی حالت بظاہر کتنی ہی پست کیوں نہ ہو، تاہم وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کا راستہ خود اپنی طبیعت سے نکال لیتا ہے"۔ مولانا نذیر احمد کے متعلق اگرچہ فی نفسہ اس قول کی تطبیق صحیح نہ ہو، پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک خود ساختہ کامیاب شخص گزرے ہیں۔ اور اُنکے حالات اور طور و طریق کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہر ایک آدمی، جو اس دنیا میں رہ کر شہرت و عظمت کے مراتب طے کرنا چاہتا ہے، کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

"کامیاب زندگی" سے یہی مراد نہیں ہے کہ انسان فکر معاش سے مستغنی ہو یا اُسکے پاس گنج وافر موجود ہو۔ کیوں کہ عقلاً "کامیابی" کی یہ صورت ہے تو ضرور، لیکن بالکل ادنیٰ اور ابتدائی۔ ہاں وہ شخص البتہ



شمس العلما، مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم

"کامیاب" کہلانے کا بوجہ احسن مستحق ہے جسکا وقت، جسکا مال، جسکا دل، جسکا دماغ اس کے بھائیوں، یا دوسرے الفاظ میں "بنی نوع انسان کے فائدہ میں کام آئے۔ ثانی الذکر شق سے قطع نظر، اور ہر ایک پہلو سے مولانا نذیر احمد مرحوم کے کارنامے گویا اس بات کا ثبوت ہیں کہ انکی ذات ملک و اہل ملک کے حق میں سرچشمۂ فیض و برکت تھی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر انکی وہ علمی کوششیں تھیں جنھوں نے اردو کے جسد بے روح میں فی الواقع جان ڈالی۔ اگر مولانا مرحوم کے علمی کارناموں پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی جائے اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ ان سے کیا کیا بیش قیمت اور دیرپا نتائج حاصل ہوے اسوقت انکی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج کل تعلیم نسواں کی جو ہڑبونگ مچی ہے وہ بلاشبہ ایک طوفان بے تمیزی کی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ حامیان تعلیم نسواں، جن میں سے اکثر خالص جوش ہمدردی کی بنا پر صنف نازک کی بہتری و فلاح کے وسائل سوچنے پر آمادہ ہوے ہیں، اپنی اپنی جگہ کیا کچھ نہیں کر رہے۔ نابل اسکول کھولنے کی فکریں ہو رہی ہیں، اعلیٰ تعلیم نسواں کے سامان بہم پہنچائے جا رہے ہیں، رسالے جاری کیے جاتے ہیں، نمائشیں ہوتی ہیں اور زنانہ کانفرنس کا خواب بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن انصاف سے دیکھیے تو جو کام چپ چپاتے مولانا نذیر احمد کر گئے ہیں وہ اپنے علمی نتائج کے اعتبار سے ان تمام نقش بر آب کوششوں سے کہیں افضل و اعلیٰ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ تعلیم نسواں کے متعلق مرحوم نے جو کچھ کیا اسوقت کیا جس وقت کوئی اسکی اہمیت پر غور کرنے والا بھی نہ تھا؛ یار و مددگار ملنا تو دوسری بات ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم پرانی روشنی کے بزرگ تھے۔ تعلیم بھی انکی پرانے طرز پر ہوئی تھی اور وضع قطع اور اکثر امور میں وہ قدامت پسند تھے۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ "مرأۃ العروس" جسکو آپ کی مستقل اولیں تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے، نہ صرف پرانے خیال کے لوگوں میں مطبوع و دل پسند ہے بلکہ نئی روشنی والوں کی زبان بھی اسکی تعریف میں ہمیشہ خشک دیکھی گئی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس میں اور نیز اسی قماش کی دوسری کتابوں میں انشاپردازی وغیرہ کی خوبیوں کے علاوہ ہندوستانی طرز معاشرت کا وہ دلآویز اور صحیح فوٹو کھینچا گیا ہے کہ باید و شاید۔ مولوی عبدالحق صاحب مرأۃ العروس کی بابت لکھتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں

> مرحوم اگر مرأۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشاپرداز مانے جاتے اور ان کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔

اسی طرح غور کیجیے تو انکی تمام تصانیف و تراجم میں بہت سی مشترک و غیر مشترک خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً کتب قانونی کے ترجمہ میں اصطلاحات جس نفاست سے چسپاں کی گئی ہیں انکی داد نہیں دیجا سکتی۔ ایسے علم ہیئت کی اصطلاحات جس عمدگی سے وضع اور استعمال ہوئی ہیں وہ مولانا نذیر احمد ہی کا حق سمجھا جا سکتا ہے۔ ترجمۂ قرآن مجید اپنی لسانی خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ آپ کا ترجمہ دیگر تمام تراجم پر حق فوقیت رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ اسوقت بھی کئی خصوصیات میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، لیکن جمہور میں اب جس قدر رواج مولوی نذیر احمد کے ترجمہ کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں۔

اس مقام پر مولوی صاحب مرحوم کے تمام علمی کارناموں کا تذکرہ غیر ممکن ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ سید افتخار عالم صاحب نے حیات النذیر کے قابل رشک ہیرو کی زندگی کے جہاں اور تمام واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے وہاں انکے علمی کارناموں پر بھی ایک مبسوط و مدلل تبصرہ لکھا ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ مصنف کی اکثر آرا سے ہر شخص کو اتفاق نہ ہو لیکن اصولاً انھوں نے اپنی کوشش

کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ایک بات جو "حیات النذیر" کے مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ سید صاحب نے اکثر مقامات پر اظہار آراء میں مفرط حسنِ عقیدت سے کام لیا ہے۔ یک نکتہ سنج دوست کا خیال ہے کہ انھیں اپنے ہیرو کے عادات وخصائل پر رائے زنی کرتے ہوے کسی قدر زیادہ آزادی سے کام لینا چاہیے تھا۔ برخلاف اسکے اُنھوں نے اکثر قابلِ اعتراض امور کی توجیہ کچھ اس طرح کی ہے جو مذاقِ سلیم کو ناگوار ہوتی ہے۔ اکثر اس قماش کی تاویلیں، جو قبولیت کا درجہ نہیں پا سکتیں، نہ صرف فضول اور غیر موثر ہوتی ہیں بلکہ اس سے مصنف کی آزادانہ رائے زنی کی قدر بھی گھٹ جاتی ہے۔ حیدرآباد کے اکثر واقعات دوسری روشنی میں دکھائے گئے ہیں اور اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا کہ مولنا اور نواب محسن الملک کے تعلقات وہاں ابتداءً کیسے تھے اور بالآخر ان دونوں بزرگوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جانے کے اسباب کیا ہوے۔ وہاں کے اکثر حالات اس انداز سے قلم بند کیے گئے ہیں گویا سید افتخار عالم صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھکر اُنھیں دیکھا یا سُنا تھا۔ لیکن غالبًا ایسا نہیں ہُوا کیونکہ حیدرآبادی پبلک کے مختلف طبقے مولنا نذیر احمدؒ کے متعلق مختلف خیال ظاہر کرتے ہیں

اجتماعِ دولت اور مہمان نوازی کے عنوان سے مصنف نے جو کچھ پیش یا اُفتادہ تاویلیں کی ہیں اُن میں سے اول الذکر بحث پر مولوی عبدالحق صاحب نے جو کچھ لکھدیا ہے وہ کافی ہے۔ اگر مولنا نذیر احمدؒ چاہتے تو اپنی دولت کے بہت سے صحیح مصرف سوچ سکتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب مولنا کرامت حسین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ثانی الذکر عنوان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے کم از کم اسلامی تعلیم اور اسلامی روایات کے منافی ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

"اُمہات الامۃ" کی بابت ضرور افسوس کیا جا سکتا ہے کہ "مولویوں" نے اُسکے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود سید افتخار عالم صاحب اُسکی طرزِ ادا پر گستاخی کا الزام لگاتے ہیں اور مولنا مرحوم پیرانہ سالی اور تجربہ کاری کے باوجود اپنی تیز زبانی کے معترف نظر آتے ہیں تو پھر "مولویوں" کو کیوں خالی خطاوار ٹھہرایا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانۂ آزادی میں کسی کتاب کا جلا ڈالنا صد درجہ قابلِ اعتراض بلکہ لائقِ نفرین سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سے وجوہ تھے جن کے باعث مولوی نذیر احمد مرحوم اس کتاب کے سارے نسخوں کو حوالۂ نار کر دینے یا تباہ کر دیے جانے پر راضی ہو گئے۔

ایک کمی "حیات النذیر" میں اور محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولنا کی شاعری پر شرح و بسط سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ لیکن ایسا عمدًا کیا گیا ہے۔ سید افتخار عالم صاحب نے مولنا کی نظموں کا ایک جداگانہ مجموعہ "نظمِ بے نظیر" کے عنوان سے شائع کیا ہے، جسکو ادبِ اُردو کی ایک بڑی خدمت کہنا چاہیے۔ اِسکے لیے شیدائیانِ لٹریچر کو سید صاحب کی سعیِ جمیلہ کی داد دینا چاہیے۔

آخر میں "حیات النذیر" کی ایک خوبی قابلِ تذکرہ ہے۔ یعنے سید افتخار عالم صاحب نے اِس ضخیم و مطول کتاب میں جس انداز اور طرزِ بیان سے کام لیا ہے وہ نہایت شگفتہ اور سلجھا ہُوا ہے اور بقول مولنا شبلی اس پر مولنا نذیر احمدؒ کے لٹریچر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ خدا کرے سید صاحب کی یہ کوشش عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہو اور اُن کے رشحاتِ قلم سے اہلِ ملک کو آیندہ بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔

"حیات النذیر" کی قیمت تین روپے محاسن ظاہری و باطنی کے اعتبار سے گویا کچھ نہیں۔ شائقین کو دستِ طلب بڑھانا چاہیے۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقدار رائچور دکن، یا دفتر رسالۂ العصر لکھنؤ سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے۔

"سید القلم"

# عصریات

## ہندوستان میں چھاپہ خانے

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی تعداد سنہ ۱۹۰۲ میں ۲۱۰۶ تھی اور سنہ ۱۲-۱۹۱۱ میں اس تعداد میں ۶۲۵ کا اضافہ ہوگیا۔ سنہ ۰۷-۱۹۰۶ میں اخبارات کے چھاپہ خانوں کی تعداد ۷۵۳ تھی۔ گذشتہ سال میں موقت الشیوع جرائد ۶۹۵ تھے۔ سنہ ۱۱-۱۹۱۰ میں بمبئی میں ۱۴۱ اخبارات شائع ہوتے تھے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں ۱۰۸، مدراس میں ۱۰۴، اور بنگالہ میں ۹۶۔ مگر اب صوبجات متحدہ سے ۱۴۱، بمبئی سے ۱۳۹، بنگال سے ۱۱۵، اور مدراس سے ۸۷ اخبار نکلتے ہیں۔ موقت الشیوع پرچوں کی تعداد میں مدراس کا نمبر اول ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوئیں انکی تعداد ۹۶، ۱۵ تھی اور ہندوستان کی زبانوں میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد ۸۸، ۹۹ تھی۔

## اخبارات ماضی وحال

اخبار نویسوں کی سالانہ کانفرنس میں جو نیو یارک میں منعقد ہوئی تھی، صدر جلسہ مسٹر رابرٹ ڈونلڈ نے اپنی نہایت دلچسپ تقریر کے دوران میں اُن تمام تغیرات اور انقلابات پر ریویو کیا جو گذشتہ بیس سال کے اندر اخباری دُنیا میں ظہور پذیر ہوے ہیں۔ اُنھوں نے پیشین گوئی کے طریق سے یہ بھی بتایا کہ آیندہ اخبارات کس قسم کے ہوں گے۔ ان تغیرات کی ایک نہایت اہم خصوصیت بقول مسٹر ڈونلڈ "اخبارات کا قوی بنایا جانا ہوگی۔ یہی اخبارات کے موجودہ انقلاب کا اصلی سبب ہے۔ آج کل اخبارات بالکل تجارت کے اصول پر عمل کرنے لگے ہیں۔ شخصی ملکیت کا رواج اُٹھتا جاتا ہے اور اس کے بجائے لوگ متحد ہوکر اخبار چلاتے ہیں۔ خواہ یہ اتحاد نجی ہو یا سرکاری۔ اب متحدہ ملکیت کی صورت میں چونکہ حصہ دار صرف روپیہ لگاتے ہیں اور اخبار نویس نہیں ہوتے اس لیے ان کی نظر منافع پر لگی رہتی ہے خواہ اس عمل میں اصول کو کتنا ہی صدمہ کیوں نہ پہنچے مگر اخبار میں جمہور کے نقطۂ خیال سے جدید طرز اخبار نویسی قدیم کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔ روزانہ اخبارات میں بحیثیت مجموعی ایک عام ترقی ہے۔ ہر جماعت کے اخبارات پہلے سے بہتر لکھے جاتے ہیں، زیادہ پڑھے جاتے ہیں، اور زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اخباروں کے مستقبل کے متعلق مسٹر ڈونلڈ کی رائے بہت امید افزا ہے۔ "اشاعت بکثرت ہوگی اور کمزور اخبارات بند ہو جائیں گے۔ بہت دُور کے مقامات کے لیے ہوائی جہاز استعمال کیے جائیں گے۔ خاص سڑک پر چلنے والی برقی ریل گاڑیاں اور موٹر پلیٹیں استعمال کی جائیں گی۔ اخبارات برقی اور ہوائی نلکیوں کے ذریعہ سے تقسیم ہوا کریں گے۔ وقائع نگار سفری ٹیلیفون لیے پھریں گے جن کو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجا سکیں"۔

## ایجاد کا علمی پہلو

کئی سال ہوئے پروفیسر میکرل نے برقی چنگاریوں کے اعمال و عادات کے متعلق مختلف تجربے کیے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان چنگاریوں سے ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جو گرمی یا روشنی کی شعاعوں سے بالکل مختلف ہیں اسکے بعد کئی طریقوں سے شعاعوں کی تحقیقات جاری رہی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایکس شعاعیں اور تین اور قسم کی شعاعیں دریافت ہوئیں مسٹر ہیری کاکس جنکی تمام عمر ایکس شعاعوں کا تجربہ کرنے اور اسکے متعلق کتابیں لکھنے میں بسر ہوئی کہا کرتے تھے کہ میں ایک دن ایسی شعاعیں دریافت کرونگا جو جنگی جہازوں کو اڑا دیگی۔ بعد میں بہت سائنس دانوں نے اسکے متعلق تجربے بھی کیے مگر کامیابی مسٹر الیوی ہی کی قسمت میں تھی

## ہندوستان کی ترقی

مسٹر مانٹیگو کی شاندار تقریر نے جو اُنھوں نے بجٹ کے موقع پر کی ہے تنقید کا بہت کافی موقع دیا ہے۔ اُن کے بیان پر انگلستان کے بہت سے اخباروں نے رائے زنی کی ہے۔ ذیل میں ڈیلی ٹیلیگراف سے اعداد نقل

کیے جاتے ہیں جن میں زیر نظر دہ سالہ مدت کے اول اور آخر سال کا مقابلہ ہے ان اعداد سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان نے ان دس سال میں کتنی ترقی کی ہے۔

| تفصیل | دہاکہ کا پہلا سال | دہاکہ کا آخری سال |
|---|---|---|
| درآمد | پونڈ ۷۸۱۳۲۱۰۳ | پونڈ ۱۲۱۶۱۴۹۰ |
| برآمد | پونڈ ۹۲۷۰۲۸۲۴ | پونڈ ۱۵۰۹۰۰۰۹۱ |
| تقسیم شدہ خطوط اور پوسٹ کارڈ | ۴۹۵۶۲۲۹۳۰ | ۱۰۵۰۸۸۹۵۲۷ |
| سیونگ بنک میں جمع | پونڈ ۲۹۷۵۸۳۵ | پونڈ ۵۸۵۷۰۹۰۵ |
| برقی پیغامات | ۶۴۷۵۵۴۵ | ۱۳۵۸۱۸۰۹ |
| مسافت ریل | میل ۲۵۳۷۲ | میل ۸۲۲۸۳۹ |
| مسافر سوار ہونے والے | ۱۹۷۴۶۰۰۰۰ | ۴۳۱۲۱۱۰۰۰ |
| کل کمائی | پونڈ ۲۲۲۷۱۸۰۰۰ | پونڈ ۴۰۸۳۳۰۰۰ |
| زراعتی نہریں لمبائی میں | میل ۲۱۳۷۲ | میل ۸۰۴۵۵ |
| طلباء درج رجسٹر | ۴۵۲۹۴۹۱ | ۶۷۹۱۱۰۵۵ |
| تعلیم کے اخراجات | پونڈ ۲۶۸۱۶۷۰ | پونڈ ۵۲۵۶۲۲۳ |

## چاولوں میں غذائیت

لینسٹ کلینک (Lancet Clinic) اپنے ایک تازہ اڈیٹوریل میں چاول کے عضلات بنانے کی خاصیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب روس جاپان سے ہار گیا تو تمام عالم کی توجہ جاپانیوں کی قوتِ برداشت اور استقلال کی طرف منعطف ہوئی اور اس بات سے حیرت ہوئی کہ ایک چاول کھانے والی قوم نے اس قدر زبردست جسمانی قوت حاصل کی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ و انگلستان میں چاول کو اسکی ترکیب میں نشاستہ کے افراط کے سبب سے عموماً ایک ادنیٰ قسم کی غذا سمجھا جاتا رہا ہے اور جس حالت میں چاول ہمیں ملتا ہے اسکے لحاظ سے یہ خیال صحیح بھی ہے۔ یہ نقص چاول میں اسکے مغذی جزو کے علحدہ ہو جانے سے واقع ہوتا ہے۔ چاول کو منڈی کے قابل بنانے اور صاف کرنے میں نہ صرف بھوسی ہی الگ کر دی جاتی ہے بلکہ وہ باریک خول بھی جس میں چاول رہتا ہے جھڑ جاتا ہے۔ اس خول کو انگریزی میں رائس میل (Rice Meal) کہتے ہیں۔ اسکا دیکھنے میں بُرا سا بھورا رنگ ہوتا ہے۔ انگلستان میں جس چیز کو آئل کیک (Oil-Cake) کہتے ہیں وہ اسی کی بنتی ہے۔ اس سے مویشی موٹے کیے جاتے ہیں۔ یہ باریک بھورے رنگ کا خول جسے کنا کہتے ہیں بہت مغذی ہوتا ہے کیونکہ یہ البیومن (Albumen.) سے بنتا ہے۔ اسکا کیمیائی تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں ۱۴ فی صدی البیومن کے مرکبات ہوتے ہیں اور ۴ فی صدی فاسفورس کا تیزاب ہوتا ہے۔ اول الذکر انسان کو بہت جلد ہضم ہوتا ہے۔ چونکہ جاپانی اور بعض اور چاول کھانے والی قومیں چاول کو جلا نہیں دیتیں اس لیے غذائیت اور ذائقہ کافی مقدار میں رہتا ہے جو اہل امریکہ اور اہل یورپ کے حصہ میں نہیں آتا۔

کیمیکل سوسائٹی کے ایک جدید جرنل میں بھی اس مضمون پر دلچسپ معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس میں آوریزنین (Oryzanin) (یعنی وہ مادہ جو چاول کے چھلکے میں پایا جاتا ہے) کی اہمیت تحقیقات کی بنا پر ثابت کی گئی ہے۔ تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ جن مرغیوں، فاختاؤں، چوہیوں، اور کتوں کو کھانے کے لیے صرف صاف کردہ چاول دیے گئے وہ بیمار ہو گئے اور آخرکار مر گئے۔ سببِ مرگ غذائیت کی کمی بیان کیا جاتا ہے۔ آوریزنین نہ ملنے کی وجہ سے جو عمدہ پرورش کے لیے لازمی ہے انکا وزن کم ہو گیا۔ چربی اور نمک وغیرہ کی ناقص خوراک آوریزنین ملانے سے بالکل کامل بن گئی۔ کتوں کی حالت میں دیکھا گیا ہے جو اس مادہ کے خوراک میں نہ شامل ہونے کی وجہ سے گھلتے چلے جاتے تھے کہ صرف تین گرین آوریزنین شامل کرنے سے بہت جلد تندرست ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آوریزنین مختلف ماکولات میں کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

## بمبئی میں ادبی تحریک

گورنمنٹ گزٹ بمبئی کی ایک حال کی اشاعت میں احاطۂ بمبئی کے ادبی نتائج کے متعلق بعض دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ اس میں سال رواں کی پہلی سہ ماہی کے اعداد دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کل کتب کی تعداد جو قریباً ایک درجن زبانوں میں شائع ہوئی ہیں ۴۶۵ ہے۔ ان میں سے ۱۳۲ کتابیں مرہٹی میں، ۶۷ سندھی میں، اور تعجب ہے کہ صرف ۱۳۱ گجراتی میں چھپی ہیں۔ دیسی تصانیف کے لحاظ سے بمبئی بنگالہ سے دوسرے درجے پر ہے۔ گجراتی اور مرہٹی دونوں زبانوں میں نظم، ڈراما، اور افسانے بہت بڑی مقدار میں ہیں مگر عام ادبیات اور فلسفہ میں ترجمے قدرتی طور پر نمایاں جگہ رکھتے ہیں جو انگریزی اور ہندوستان کی قدیم زبانوں سے کیے گئے ہیں۔ آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ احاطۂ مذکور میں ایک سوسائٹی ریشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن ( Rationalist Press Association ) کے اصول پر قائم کی گئی ہے جس کا مقصد اعلیٰ قسم کے لٹریچر کو ارزاں بنانا ہے کہ وہ آسانی سے عوام کی دست رس میں آسکے۔

## تصنیفات پنجاب میں

پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے جو رپورٹ حال میں شایع کی ہے اُس میں موجودہ اور گذشتہ سال کے کام کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ جن کتابوں پر غور کیا گیا، اُنکی تعداد ۱۰۵ سے ۱۴۱ ہوگئی ہے اور ایسے مصنفوں کی تعداد جنھوں نے اپنی کتابیں اس غرض سے بھیجیں کہ لٹریچر فنڈ سے انکی سرپرستی کیجائے، ۴۱ سے ۴۹ ہوگئی ہے۔ نیز ایسی کتابوں کی تعداد جن پر فنڈ کی طرف سے غور کیا گیا، ۷۷ سے ۱۰۴ ہوگئی ہے۔ جو رقم اسکولوں کو دی جانے والی کتابوں اور آلات کے خریدنے پر صرف ہوئی اُسکی مقدار ۵۱۴۲ روپے ۶ آنہ ۵ پائی سے ۶۶۸۲ روپے ۴ آنہ ۶ پائی تک پہنچ گئی ہے۔ بلاشبہ لٹریچر فنڈ کی سرپرستی دیسی زبانوں کی ترقی میں مدد دینے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ ایسے مصنفوں میں سے جنھوں نے غور کے لیے اپنی کتابیں بھیجی ہیں ۲۴ نے اُردو میں لکھی ہیں، دس نے ہندی میں اور ۱۵ نے پنجابی میں۔ ان میں سے ۱۹ کو انعام ملا۔ سات کامیاب اُردو مصنفوں کو ۱۵۰۰ روپے، سات کامیاب ہندی مصنفوں کو ۱۲۰۰ روپے اور پانچ پنجابی مصنفوں کو ۸۰۰ روپے بطور انعام دیے گئے۔

اگرچہ انعامات میں مقابلہ کرنیوالے مصنفوں کی تعداد قابلِ یادگار ہے مگر تصانیف خوبی کے لحاظ سے کمیٹی کی راے میں مبتذل ہیں۔ خاص تجاویز عمل میں لائی گئی ہیں جن سے اعلیٰ درجے کے مصنفوں کو لکھنے اور تصانیف کو غور کے لیے ارسال کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔

## قدیم ہندوستان میں جراحی

حال میں سہیتہ سوا کلکتہ میں مسٹر کوی راج گنا ناتھ سین ایم اے ایل ایم ایس نے ایک بہت دلچسپ مضمون پڑھا جس میں اُنھوں نے قدیم سنسکرت اشلوک نقل کر کے یہ دکھایا ہے کہ جراحی سے نہ صرف قدیم ہند واقف ہی تھے بلکہ اُنھوں نے اُسے ایسے درجۂ کمال تک پہنچایا تھا کہ آج کل کی جراحی اُن لوگوں کو جنھوں نے اسکا عمیق مطالعہ کیا ہے، قدیم ہندوستان کی جراحی کی جسکو دو ہزار برس گزرے محض ایک نقل نظر آئے گی۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ قدیم اشلوکوں کی امداد سے یہ بھی دکھایا گیا کہ قدیم ہندو نہ صرف جراحی کے اکثر آلات و اسلحہ سے کامل واقفیت رکھتے تھے بلکہ وہ ایسے ہی نفیس، تیز، مجلا، اور کارآمد آلات بنا سکتے تھے جیسے آجکل بنتے ہیں۔ سنا ہے کہ مسٹر سین اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں جو تیار ہونے پر اس اہم معاملہ پر بہت کافی روشنی ڈالے گی اور اہلِ مغرب کے اس دعوے کی صحت و غیر صحت کا کہ موجودہ جراحی خالص مغرب کی ایجاد کردہ ہے، ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دے گی۔

## برقی نیند

ڈاکٹر نیگل شمٹ ( Dr. Nagelschimidt ) کے اکتشافات کی رو سے وہ وقت دُور نہیں ہے کہ مرض بے خوابی کے

تمام خطرات دفع ہو جائیں اور صرف ایک بٹن کے دبانے سے کامل آرام حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹر موصوف کتوں اور خرگوشوں پر بغیر کسی قسم کے مضر نتائج پیدا کیے برقی نیند طاری کر چکے ہیں۔ وہ کوئی وجہ نہیں پاتے کہ بچے اور سن رسیدہ حضرات پر بھی کیوں بلا خوف یہ عمل نہ کیا جائے۔ ان کے اکتشافات کا ایک نئی طرح کی برقی رو پر انحصار ہے جو کھوپڑی میں دماغ کی زیریں سطح کے قریب لگانے سے خواب اور اثرات پیدا کرتی ہے۔ جب تک برقی رو علیحدہ نہ کی جائے خواب کی حالت جاری رہتی ہے اور اسکے علیحدہ کرتے ہی ایک منٹ میں مریض بالکل ہوشیار اور بیدار ہو جاتا ہے۔ طب میں بجلی روز بروز اپنا دائرہ وسیع کر رہی ہے۔ انگلستان کے بعض سرجن اس طریقہ کی آزمائش کے بہت مشتاق ہیں مگر وہ ایسے مسلمہ ثبوت اصولوں کے منتظر ہیں جن سے انکا پورا اطمینان ہو جائے کہ مریض کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

## انڈوں کے متعلق ڈاکٹروں کے جدید اکتشافات

بعض چیزوں کے خول میں سے جراثیم نہیں گزر سکتے مگر انڈے کا چھلکا اس قسم کا نہیں ہے۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل میں ایک محقق لکھتا ہے، کس قدر کثرت سے، کہاں اور کس طرح انڈوں میں جراثیم داخل ہوتے ہیں۔ یہ سوال نہایت ضروری ہے کیوں کہ انھیں کے جاننے پر انڈوں کو غذا کے لیے جراثیم سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اور کامیابی کا انحصار ہے۔ اگر جراثیم اسوقت انڈوں میں داخل ہوتے ہیں جس وقت وہ مرغی کی اوودی ڈکٹ ( Oviduct ) میں سے نیچے کی طرف آتا ہے، تو ہمارے پاس اسکا کوئی براہ راست تدارک نہیں ہے۔ البتہ اگر جراثیم اس وقت داخل ہوتے ہیں جس وقت کہ مرغی انڈا دیتی ہے یا اسکے بعد، تو اسکی روک تھام کے موثر طریقے وضع ہو سکتے ہیں۔ کئی سال گزرے لیڈی ڈاکٹر پننگٹن ( Pennington ) نے جو ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ زراعت سے تعلق رکھتی ہے، تازہ انڈوں کے واضح مطالعہ کی رپورٹ شائع کی تھی۔ ان انڈوں کی تمام روداد اُسے معلوم تھی جنکا امتحان اُس نے علم جراثیم کے رو سے کیا۔ اُسکی تحقیقات بتاتی ہے کہ جراثیم انڈے کی سفیدی اور زردی دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ جس قدر انڈوں کی اُس نے جانچ کی اُن میں صرف ۱۱ فی صدی جراثیم سے پاک ملے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تئیس انڈوں میں دیکھا گیا تو ۲۴ قسم کے جراثیم برآمد ہوے۔

کوسووز ( Kossowiz ) کی رائے میں تحقیقات کے اثنا میں یعنی انڈوں کو چھوتے وقت ہاتھ اور ہوا میں سے جراثیم اُن میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُس نے خود تحقیق کی ہے کہ تازہ انڈے عموماً جراثیم سے پاک ہوتے ہیں مگر ان پر نہایت خراب قسم کے خرد بینی کیڑے تھوڑے وقفے میں حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ کوسووز کی رائے میں پرانے انڈوں میں جراثیم کا دخل بہ نسبت تازہ انڈوں کے زیادہ آسانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انڈوں کو محفوظ رکھنے کے لیے سردی پہنچانے کا طریقہ بہترین ہے۔ چھوٹے وغیرہ میں بھی [illegible] ہے۔ جب سردی پہنچانے کا عمل نہ ہو سکے تو سوڈیم سلیکٹ وغیرہ کو استعمال میں لانا چاہیے۔

بعض جرمنی کے سائنس داں اعلان کر رہے ہیں کہ انڈے کے چھلکے کی خوراک سے آدمی صد سالہ عمر حاصل کر سکتا ہے۔ فرانس میں انڈوں میں ایک اور خوبی دریافت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر آمت ( Dr. Amat ) کے مضمون کے رو سے جو ڈاکٹر مذکور نے تھیراپیوٹک سوسائٹی ( Societe Therapentique ) کے سامنے پڑھا ہے، تازہ انڈے کی جھلی انسان کی جلد کے لیے نہایت عمدہ محرک ہے۔ جب کوئی مریض بہت خراب زخم لیے ہوے اُسکے پاس آتا ہے، تو وہ اُسکو دھوکر انڈے کی جھلی کی بہت باریک تہوں سے اُسے ڈھانپ اور اُس پر پٹی باندھ دیتا ہے، ۴ یا ۵ دن میں زخم اچھا ہو جاتا ہے اور نئی کھال آجاتی ہے۔ فرانس میں ایک اور شخص جو دوا فروش ہے چوزوں کو کونین اور دیگر دوائیں کھلاتا ہے اور اُن کے انڈوں کو ۵ فرینک فی درجن

یا اس سے زائد پر پہنچا ہے۔

## موت اور زندگی کے متعلق ایک نیا نظریہ

پروفیسر میکس ربنر ( Prof. Max Rubner ) جو فزیالوجیکل انسٹیٹیوٹ برلن کے ڈائرکٹر اور بہت سی عالمانہ کتابوں کے مصنف ہیں، جسم کے انحطاط اور ممات کو ایک نئی طرح سے سمجھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انحطاط اور موت کا سبب یہ امر واقع ہے کہ جسم میں قوت ( Energy ) پیدا کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ ہر جاندار کو جس میں انسان بھی شامل ہے قدرت نے قوت کی ایک مقررہ مقدار پیدا کرنے کی قابلیت دی ہے۔ اور جب یہ قوت ایک بار پیدا ہو کر ختم ہو چکتی ہے تو اور سلز ( Cells یعنی وہ خردبینی کوٹھریاں جو جسم کی اکائی مانی گئی ہیں) پیدا نہیں کر سکتے اور موت اس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کو مستثنیٰ کر کے نیز اختلافِ اوزان کا لحاظ رکھ کر قوت پیدا کرنے کی قابلیت بتناسب وزن بڑے جانوروں میں تقریباً یکساں ہے۔ گھوڑا ۱۶۳۰۰۰ کیلری ( Calory حرارت کی اکائی یعنی حرارت کی وہ مقدار جو ایک کیلوگرام پانی کو صفر درجہ حرارت سے ایک درجہ حرارت سنٹیگریڈ تک پہنچانے کے لیے ضروری ہو) قوت اپنے وزن کے فی کیلوگرام کے حساب سے پیدا کرتا ہے۔ اس کا وصۂ زندگی حادثات سے قطع نظر کر کے اس کے اس قوت کے پیدا اور استعمال کرنے کی رفتار پر منحصر ہے۔ ایک بیل کی حیات معمولاً ۱۴۰۰۰۰ کیلری فی کیلوگرام کے حساب سے پیدا اور خرچ کرنے پر مشتمل ہے۔ ایک کتے کی حیات ۱۶۴۰۰۰ اور ایک بلی کی ۲۲۳۰۰۰ کیلری پر۔ ان اعداد میں وہ قوت شامل نہیں ہے جو کامل نشو و نما سے قبل پیدا کی جا سکتی ہے۔

انسان کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔ اس میں فی کیلوگرام ۷۲۵۰۰۰ کیلری پیدا اور خرچ کرنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اس حساب میں وہ قوت نظر انداز کر دی گئی ہے جو ایامِ نمو میں پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانی کے زیادہ طویل المدت ہونے کا سبب یہی ہے کہ انسان میں اور حیوانوں کی نسبت قوت پیدا کرنے کی قابلیت چار پانچ گنی زیادہ ہے۔

ہر قسم کی بے اعتدالی زندگی کو کم کرتی ہے کیوں کہ اس سے قوتِ ممکنہ کے مجموعہ کا غیر معمولی تیز رفتاری سے اسراف ہوتا ہے۔ بیماریوں، جسم کی دیگر بے ترتیبیوں، اور زندگی کی مضرِ صحت حالتوں کا بھی یہی اثر ہوتا ہے۔ افعالِ حیات کے لیے قوت کا ایک مخصوص قلیل ترین صرف لازمی ہے۔ لیکن معاشرت میں عاقلانہ تدابیر پر عمل کرنے سے یہ ممکن ہے کہ نسبتاً مخصوص وقت میں صرف ہونے والی مقدارِ قوت کو کم کیا جا سکے۔

## امریکہ کے گریجویٹ کیا کرتے ہیں؟

یونائیٹڈ اسٹیٹس کے تعلیمی صیغہ نے امریکہ کے کالجوں کے گریجویٹوں کے پیشوں کے متعلق ۱۶۴۲ء سے لیکر ۱۹۰۰ء تک کے اعداد پبلک کے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ اعداد ۷۳ کالجوں اور یونیورسٹیوں نے فراہم کیے ہیں۔ ہر صدی میں سے چار سال کا اوسط حسب ذیل ہے:—

| پیشہ | ۱۷۰۰ - ۱۶۹۶ | ۱۸۰۰ - ۱۷۹۶ | ۱۹۰۰ - ۱۸۹۶ |
|---|---|---|---|
| مذہبی خدمت | ۶۵٫۱ | ۲۱٫۴ | ۵٫۹ |
| قانون | ۱٫۶ | ۳۰٫۵ | ۱۶٫۵ |
| طب | ۳٫۱ | ۸٫۴ | ۶٫۶ |
| تعلیم | ۴٫۶ | ۵٫۶ | ۲۶٫۶ |
| کاروبار | ۱٫۶ | ۵٫۶ | ۱۸٫۸ |
| سرکاری ملازمت | ۹٫۴ | ۱٫۱ | ۱٫۰ |

اٹھارویں صدی کے اختتام پر مذہبی خدمت کو سب پیشوں سے بہتر خیال کیا جاتا تھا اور قریباً دو تہائی گریجویٹ اسی پیشہ کو انتخاب کرتے تھے۔ ایک صدی کے بعد کُل تعداد کا $\frac{1}{5}$ حصہ اس میں داخل ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کے آخر میں صرف ۰ فی صدی اسے اختیار کرنے لگے۔ تعلیم نے جسکو ۱۸۲۵ء تک مقابلتہً گریجویٹ کی بہت کم تعداد اختیار کرتی تھی نہایت

تیز رفتاری سے ترقی کی ہے۔ اب یہ پیشہ تمام پیشوں سے بڑھا ہوا ہے اور ایک چوتھائی سے زیادہ گریجویٹ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ قانون اٹھارویں صدی کے آخر میں قریباً ½ گریجویٹ کا پیشہ تھا اور تمام پیشوں سے بڑھا ہوا تھا اس وقت سے نسبتاً اسکی اہمیت کم ہوگئی ہے اگرچہ اس پیشہ میں داخل ہونے والوں کی اصلی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ کاروبار میں گریجویوں کی تعداد ترقی کر رہی ہے اس وقت تک کل تعداد کا ⅙ حصہ تقیقی کاروباری زندگی اختیار کرتا ہے۔ ان ۲۷ کالجوں کے گریجوایٹوں میں سے ایک فی صدی سے بھی کم زراعت میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک صدی پہلے یہ نسبت تین چار گنی زیادہ تھی۔

## ہندوستان میں کوئلہ کی پیداوار

ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں معدنیات کے چیف انسپکٹر کی سالانہ رپورٹ کی رُو سے کس قدر کوئلہ پیدا ہوا ہے:۔

| نام صوبہ | وزن (ٹن) |
|---|---|
| بنگال | ۴۳۰۶۱۲۹ |
| بہار اُڑیسہ | ۹۱۲۳۴۳۷ |
| پنجاب | ۳۸۴۰۹ |
| آسام | ۲۹۶۴۱۵ |
| بلوچستان | ۴۵۷۳۲ |
| صوبجات متوسط | ۲۳۳۹۹۶ |
| صوبجات متحدہ | ۵۰ |
| میزان | ۱۴۰۴۴۳۶۸ |

## پیرس میں ہندوستانی صنعت

آیندہ نمایش کے لیے پیرس میں ہندوستان کے صنائع کو بھی خاص طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ پیرس کی سی جگہ کی نمایش میں ہندوستان کی صنعت کا مدعو کیا جانا لازمی طور پر ایک امتیازی نشان اور اہل ملک کے لیے مسرت کا موقع ہے۔ اُمید ہے کہ اس ہمت افزائی سے بہترین اور مستقل فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔

## جرائم کے متعلق فلسفیانہ تحقیقات

ڈاکٹر متفق ہیں کہ جرم کرنے کا میلان صحیح اور تندرست دماغ میں نہیں ہوتا کوئی شخص جس کا دماغ درست حالت میں ہو ہرگز خودکشی نہیں کرسکتا نہ دوسرے کو قتل کر سکتا ہے۔ جرم اُسی حالت میں ہوتا ہے جبکہ مریض کی عقل میں فتور آگیا ہو یعنی دماغ کے صحیح نہ رہنے اور عادت خراب ہونے سے جرم کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے بعض فلاسفروں کی رائے ہے کہ جیل خانے موقوف کر دیے جائیں اور بجائے ان کے شفا خانے بڑھائے جائیں اور بذریعہ دماغی اپریشن کے مجرموں کے دماغ کے اُن مرکزوں کو درست کر دیا جائے جن سے جرم کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

ہر انسان ویسا ہی ہوتا ہے جیسے اُس کے دماغ میں مختلف صفات کے خانے ہوتے ہیں۔ جس طرح کسی کے دماغ میں علم موسیقی یا علم ریاضی حاصل کرنے کے مرکز زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اُسی طرح خاص جرائم کے مرکز بھی بعض اشخاص کے دماغ میں بن جاتے ہیں۔ وہ اپریشن سے دُور کیے جا سکتے ہیں اور ایک دس نمبر کا بدمعاش اچھا خاصا بھلا مانس بنایا جا سکتا ہے۔ پس جرم ایک مرض ہے اور مریض کو بجائے تکلیف دینے کے اُس کا علاج کرنا چاہیے۔

معلوم نہیں فلاسفروں کی اس تھیوری پر کتنے دنوں بعد عمل شروع ہوگا لیکن عام طور پر یورپ کی عدالتوں کا رجحان نرمی سزا کی طرف ہے۔

## شرارِ حسن

ظہورِ عالم آرائی تھا انکی خودنمائی میں — نیاز آموزیاں مخفی تھیں نازِ کبریائی میں

بلائیں پڑ گئیں جانیں مگر قابو الٰہی کہکر — انھیں بھی کچھ مزا آیا ہے اس فتنہ طرازی میں

شرارِ حسن جاناں نے دکھائیں گرمیاں اپنی — گدازِ عشق بھی شامل ہوا حیرت فزائی میں

---

مرا دل ہے کہ گویا اک تماشا گاہِ حیرت ہے — عجائب خانۂ قدرت ہے اک ساری خدائی میں

بلا کا اضطراب آفت کی سوزش قہر کی گرمی — قیامت کے اثر دیکھے ہیں حسنِ دلربائی میں

---

کشادِ ملتجائے عاشقاں انکی اسیری تھی — مدد کی دل نے قیدی نکلے اس مشکل کشائی میں

تشوّدِ کار کا عقدہ کھلا دردآشنا ہو کر — عجب انداز پنہاں تھا مری بے دست و پائی میں

کسی کے حسن عاشق آفریں پہ مر مٹا ہوں

ہر اک جلوے پہ محفل میں میں محوِ تماشا ہوں

مجھے کیوں دیدیا عشقِ ابد نے اضطراب اپنا؟ — بنایا شہسوارِ حسن نے کیوں عمر کا ابنا؟

کھلی رہتی ہے کیوں ہر دم مری چشمِ تماشائی — کسی لیلائے بہار نے کیوں بند نقاب اپنا؟

تڑپتا لوٹتا رہتا ہے دل کیوں میرے پہلو میں — دکھایا کس نے مجھکو روئے زیبا بے حجاب اپنا

جلا ڈالا شرارِ حسنِ عشق انگیز نے دل کو

ملی ہے برقِ خرمن سوز کر میرے حاصل کو

نگاہوں میں مری ہے وادیٔ ایمن جہاں سارا — مجھے اس بزمِ ہستی میں دل بیقرار نے مارا

جدھر جاتا ہوں میں ہے طورِ سینا میرے ہر جلو میں — میں اپنی چشمِ بینا میں ہے ذوقِ دید کا ہارا

حسینانِ جہاں کیوں عشقِ حسن آئے خیالوں میں — نمودِ حسنِ جاناں میکشد از پردہ دلہا را

میں اپنی بیقراری پہ کبھی خود محوِ حیرت ہوں — مرے دل میں بجائے خون بھرا ہے بھر دیا پارا

---

ہر اک انساں یہاں آیا ہے اپنا امتحاں دینے — مگر مرتے ہیں کس شوق میں اسکندر و دارا

اگر شاہنشہِ عالم بھی ہو اخلاق سے خالی — تو وہ سلطاں نہیں ہے بلکہ آک مفلس ہے بیچارا

ضیائے علم ہو اس حسنِ عشق آموز کی رہبر — کہ جسکی حق نمائی کا کرشمہ ہے جہاں سارا

مقامِ عشق میں شاہ و گدا دونوں برابر ہیں — کہ "عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را"

شرارِ حسن ہے پنہاں مری نغمہ سرائی میں

سرورِ خسروی حاصل ہے مجھکو اس گدائی میں

**حمید کوٹلوی**

## بمبئی کے ایک ساحل کا منظر

ذکر اک شب کا ہے پڑھنے سے جو گھبرایا دل — میں ٹہلتا ہوا دریا کے کنارے پہنچا

ساحلِ بحر پہ تھی نورِ قمر کی چادر — چادرِ بحر پہ بہتی ہوئی آتی تھی ہوا

ایک سنّاٹے کا عالم تھا نظر کے آگے — گئی جس سمت نظر سب کو سکوں میں پایا

کھیل کر پانی سے پیدا کیں ہوا نے نوبتیں — دامنِ کوہ میں تھی جسکی دل آویز صدا

چھیڑتی تھی جو درختوں کو ہوا رہ رہ کر — بانسری کی سی صدائیں تھیں سُریلی پیدا

موج پر موج چلی آتی تھی آہستہ خرام — چاند اُس پار تھا پانی کے کنارے نکلا

پرتوِ ماہ کبھی لوٹ گیا پانی پہ — کروٹیں موج کے پہلو سے کبھی لینے لگا

کرہ سے چرخ کے تھا نور فلک تا بہ زمیں — پردہ پرتوِ تنویر تھا عالم سارا

بالکل بے مثل ہلال اور فلک پر تھا ماہ — چاند تھا ایک زمیں ایک فلک پر نکلا

مہر سے ماہ زمیں مہ سے منور تھی تمام — رات کے وقت بھی تھا جلوۂ دلکش پیدا

جگمگاتی ہوئی قندیلیں لبِ خلیج — چشمکیں کرتی تھیں قندیلِ فلک پر گویا

ریت کے ذرے کنارے پہ چمکتے تھے — سیپیوں نے گرا رکھے تھے یہ موتی ہر جا

طالبِ علم کو ہوتی نہیں کچھ فکرِ معاش — بارِ پڑھنے کا بھی تھا سر پہ تو ہلکا ہلکا

ہو گیا تازہ سمندر کی ہوا سے جو دماغ — بارہا بار ہا دل سے ہوئی فرحت پیدا

میل دو میل کنارے پہ بچھیں تھیں کرسیاں — نیچرل سین میں یہ حضرتِ انساں کی ادا

وقت انسان کے آنے کا تھا وہ لیکن — ایک برخاستہ خاطر تھا وہاں بیٹھا ہوا

دیکھکر مجھکو لگا کہنے کہ کیوں اے عابد — "تجکو بھی جذبۂ دل کھینچکے آخر لایا"

دیکھ اس سین کو دلکش بھی ہے خوش کن بھی ہے — ساری قدرت کا تماشا ہے یہاں جلوہ نما"

بارہا دیکھ کے یہ سین ہوئی ہے تفریح — یہ لبِ آب و شبِ ماہ یہ سبزہ یہ ہوا"

مگر اب دیکھ تو مجھکو کہ میں ہوں افسردہ — ہوئی دا شد خاطرنہ ذرا غم بہلا"

کھل گیا آج کہ جو کچھ ہے ہمیں یہ وہ ہیں      دل جو خوش ہو تو مناظر بھی ہیں دلکش بخدا
سچ ہے دل شاد اگر ہے تو ہے دنیا خوش کن      دل کدر ہو تو عالم ہے کدورت سے بھرا
دل ہو غمگین تو ہو غم سے مبدل یہ سماں      ولفریبی کے عوض سیر بھی ہو غم افزا
چاندنی دیدۂ غمگین میں نظر آئے کفن      شور ہو جوں کا بھی معلوم ہو ویرانی کی صدا
ناامیدی کا ہم جو تسکین کا دیا کرتی ہے      کھینچتی ہے وہ آنکھوں میں سماں حسرت کا
دور بیٹھ کے پڑھا تھا کسی نے دلکو      چھپ چھپ کے کسی دل کو کر گئی بسیا
تھا یہ خوش منظر لیے تھا وہ نظارۂ خوشنما      دیر تک بیٹھ کے قدرت کا تماشا دیکھا
چاند ہونے لگا پوشیدہ جو بس زیر زمیں      کالی چادر میں لگی چھپنے یہ زالِ دنیا
چاند نے مجھکو اشارہ یہ کیا وقت غروب
مجھ سے بہ رات بہت تھوڑی ہے قصہ ہے دراز      زین العابدین عابد

## دل کی حالت

اے دل افسوس یہ کیا ہو گئی حالت تیری      نہ رہی آہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری
روشِ دہر میں ہوتی گئی ہر دم تغییر      اور اسی طرح بدلتی گئی عادت تیری
قید ہستی یہ ہوا ہیں فراغت کا گماں      یعنی موقوف ہوئی رنج پہ راحت تیری
کچھ نہیں نفس کی تحریک سے گو تجکو حذر      ہاں مگر خلق سے مخصوص ہے نفرت تیری
جو دکھاتی ہے وہ اب لوٹ رہا ہے کیسر      ہائے دلکش تھی جو پاکیزہ محبت تیری
تجکو تو خیر ہوس پہ ہے فقط وہم غنا      ہائے حرص و ہوا سے ہے قناعت تیری
لگ گیا حسن صنم پھر پرستش تجکو      پھر گئی حسن حقیقی سے طبیعت تیری
عمر دو روزہ کو سمجھا ہے حیات خضری      بیخبر موت سے رکھنے لگی غفلت تیری
تھی جو وابستگی جسم ہوئی تابع روح      تیرے بڑھنے سے گھٹی او بھی قوت تیری
انس کا خلق کا تجھ میں نہ رہا نام و نشاں      تو کس طرح ہو انسان سے نسبت تیری
دی نکوکاری پہ بدکاری کو تو نے ترجیح      یوں مٹا کر تجھے اب بٹ گئی دولت تیری
یاد آغاز ہے اب کچھ نہ خیال انجام      باعث کفر ہوئی حیف رعونت تیری
پھر بھی جرأت یہ نہیں مائل اصلاح ہو تو      گرچہ پوشیدہ نہیں تجھپہ خباثت تیری
وائے بر عقل کہ ہو علم ترا لاعلمی      حیف بر حال کہ اتنی ہو جہالت تیری!
یاد ایام کہ آک بھولی تھی ادا تری      یاد ایام کہ تھی سادگی زینت تیری
ہائے وہ وقت کہ ولجوئی تھے طرز طریق      ہائے وہ وقت کہ خوش کن تھی ملاقات تیری
کیسے پیٹھے تھے کبھی تیرے وہ شور الفاظ      کتنی پیاری تھی کسی وقت شرارت تیری
کیا ہوئے وہ تیری ہنیکر ہی ایام قدیم      کیا ہوئی ہائے وہ دیرینہ بشاشت تیری
ہائے وہ دن کہ تھا یگانہ سے بھی تجھے      ہائے وہ دن کہ تا حد وہ تھی رغبت تیری
اب کہاں آہ وہ یک گونہ تری نفرت کذب      اب کہاں ہائے وہ بے لوث صداقت تیری
نہ رہے تجھ میں اب انداز وفا کے آثار      نہ رہی اب وہ دل خلق میں الفت تیری
دور سب تجھ سے ہوئیں نیک روی کی باتیں      تجھ سے رخصت ہوئی وہ جوش شرافت تیری
نفس عالی ہے اک تجھ سے ہوا بیٹھا ہے مبشر      نفسِ غالب نے بدل دی یہ جبلت تیری
شرم کی بات ہے اس طرح اگر خوار ہو تو      ہائے افسوس ہے گر یوں ہو مذمت تیری
سچ تو یہ ہے کہ ہے بے فائدہ جینا تیرا      حامیِ قوم نہ گر ہو سکی خدمت تیری
یاد رکھ یہ کہ ہیں اعمال ہی بس تیرے رفیق      اور سب چیزوں سے ملزوم ہے فرقت تیری
دشمن نفس ہے تیرا تجھیں اگر ہمت ہے!      بھول اسے بانی ہے ابلیس کی عداوت تیری
کام وہ کر جو ہو ہر طرح سے شایان بشر      جس سے شرمندہ ہو عقل و فراست تیری
پہلے کر اپنے ہی ہاتھوں سے تو عزت اپنی      ہو گی پھر ہی نظر دہر میں وقعت تیری
ہمکو اے دل ترے باطن کی ہے عظمت مقصود      ہمکو منظور نہیں ظاہری حشمت تیری
سحر اتنی تو ہو کوشش یہ پس از مات
پھر بنی ہو قالب انساں میں ودیعت تیری      اقبال درانی ساحر

## تحریک اخلاق

طلسم عالم سفلی کا کیونکر راز افشا ہو      اگر اک پردہ اٹھ جائے تو ظاہر اور پردہ ہو
محیط دہر میں جب آشنا کا نام عنقا ہو      تو کافی ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہو
کوئی چشم حقیقت بیں اگر محو تماشا ہو      حجاب اٹھنے لگیں سارے نہاں سب آشکارا ہو
سراسر غیر ممکن ہے لباس روح میلا ہو      لباس جسم ظاہر سو طرح گو پارا پارا ہو
خلش گر ہے دل اہل صفا کو رنج کیا پہنچے      گل خوش رنگ کو کانٹوں کی صحبت سے ضرر کیا ہو
نہیں مانگے سے ملتا ہاتھ پھیلانے سے کیا حاصل      قناعت چاہیے اسپر میسر جس کو جتنا ہو

غنیمت ہے وہی جو کام اپنے سے نکل جائے کسی کو کیا خبر اس کی خدا جانے کل کیا ہو

بدل جاتا ہے رنگِ ہستی موہوم اک دم میں کہیں دریا بنے قطرہ کہیں قطرہ دریا ہو

جو سیدھی چال چلتے ہیں استقلال رکھتے ہیں کہ خط ہندسی کا جس طرح انجام نقطہ ہو

اثر افعال خوب و زشت دو نہیں ہوتا کچھ ہے جو بویا جائے اک دانہ تو لونا تخم پیدا ہو

جو باتیں نقش ہو جاتی ہیں کب لب سے نکلتی ہیں وہی مُہریں کھلا کرتی ہیں جن کا نقش گہرا ہو

بجھا ہو دل اگر یوں شامل یاران محفل ہوں ہرے پتوں میں جیسے خشک کوئی زرد پتا ہو

اُسے عبرت پکڑنی چاہیے نیرنگ عالم سے جو اس عمر دو روزہ پر کوئی نادان پھولا ہو

غضب ہے ملنے والوں کو ہمیں نقصان پہنچائیں اُسی کے عیب ہم ڈھونڈیں ہمارا جو شناسا ہو

تمنا دور کرنے کی نہیں باقی تمنا میں دل وحشت زدہ کب ہمدم اہل تمنا ہو

جو کچھ ہو کہنا سنتے سامنے طے کر لیا جائے نہ پھر اچھی بری نکلے شکایت ہو نہ شکوا ہو

لگاؤں اپنی آنکھوں میں ارادت سے عقیدت سے میسر اہل باطن کی اگر خاک کف پا ہو

دل مشفق ہمارا ہر کرتا ہے یونہی ہمسر جگر سوالوں میں جس طرح جھگڑا کوئی برپا ہو

عجب کیا طاقتیں یوں ناتوانی سے بدل جائیں مسافر راہ کا ہارا تھکا جس طرح سوتا ہو

خیالات دلی کس طرح دل سے یک بیک نکلیں نہیں ممکن جدا ایک لخت ہر خار کف پا ہو

نہیں مشکل نئے شغل بات کی تحصیل بھی کل مگر کچھ شوق ہو دل میں کچھ ان باتوں کا لپکا ہو

معانی خیز ہو محل نہ ہو جو کچھ کہا جائے کہ جیسے شکل اقلیدس آخر میں نتیجہ ہو

نہ ایسے امر میں کچھ رائے دینی چاہیے ہرگز کیا ہو غور ہی جس پر نہ کچھ سوچا نہ سمجھا ہو

رہائی موت کے پنجے سے پا سکتا نہیں ہرگز کوئی ہو طفل نابالغ جواں ہو یا کہ بڈھا ہو

برس جائیں جو نیسان کرم سے گوہر مضمون
روانی اشک کے خامہ میں مثل موج دریا ہو
اشک ملند شہری

## قطعہ

زمزمہ سنج تھی یوں کنج قفس میں بلبل ہمصفیران چمن کیا مجھے گلزار نہ تھا

کیا مجھے باغ میں کل رخصت پرواز بھی کیا مجھے انجمن گل میں کبھی بار نہ تھا

کیا کبھی یاد بہاری سے نہ تھی عشق اللہ کیا گل تر سے مری دید نہ تھی پیار نہ تھا

آشیاں میرا نہ تھا سایۂ گل میں ہرگز کیا چمن میرے لیے رہنے کو نہ ہموار نہ تھا

کیا نہ تھی شاخ نشیمن مری پھولوں سے لدی کیا مرے پیش نظر غنچوں کا انبار نہ تھا

کیا یہ یاد نہیں تم کو کہ بلا منت غیر شاہد گل کا میسر مجھے دیدار نہ تھا

کبھی اس گل پہ میں بیٹھی کبھی اس غنچہ پر اڑ کے اس شاخ سے اس شاخ پہ دشوار نہ تھا

کون سا غنچہ تھا جو منھ نہ لگا یا میں نے کون سا گل تھا کہ پروردۂ منقار نہ تھا

شاخ گل باد صبا سے جو لچک جاتی تھی تازیانہ مری تنبیہ کا کیا خار نہ تھا

خار کھانے ہوئے قمری مری جانب سے رہی اُس کو کچھ اور سوا سرو کے درکار نہ تھا

باد صرصر کی چلی اور نہ گل چینوں کی خندۂ گل کا سوا میرے کوئی یار نہ تھا

دام ہر ذرہ پہ پھیلا دیکھا تا کر باغباں تاک میں کیا در پئے آزار نہ تھا

حق تو یہ ہے کہ بہ افضل الٰہی جب تک بال بھر بھی مجھے اندیشۂ اغیار نہ تھا

آب و دانہ کی کشش یا مرے اعمال کہو یا یہ سمجھو کہ نصیبا مرا بیدار نہ تھا

دام صیاد میں خود پھنس گئی نادان بنکر کوئی تقدیر کے لکھے سے خبردار نہ تھا

کون تھا ہائے جوانان چمن میں ایسا جو مرے واسطے سر دینے کو تیار نہ تھا

پر مقدر کا نوشتہ نہیں ٹلتا ہرگز جو ہوا خوب ہوا اس سے تو انکار نہ تھا

ہے مجھے اہل گلستاں سے شکایت اتنی کیا کوئی بلبل ناشاد کا غمخوار نہ تھا

دوستداران چمن سب تھے چمن کے ساتھی دام صیاد میں دیکھا تو کوئی یار نہ تھا

نغمہ سنجان محبت مجھے کیا بھول گئے یاد بھولے سے بھی کر لیتے تو دشوار نہ تھا

داستاں بلبل بیکس کی جو چھیڑی اختر
کیا تغزل کو کوئی یار طرحدار نہ تھا
اختر علوی

## تصویر جاناں

کس کی تصویر ہے تو اے تصویر رشک کھاتا ہے تجھ سے ماہ منیر

تو ہے پیاری ادا تری پیاری ہے تمنا بھی تیری کیا پیاری

بولتی کیوں نہیں! بھلا تصویر نہیں رکھتی زبان کیا تصویر

روٹھنا تجھ کو گر پسند آیا میں نے منت میں بھی مزہ پایا

ہنس کے تو بجلیاں گرا مجھ پر ہاں رُلا مجھ کو آج ہنس ہنس کر

میرے قابو میں اور یہ بیداد نقش دیوار اور ستم ایجاد

ہاں خدا کے لیے زبان تو کھول  میرے سر کی قسم تجھے کچھ بول

میں ہوں پروانۂ جمال ترا  میں ہوں آشفتۂ خیال ترا

ہائے یہ خوشنما تری زلفیں  ہائے یہ دل رُبا تری زلفیں

نرگسیں چشم پہ نثار غزال  ابرووں پہ فدا ہزار ہلال

میری باتوں کا کچھ جواب تو دے  اس خموشی کا ماجرا تو کھلے

بے زبانی میں تیری سو باتیں  خامشی میں ہزار ہا گھاتیں

آہ یہ تمکنت تری ! تصویر  دستِ قدرت سے کیا کھنچی تصویر

ظلم و شوخی ہر اک ادا جس کی

بات سیماب تی تقضا جس کی  آغا رفیق بلندشہری

## آتشِ روشن

کیوں نہو لے آتشِ روشن جہاں کے کام کی  ایک ہی ہو فی الحقیقت تو بھی اپنے نام کی

فائدہ بخش جہاں تو ہے مفیدِ روزگار  تیرے دم سے ہیں نکلتے کارہائے بیشمار

ہاں کھلاتی ہو پکا کر تو غذائیں خوب خوب  پوری کرتی ہو ہماری اشتہائیں خوب خوب

موسمِ سرما میں تو ہو روح پرور جاں نواز  روز و شب رہتا ہو انسانوں سے تیرا ساز باز

تیرے دم سے ہیں سفر میں ہمکو کیا آسانیاں  ریلوے انجن ہزاروں اور موٹر گاڑیاں

کشتی چلتی ہو سمندر پہ دخانی بھی تری  ہاں حکومت کرتا ہو تسلیم پانی بھی تری

اہلِ جرمن کو بھی تجھپر کیسے کیسے ناز ہیں  کرشمے انسان کے پیدا پر پرواز ہیں

تیرے دم سے رات کو روشن ہو ظلمت کدہ  زینتِ بزمِ طرب ہو رونقِ عشرت کدہ

کام آئی خلقتِ عالم میں تیری ذات بھی  تجھسے خالق نے بنایا عالمِ جنات بھی

ملتی جلتی ہو ستم گر تو رُخِ دلدار سے  شعلہ رو کہتے ہیں ہم تجھکو بہت ہی پیار سے

ہوں بیاں اے نار کیا الطاف گوناگوں ترے  اہلِ ہستی جان و دل سے ہیں غرض مفتوں ترے

درحقیقت تو بھی اک معشوقِ شوخ و شنگ ہو  دیکھکر چہرہ کھبو کا سا زمانہ دنگ ہو

دل رُبائی دل ستانی کی غضب کی آن ہے  تجھ میں سرتاپا صنم محبوبیت کی شان ہو

تند خو ہو شوخ چشم و سرکش و خود سر ہو تو  قہر ہو۔ آفت۔ بلا ہو۔ فتنۂ محشر ہو تو

تیری الفت جا کے پوچھے تیرے مستوں سے کوئی

لطفِ سوز و ساز ان آتش پرستوں سے کوئی

ایک گر حسنِ جہاں آرا پہ اٹھلاتی ہے تو  اہلِ ہستی پر قیامت کا ستم ڈھاتی ہے تو

آج کیا منظر دکھائے تجھسے آتشباز نے  پھونک ہی کر رکھدیا تیرے ادا و ناز نے

ایک ہمسائے کے گھر میں کیا شگوفہ چھیڑ کر  لی خبر جا دوسرے کی پھر وہیں منھ موڑ کر

سرکشی تیری نہ بھولیگی کبھی اے تند خو  آسماں سے گویا باتیں کر رہی تھی ہو بہو

وہ جھجک کر اس طرف سے اس طرف وہ جانا ترا  وہ ہوا میں آتشیں چادر سا لہرانا ترا

ہائے وہ دود سیہ کے گیسوئے مشکیں ترے  ہائے وہ شعلہ سا رُخ وہ عارضِ رنگیں ترے

نکلتے تھے شرر اس دودِ تیرہ تار سے  جھڑ رہی تھی یا کہ افشاں زلفِ عنبر بار سے

وہ ترا غیظ و غضب وہ خود نمائی الاماں  ایک عالم تھا کھڑا انگشت حیرت در دہاں

کیسا عبرت زا تھا منظر حیرت افزا شان کا  سامنے گویا تھا اک آتش کدہ ایران کا

گاہے ہوتا تھا گماں آتش فشانی کوہ کا  ایک طوفاں تھا بپا دل میں غم و اندوہ کا

آتشیں منظر جہنم کی دلاتا یاد تھا  جس سے ہر اچھا بُرا اپنی جگہ ناشاد تھا

ہاں تری برقِ تبسم نے دیا خرمن جلا  دستِ شوق آگے بڑھایا تھا کہ بس تن من جلا

گھر کا گھر تو نے جلا کر کر دیا ہے خاک بھی  تھی غریبوں کی جو پونجی ہو گئی وہ پاک بھی

جل گئے ہیں سائبانِ اسکے بہت جاذب بھی  خاک ہو کر رہ گئے سارے در و دیوار بھی

حیف وہ گھر جو بلا شک تھا نگارستانِ چیں  نقشِ ویرانی ہوا ہے اسکا سب کچھ دلنشیں

توبہ توبہ صاحبِ خانہ کی حسرت کیا کہوں  حیف میں اس سوختہ ساماں کی حالت کیا کہوں

گاہ سکتہ میں تھا گہ یوں کرتا تھا فریاد بھی  "مجھ سا نا یارب ہو نہ کوئی خانماں برباد بھی"

لوگ سمجھا کر اسے لے آئے آخر ہوش میں  ورنہ بڑھکر خاک ہو جاتا ترے آغوش میں

تھے مددگاران صادق بیشتر احباب بھی  شیخ کا ہمدرد نکلا جان و دل سے شاب بھی

برہمن کو ذات کا اس دم نہ آیا تھا خیال  تھا نوادِ دیوتی اسوقت سارا پائمال

ہاں وہی شے دیکھیے بہرِ خدا ہے کیا کہوں

دم میں باسط پھر وہی قہرِ خدا ہے کیا کہوں  باسط بسوانی



[illegible] اعظم [illegible]

# العصر

## تقویم پارسیہ

پارسیوں کی تقویم کی وجہ تسمیہ بلحاظ اپنے سال اور مہینوں اور دنوں کے اور ان عیدوں اور جشنوں کے جو وقتاً فوقتاً منائے جاتے ہیں یا منائے جاتے تھے ایسی عجیب اور دلچسپ ہے کہ شاید ہی کسی اور قوم کی تقویم ایسی ہو۔ اس تقویم سے فارسی قوم کے مذہبی عقائد اور ریت رسم اور توہمات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل فارس دوزخ بہشت۔ سزا جزا۔ بد اور نیک اعمال کی میزان فرشتوں کی ہستی اور کام وغیرہ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ سورج کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ماسوائے اسکے اورمزد اور آہرمن نیک اور بد دو بڑی روحوں کو مانتے تھے جو ایک دوسرے کی باہم مخالف ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی اس تقویم سے ظاہر ہوتی ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

فارسی نظام شمسی کا سنہ نہایت ہی قدیم زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ فارسی مورخین و منجمین عموماً بتاتے ہیں کہ اسکا آغاز شاہ جم یا جمشید کے وقت سے ہوا ہے جو ۳۰۰۰ برس قبل مسیح سے بھی پہلے موجود تھا۔ فارسی سال میں تیس تیس دن کے بارہ مہینے ہیں۔ جن سے سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔ مگر ۳۶۵ کی تعداد پوری کرنے کے لیے ایک ہی مہینہ میں ۵ دن ایزاد کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک تو ان کے درمیان لوند کا سال ہوا کرتا تھا جسکی وجہ سے انکا نوروز موسم بہار میں آکر پڑا کرتا تھا جبکہ آفتاب برج حوت پر داخل ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ہر ۱۲۰ سال کے بعد لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر سال کے تیرہ مہینے کر دیئے جاتے تھے۔ اور اُسوقت تمام فارسی قلمرو میں بڑے شادیانے اور جشن منائے جاتے تھے۔ یہ مہینہ عرصہ اول کے اختتام پر ماہ فروردین (مارچ) کے پہلے ہوا کرتا تھا۔ عرصہ دوم میں اردی بہشت (اپریل) کے بعد ہوتا تھا۔ اور عرصہ سوم میں خرداد (مئی) کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اور وہ پانچ فالتو دن اسی مہینہ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ یہی سلسلہ سنہ ۶۳۶ء تک جاری رہا جبکہ ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدگرد کو عربوں نے شکست دیکر تخت سے اُتار دیا تھا۔ اور تب فارس خلفاء کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا تھا۔ اس وقت سے نظام شمسی کے سال کے ان فالتو دنوں کی جانب سے بے پروائی ہوتی گئی اور محمدی قمری سنہ تمام مذہبی اور ملکی معاملات میں داخل ہو گیا۔ یہی حال سنہ ۱۰۷۹ء تک رہا جبکہ فارس کے سلجوقی سلطان ملک شاہ [illegible] کا امیر الامرا تھا اس جنتری

کی اصلاح کی تب سے یہ جنتری اُسی کے نام نامی سے مشہور ہوگئی۔ اور نوروز برج حوت کے پندرہویں درجے سے ہٹا کر برج آذری کے پہلے درجے میں لایا گیا اور نوروز کا دن ہر چوتھے سال بڑھایا جانے لگا۔ اسی سبب سے اس چوتھے سال کو کبیسہ یا کبیپ کا سال کہتے ہیں۔ مگر مجوسی اپنے پنجوں میں وہ فالتو دن اپنے آخری مہینے اسفندارمذ (فروری) میں بڑھاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ایام ماہ آبان (اکتوبر) میں بڑھائے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ دن یزدگرد بادشاہ کی شکست کے وقت پر کبیپ کے سال میں اس مہینے کے بعد آتے تھے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قدیم فارسی مہینہ ہفتوں میں منقسم نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس لیے کہ ہر ایک دن اُسی فرشتہ کے نام سے موسوم ہوا کرتا تھا جو اس دن پر مامور متصور ہوتا ہے اور ایسا ہی ہر ایک مہینہ بھی اُسی فرشتہ کے نام پر ہوا کرتا ہے جو اُس مہینہ پر مامور متصور ہوتا ہے۔ یہ فرشتہ اُن تمام چیزوں کے افعال پر اپنا حکم اور اثر رکھتا ہے جن کو یعنی (دسوکی) خدائے عالم الغیب نے اپنے زیر حکومت رکھ دیا ہے۔ اسی طرح ہر ایک دن کا فرشتہ اُن تمام اعمال پر اپنا قابو اور اثر رکھتا ہے جس پر کہ وہ مامور یا مقرر ہے۔ یہ فرشتے دو انواع پر منقسم ہیں۔ جو فرشتے مہینوں پر مامور ہیں وہ اُن فرشتوں سے بہتر سمجھے جاتے ہیں جو دنوں پر متعین ہیں۔ اور دنوں پر مامور فرشتے مہینوں پر مامور فرشتوں کے کارکنان کہلاتے ہیں۔ ہر بڑے فرشتہ کے لیے اُن کے اپنے مہینہ میں ایک خاص دن مقرر ہوتا ہے جس کا وہ خاص لحاظ رکھتا ہے اور اُس کی خاص توجہ کا مرجع ہوتا ہے۔ ہر فرشتہ کے لیے خاص خاص دعا مقرر ہے جس کو زمزمہ کہتے ہیں۔ اور ایک فرشتہ کی زمزمہ خوانی دوسرے فرشتہ کی زمزمہ خوانی سے بہت ہی معزز اور قابل احترام سمجھی جاتی ہے۔ فارس کے بادشاہ اس بات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر روز نیا طلسم استعمال کیا کرتے تھے اور ہر ایک طلسم پر اُس دن کے فرشتہ کی بابت کچھ نہ کچھ کندہ ہوا کرتا تھا۔ اسی اعتقاد کے مطابق اُن کے دسترخوانوں پر بھی ہر روز نئی نئی قابیں آیا کرتی تھیں اور وہ ہر روز نئی پوشاک زیب تن کیا کرتے تھے۔ ہر امر میں ان فرشتوں کی رضامندی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اور اسی لیے میلے اور عیدیں مقرر ہوئی تھیں۔ ان میلوں اور عیدوں میں مذہبی اور پولیٹیکل ہر دو عمل کی یادگاری ہوا کرتی تھی۔ جو دن مہینے کے فرشتوں کی زیر حفاظت سمجھے جاتے تھے وہ عام طور پر نہایت ہی خصوصیت کے ساتھ قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے۔ قدیم زمانہ میں فارسی سال کا پہلا مہینہ بہاری نقطۂ مساوات لیل ونہار (Equinox) سے شروع ہوا کرتا تھا جیسا کہ مذکور ہوا اور ابتدا میں اس کو آذر یا آذر کہتے تھے۔ جس کے معنی ہیں آگ یا وہ فرشتہ جو آگ پر مقرر ہے۔ ان مہینوں کے نام اور اُن کے فرشتوں کے حالات اور دنوں وغیرہ کا پورا بیان حسب ذیل ہے۔—

پہلا مہینا **فروردین** (مارچ) ہے۔ اور یہی اس مہینے کے فرشتے کا نام بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ فردوس کا خازن ہے اور فردوس کی ہیولی روحوں کی خاص حفاظت و نگرانی اُسی کو تفویض ہے۔ اس مہینے کے روز اول پر جس کو نوروز کہتے ہیں ایک خاص میلا ہوا کرتا تھا جو چھ دن تک رہتا تھا اس جشن کے پہلے دن بادشاہ عوام الناس کی خوشنودی اور بہبودی پر خاص توجہ کیا کرتا تھا۔ دوسرے دن عالموں اور فال گیروں کو دعوت دیا کرتا تھا۔ تیسرے دن دین کے ہادیوں اور پجاریوں اور ملک کے مشیروں کی دعوت ہوا کرتی تھی۔ چوتھے دن شہزادے اور امرا مہمان ہوتے تھے۔ پانچویں دن شاہی بچوں کی ضیافت ہوا کرتی تھی اور چھٹے دن جو بادشاہ کا خاص دن کہلاتا تھا اس میں تمام رعایا اپنی اپنی لیاقت اور مرتبہ کے موافق بادشاہ کے حضور میں نذریں پیش کرتی تھی۔ نوروز سے پہلے کی شام کو ایک نہایت ہی خوش قطع اور حسین و پاکیزہ نوجوان جو نوروز مجسم و مشخص متصور ہوا کرتا تھا شاہی خوابگاہ کے دروازہ پر متعین کیا جاتا تھا۔ یہ نوجوان عین اُس وقت بادشاہ کی خوابگاہ میں داخل ہوا کرتا تھا جبکہ آفتاب اپنے افق سے اوپر آجاتا تھا اور بادشاہ فوراً اُس سے مخاطب ہو کر کہتا تھا "تو کیا ہے؟ تو کہاں سے آتا ہے؟ تو کہاں کو جاتا ہے؟ تیرا کیا نام ہے؟ تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اور تو کیا لایا ہے؟" وہ شخص ان سوالوں کا جواب اس نہج سے

دیا کرتا تھا "میں خوش قسمتی اور مبارک ہوں۔ خدا نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور اپنے ساتھ نوروز کو لایا ہوں"۔ جب وہ یہ کہہ کر بیٹھ جاتا تو ایک اور شخص اپنے ہاتھ میں نقرئی قاب لیے ہوئے ظاہر ہوتا تھا۔ اُس قاب میں گیہوں۔ جَو۔ مٹر۔ ماش۔ تِل۔ اور چاول رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اناج کے سات سات خوشے اور نَو نَو دانے۔ شکر کی یا مصری کی ٹِکّی۔ اور نَو نئے نئے سکّے بھی۔ یہ سب اُس قاب میں رکھے ہوئے بادشاہ کو بطور تحفہ یا ہدیے پیش کیے جاتے تھے۔ اسکے بعد وزیر اعظم۔ سپہ سالار۔ خزانچی۔ اور محکمۂ جنگ کا سپرنٹنڈنٹ کمرہ میں داخل ہوتے۔ پھر شہر کے شرفاء حسب مراتب کمرہ میں تشریف لاتے تھے۔ تب مذکورہ بالا اناج کی بنائی ہوئی ایک بڑی سی روٹی بادشاہ کے سامنے پیش کیجاتی تھی۔ بادشاہ تھوڑا سا اُس میں سے لیکر کھا لیتا اور باقی حاضرین کے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "لو۔ یہ نئے زمانے کے نئے سال کے نئے مہینے کا نیا دن ہے۔ تمام چیزیں جو زمانہ میں شامل ہیں نئی بنائی جائیں"۔ اسکے بعد بادشاہ اپنے اُمرا اور درباریوں کو قیمتی لباسوں سے ملبس کرتا اور برکت دیکر وہ تحفے انکے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا جو وہاں لائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ رسم جمشید بادشاہ نے شروع کی تھی جو اُسوقت اِستخر (یعنی شہر پرسیپولس) میں پہلی ہی مرتبہ علانیہ طور پر داخل ہوا تھا اور جس شہر کی تعمیر جمشید نے حال ہی میں کرائی تھی۔ علاوہ دیگر احکام کے ایک حکم اُسنے یہ بھی نافذ کیا تھا کہ فارسی سنہ بھی اُسی روز سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی قسم اور اسی موقع کی اور بہت سی متفرق رسمیں آبان اور اسپندارمذ مہینوں کے بیان میں مذکور ہونگی۔ اِس دن کے علاوہ اُنیسویں دن بھی ایک خاص فرشتے کی عید ہُوا کرتی تھی اور وہ بھی اسی طرح ضیافتوں اور میلوں سے منائی جاتی تھی۔ لوگ اس عید میں بھی نئے لباسوں سے آراستہ ہُوا کرتے تھے اور تمام سلطنت میں کے جھنڈوں اور ریوڑوں اور گلّوں کے حالات کا معائنہ ہُوا کرتا تھا۔

دوسرا مہینا اردی بہشت (اپریل) کا ہے اور چہارم مہینے کے فرشتہ کا نام بھی ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں بہشت کی کنجیاں ہیں اور وہ پہاڑوں اور آگ کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ تیسری تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے جنگ کرنا۔ آتش خانہ میں جانا۔ اور بادشاہ کے حضور میں دن خوشی میں گذرانا اچھا سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس دن کو ان کاموں کے لیے سعد سمجھتے تھے۔

تیسرا مہینا خورداد (مئی) کا ہے۔ اس فرشتے کا اختیار تمام سمندروں دریاؤں اور ہر قسم کے پانیوں پر اور ساتھ ہی ہر قسم کے نباتات اور درختوں پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس ماہ کی ۶ تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے شادی کرنا اور خدا اور فرشتوں سے دعائیں کرنا تاکہ وہ انکو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھیں اور انکی تمام ضروریات مہیا کریں سعد اور باعث کامیابی تصور کیا جاتا تھا اور خوش قسمتی کا ایک سبب سمجھا جاتا تھا۔ اور ۱۰ تاریخ پر اس لیے خوشی منائی جاتی تھی کہ اُس روز فارس کی سلطنت نے غاصب ضحاک پر فتح حاصل کی تھی۔

چوتھا مہینا تیر (جون) ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرشتہ خورداد فرشتہ کے ماتحت ہے اور اُس سے کم درجہ پر ہے اور مویشیوں کی حکمرانی اور انکی حفاظت اسکی تفویض میں ہے۔ اس ماہ کی ۱۳ تاریخ پر آبریزگان نامی ایک عید منائی جاتی ہے۔ جسکی تقریب پر ہر فرقہ کے اشخاص ایک دوسرے پر پانی چھڑکتے ہیں مگر امراء اور دیگر مرتبت لوگ پانی کے عوض گلاب یا نارنگی کے پھول کا عرق یا اور کوئی خوشبودار عرق استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس عید کی بنا بھی ایک خاص تاریخی واقعہ ہے۔ یعنی اِس دن فریدوں کے پوتے منوچہر اور تاتاری بادشاہ حملہ آور افراسیاب کے درمیان ایک عہد نامہ ہُوا تھا جسکی رو سے ہر دو سلطنتوں کی حدود بندی کے بارے میں یہ رائے قرار پائی تھی کہ مشہور و معروف فارسی تیر انداز آرش نامی تیر چلائے اور جہاں اُسکا تیر گرے وہیں دونوں سلطنتوں کی حد قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اُسنے تیر چلایا اور وہ تیر دریائے آمو کے دوسرے پار جا پڑا۔ پس وہی اُسوقت سے اِن دونوں حکومتوں کی حدود چلی آتی ہیں۔ آب ریزی کی یہ رسم اسی عید کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ اور عیدوں میں بھی یہ رسم ادا کیجاتی ہے۔ مثلاً نوروز اور مہرجان کی عیدوں میں

اور نیز ماہ خورداد اور ماہ بہمن کی ۳۰ تاریخ پر بھی یہ رسم خصوصاً اصفہان میں ادا کی جاتی ہے۔

پانچواں مہینا **مُرداد** (جولائی)۔ یہ فرشتہ درختوں اور دیگر نباتات اور پھلوں اور بیجوں کے مشہور و معروف فرشتوں میں سے ہے۔ اِس فرشتے کے دن (۷ تاریخ) پر جشن نیلوفر نامی ایک جشن ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اس رسم میں نیلوفر کے پودے مستعمل ہوتے ہیں۔ اس موقع پر جس قدر عرضیاں بادشاہ یا عظام حکومت کی خدمت میں پیش ہوتی تھیں وہ بپا منظور ہو جایا کرتی تھیں اور عرضی دہندگان کی مرادیں بر آیا کرتی تھیں۔ لفظ "مرداد" کے معنی ہے "موت دینا" اس لیے وہ موت کا فرشتہ خیال کیا جاتا تھا اور اکثر فرشتہ مرگ کے لقب سے ملقب ہوا کرتا تھا۔

چھٹا مہینا **شہریور** (اگست) کا ہے۔ اس فرشتے کے حوالہ تمام فلزات اور معدنیات تھیں۔ اسکا دن ۴ تاریخ پر پڑتا ہے۔ مگر نہ تو اس دن پر اور نہ دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ تاریخ پر کوئی رسم منائی جاتی تھی۔ یہ موخر الذکر تاریخ موسم خزاں میں آکر پڑا کرتی تھی اور اسکو خزان کہا کرتے تھے۔

ساتواں مہینا **مِہر** (ستمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ تیز فہم مخبر ہوا کرتا۔ آفتاب کا نظم و نسق اسکے ذمے متصور ہوتا تھا اور محبت و دوستی پر مامور سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ روز محشر پر لوگوں کو شمار کرنا اور انکو جزا و سزا دینا اسی کا کام تھا۔ لوگوں کا گمان تھا کہ قیامت کے دن یہ فرشتہ ایک پل پر بیٹھے گا اور جب سروش نامی فرشتہ لوگوں کے اعمال میزان میں وزن کر چکے گا تو اس پل پر سے اُن تمام روحوں کا گزر ہوگا۔ اگر کسی کے نیک اعمال اُس ترازو میں بال بھر بھی وزن میں زیادہ ہونگے تو بہ انکے خیال کے مطابق اُس صاحب اعمال کے لیے فردوس کا دروازہ کھل جاتا ورنہ اسفل میں اُسکا حصہ مقرر ہو جاتا ہے جہاں پر اُنکے خیال کے مطابق اُنکو فردوس کی خوشیوں کے سات مدارج کے مقابل میں سات مختلف دُکھ بھگتنے پڑتے ہیں۔ ۱۶ تاریخ سے جو اِس فرشتے کا دن ہے اُنکی سب سے بڑی عیدوں میں سے ایک عید کا آغاز ہوا کرتا ہے جسکو مہرگان کہتے ہیں۔ یہ عید چھ دن تک ہوتی رہتی ہے۔ اسکی بابت بہت سی روایتیں مشہور ہیں مگر ایک روایت سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ یہ عید موسم خزان کے نقطہ مساواتِ لیل و نہار کے وقت کی یادگار اور اُن کے سورج دیوتا کی شان میں ہوتی تھی اور ایسا ہی نوروز کے دن پر بھی جبکہ سورج برجِ آذری میں داخل ہوتا ہے سولھویں تاریخ پر خصوصیت کے ساتھ عید ہوا کرتی تھی۔ اور روپے پیسے والے آدمی اُسوقت روغن بان لگاتے اور اپنے اوپر عرقِ گلاب چھڑکتے اور مختلف قسم کے پھل کھایا کرتے تھے اُنکا خیال تھا کہ اگر ہم اِن رسمیات کو عمل میں لائیں گے تو اُن بلیات سے محفوظ اور مامون رہیں گے جو آیندہ سال بھر آتی رہینگی۔ اس عید کے پہلے دن بادشاہ روغن بان سے اپنے آپ کو مسح کرکے اور مختلف الالوان لباسِ فاخرہ زیب تن کرکے اور ایک ایسا تاج پہن کر جسکی چوٹی پر ایک عظیم الشان مورت سورج دیوتا کی بنی ہوئی ہوتی تھی آراستہ اور ملبس ہوکر اپنے سریر سلطنت پر رونق افروز ہوا کرتا ہے۔ اُس وقت اُنکا بڑا پجاری ایک نفیس نقرئی طباق لیے ہوئے جس میں مصری۔ شفتالو۔ بہی۔ سیب۔ لیموں۔ انار۔ عناب۔ سفید انگوروں کا ایک خوشہ اور سات گونہ بیری قرینہ سے چنی ہوئی ہوتیں اور اُسپر کچھ پڑھتے ہوئے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا کرتا تھا۔ بادشاہ اس قاب میں سے کچھ کھا لیا کرتا تھا اور اُسکے بعد اُسکے تمام اُمراء اور حکام اپنے اپنے مدارج اور مناصب کے مطابق اُٹھ اُٹھ کر بادشاہ کے حضور میں جاتے اور اُس قاب میں سے لیکر تناول کر لیا کرتے تھے۔ من بعد بادشاہ کے توشہ خانہ سے نفیس پوشاکیں اور دیگر قیمتی اور عمدہ اشیا لاکر اُنکے درمیان تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اِسدن لوگ اپنے بچوں کا نام رکھنا یا اُنکا دودھ چھڑانا سعد سمجھا کرتے تھے، اور یہ بھی دستور تھا کہ اگر آج کے دن بادشاہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو فوراً وہ سورج دیوتا کا پجاری بنائے جانے کے لیے بڑے جشن کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔

آٹھواں مہینا **آبان** (اکتوبر) ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ

ئوہماؤ کے ماتحت اور یہ بھی پر مامور ہے۔ اسکا دسواں دن اس فرشتے کے نام پر موسوم اور مخصوص ہوتا تھا اور اُس روز اس ایک خاص تواریخی واقعہ کی یادگار میں سالانہ عید منائی جاتی تھی کہ آج ہی کے دن تاتار یا توران کا بادشاہ افراسیاب جسنے فارسیوں کو بارہ برس تک اپنے قبضہ میں رکھ چھوڑا تھا فارس کے ملک اور سلطنت سے بدر کر دیا گیا تھا۔ اسکے علاوہ اُس بارش کی یادگار بھی ہوا کرتی تھی جو اُنکی روایت کے موافق سات سال کی خشک سالی اور قحط کے بعد ہوئی تھی۔ چونکہ قدیم زمانہ میں یہ سال کا آخری مہینا ہوتا تھا اس لیے اس میں پانچ فالتو یوم ایزاد کیے جاتے تھے۔ اِس موقع پر گیارہ دن تک لگاتار عید منائی جایا کرتی تھی۔ جسکا آغاز ۲۶ تاریخ سے اور انجام اگلے مہینے آذر کی یکم پر ہوا کرتا تھا۔ اِس عید میں ماسوائے دیگر رسوم کے ایک یہ رسم بھی ادا کیجاتی تھی کہ بہت سی اونچے اونچے میناروں کی چوٹیوں پر مختلف قسم کے کھانے رکھدیا کرتے تھے تاکہ (جیسا کہ اُنکا اعتقاد ہے) پریاں اور فوت شدگاں کی ارواح آکر وہ کھانا کھا جائیں اور اُن سے حظ اُٹھائیں۔ جب تک کہ یہ ضیافت اُنکے مفروضہ مہمان تناول کرتے رہتے تب تک پُجاری باجوں اور گیتوں اور ناچ سے (جو ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کیا کرتے تھے اور جسکو دست بند یا پنجہ کہتے تھے) اُنکو خوش کرتے رہتے تھے۔ ہر درجہ اور مرتبہ کے لوگ اِس جلسہ کی تقریب پر نہایت ہی بے لگام خوشیاں منایا کرتے تھے۔ عمدہ عمدہ لباس پہنا کرتے اور ایک دوسرے کو بے باکانہ دعوتیں دیا کرتے تھے۔ اہل دولت و ثروت سے غریب غربا کو چھوٹے چھوٹے ہدیے جو داشتن کے نام سے موسوم ہوتے دیے جایا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بادشاہ بھی مع اپنے امرا و شرفا کے پھولوں کے ہاروں (جنکو تباک کہتے تھے) اور ایک قسم کے گلوبندوں سے (جنکو زرگر کہتے تھے) آراستہ ہو کر عوام الناس کی خوشی میں شریک ہو کر اُنکو مشرف و ممتاز کیا کرتے تھے۔ علی الصبح جلوس سب سے پہلے آتش گاہ میں جاتا اور جب وہاں عبادت ہو چکتی تو لوگ بڑے جوش سے قسم قسم کے باجے بجانے اور خوش الحانی سے گانے اور خوب ناچنے لگ جاتے تھے۔ یہ راگ رنگ اکثر ٹولیاں ٹولیاں ہو کر رچایا کرتے تھے اور ہنسانے والی طرح طرح کی نقلیں ہوا کرتی تھیں جنکے لیے نقالوں اور گانیوالوں کو بڑی بڑی اجرتیں دی جاتی تھیں۔ اس مزدوری کو پانجی یعنی پانوں کی مزدوری کہا کرتے تھے۔

نواں مہینا **آذر** (نومبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ آتش پر مامور تھا اور اس کا نواں دن اسکے نام سے کہلاتا تھا۔ اِس روز تمام فارسی سلطنت میں آگ کے انبار کے انبار روشن کیے جاتے تھے اور زردشت کے حکم کے بموجب ملک کے تمام آتش گاہوں کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر تمام آتش گاہیں بڑی عمدگی اور تزک و احتشام سے آراستہ کیجاتی تھیں اور سب لوگ ناخن کٹواتے اور اپنے تمام بدن کے بال مُنڈاتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم ایسا کرنے سے اپنے سال بھر کے تمام گناہ اور قصور اُتار کر پھینک دیتے ہیں۔

دسواں مہینا **دی** (دسمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ نہ صرف اسی مہینے پر مامور تھا بلکہ اُن تمام دنوں پر بھی اختیار رکھتا تھا جو دی سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً دی بہ آذر۔ دی بہ مہر۔ گیارہویں تاریخ پر (جو اس فرشتے کا دن ہوتا ہے) تمام پارسی سلطنت میں آگ کی شان میں ایک بڑا میلا ہوا کرتا تھا۔ اس میلے کے آغاز کی بابت بہت سی مختلف روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی ہی عجیب و غریب ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سالانہ موقع پر موسم سرما نے ایک دفعہ دوزخ سے نکل آنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہاں اُسکو بہت ہی گرمی لگتی تھی۔ فارسیوں کے آبا و اجداد نے یہ دیکھکر فوراً بڑے بڑے آتشی انبار لگا دیے اور اس سے اُسکو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ تو اور زیادہ اسفل میں آگیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پھر زمین سے روانہ ہو کر تاریکی کے سایوں میں چلا گیا۔ اس موقع پر شب کی درخشندگی کے عام نظارہ کو دوبالا کرنے کے لیے بادشاہ اور اُسکے اہل دربار جھاڑیوں اور درختوں کی چھوٹی چھوٹی اور ہلکی ہلکی شاخیں کاٹ کر اور اُنکو ہوا کے پرندوں اور جنگل کے جانوروں اور درندوں کے جسموں کے ساتھ ترکیب سے باندھکر روشن کر کے اُن کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پرندے تو آسمان میں اُڑتے اور جانور جنگلوں میں بھاگتے

جس سے آس پاس کے جنگل میں اُٹھتے تھے۔ اور یوں رات کے وقت روشنی کا شاندار نظارہ نظر آیا کرتا تھا۔ بعض قدیم مشرقی اور یورپ کے محققین اس قسم کی رسومات کا پتہ آج سے چار ہزار برس پیشتر تک لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسم اُسوقت شروع ہوئی تھی جبکہ فارسیوں کے پہلے بادشاہ کیومرث کے کیصد بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی فارسی بادشاہ ہے جسکو بائبل میں عیلام کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ یہ عید اُسوقت کی یادگار منائی جاتی تھی جبکہ بیبت ناک اژدھے کو اُسکے پوتے ہوشنگ نے ہلاک کر دیا تھا۔ مگر عام رائے یہ ہے کہ خوشی اس موقع پر کیجاتی تھی کہ اُسوقت آفتاب خط جدی پر داخل ہوتا ہے اور یہی وقت ہے دن بڑے اور گرمی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ چونکہ اس سخت موسم میں آگ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے اس لیے اس خوشی کا اظہار طبعی طور پر آگ کے تودے اور انبار لگا کر اور اُنکے سامنے بیٹھکر خوشیاں منانے کے سوا کسی اور طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس حالت اور نظارہ سے وہ تمام خیالات اور احساسات رفع ہو جاتے ہیں جو تاریکی اور سخت سردی سے پیدا ہوے تھے۔ اسی زمانہ میں اسی قسم کی رسم انگلستان میں بھی ہُوا کرتی تھی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ اب ہم موسم سرما کو الوداع کہتے ہیں اور موسم بہار کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس مہینے کی پندرھویں تاریخ ایک مشہور و معروف رسم کے لیے معین اور مخصوص تھی۔ یعنی اُسوقت آٹے یا مٹی کی بہت سی مورتیں اُن فوت شدہ بزرگوں کی بنایا کرتے تھے جو اُنکے خیال میں معزز تھے۔ اور اُن مورتوں کو عام گزرگاہوں میں رکھا کرتے تھے بالخصوص چوراہوں اور چوکوں پر۔ اور انکی بڑی بھاری تعظیم اور تکریم کرنے کے بعد اُنکو جلا دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر علی الصبح کچھ بولنے سے پہلے ایک سیب کھالینا۔ اور ڈھاک کی جڑ کی دھونی لینا بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ایسا کرنے سے آیندہ بارہ مہینوں تک کی زندگی بڑے امن سے گزرا کرتی ہے۔ محتاجی اور بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ ۱۶ تاریخ پر لہسن کی عید ہُوا کرتی تھی۔ لوگ لہسن کو گوشت اور سبزی کے ساتھ خاص طور پر پکایا کرتے اور سمجھا کرتے تھے کہ اس طلسم سے ہم دیوؤں کے حملوں سے بچے رہتے ہیں اور خاص خاص منتروں کے ذریعہ سے ہم دیوؤں کو انکے ٹھکانے سے نکال دیا کرتے ہیں جو ان دیوؤں کا باعث ہُوا کرتا ہے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر یہ طلسم اس موقع پر پڑھا جائے تو بہت موثر اور مفید ہوا کرتا ہے۔

گیارھواں مہینا بہمن (جنوری) ہے۔ یہ فرشتہ تمام دیگر فرشتوں میں نور اور تجلی میں افضل ہے۔ سمجھا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ تمام مخلوقات پر حکمران ہے مگر انسان اُسکی حکومت سے باہر ہے۔ کیونکہ انسان اور مزد کی خاص نگرانی میں ہے۔ اور مزد کے معنی ہے "علم کل"۔ وہ تمام غیظ و غضب کا منتفی کرنیوالا اور تمام جھگڑوں کا ثالث تصور ہوتا ہے۔ ۲ تاریخ پر جو اس فرشتہ کا دن ہے اناج یا گوشت کی عید مناتے تھے اور اُس اناج اور گوشت کو سفید یا سرخ بہمن کے ساتھ پکایا کرتے تھے اور جب رکابی تیار ہو جاتی تو اُسپر سرخ بہمن اور مصری کوٹ کر اور ملا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ سفید بہمن کو دودھ میں پیس کر قوت دماغ کے طور پر نوش کیا کرتے تھے۔ اس دن پر گھر کی بنیاد رکھنا، نئے کپڑے کاٹنا یا بنانا یا سینا، ناخن کاٹنا اور بال منڈانا، طبی جڑی بوٹی تلاش کرنا شبھ سمجھتے تھے اور انکا عرق یا تیل نکال لیا کرتے تھے۔

بارھواں مہینا سپندارمذ (فروری) ہے۔ اس فرشتہ کے سپرد کرۂ زمین ہے اور نیک مستورات کا بھی وہی محافظ و نگران متصور ہوا کرتا تھا۔ اس سبب سے پانچویں تاریخ جو اسکا دن تھا بیاہ شادی کے لیے نہایت موزوں اور شبھ سمجھی جاتی تھی۔ اس دن کے ناموں میں سے ایک نام مردگیران (یعنی مردوں پر حکومت کرنا یا آدمی لینا) تھا۔ اس عقیدہ کی بنا ایک قدیم رسم پر تھی جسکے ذریعہ سے اس دن پر مستورات کو خاص حکومتانہ اختیارات دیے جاتے تھے۔ اور خاوند اپنی بیویوں کے نہایت ہی زبردست احکام کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ اور کنواریاں اس امر کی مجاز تھیں کہ اپنے حسب منشا خاوند چن لیا کریں۔

مہینوں کی جو ترتیب اس جگہ دی گئی ہے وہ وہی ہے جو فارس میں سلطان جلال الدین کی اصلاح کے وقت سے جاری ہے جسنے نہایت قدیم طریق کو جسے دراصل جمشید نے مرتب کیا تھا بحال کر دیا ہے۔
ای۔ کے۔ دلسر

# مسئلۂ انتشارِ قوت اور عالم کی بربادی

مسئلۂ انتشار قوت ( **Dissipation of Energy** ) طبیعیات میں ایک نہایت عجیب غریب اور نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اجسام کی قوت عمل طبعی سے رفتہ رفتہ خارج ہو رہی ہے، اور آخرکار وہ اخراجِ قوت سے مُردہ اور بیکار ہو جائیں گے یہ عالم گیر عمل ہے۔

**لارڈ کیلون کی رائے** | لارڈ کیلون اسکے مخترع تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "عالم محسوسات کے اندر عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قوت کیونکہ اجسام کے اندر سے نکل نکل کر خارج ہو رہی ہے۔ جو بے جان مادی عمل جاری ہیں انکے وسیلے سے اس اخراجِ قوت کی تلافی نہیں ہوتی۔ ذرّوں کے اجتماع اور ارتباط سے بھی (قوت ضائع ہونے کا) یہ خسارہ پورا نہیں ہوتا۔ چاہے یہ عمل اجتماع نباتی زندگی سے بہرہ یاب ہو یا کسی جان دار کی مرضی کے تابع ہو" جس کے معنی یہ ہیں کہ خواہ نباتات کے اندر قدرتی عمل جاری ہو یا خوراک وغیرہ کے وسیلہ سے ہم کام کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کریں مگر عمل انتشار سے جو قوت برباد ہو جاتی ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ آخرکار ہم مر جاتے ہیں۔ انجن رات دن چلتا رہتا ہے اور کچھ مدت کے بعد اتنا فرسودہ اور بیکار ہو جاتا ہے کہ مرمت سے بھی کام نہیں دیتا۔ نباتات بھی کچھ عرصہ کے بعد مُرجھا جاتی اور سوکھ جاتی ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ کرۂ ارض انسان کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ ایک زمانہ آیندہ ایسا آئیگا کہ وہ جان داروں کی بود و باش کے قابل نہ رہیگی۔ تاوقتیکہ انسان کا موجودہ ڈھچر اور قواے جسمانی، دماغی، اور روحانی بدل نہ جائیں یا قوانین میں تغیرِ عظیم واقع نہ ہو۔ جو اس وقت عالم کے اندر موجود ہیں"

**ہربرٹ اسپنسر کی رائے** | عالم کی آخری حالت کی بابت ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "جو عمل ہر جگہ ہو رہے ہیں اُنکا یہ انجام ہوگا کہ ہر جگہ شہر خموشاں کی سی خاموشی چھا جائے گی۔ سب کام معطل ہو جائیں گے۔ ہم سب ہلاکت کے اُس گڑھے میں جا گرینگے جو منھ کھولے ہڑپ کرنے کو تیار ہے" (ورسٹ پیپلز صفحہ ۵۰۴)

مشہور عالم فلکیات رچرڈ پراکٹر لکھتا ہے "سورج سے دس لاکھ کا حرارت خارج ہوتی ہے جس کا صرف ۲۲۷ واں حصہ سیاروں کے حصہ میں آتا ہے باقی خلا میں جاکر غائب ہو جاتا ہے"

**سر آلیور لاج کی رائے** | آپ طبعیات کے نہایت ہی مشہور عالم، مانچسٹر یونیورسٹی کے پرنسپل، کئی کتابوں کے مصنف، خدا کے قائل، دین دار اور نیک آدمی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر والس کی طرح روحانیات سے دلچسپی ہے۔ آپ کی رائے نا طق سمجھی جاتی ہے۔ آپ انتشار قوت کی بابت لکھتے ہیں "وہ قوت جسے تابو کر کے ہم ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کر سکتے ہیں اور اس سے خاص کام لے سکتے ہیں، وہ کارآمد قوت کہلاتی ہے کیونکہ اس سے اپنے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے، گو انتقال سے قوت کی مقدار کم نہیں ہوتی مگر بار بار منتقل ہونے سے اُسکے کارآمد ہونے میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں اُسکا کچھ حصہ زائل ہو جاتا ہے۔ اور ذراتی حرکت (حرارت) بنجاتی ہے اور اس طرح وہ ہمارے قبضۂ اختیار سے باہر ہو جانے سے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ بظاہر ناگزیر عمل ہے جو آپ سے آپ ہوتا رہتا ہے۔ اسی کا نام انتشار قوت ہے۔ تمام بے جان عملوں سے انتشار لاحق ہو جاتا ہے اور یہ عمل سب جگہ اور چیزوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ جاندار ہستیاں اسکے عمل کی ہدایت کر سکتی ہیں"

**پروفیسر جان ٹیٹ و سٹوارٹ کی رائے** | مشہور و معروف عالمان طبیعیات پروفیسر جی پی ٹیٹ اور بالفور اسٹوارٹ نے اپنی مشہور کتاب "دی ان سین یونیورس" ( **The Unseen Universe** ) میں حرارت کے اخراج سے عالموں کی بربادی کی بابت حسب ذیل تحریر کیا ہے "حرارت کا میلان عام مُساوات ہے۔ سچ پوچھو تو حرارت اس عالم کے اندر مساوات

کا درجہ قائم کرنے والی اور عدم مساوات کی دشمن ہے۔ اس سے اس عالم کا بلاشبہ خاتمہ ہو جائیگا۔ اس عالم کو ایک عظیم الشان انجن یا اُن سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا میں نے انجنوں کی مثالوں سے کام لیا ہے۔ ہماری دنیا بلکہ تمام نظام شمسی کی حرارت کا سرچشمہ آفتاب ہے جس طرح آسمان کے دیگر ستارے دیگر نظامہائے شمسی کی گرمی کا مصدر ہیں۔ جو قوت ہماری ہستی کے لیے لازمی ولابدی ہے وہ اُس حرارت سے حاصل ہوتی ہے جو سورج سے خارج ہوکر آتی ہے۔ اور وہ قوت اس گرمی کا ایک نہایت ادنی جزو ہے۔ گو سورج ہمیں قوت بہم پہنچاتا ہے مگر وہ خود سرد ہوتا جاتا ہے۔ آخرکار ایک ایسا وقت آئیگا جب کہ اخراج حرارت سے جو خلا میں ہوتی رہتی ہے سورج زندگی کو سہارا دینے والی اُس قوت سے محروم ہو جائیگا جو اس وقت اسکے پاس موجود ہے۔ یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ سورج کے سرد ہونے کے ساتھ ایتھر کی رگڑ سے ہمارا کرۂ ارض اور دیگر سیارے گھومتے گھومتے آفتاب کی طرف کھنچ جائینگے اور آخرکار اُسکی سطح پہ جاکر برباد ہو جائیں گے۔ اس سے قدرۃً ایک قسم کا تصادم ہوگا جس سے حرارت اور قوت پیدا ہوگی اور کچھ عرصہ کے لیے سورج کی قوت بحال ہو جائے گی مگر بالآخر یہ بھی ختم ہو جائیگی اور آفتاب حرارت و روشنی سے بالکل محروم ہو جائیگا۔ تاوقتیکہ اپنے کسی ہمسایہ سے ایتھر کی رگڑ سے ٹکرا کر اسکی ہستی تہس نہس نہ ہو جائے۔

اس بحث پہ زیادہ بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مگر زندگی جبکہ اس کا تعلق طبعی حالات اور قُوا سے ہے قوت کی تسخیر اور نئی صورتیں اختیار کرنے پر موقوف ہے۔ یہ امر بھی یقینی ہے کہ زمانہ بزمانہ اس قسم کے تغیرات کا امکان کم ہوتا جاتا ہے اور جو کچھ ہمیں عالم کے قوانین اور قوا کے عمل کی کیفیت معلوم ہے اسکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالم کی آخری صورت یہ ہوگی کہ قوتِ بارز کے زائل ہونے اور قوت مخفی کے علاحدہ کارہ ہو جانے سے تمام مادہ ایک ہولناک انبار بنجائیگا اور اس مجموعہ کا درجۂ حرارت و بہ وقت مساوی ہوگا۔

گو نظام شمسی کی قوت مخفی اتنی وسیع ہے جسے ہم اپنی لاچاری کی وجہ سے غیر متناہی قرار دیتے ہیں کہ وہ بے انتہا صدیوں تک زندگی کی طبعی ضروریات کو پورا کرتی رہیگی۔ اگر سیریس (Sirius) اور آفتاب آپس میں ٹکرا جائیں تو اس سے تیس گنا زیادہ حرارت پیدا ہوگی اگر قوانین قدرت موجودہ صورت میں جاری رہے تو بے شمار زمانوں کے بعد مردہ آفتابوں کے ہمارے آفتاب سے ٹکرانے کا سخت احتمال ہے ان کے جسموں کا بڑا حصہ باریک خاک میں تبدیل ہو جائیگا اور اسکے وسیلہ سے بڑے بڑے سیارے اور آفتاب نئے سرے سے بنیں گے۔ الغرض موجودہ نظام شمسی سے زیادہ شاندار اور وسیع نظام شمسی قائم ہو جائیگا۔ مگر شمار میں ارکین شمسی کم ہوں گے۔ اس طرح کچھ مدت کے بعد قوت ختم ہو جائیگی۔ اسکے ساتھ حرکت بھی بند ہو جائیگی اور عالم کے چاروں طرف دائمی سکون اور خاموشی ہوگی۔ جیسے سیاروں کی آیندہ حالت ہوگی ویسے ہی وہ کچھ زمانہ پیشتر بھی تھے۔ انکا ہیولیٰ سفید خاک ایسا تھا جو گردش کر رہا تھا مگر اسکے اندر قوت مخفی تھی۔ خلا میں مادہ سفید بادلوں کی طرح گردش کر رہا تھا آخرکار اُس میں انقلاب پیدا ہوا اور سرد ہوکر کرے اور سیارے بنتے گئے۔ موجودہ عالم کی ابتدا ہوئی تھی تو انتہا بھی ہوگی اسے ہمیشگی اور استمرار نصیب نہیں۔ اسے فنا سے بالا سمجھنا غلطی ہے جسے آزاد ...

## سادگی

مجھے بارہا اس خیال سے سخت تعجب ہوا ہے کہ "سادگی" یا "اصل" کرنا اور اسکی صحیح تعریف کرنا کتنا مشکل ہے۔ بادی النظر میں اسکے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ جو معنی ہم لفظ "سادہ" کے لیتے ہیں وہ محدود ہیں۔ کیونکہ یہ زیادہ تر ایک ایسے اثبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نفی کے معنی دیتا ہے۔ گو یہ بات تعجب انگیز

معلوم ہو گر ہمارے قبول کردہ استعمال میں ایسا ہی ہے۔ ہم عام طور پر "سادہ طریقہ" اور "ایک سیدھی سادی بات" کے الفاظ کا استعمال کیا کرتے ہیں اور ان الفاظ سے ہمارا یہ مفہوم ہوتا ہے ایک ایسا "طریقہ" یا "بات" جس کے کرنے کے لیے ہم کو زیادہ ہوشیاری اور تیز فہمی سے کام نہ لینا پڑے۔ پھر ہم کہا کرتے ہیں "سیدھا سادہ آدمی" جس کا مطلب ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو چالاک اور ہوشیار نہ ہو۔ بعض اوقات ہم اس سے بھی بڑھ کر کہا کرتے ہیں کہ "ہاہا! یہ تو مجسم سادگی ہے"۔ جس کا مطلب اس سے بہت زیادہ ہوتا ہے جس قدر سمجھا جاتا ہے۔ اسکے اصلی معنی ہے نہ کہنے والا آگاہ ہوتا ہے نہ سننے والا۔ یہ لوگ قابل افسوس ہیں۔ استعمال اور عادت نے خیال کی حدبندی کر دی ہے۔ سادگی کے معنی میں ذیل کی باتیں شامل کر لینا مناسب ہوگا :—

(۱) لطافتِ مزاج بے ریاکاری۔

(۲) فطرت کامل جو تبدیلی اور شکست سے مبرا ہو۔

(۳) آزاد معصومیت جو سب کے ساتھ یکساں ہو۔

(۴) عادات کی صفائی جو اندرونہ کا سچا انعکاس ہو نہ کہ رسوم کی مصنوعی نمود یہ خیال کہ "یہ باتیں خیال ہی خیال ہیں" قابلِ اعتراض ہے۔ "سادگی" کی تعریف کیوں کرتے ہو؟ درخت سے گھاس کیوں مراد نہیں لیتے حالانکہ اسکے بھی تنہ اور پتے ہوتے ہیں؟

پس یہ محدود نفی کا پہلو ہے جو ایک اثباتی لفظ کے کہنے اور سننے والے کو پیش آتا ہے۔ "جو کچھ ہے" یہ "جو کچھ نہیں ہے" کے بعد آتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرا پہلو ہے جو اسکے اثباتی معنوں کی اہمیت سے انکار کرتا ہے اور یہی ہمارا نہایت اہم اور دوسرا سبب ہے۔

ہماری سویلیزیشن (تہذیب) خاص طور پر ہم کو ہر صاف اور سادہ چیز کے لیے اندھا بنا دینے کی ذمہ دار ہے۔ سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف (Complexity) ترقی پر۔

دن، رات، بہار، موسم گرما، خزاں اور موسم سرما ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے ہیں صرف زمین کی ایک سادہ حرکت سے انسان کا عجیب و غریب ڈھانچ قائم ہے صرف سادہ طور پر سانس لینے اور نکالنے سے۔ بلاشک "سادگی" نہایت تحیر انگیز ہے! اس سرزمین کی ہر چیز کو آزماؤ مگر کوئی بھی سادگی کے احاطے سے باہر نہ پائی جائے گی۔

اب تھوڑی دیر کے لیے اس "خالق اصغر" یعنی انسانِ عظیم کا خیال کرو اسکا سب سے بڑا کام سویلیزیشن ہے۔ اسپر کون حکومت کرتا ہے؟ مذہب فلسفہ، علم، سیاست، سائنس، جنگ، صلح، صناعی، تجارت، زر، آزادی دستکاری، انصاف اور سخاوت وغیرہ وغیرہ۔ جو الفاظ ملتے جائیں سب ان کے ساتھ ملاتے جاؤ یہاں تک کہ کوئی نام باقی نہ رہے۔ لیکن "اس پر کون حکومت کرتا ہے؟" یہ سوال پھر بھی حل طلب رہ جاتا ہے جب تک ہم یہ نہ کہیں کہ "انسان سویلیزیشن پر حکومت کرتا ہے اور سویلیزیشن انسان پر"۔ اسکا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہر نسل اور ہر صدی اپنے "مہذب ترین" ہونے کا دعوی کرتی ہے اور اپنے سے کچھ ہی پہلے زمانہ کو "زمانۂ تاریک" ( Dark Age ) کا خطاب عطا فرماتی ہے۔ سنہ عیسوی کی ابتدا ہوئی اور اس سے پہلے زمانہ کو مایوسی کے ساتھ "تاریک" کہا گیا۔ تہذیب نے ایک دوسرا نام وضع کیا اور گذشتہ چودھویں صدی کو "زمانۂ وسطیٰ" کہکر پکارا گیا۔ ہم بیسویں صدی کے اشخاص بھی ان روایتی خطابات میں حصہ لیں گے اور تیسویں یا چالیسویں صدی کے لوگ ہماری پہچان کے لیے کوئی نیا نشان ایجاد کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے زمانوں پر "اولڈ فیشن" کا لیبل لگایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے ایک تازہ نام حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ "انسانِ عظیم" درحقیقت انسانِ عظیم ہے!

یہ ہے انسان کی ساختہ سویلیزیشن کا خاکہ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اسکی پیدائش کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمکو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ "سادگی" سے نظرپوشی کی گئی ہے۔ بے شک تخیل پر بھی کچھ الزام رکھا جاتا ہے مگر تجربہ کوشش عام طور پر قبول شدہ ہے۔ ہر شخص کو قریب قریب معلوم ہے کہ انسان بیشتر کس طرح پھلوں، گوشت اور چشموں کے پانی پر گزارا

کیا کرتا تھا۔ حضرت انسان غاروں یا درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے۔ ہر طرف نیچر کی حکومت تھی۔ یہ میدانی زندگی صحت بخش، طاقتور، اور بے لوث تھی۔ فکر، رنج، گناہ اور خجالت کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ نہ بیماریاں ہوتی تھیں، نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں نہ آزادی کے لیے کوششیں۔ صرف آزادی اور سادگی ہر طرف بے کھٹکے اور بے پوچھے گچھے حکومت کرتی تھیں۔ خیالات سادہ تھے مگر وسیع اور متفق۔ خیالات نہ تو ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں الجھے ہوئے۔ اس کے بعد آگ نے رواج پایا جس نے ہمارے تعلقات کو نیچرت کامل طور پر جدا کردیا۔ اُس چور کو جس نے آسمان سے آگ چرائی تھی، دیوتاؤں نے کافی سزا دی۔ یہ سزا انسان کو دی گئی اور نظیر سابقہ قائم ہوگئی۔ ہم اب بھی دیوتاؤں کے انصاف کو بُرا کہتے ہیں۔ اسی آگ کے معلوم ہونے کے دن سے سویلزیشن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی وقت سے ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور انکے پورا کرنے کے ذرائع بہت کم دستیاب ہوتے گئے۔ گھڑی نے تختہ ساعت نما کو شکست دی اور تب ہی سے زمانہ موجودہ ماڈرن ازم ( Modernism ) کا آغاز ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضروریات بے حد بڑھ گئیں اور برکات اولیں غائب ہوگئیں۔ مجوسیوں کا یہ کہنا بجا تھا کہ "شیطان سویلزیشن کا باپ ہے۔ اس نے خوشی، صفائی اور معصومیت یا بالفاظ دیگر "سادگی" کے چلے جانے کے بعد اچھائی اور برائی دونوں نازل کیں۔"

"انسان مظہرِ خالق ہے" یہ اب ہماری پیدائش اور خلقت کا ایک متروک الاستعمال مقولہ رہ گیا ہے۔ جو مقولہ موجودہ "مہذب" صدیوں پر صادق آتا ہے وہ یہ ہے کہ "انسان اچھائی اور برائی کا غیر منفک مجموعہ ہے"۔ شیطان کے الہام کا کیا ہی عمدہ نتیجہ ہے! اسی سے تمام شکست کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ ہماری تمام خلقت مخلوط (Complex) ہوگئی ہے۔ ہمارا دماغ ایک گہرے اخلاط میں کام کرتا ہے اور کبھی کبھی اس خلط کو اور بھی زیادہ مخلوط کردیتا ہے۔ ہم اخلاق کے قواعد بناتے ہیں یہ فرض کرکے کہ علم الاخلاق ایک نہایت پیچیدہ چیز ہے ورنہ قواعد کی کیا ضرورت لیکن ہم خود نہیں جانتے کہ جسکا ہم اعلان کرتے ہیں وہ یہی اصل چیز ہے۔ "جان کے بدلے جان" ہم کہا کرتے ہیں لیکن کبھی ان الفاظ کا میدانِ جنگ میں بھی خیال رکھا جاتا ہے؟ اگر تم بقول شاہنشاہ کے ساتھ "قتل قتل قتل قتل۔ قتل قتل" کی ہم نوائی کرو تو یقیناً اخبارات میں تمہاری بے حد تعریف کی جائے گی۔ تمہارا قاتلانہ اور لعنتی فن سپاہ گری تاریخوں میں تحریر کیا جائے گا اور اسکے معاوضہ میں تمہارے نام کے ساتھ چند الفاظ بڑھا دیے جائیں گے۔ "ہر ایک سے محبت کرو یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی" یہ ہمارے کُرہ کی ایک سادہ ترین آواز نے اعلان کیا تھا۔ "بے شک لیکن بلحاظ تفریق رنگ کے" اسپر سیاسی با اخلاق شخص ایزاد کرتا ہے اور پھر بھی ہزاروں جبر، وعدوں اور دروغ گوئیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

اسی طرح تمام انسانی شاخوں میں کوئی ایسا قاعدہ کبھی نہیں بنایا گیا جسکے ساتھ اُسکا "باطل ساز" استثنا نہ لگا ہو۔

ہم نے اپنے واسطے ایک نئی بادشاہت قائم کی ہے جسکا اصول فرمانروائی سادگی نہیں بلکہ تکلف ہے۔ اچھائی، سادگی، اور صفائی سے یکساں جدائی ہمارا کام رہ گیا ہے۔ ہمارے مقاصد بھی ایسے ہی ہیں یعنی کسی چیز کو جس حالت میں پائیں اُسے اُسکے برخلاف بنا دیں۔ بعض اوقات میں گھنٹوں اس بات پر غور کیا کرتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کی ایجاد کردہ ایسی سائنس بھی ہے جسکی بنیاد سادگی پر رکھی گئی ہو؟

میں پہلے مذہب کو لیتا ہوں، جو دنیا میں ہمارا مقصد خاص ہے۔ اسکی بنیاد خلاقِ عالم کے سادہ ایمان پر ہے۔ لیکن بعض آدمی ہمکو بے حد پیچیدہ مباحث میں ڈالتے ہیں جن سے ہماری عقل گم ہوجاتی ہے اور ہم تعجب کرنے لگتے ہیں کہ آیا ہم زیادہ عقلمند ہیں یا زیادہ بے وقوف۔ بعض آدمی ریاضت کی تعلیم دیتے ہیں جسکو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ تمیز اگر وہ تارک الدنیا ہونے کی

صلاح دیتا ہے۔ دوسرے یہ بتاتے ہیں کہ "جو یہاں ہے سو وہاں ہے" ایک گروہ کہتا ہے کہ جب تم دنیا میں تناسخ کے پھیرے سے نکل جاؤ گے تو کچھ حاصل ہوگا۔ اور جب اس کچھ کی تشریح پوچھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ "نہیں" سے بھی بدتر ہے۔ اسی کے ساتھ عظیم الشان مہذب اور نیٹشکے پرستش No-ism کی ہے۔ یہ لوگ ہر چیز سے انکار کرتے ہیں۔ انسان اِن رسومات، عقائد، رواجات، اقوال اور افکارات وغیرہ کے اخلاط کے سامنے حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ "سادہ غیبی آواز" پر لوگ کم توجہ کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ مثل ایک شفیق باپ کے اپنے بچوں سے کہتا ہے "میری طرف آؤ" لیکن جب ہم اُسکی طرف جاتے ہیں تو اس طرح جاتے ہیں جیسے کوئی سراغرساں کسی کے اسرار دریافت کرنے جاتا ہے یا جس طرح کوئی ترجمان جو اپنے کو بہ نسبت اُس شخص کے جسکی وہ ترجمانی کرتا ہے، زیادہ ظاہر کیا کرتا ہے۔ اسکے بعد ہم ان اسرار کو امتحانی نلی میں ڈالتے ہیں۔ گرمی پہنچاتے ہیں، رنگ دیکھتے ہیں، نتیجہ نکالتے ہیں اور آخرکار اپنی حماقت کا اظہار کرتے ہیں۔

غریب "مہذب آدمی" اپنے ایک انچ بھر کے دماغ سے ہر چیز کا امتحان کرنا چاہتا ہے جسکے لیے وہ ہرگز قابل نہیں ہے۔

اب میں اپنے مشاغل تفریح کو لیتا ہوں۔ یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں۔ ہر بچہ روتا اور چلاتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اسکے بعد ہم رونے سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ زندگی بھر ہمارا یہی مشغلہ رہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جو کبھی کسی نے نہ بنائی ہو۔ ہماری پیدائش کے ساتھ ہی ہنسنا اور مسکرانا بھی آتا ہے جو ہمارے قلبی انبساط کا بیرونی انعکاس ہوتا ہے۔ نیچر نے یہی چیزیں ہماری تفریح کے لیے دی ہیں۔ اسکی اشکال مختلف ہوتی ہیں لیکن اسکا رجحان یکساں رہتا ہے۔ زمانۂ خوشی پانچ سال تک رہتا ہے۔ اسکے بعد ہر چیز اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ خاک، گھاس، درخت، پتے، پھول اور عالم کا ہر نظارہ اور آواز ایسی معلوم ہوتی ہے گویا یہ چیزیں خاص ہمارے ہی لیے بنائی گئی ہیں۔ ہم ایسا کہنے میں انکے ساتھ کافی انصاف کرتے ہیں۔ تم نے اکثر بچوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ اس میں بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اتنا زیادہ جتنا کہ تم اپنے تازہ خرید ریشمی لباس میں بھی نہیں ہوئے۔ تمھاری تہذیب انھیں "نجس" کہہ سکتی ہے مگر ابھی یہ فیصلہ باقی رہتا ہی کہ آیا تم زیادہ ناپاک ہو یا وہ۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے بچہ انسانی تہذیب میں گرفتار ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گزشتہ مشاغل تفریح کو طفل مزاجی پر محمول کرنے لگتا ہے۔ صاف اور سادہ خوشی جو ہمارے اردگرد کی چیزوں سے دل میں پیدا ہوتی تھی کم ہونے لگتی ہے اور مثل تھیٹر، راگ، رقص، دعوت، دوڑ، شطرنج اور دوسرے تہذیبی ناقابل بیان تکلفانہ مشاغل تفریح میں خوشی پانے لگتے ہیں۔ جب تک ہماری رگوں میں سرخ خون دوڑتا رہتا ہے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی انکا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ضعیفی آجاتی ہے، گرمی نکل جاتی ہے اور ہم تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ چند مختصر دعاؤں سے کرکے گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتے ہیں اس امید میں کہ ہمیں دوسرے عالم میں بھی ویسی خوشیاں نصیب ہوں جیسی ہم نے یہاں دیکھی ہیں۔

سب کے سب اندھے راحت طلب ہیں! کیا ہم کبھی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے انجام پر بھی نظر ڈالتے ہیں جو صرف اس وجہ سے دل خوش کن ہیں کہ وہ ہمارے جسم کی بعض حس کو گدگداتی ہیں۔ یہ لوگ چند ہی ایسے نکتے ہیں، متعجب ہوتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں، پژمردہ ہو جاتے ہیں، اُکتا جاتے ہیں، مگر انھیں کبھی سچا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ نہ کبھی انکی سچی خوشی کی رگ حرکت میں آتی ہے نہ وہ ہم کو بچا سکتے ہیں نہ ہمارے اخلاق درست کر سکتے ہیں۔

"اُٹھتی ہوئی لہروں کی طرف بڑھنا کبھی آرام دہ نہیں ہو سکتا۔" دماغ پر خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن تمام قدرتی مناظر کے لیے بیکار ہو جاتا ہے جو درحقیقت خوبصورت ہیں، سادہ ہیں، اور خصوصاً ہمارے خوش کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کس نے ہماری آنکھیں صبح، طلوع آفتاب، دوپہر کی خاموشی، خاموش دریا کے کناروں، میدانوں، درختوں اور انکے کنجوں، بادِ نسیم، شفق، اور شب ماہ کے نظاروں کی طرف سے بند کر دی ہیں؟ سویلزیشن

اور اُسکے موجد نے یہ جواب ہے۔ ہم ان نظاروں کے وقت سوتے رہتے ہیں اور باقی کو "غیر دلچسپ" کہ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارا ہندوستان کبھی قدرتی مناظر کی قدر و منزلت نہیں جان سکتا۔ باوجود اس امر کے کہ ہمارے پاس خوبصورت سے خوبصورت سینریوں اور عمدہ سے عمدہ مناظر کی کمی نہیں پھر بھی ہمارے خیالات شاذ و نادر اپنی اندرونی جگہ کو چھوڑکر ان قدرتی مناظر کے دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو گاڑیاں اور گھوڑے رکھتے ہیں نشست گاہوں اور پارکوں میں جاکر اپنی ضرورت فیشن پوری کر لیتے ہیں۔ اس سے انکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خود عورتوں اور مردوں کو دیکھیں اور دکھائیں۔ انکے پاس درختوں یا گھاس کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا دل فریب نظارہ دیکھنے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہوتا ہے۔ انکو جو بہر قسمت یا ہمت کے ذرا ہیٹے ہیں، خوشی کا دروازہ بالکل بند ہوتا ہے۔ انکے پاس ایسی چیزوں کا خیال کرنے کے لیے وقت کم اور قابلیت معدوم ہوتی ہے۔ انکے لیے آفتاب کا طلوع ہونا گویا فورا کام کے لیے بلاوا ہے اور شام دن بھر کی مزدوری کے بعد آرام کرنے کے لیے۔ اگر کچھ وقت ملتا بھی ہے تو وہ حقہ وغیرہ پینے اور فضول گفتگو میں ضائع کر دیتے ہیں بعض وقت میں خیال کیا کرتا ہوں کہ آیا ان لوگوں کے دماغ بھی ہے۔ اوقات فرصت بھی ان لوگوں کے لیے راحت و انبساط ہیں جو ذرا سا بھی دماغ رکھتے ہیں۔ اب طالب علموں کو لو۔ ان پر کم از کم نیچر کے کچھ حقوق ہیں کیونکہ وہ اس کی بابت انگریزی کتب کا مطالعہ کرتے وقت کچھ سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ طلبا نیچر سے عجیب بے پروائی اور بے خبری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک انٹرنس کے طالب علم سے پوچھو کہ "قدرتی سینری سے کیا مطلب ہے؟" اُسنے سینری یا سین کا نام تو نیو الفریڈ کمپنی یا کسی اور تھیٹر میں سنا ہوگا مگر "قدرتی سینری" اُسکے لیے ایک بالکل عجیب بات ہے۔ لفظی معنی تو وہ جانتا ہے لیکن ہزار طالب علموں میں سے ایک بھی اُسکو ادراک نہیں کرتا۔ اُس سے حظ اُٹھانا تو ایک بڑی بات ہے یہی حالت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو ورڈسورتھ، کولرج، شیلی، کیٹس، براؤننگ اور ٹینی سن کی کتب کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں۔ مطلب سمجھ لیا جاتا ہے اور اسکی ایک تصویر دماغ میں اُتار لی جاتی ہے مگر اسکی اصلی تعریف کرنا ایک ہندوستانی طالب علم کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ آنکھیں ہیں لیکن دیکھتی نہیں؛ کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ اُنکی ذہانت عجیب طور سے الفاظ کے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ مثال کے لیے میں اپنے ایک ہم جماعت کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ کالرج کی کتاب پڑھتے وقت جب ہم اُن چند اشعار پر پہنچے جو سر پیٹرک اسپنس (Sir Patrick Spens کی زبانی) سے بیان کیے گئے ہیں:—

"کل میں نے نئے چاند کو دیکھا جو پرانے چاند کے ساتھ ہم آغوش تھا" تو اسکا مطلب میرے دوست کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے لیے ہر چاند کی پہلی تاریخ کو یہ ایک عام نظارہ تھا۔ میرے دوست نے جب پروفیسر سے اسکا مطلب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا "یہ کسی شام کو دیکھ لینا"۔ ایسی ایسی عام چیزوں کے مشاہدہ کی کمی ہندوستانی طلبا میں عام ہے۔ وہ اپنے مطالعہ، کھیل اور ہنسی مذاق میں اتنے مستغرق رہتے ہیں کہ انکو اس قسم کی "بیہودگیوں" کے لیے وقت بھی نہیں ملتا۔ سادہ اور عمدہ ترین قسم کی خوشیاں اُن میں معدوم ہیں۔ تنہائی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ میدان اور دوسرے غیر آباد مقام اُنکے لیے ناقابل برداشت اور بالکل غیر دلکش ہیں۔ ان میں سے ایک بھی گنجان درختوں کے نقاب میں سے طلوع ہوتے ہوئے رخِ آفتاب کا نظارہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، اور نہ کوئی غروب آفتاب کی خوش نظارگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پارک درحقیقت نصف النہار اور چاندنی رات میں نصف شب کے وقت نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ شہر کے بکثرت آباد حصص بھی رات میں دو تین بجے کے وقت جبکہ ماہتاب کی روشنی پھیکی پڑنی شروع ہو جاتی ہے، قابل دید ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے بیان کرنے پر کہ مختلف پرندوں کے پیروں کے نشانات ایک علیحدہ راستہ پر بے حد خوش نما نظر آتے ہیں، احباب نے تحقیر آمیز قہقہہ لگایا تھا۔ ایک دوسری مرتبہ میرے دوست مجھپر افسوس کرنے لگے جب میں نے بیان کیا کہ رات کو میں

دراو تھے میدان میں، اس لیے ٹھہر گیا تھا کہ اپنے چاروں طرف گیدڑوں کا شور سنوں۔ تنہا ایک وسیع تاریک میدان میں جانا جس پر ماہ ستمبر کی لانبی لانبی گھاس بچھی ہو، اور وہاں شکار کی تلاش میں کسی درندہ کا دہاڑنا جس سے تمام میدان گونج اٹھے، اسکے بعد ایک گہری خاموشی کا ہر طرف چھا جانا اور کسی ایسی ہی ہیبت ناک آواز کے خوف سے گھر کو واپس چلا آنا، ایک طلسمی راحت و انبساط رکھتا ہے۔ دن کے وقت بھی ایسے مقامات پر جانے سے بچو کیونکہ ہے کہ لوگ نظر حقارت سے دیکھیں گے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خطرات اور ہیبت ناک آوازیں بہ نسبت کسی قومی رفارمر کی آوازوں، یا کسی نئی راہ کے لیے پولیٹیکل چیخ پکار کرنے والوں سے زیادہ بے لوث اور پاک صاف ہیں۔

اسی طرح اور روزانہ امور میں بھی سادگی صرف اپنے فقدان کی وجہ سے سرفراز ہے۔ ہر امر پر جداگانہ بالتفصیل بحث کرنا طول اور مشکل ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

لباس میں جتنے زیادہ اور پُر تکلف کپڑے، تم استعمال کرو، اتنے ہی زیادہ اپ ٹو ڈیٹ خیال کیے جاؤ گے۔ محض فیشن تمہارے واسطے کافی نہیں یعنی بغیر تکلف اور فیشن کے مجموعہ کے کام نہیں چل سکتا۔

کھانے کا طریقہ اتنا قدیم، صنعتی اور تکلفانہ ہے کہ لفظ صفت "سادہ" اس کے کسی حصہ کے لیے استعمال کیا جانا موجب شرمندگی ہے۔ ہمنے کھانا پکانے کی ایک خود نما فلاسفی بنالی ہے۔

گفتگو کرنا زمانۂ موجودہ کا ایک مشکل ترین ہنر ہے۔ اگر تم کم گفتگو کرو، تو ڈرپوک، عجیب اور نا قابل شمار کیے جاتے ہو۔ اگر زیادہ گفتگو کرتے ہو تو "باتونی"، "بے لطف"، اور "کتابی" کے خطابات کی عزت حاصل کرتے ہو۔ سادہ گفتگو معیوب سمجھی جاتی ہے۔ جتنا زیادہ تم تخیل کی مدد سے اپنی گفتگو میں نمک مرچ ملا سکو اور جتنے دروغ آمیز فقرے تم شامل کر سکو، اتنے ہی زیادہ پختہ کار اور خوش مزاج مانے جاؤ گے۔

سادے اور سیدھے راستے اب پرخطر ہیں۔ اس طرح رہو کہ ہر آدمی تمہاری نسبت ہنی ایک رائے قائم کر سکے لیکن ان میں ایک بھی درست نہ ہو اسی طرح اگر ہماری عادات سادہ ہیں تو وہ محض مخلوط سمجھے جانیکے قابل ہیں۔

ہمنے "سادگی" کو اپنے پاس سے اتنا دور پھینکدیا ہے جتنا ممکن تھا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی اطمینان نہیں۔ بعض اوقات ہم اس سے بڑے معنی نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "سادہ لوح" کے کیا معنی ہیں۔

سویلیزیشن نے سادگی کو یہ جگہ دی ہے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ کیونکر واقع ہوا۔ جوں جوں دنیا یا انسان ترقی کرتا جاتا ہے سادگی تکلف میں مخلوط ہوتی جاتی ہے۔ کچھ بھی ہو مگر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ نا روا اور نا درست ہے۔ ہمارے دماغوں کی کشادگی مفقود ہوگئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزمرہ کی باتیں دماغ پر اپنا اثر نہیں چھوڑتیں۔ میں آج کل کے آدمیوں کو خیال کرتا ہوں گویا وہ خود بڑے پیمانوں کے سامنے کھڑے ہیں اور محنت سے بنائی ہوئی مہذب ضروریات زندگی کا پلہ برابر کرنا چاہتے ہیں جس کا برابر اور کم کرنا اُن کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ اوزان جانتے ہیں جن کو کبھی اِدھر کبھی اُدھر رکھتے ہیں، ڈنڈی کو دیکھتے ہیں، مگر اطمینان نہیں ہوتا۔ بے فائدہ چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں، خود کو ترازو کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں، پھر بھی وزن برابر نہیں ہوتا۔ اگر میں کسی ایسے کام پر مقرر کیا جاتا تو میں بجائے بتوں کے پودے، گھاس، پتے، پانی اور دوسری بہت سی سادہ چیزیں ڈالتا اور مثل مشہور شہنشاہِ روم کے ایک باغ کی ناچیز پیداوار کو بادشاہی پر ترجیح دیتا۔

دنیا میں تم سادگی کے ساتھ رہو تو آدھی دنیا پر غالب آجاؤ گے۔ سادہ عادات، سادہ خیالات، سادہ مشاغل تفریح، سادہ تلذذات سادہ ضروریات، سادہ عقائد رکھو۔ دنیا مع اپنے زریں تکلف کے تم پر کچھ اثر نہ ڈال سکے گی۔ ایک مرتبہ اور یاد رکھو کہ "سادگی بحر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف ترقی پر"۔ اب اس بات کا فیصلہ تمہارے اوپر ہے کہ تم کس کے مقلد بننا پسند کرتے ہو۔ مترجمہ محمد ابراہیم خان تجلی

# ارتقاء انسانی

ڈارون کے فلسفہ کی بنا پر اس مسئلہ کے تسلیم کرنے والے بہت سے پیدا ہو گئے ہیں کہ انسان نے نسلِ حیوانی سے متغیر ہو کر موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ اسی طرح جانور بھی ایک دوسرے کے تغیرات سے نت نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈارون کے فلسفہ کی پوچ اور بے حقیقت دلیلوں پر عقل و دانش کے ہوتے ہوئے ذی فہم انسان کس طرح ایمان لے آتا ہے اور اپنی اصلیت اور خلقت کے راز کو کیسے اندھے پن سے معلوم کر کے بے عقل جانوروں کی طرح خوشی محسوس کرتا ہے۔ درحقیقت ایسے لوگ ضرور فطرتاً حیوانیت سے حصہ پائے ہوئے ہیں اور انکی عقلیں بیجا تقلید اور جدت طرازی کی دُھن میں نہایت گہری تاریکی کے بوجھ میں دبی ہوئی ہیں۔

ڈارون وغیرہ نے جو نظریہ قائم کیا ہے اور اسپر جس قدر دلیلیں لکھی ہیں تاریخی و مذہبی و عقلی اعتبار سے نہایت ہی ہیچ اور پوچ ہیں۔ دراصل وہ ایک واہمہ ہے جسکو محض اپنے ذہنی دلائل سے ڈارون نے متشکل کر دیا ہے ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بناوٹی صورتیں پرچھائیں کے برابر بھی پائدار نہیں۔

سب سے پہلے تو یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ جب دنیا میں انسان حیوان دو لفظ موجود ہیں اور انکا استعمال ہوتا چلا آیا ہے تو لازمی ضروری ہے کہ دنیا میں یہ دونوں جنسیں ابتدا سے موجود تھیں جن کے مسمّٰی کے لیے یہ الفاظ ایجاد ہوئے۔ بلکہ بدیہی طور پر یہ دلیل قائم ہوتی ہے کہ دنیا کے آغاز پر جب نسل انسانی و حیوانی کا وجود ہوا ہے تو خود حضرتِ انسان نے اپنی عقل و دانش اور علم و عمل کے ذریعہ سے اپنی اور حیوان کی ذات کے لیے دو جدا جدا لفظ ایجاد کیے جس سے ثابت ہے کہ خود انسان ہی ابتدا میں موجود تھا۔ اور وہ حیوانوں کو خود سے جُدا دوسری مخلوق جانتا تھا۔ اگر وہ ابتدا ہی سے حیوان ہوتا اور ارتقاء کے ذریعہ سے یہ چولا بدل لیتا تو ضرور تھا کہ اُسکی زبان میں وہی ارشادات موجود ہوتے جو پہلی خلقت میں تھے اور وہ کبھی خود کو نسلِ سابقہ سے جدا کر کے نئی صورت نیا مسمّٰی نہ اختیار کرتا۔

یہ خیال کتنا لغو ہے کہ انسان نے بندر کی شکل سے ارتقا حاصل کر کے انسانیت کا جامہ پہنا ہے۔ اگر قدرت یا مادہ کا یہی فعل ہے کہ وہ ارتقا کے ذریعہ سے نوعِ اول کو نوعِ جدید میں تبدیل کرے تو کون امر مانع ہے کہ اور بندر اس وقت تک انسان ہو جانے سے محروم رہ گئے۔ حالانکہ اس کلیہ کی بنا پر ہر سال یا ہر صدی میں یا ہزار سالہ دور میں تو ضرور بالضرور بندر سے انسان ہو جاتا۔ لیکن یہ آج تک نہ معلوم ہوا کہ کوئی بندر ارتقا حاصل کر کے انسان بن گیا۔ اور اس طرح بندروں کی نسل کم اور انسان کی نسل زیادہ ہو گئی۔

بڑا تعجب تو یہ ہے کہ ان نظریہ قائم کرنے والے مادیین نے اس وقت تک یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ ابتداءً کون سا بندر انسان بن گیا تھا اور کیوں کر اُسکی نسل انسانی نے ترقی کی؟ یہ بھی ظاہر نہیں ہوا کہ صرف نر نے انسانی صورت اختیار کی تھی یا مادہ نے یا دونوں نے۔ یا نر انسان و مادہ بندر سے نسل انسانی کا وجود ہوا ہے یا مادہ انسان و نر بندر سے۔ صرف ظاہر کر دینا بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا تاوقتیکہ نہایت کافی طور پر اسکا ثبوت نہ ہو لیکن ثبوت تو کہاں اس امر کے ظاہر کرنے کی نوبت ہی نہیں پہنچی لیکن واہ رے انسانی طبائع اور واہ ری حمیت و غیرت کہ بغیر کسی واقعی اور مضبوط دلیل کے خود انسان حیوانیت کے چولا کو قبول کرنے اور خود کو بندر کی اولاد ماننے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ڈارون یا دوسرے نظریہ قائم کرنے والے مادیین نے باوجود اتنی بڑی تحقیقات اور دعوے کے جو ارتقاء کا کلیہ قائم کرنے پر مبنی ہے کسی بندر کے انسان ہو جانے پر خصوصیتِ خاصہ کا انحصار کیا ہے جس سے

ظاہر ہے کہ وہ نامعلوم انسان جو بندر سے آدمی ہوگیا تھا صرف ایک ہی تھا اور پھر اسکے بعد کوئی دوسرا بندر یا جانور ارتقا کے ذریعہ سے انسان نہیں بن سکا۔ یہ وجہ بتائی ہے کہ آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس سے پہلے انسان میں انسانی ارتقا کا مادہ حلول کر گیا تھا اور اُسکے بعد کون سے امور مانع آئے کہ پھر کسی بندر یا دوسرے جانور نے پیکر انسانی اختیار نہیں کیا؟ آخر اس سلب مادہ یا پیدائش کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں جس قدر مضامین شائع ہوے ہیں کسی ایک میں بھی ان امور کا پتہ نہیں ہے تاہم مضامین نگار صاحبان کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے ناقص اور لغو فلسفہ کے ذریعہ سے موجودہ اور آیندہ نسلوں کے ذہن میں اس زہریلا و فاسد مادہ کا اثر قائم کرکے دائرۂ معلومات کو وسعت دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اُس میں سر سے پیر تک ابہام ہی ابہام ہے۔ اگر یہ نظریہ مفید اور واقعی ہوتا تو بے شک اسکی اشاعت لازمی تھی لیکن جبکہ وہ محض ہذیان اور بے سروپا ہے تو اُسکی اشاعت بجائے مفید ہونے کے سخت مضر ہوگی۔

ڈارون نے جو نظریہ قائم کیا ہے وہ محض ذہنی ہے بدیہیات سے اسکو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یا اُسکے ہم خیال ابھی تک کوئی ایسا کلیہ قائم نہیں کرسکے جس سے ارتقا کا دور ہمیشہ جاری ہونے کا ثبوت مل جاتا۔

اگر ڈارون یہ نظریہ قائم کرنے سے پہلے تاریخ سے مدد لیتا یا یہ کہ خود ہی کوئی فرضی تاریخ تصنیف کرکے اس بات کا ثبوت پیش کردیتا کہ فلاں مُلک میں بندر نے ارتقا کے ذریعہ سے نوع انسانی حاصل کی تب بھی اس زمانہ کے انسانوں کو اسکی تھیوری کے سمجھنے میں کچھ مدد مل سکتی تھی لیکن تاریخ بالکل خاموش ہے۔ اُس سے ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ ارتقا کا دور کس وقت میں ہوا تھا۔

جن لوگوں کو خدا نے عقل سلیم دی ہے وہ ہرگز اس کلیہ کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ پروفیسر و. کو جرمنی نہایت ممتاز نوع انسانی اپنے لکچر؛ اُستاد برلن کی انجمن تحقیقات میں اس امر پر خاص روشنی ڈالتے ہوے کہتا ہے کہ "ڈارون کے مقلد اسے ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں جس حالت میں کہ ڈارون اور اُسکے مقلد آج تک بھی ثابت نہیں کر سکے کہ سب سے پہلا انسان کب اور کہاں نمایاں ہوا تھا تو یہ بات کیسے ماننے کے قابل ہوسکتی ہے کہ محض ارتقا کی بدولت انسان نے بندر کے قالب سے نکل کر یہ ہیئت کذائی اختیار کی ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر بندر نے ارتقا حاصل کرکے جامۂ انسانی پہن لیا تو اُس نے اپنے حیوانی دماغ میں عقل اور زبان میں نطق انسانی کس طرح پیدا کرلی؟

ڈارون کا نظریہ محض اس بنا پر ہے کہ اُس نے بندر کو انسان سے بہت مشابہ پایا ہے اور وہ افریقہ کے بندروں کو انسان سے بہت قریب خیال کرتا ہے۔ حالانکہ اگر ڈارون تاریخی مذہبی معلومات و روایات کی طرف متوجہ ہوتا تو اُسے معلوم ہوجاتا کہ دراصل بندر سے انسان ہوگیا ہے یا انسان سے بندر بن گئے۔

مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن شریف میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ بنی اسرائیل اپنی نافرمانی کی وجہ سے بندر بنا دیے گئے۔ اس مقدس شہادت سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ بندر کی جنس پہلے سے موجود تھی کیونکہ انسان کو مسخ کرکے بندر کردیا گیا۔ اور یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی بندر افریقہ کے جنگلوں میں رہتے ہوں یا اُنکی نسل میں افریقہ کے بندر ہوں اور اس لیے اُن بندروں میں انسانی عادات پائے جاتے ہوں جس سے ڈارون کو دھوکا ہوا کہ بندروں میں خلقتاً و فطرتاً انسانی خصائل موجود ہیں اور اسی لیے وہی ارتقا کے ذریعہ سے انسان بن گئے ہیں۔

ڈارون نے تو اپنی جدت طرازی کی دُھن میں تاریخ عالم پر نظر ڈالنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ البتہ جنگلوں کی خاک چھان کر بندروں کی تحقیقات میں انہماک رکھا۔ اور سب سے زیادہ استدلال ارتقا انسانی ساخت دماغ

کو قرار دیا۔ حالانکہ جب افریقہ کے بندر مسخ شدہ انسانوں کی نسل سے خیال کیے جائیں تو اُن کے دماغ ضرور مثل انسانوں کے ہوں گے۔ لیکن مقلدینِ ڈارون کو کیا ہوا انھوں نے تاریخی حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی اور آنکھ بند کرکے ڈارون کے نظریہ پر ایمان لے آئے ؟

اس سے زیادہ ارتقا کی دوسری سیڑھی تغیر قرار دی گئی ہے اور نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ جو جانور پہلے قوی الجثہ یا دوسری صورت کے ہوتے تھے ویسے اب نہیں ہوتے۔ لہذا ارتقا کے ذریعہ سے جانوروں نے دوسری صورتیں اختیار کی ہیں۔ یہ استدلال بھی عجیب و غریب ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ باعتبار سلسلۂ توالد و تناسل پچھلی خلقت بہ نسبت اگلوں کے ہر طرح کمی کا درجہ پاتی ہے اس لیے اُن میں ضرور تدریجاً نقص ہونا چاہیے۔ ہاں اگر یہ ہوجاتا کہ ہاتھی اونٹ اور اونٹ گھوڑا بنجایا کرتا تو کہا جاسکتا تھا کہ جانوروں نے تغیر کے ذریعہ سے دوسرا قالب اختیار کرلیا۔ مگر محض اس سے کہ اگلے زمانہ کے ہاتھی نہایت قدآور، جسیم و قوی الجثہ ہوتے تھے اور اب بہت ہی چھوٹے اور کم زور ہیں یا یہ وجہ متغیر ہو کر ہاتھی نہیں رہے۔ بہت ہی بودی دلیل ہے۔ یا یہ کہنا کہ پہلے جو جانور پیدا ہوتے تھے اب وہ نہیں رہے ہیں لہذا اُن جانوروں نے ارتقا کے مادہ سے دوسرا ہی پیکر اختیار کرلیا ہے صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ قدرت یا مادہ نے اُن جانوروں کو معدوم کرکے دوسری قسم کے جدید جانور بنا دیے۔ اگرچہ عامۃً یہ کلیہ کُل جانوروں پر صادق نہیں آتا۔ کیونکہ گائے، بھینس، گھوڑا، ہاتھی وغیرہ بہت سے ایسے جانور ہیں جو لامعلوم زمانہ سے اسی ہیئت پر چلے آتے ہیں۔ اس لیے جس قدر دلائل ڈارون اور اُنکے مقلدین نے قائم کیے ہیں ہرگز قابل تسلیم نہیں ہوسکتے۔ بلکہ مشاہدۂ عقل، تاریخ اور مذہب ان باتوں کو پورے طور پر رد کرکے خالق مطلق کی حکمت بالغہ کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان و حیوان اور کُل مخلوقات کا پیدا کرنے والا وہی ایک حکیم مطلق ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ دوسری صورت اختیار کرے۔

محمد عبد الرحیم

## کلامِ شاد

از ہز ایکسی لنسی راجۂ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر جی سی آئی ای

پھرے ہر سو مگر اجمیر کے دربار میں آئے
تھے جس سرکار کے بندے اسی سرکار میں آئے

بظاہر ہو ولی لیکن حقیقت میں خدا جانے
تمھاری مدحت والا کہاں گفتار میں آئے

اگر دربار میں خواجہ کے اک بار جائیں گے
کہینگے ہم یہی اے دل کہ کوئے یار میں آئے

اُسی یوسف کے ہاتھوں بکو بس منظور بکنا تھا
اسی امید پر ہم چشت کے بازار میں آئے

زمانہ چھان ڈالا عمر گزری جستجو کرتے
بحمد اللہ آخر کو حریم لدار میں آئے

مے توحید ملتی ہے اسی میخانہ میں شتو
مزا آتا ہے جب چشت کے بازار میں آئے

تمنائیں ہماری شاد ہوجائیں گی سب پوری
معین الدین اجمیری رحؒ کے ہم دربار میں آئے

# راجہ ارن

ایشیائی سلطنت میں جب سرزمینِ ہند کی عنانِ حکومت راجوں مہاراجوں کے قبضۂ اختیار میں تھی، راجہ ارن ایک بڑا مشہور، منصف مزاج، عالی دماغ خداپرست، اور اپنے مذہب کا سچا حامی ہوگزرا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے عہدِ حکومت میں لوگ اسکی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور اسکی حکومت کو خدا کی رحمت خیال کرتے تھے۔ یہ راجہ اپنے مذہب کی پابندی کے باعث راجگانِ جلیل القدر میں بہت ہی معزز، موقر، اور ہردل عزیز تھا بلکہ اُن راجگانِ ہند میں جن کی حکومت اس سے بدرجہا افضل تھی، یہ ہمیشہ ممتاز اور سربلند سمجھا گیا۔ چونکہ وہ دینی اور دنیاوی دونوں امور میں یکساں دلچسپی لیتا تھا۔ اس لیے اُس کی محبت اور وفاداری کا اثر ملک کے ہر طبقہ میں یکساں تھا۔

اُس کے زہد و تقوے اور خدا ترسی کی مثال باوجود سلطنت و حکومت کے تاریخی دنیا میں بہت کم ملے گی۔ رات کو گشت کرنا، یتیموں اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا، فقیروں مسکینوں کی دلجوئی کرنا، رہزنوں اور بدمعاشوں کی تنبیہ اور سرکوبی کرنا، اُسکے اوقات منضبطہ کا پہلا جزو تھا۔ وہ اکثر بھیس بدل کر فقیرانہ لباس میں اِن کاموں کو انجام دیتا، اور چونکہ وہ ان کاموں کو فرضِ عین سمجھتا تھا، اس لیے اسکے حسب خواہش انجام پانے سے اُسے روحانی خوشی حاصل ہوتی۔ وہ رات کے وقت اپنے محل کے ایک گوشہ میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ خدا سے اپنی غفلت اور بھول چوک کی معافی مانگتا، اور اپنے فرائض سے ہوشیار اور سبکبار ہونے پر تہہ دل سے خدا کا شکریہ ادا کرتا۔ اس کی عادت تھی کہ رات کو صرف دو گھڑی آرام کرکے علی الصباح اُٹھتا، غسل کرکے خلوص نیت سے پوجا پاٹ میں مصروف ہوجاتا، آٹھ بجے دن تک اسی طرح اپنے خالق کی پرستش کا حق ادا کیا کرتا۔ اس اثنا میں کسی دوسرے کام کی طرف (خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہو) ہرگز متوجہ نہ ہوتا تھا۔ اس نیک نہاد راجہ کو اپنے ملک کے مدارس و معابد کی طرف خاص توجہ تھی۔ ارباب علم و فضل کی تعظیم، علوم و فنون کے موجدوں اور علم کی ترقی چاہنے والوں کی قدردانی اُسکی فطرت میں داخل تھی۔ ذی علم برہمنوں کی بڑی عزت کرتا، اور ہمیشہ اُنکی خدمت گزاری کو فخر سمجھتا۔ وہ خود بھی ایسا عقیل و فہیم تھا کہ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اُسکی ترکیبوں اور معمولوں کو اپنا دستور العمل بناتے اور اُسکے اخلاقی اور تمدنی خیالات سے سبق لیتے تھے۔

یہ وہی زمانہ تھا جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں ایسی خوش حالی، اور فارغ البالی تھی کہ اگر شارع عام پر کسی کا ایک رومال (خواہ اور کوئی شے) گرجاتا تو وہ مدتوں پڑا رہتا۔ کوئی شخص اُسکی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا۔ اس راجہ کے ملک میں اخلاقی جرم کی سزا خصوصیت کے ساتھ سخت رکھی گئی تھی۔ اسکی رعیت پروری، انصاف پسندی، اور جود و سخا نے خاص و عام کے دل پر اُسکی بڑائی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اور دور دور تک اسکی شہرت پھیل گئی تھی۔

اس نیک بخت راجہ کے گھر میں مدت دراز تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ جب اس بات کو خیال کرتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ اور وہ خدا کی مرضی پر صابر و شاکر تھا، اس لیے اُس نے کبھی اس رنج سے بےچین ہوکر ہائے وائے نہیں کی۔ نہ کبھی اپنی تقدیر کی شکایت زبان پر لایا۔ البتہ اپنے ایشور کو یاد کرتا، اور اُسی سے اپنی حالت عرض کرتا۔ وہ اولاد سے محروم رہنے کو اپنے کسی گناہ کی سزا سمجھتا، اس لیے وہ اُن پنڈتوں اور خداپرستوں کو جو اسکے راج کے وظیفہ خوار تھے، اکثر بلا کر اُن سے دعائے نیک کا طالب ہوتا اور دعائے عفوِ تقصیر کی التجا کرتا تھا۔ اسکی تمام رعایا اسکے لیے تہِ دل سے دعا کرتی تھی کہ اسکے گھر اولاد ہو۔ اکثر لوگ اس مطلب

کے لیے اپنے اپنے مکانوں میں چلہ کشی کیا کرتے تھے۔ بالآخر خدا کی مہربانی نے اُسکی امید پوری کی، اُسکی آرزو کا پودا ہرا بھرا ہوا۔ یعنی اُسکے گھر میں ایک جیتا جاگتا، خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام ستیہ برت رکھا گیا۔

ہم اُسکی پیدائش کی خوشی، دھوم دھام، اور شاہانہ رسوم کے متعلق یہاں کچھ لکھنا نہیں چاہتے، اور نہ ستیہ برت کی پرورش پرداخت اور تعلیم و تربیت کی بابت مضمون کو طوالت دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ صرف اسی قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ راجہ ارن کی ذاتی قابلیت اور بلند خیالی نے اسے اٹھارہ برس کی عمر تک سال ضروری علوم و فنون کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر دیا۔ اسکے بعد تین سال تک اور بھی اپنی خاص نگرانی میں رکھ کر سلطنت کے متعلق خاص خاص باتیں بتائیں۔ پھر اُسے ایک صوبہ کی گورنری پر ممتاز کیا۔ اِس شہزادہ کو ریاست اور حکومت کے باب میں ایک قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس صوبہ کی حالت کچھ سے کچھ ہوگئی۔ خوش حالی کا پایہ آسمان پر پہنچ گیا، ہر جانب غیر معمولی رونق پیدا ہوگئی۔

راجہ ارن کے دل کی مسرت کا حال نہ پوچھیے! اس ہونہار لختِ جگر کی روزافزوں ترقی دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ مگر صد آفریں اسکی متانت اور عالی ظرفی پر کہ اس نے ستیہ برت کے عمدہ خصائل اور پسندیدہ اطوار کو کبھی اپنی تعلیم و تربیت پر محمول نہ کیا، بلکہ صرف خدا ہی کی طرف اسکی نسبت کی۔ واہ رے عارفانہ خیال!

(اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو)

راجہ ارن نے اُسکو پورے سات سال تک منصب گورنری پر بحال رکھکر ولی عہدی کے خلعت سے سرفراز کیا۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ شباب کی اُمنگیں جوش پر تھیں۔ رقص و سرود کی صحبتیں (باپ سے مخفی) ہونے لگیں۔ اسکے مزاج میں خودی اور آزادی آگئی۔ چند ناعاقبت اندیش دوستوں نے اُسکے خیالات اس طرح بگاڑے کہ وہ باپ کی جانب سے بے خوف ہی نہیں ہوا بلکہ سخت ناراض اور آزردہ خاطر بھی ہوگیا۔ اُف ری صحبتِ بد تیرا بُرا ہو!

غرض کچھ ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہی لڑکا جسکی خوبیوں کا ذکر ابھی آپ سن چکے ہیں! ایک عیاش مزاج اور آوارہ ترین شمار ہونے لگا۔ راجہ کو اسکا جو کچھ صدمہ ہوا، وہ ناقابل بیان ہے۔ اُسکی ساری آرزوؤں کا خون ہوگیا۔ اُسکی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، بیٹے کی خبریں سن سن کر اُسے روحانی صدمہ ہونے لگا۔ اور اسی صدمۂ روح فرسا سے وہ لحظہ بلحظہ نحیف و نزار ہونے لگا۔ رعایا کو جیسی خوشی اور آزادی حاصل تھی، اب اُسکے برعکس اپنی آبرو، عزت بچانے کی فکر پڑ گئی۔ طوائف الملوکی کے آثار نمایاں ہوئے۔ بدعملی چاروں طرف پھیل گئی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ولی عہد کی ایک ناگفتہ بہ خبر ایک معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی کے متعلق مشہور ہوئی۔ اور یہ خبر تحقیق کے ساتھ راجہ کے حضور میں پہنچائی گئی۔ اُس منصف مزاج راجہ نے اپنے اصول و آئین کے مطابق ولی عہد کو جلاوطنی کی سزا دے دی۔ اور حکم ناطق مشتہر کر دیا کہ "ستیہ برت ہرگز شرفا کے ساتھ آبادی میں رہنے نہ دیا جائے"۔ ایسی سزا کو سنسکرت زبان میں "پاگنت" کہتے ہیں، اور اُس عہد میں ایسے جرم کی یہی سزا مقرر تھی۔

ستیہ برت ایک مدت تک صحرا نوردی کرتا رہا۔ چونکہ چند روز کے بعد اسکا نشۂ غفلت اُتر چکا تھا، اس لیے وہ اپنے ہم صحبت احباب کے اغوا پر اشکِ ندامت بہاتا اور دل ہی دل میں نہ جانے کیا کیا باتیں سوچ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا۔ بعض وقت وہ اپنے دل میں مر جانے کی ٹھان لیتا اور اسے اپنے ظلم و طغیانی کی سزا تصور کرتا۔ مگر پھر کچھ سوچ سمجھ کر اِس ارادۂ فاسد سے باز رہ جاتا۔ جس مصیبت میں اُسکی دردناک زندگی گزر رہی تھی، وہ اُسکی اگلی پچھلی باتیں یاد دلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنے پچھلے کارناموں پر غم کے نوحے کرتا، اور خدا سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتا، اور رات دن اپنے معبود کی پرستش میں مصروف رہتا تھا۔

ایک مدت کے بعد رفتہ رفتہ اسکی خبر راجہ ارُن کو ہوئی۔ اُس نے اپنے دربار کے امیروں وزیروں سے صلاح لے کر ستیہ برت کو اپنے پاس بلالیا اور پچھلی خطاؤں کی معافی دی۔ راج گدی اسکے حوالہ کی اور آپ گوشہ نشین ہوگیا۔ جس وقت راجہ ارُن نے اپنے پیارے اکلوتے بیٹے کو راج گدی سپرد کی یہ چند نصیحتیں اُسکو کیں جو فی الحقیقت صلاح و فلاحِ دارین کے لیے کافی ہیں :-

(۱) اے بیٹے! ہمیشہ اپنے علم اور عقل کو اپنے کاموں کا رہبر بنانا۔
(۲) ہر کسی پر اعتماد نہ کرنا۔
(۳) دوست اور دشمن کی پوری جانچ کرنا۔
(۴) ذی علم لوگوں کو اپنا مشیر کار بنانا۔
(۵) خدا کے پہچاننے والوں کی عزت کرنا۔
(۶) وید پڑھنے والے باعمل برہمنوں کی تعظیم فرض جاننا اور خبردار انھیں ناراض نہ کرنا۔
(۷) کسی سائل کا سوال رد نہ کرنا مگر جاہل گداگروں کو زیادہ مت دینا۔
(۸) کبھی دھرم کی حد سے باہر قدم نہ رکھنا۔
(۹) لالچ اور بُری خواہشوں سے دھرم کو ناپاک نہ کرنا۔
(۱۰) فجر دم بستر خواب سے اُٹھنا ضروریات سے فارغ ہوکر ایشور کی پرستش کرنا۔
(۱۱) خدا سے ہمیشہ ڈرنا۔
(۱۲) ہمیشہ بموجب دھرم شاستر کے معاملات کا فیصلہ کرنا۔
(۱۳) کسی معاملہ میں بے پروائی یا جانبداری یا نامناسب رعایت کو دخل نہ دینا۔
(۱۴) انصاف کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا۔
(۱۵) رعایا کی حفاظت مستعدی سے کرنا اور انسے مناسب مالگذاری لینا۔
(۱۶) بدمعاشوں، چوروں، اور رہزنوں کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔
(۱۷) معقول اور معتبر ذرائع سے حالات و واقعات ملکی سے خبردار ہوتے رہنا۔
(۱۸) ہمیشہ فضول گوئی سے نفرت رکھنا۔
(۱۹) صحبت بد کو زہر قاتل سمجھنا۔
(۲۰) شراب خواری سے پرہیز کرنا اور اپنی رعایا کو بھی شرابخواری سے بچانا۔
(۲۱) خزانہ بہ حفاظت اکٹھا کرنا مگر خلاف حق ایک پیسہ بھی رعایا سے لے کر خزانہ میں نہ رکھنا۔
(۲۲) غریبوں یتیموں بیکسوں اور غریب الوطنوں کی مدد کرنا۔
(۲۳) رعایا کو اپنی اولاد کے برابر جاننا۔

فی الحقیقت یہ وہ نصیحتیں ہیں جن سے ہمارے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے اصول اور خیالات کا پتہ چلتا ہے اور یہ انھیں خیالات کا کرشمہ تھا کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں صدی بعد تک ہندوستانی بادشاہتیں ایسی عزت اور وقعت کے ساتھ قائم رہیں۔ راجہ ارُن کی ایک ایک نصیحت فوائد سے پُر ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جنھیں طلائی حرفوں سے لکھا جائے تو زیبا ہے۔ اخلاق، تمدن، تہذیب، بلکہ مذہب کے کُل فلسفے انھیں چند نصائح کے اندر موجود ہیں۔

الغرض راجہ ارُن، ہندوستان میں ایک غیر معمولی صفات کا راجہ ہُوا ہے۔ جس کے واقعات زندگی میں بادشاہت اور صوفیت دونوں رنگ نہایت خوشنمائی کے ساتھ ملے جُلے نظر آتے ہیں۔

اقرار (عظیم آبادی)

# بی ممتازی خانم

حضرت محمد واجد علی شاہ بہادر کے زمانہ میں لکھنؤ پرستان بنا ہوا تھا دن رات ہُن برستا تھا۔ جو لوگ لکھنؤ سے خالی ہاتھ آتے، لکھنؤ سے بھرے پُرے جاتے تھے۔ بی حیدری خانم زنانی ڈیوڑھی کی چٹھی نویسنی تھیں۔ سارا اعلا انکے اختیار میں تھا۔ انا، دوا، ماماؤں کی تنخواہیں انھیں کے ہاتھ سے تقسیم ہوتی تھیں۔ کچھ دنوں بعد محل کی نوکری چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہیں۔ نواب مخدرہ عالیہ نواب خاص محل کو بہت رنج ہوا کہ ایسی دیانت دار، پابند صوم وصلوٰۃ، نیک طینت، پڑھی لکھی عورت اب ملنا مشکل ہے۔ دست قلم عورتوں کا تو ہندوستان میں کال ہے۔ مگر بی حیدری خانم مجبور تھیں اسلیے کہ ان کے شوہر بہت بیمار تھے اور کم زور زیادہ ہوتے جاتے تھے۔ میاں بیوی میں بہت محبت تھی۔ کاظم علیخاں ان کے شوہر بہت نیک مزاج [illegible] کے آدمی تھے۔ باپ دادا کی جائداد تلف کر چکے تھے۔ آپ ...ائی کے منشیوں میں ملازم تھے۔ بیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن شاہی کا زمانہ تھا۔ تنخواہ سے دس گُنا مل رہتا تھا۔ کاظمین کے قریب عالی شان مکان تھا اور دولت مندوں میں انکا شمار تھا۔ بیوی نے بھی کچھ کم روپیہ نہ کمایا تھا۔ اب انکو نوکری کی پروا نہ تھی۔ خود گھر میں نوکر چاکر موجود تھے۔

ایک میاں اور ایک بیوی صرف دو دم اور اس قدر دولت! بیوی نے دل کھول کر علاج کیا اور شہر کے نامی حکیموں کو بلوایا۔ آخر حکیم مرزا محمد علی مرتعش کا علاج راس آیا اور انھیں کی دوا سے خدا نے صحت دی۔ اسی مدت میں خدا کی قدرت سے بیوی کو پیٹ ہو گیا گویا سوکھے دھانوں پانی پڑا اور نو مہینے کے بعد لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ممتازی خانم رکھا گیا۔ ماں باپ دونوں کو بہت خوشی ہوئی اور لڑکی کی پرورش بہت اچھی طرح ہونے لگی۔ جب لڑکی سات برس کی ہوئی تو باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔

خاں صاحب کچھ ایسے بیمار نہ تھے جس سے گمان ہوتا کہ اتنے جلد مر جائیں گے ابھی ایک مہلک مرض سے اچھے ہو چکے تھے اور بہت توانا و تندرست تھے دفعۃً بخار آنے لگا۔ اسکے بعد سرسامی حالت ہو گئی۔ بہت کچھ حکیموں نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن قابو نہ چلا اور جمعہ کے دن صبح کو انتقال کیا۔ حیدری خانم نے انکا مرنا بہت دل کھول کے کیا۔ اور چہلم میں خاں صاحب کی ساری چیزیں کپڑے، رومال، دوشالے، اچھا خاصہ جہیز، کئی ہزار کا اسباب انکے نام مسجد کے مُلّا کو خیرات میں دے دیا۔ سال بھر تک برابر رونا پیٹنا رہا آخر صبر کر کے بیٹھ رہیں۔

ممتازی خانم سات برس کے سن سے ہمیشہ پڑھنے لکھنے میں رہتی تھی اور سینے پرونے کا ایسا شوق تھا کہ گیارہ برس کے سن میں بہت مشاق ہو گئی۔ قطع بُرید میں ہاتھ بہت رواں تھا۔ بیونتنے کی راہ خوب جانتی تھی زنانے مردانے کپڑے، گوکھرو، بنت، چٹکی، گوٹ، مغزی، کارچوبی، کلابتونی کام، چکن، کام دانی سب جانتی تھی۔ سب طرح کے کھانے پکانا آتے تھے عمدہ عمدہ مربے، تحفہ تحفہ اچار بنا لیتی تھی۔ خوش نویسی میں ماں سے کم نہ تھی۔ صورت بھی اچھی تھی اور بات چیت بھی عقل مندی کے ساتھ تھی ملنسار ایسی تھی کہ ہر بی بی کو اسکی باتوں میں مزا ملتا تھا۔ چال ڈھال چھب تختی ہزاروں میں ایک تھی۔ کم سن لڑکیاں ہر وقت چمٹی رہتی تھیں۔ ہمجولیوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھی لیکن کہانیوں میں بھی نصیحت کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کھانا پکانے کی کتاب "خوان نعمت" کھولی اور بہت سی باتیں اسکی غلط بتائیں۔ نئی نئی ترکیبیں کھانوں کی ایجاد کیں۔ دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھیں۔ ماں کا دل ہر وقت باغ باغ رہتا تھا۔ ماں نے بھی اسکو اُردو کی کتابیں گھول کر پلا دی تھیں۔ قرآن شریف فرفر پڑھتی تھی۔ بعض عربی جملوں کا ترجمہ بھی کر لیتی تھی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں

بخوبی پڑھا سکتی تھی۔ جاہل عورتوں کی طرح بد مزاجی، خودستائی کی انہیں بو بھی نہ آئی تھی۔ عموماً لڑکیاں کم سنی سے پان کھانا شروع کرتی ہیں مگر ممتازی کو اس سے کچھ نفرت سی تھی۔

اب ماں کو یہ فکر تھی کہ کہیں اچھے خاندان سے بات چیت آئے جو دال روٹی سے خوش ہوں اور نیک طوار پڑھے لکھے ہوں تو اس کے دو بول کر دوں۔ رات دن یہی دعا تھی کہ ممتازی خانم کی خانہ آبادی ہو۔ سہرے کے پھول کہیں جلد کھلیں۔ ہم بھی اپنی زندگی میں انکو خوش حال دیکھ لیں اور جو خدا نخواستہ ہم نہ ہوے تو انکی بڑی خرابی ہوجائیگی۔ آج کل کے عزیز یزید سے بدتر ہیں۔ آنکھ بند ہوتے ہی گھر گرستی کھسکا دینگے اور دائی بندی کو گھر سے نکال دینگے۔

تمام شہر میں ممتازی کی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری مشہور تھی۔ دُور دُور سے پیام سلام آنے لگے۔ روز ایک نئی مشاطہ آتی تھی۔ اونچے اونچے گھروں سے نسبت کے رقعے آنے لگے۔ حیدری خانم حیران تھی کہ کیا کرے کوئی مرد گھر میں نہیں ہے جو بات چیت کرے لڑکے کا چال چلن دریافت کرے۔ ذات پات پوچھے۔ صورت شکل دیکھے۔ حسب نسب کا پتہ لگائے میں عورت ذات کیا کرسکتی ہوں۔ اسوقت میں کوئی عزیز ایسا نہیں جو اپنے کام آئے۔ اپنے طور پر اس نے بہت چھان بین کی مگر عورت ذات تھی مشاطہ کی چال کو نہ سمجھی۔ یہ قوم زمین آسمان کے قلابے ملانے میں مشہور ہے ایک پردہ دار عورت کو دَم جھانسے میں لانا کتنا بڑا کام تھا۔ مَردوں کے تو کان کاٹتی ہیں۔ جہاں سے انکو چار پیسے زیادہ ملنے کی امید ہوتی ہے اُسی کی سب سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ آخر ایک نسبت بی حیدری خانم کو پسند آئی۔ دولہا والوں کی طرف سے جلدی ہونے لگی۔ نکاح کی تاریخ ٹھہر گئی۔ برات آئی۔ جب دولھن گھر سے رخصت ہونے لگی تو ماں کی روتے روتے حالت غیر ہوگئی۔ سب بیبیاں آب دیدہ ہوئیں۔ جتنی ہمجولیاں تھیں انکی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ڈومنیاں بدائی (وداعی) گا رہی تھیں۔

نگوڑی ماں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ خوب جی کھول کر حوصلہ نکالا۔ اپنے مقدور سے زیادہ دیا۔ کھانے جوڑے کے پانسو روپے دیے۔ چاندی کا پلنگ، کارچوبی پلنگ پوش، اوڑھنا تکیہ چادر لحاف، سچ بند جوڑے بھاری بھاری پُرزر، سر سے پاؤں تک سونے کا زیور، پاندان، چوگھرا، اُگالدان، جوڑ چاندی کے، عطردان، خاصدان، گڑگڑی، اگالدان، چھپر کھٹ، چاندی کا، مسند تکیہ، دوشالہ، چاندی کے ساز سمیت گھوڑا۔ سلامی میں پانسو روپے، سمدھن کو نفیس جوڑا۔ تانبے اور چینی کے برتنوں کی تو انتہا نہ تھی۔

جب لڑکی رخصت ہونے لگی تو ساس نے داماد سے رو کر کہا "واری میرے پاس کچھ دھن دولت نہیں ہے۔ میری کمائی یہی بچی ہے۔ یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں میری بچی بہت نازوں کی پالی ہے اس کا دل نہ توڑنا۔ میں واری جاؤں یہ کبھی تمہارے خلاف نہ کرے گی۔ بد مزاجی سے اسکو معاف رکھنا۔ ماشاءاللہ پڑھی لکھی ہے تم کو اسکے ساتھ آدمیت سے پیش آنا چاہیے۔ میری عزت تمہارے ہاتھ۔ منہ دھلانے کو لونڈی دیتی ہوں"۔ دولہا ساس کے آگے ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "میری مالک ہیں اور مختار ہیں۔ میں ان کا ہمیشہ تابعدار رہوں گا اگر میری کھال کی جوتیاں بنوائیں گی تو بھی مجکو عذر نہ ہوگا"۔

ساس نے خوش ہو کر چٹ چٹ بلائیں لیں اور کہا بیٹا میں نثار میں واری یہ سہاگ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے۔ تم سے بیاہ کر اسکے بھاگ جاگ گئے۔ الٰہی! تمہاری سیکڑوں برس کی عمر ہو، رچنا بسنا نصیب۔ دشمنوں کا بال بیکا نہ ہو۔

جب سلامی ہو چکی دُلھن سکھپال میں سوار ہوئی زار و قطار رو رہی تھی۔ پہلے جہیز نکلا پھر جوڑے کا کھانا ساتھ ساتھ تھا۔ جب دُلھن دولہا گھر پر آئے ساس کو سب نے مبارک باد دی۔ ساس نے پہلے بلائیں لیکر بہو بیٹے کو دعائیں دیں۔ دونوں پر سے وار کر پانی پیا۔ چوتھی چالوں

سے فرصت ہوئی تو گھر گرہستی دیکھنے کی نوبت آئی۔ دُلھن نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سسرال بالکل مفلس ہے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان ہے جسکی دیوار چاروں طرف سے گری ہوئی ہے۔ چھتوں کی دھنیاں کمان ہو رہی ہیں۔ برسات میں ٹگنائی اور دالان ایک ہو جاتا ہے۔ چھانپ کے بدلے چٹائیاں چھت میں پڑی ہیں۔ ایک دالان ہے اسی میں باورچی خانہ ہے اسی میں آبدار خانہ ہے اسی میں غسل خانہ ہے اسے میں بڑی بی کے رہنے کا ٹھکانا ہے۔ بغل میں ایک صحنچی ہے جس میں ممتازی خانم کا چھپر کھٹ لگایا گیا ہے۔ ساس ایک سیدھے مزاج کی عورت اُسکو کچھ بُرے بھلے سے مطلب نہیں۔

سرفراز علیخاں شوہر نشہ باز افیونی اور مدکیا ہے۔ کچھ پڑھا نہ لکھا نرا جاہل۔ اچھے لوگوں کی صحبت سے نفرت کاہلی اور جاہلی نے پلنگ پر پڑے پڑے روٹی کھانے کا خوگر بنا دیا تھا۔ محنت سے پیسہ کمانے کی فکر مطلق نہ تھی۔ کسی وقت میں باپ دادا کے زمانہ کی گلی گھرچن تھی وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے کھا چکے تھے۔ اب جہیز پر دارومدار تھا۔ گھوڑا تو گھر پر بندھا نصیب نہ ہوا اوپر اوپر بک گیا۔ جہیز بھی آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ کچھ چنڈو باز افیونی آتے تھے وہی پیسے کی چیز دمڑی کو بیچ لاتے تھے۔ ممتازی خانم کو اس بات کا بہت ملال تھا لیکن کیا کر سکتی تھی۔ کچھ بولتی ہے تو عمر بھر کا ساتھ چھوٹتا ہے۔ اسی غم میں گھلی جاتی تھی مگر دانشمند ایسی تھی کہ ذرا بھی چہرے پر میل نہ آنے دیا۔ خاوند سے بہت خندہ پیشانی سے بولتی بات کرتی اور اُسکا دل ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتی۔

اُس نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا تھا وہی ہوا اب واویلا کرنے سے دونوں کی رسوائی اور تکا فضیحتی ہے۔ جوتیوں میں دال بٹی تو کیا فائدہ ہوا؟ بندھا ہوا خوب مار کھاتا ہے۔ رونے پیٹنے سے خاوند جاہل سے عالم نہیں بن سکتا۔ بلکہ اور دلوں میں نزاع پیدا ہو جائے گی۔ ابھی تک تو ہر طرح زندگی ہنسی خوشی سے کٹتی ہے عقلمندی اسی میں ہے کہ دنیا میں رسوائی نہ ہو اور چار آدمی الزام نہ دیں۔ اماں بیچاری کا بھی کوئی قصور نہیں۔ اُس غریب نے تو خوب چھان پھٹک کی مگر ان کمبخت کٹنیوں کے جال فریب میں اچھے اچھے مرد آ جاتے ہیں وہ تو عورت ذات تھیں۔ بظاہر سب طرح ٹھونک بجا لیا تھا ہم کو بھی معلوم تھا کہ ہم اچھے خاصے شریف رئیس عالی خاندان کے گھر جاتے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب تو زندگی بھر پاپڑ بیلنا پڑے۔ اگر اماں سن پائیں کہ میں اس مصیبت میں ہوں تو جیتے جی مر جائیں۔

کوئی بات ہو چھپی نہیں رہتی۔ ممتازی خانم نے قسم کھانے کو ایک حرف تک نہیں کہا لیکن شدہ شدہ سارا کچا چٹھا اہل محلہ نے بی حیدری خانم کے گوش گذار کیا۔ سنتے ہی چراغ پا ہو گئیں۔ اُسی وقت ڈولی میں سوار ہو کر سمدھیانے آ کودی۔ گھر کا وہی نقشہ تھا جیسا لوگوں نے بیان کیا تھا۔ غصہ سے تھر تھر سارے بدن سے کانپ رہی تھی۔ آخر نہ رہا گیا۔ کلیجہ سے شعلے اُٹھنے لگے اور برافروختہ ہو کر کہنے لگی۔ لوگو ابھی گھر تھا جس میں میری زندگی بھر کی کمائی دھن دولت مُوس لی گئی۔ ہے ہے! کیسے میری بچی کے کرم پھوٹ گئے تھے۔ اے بی سمدھن دیکھنے کی تو تم بھولی بھالی ہو مگر ٹھگنے کے فن تم کو خوب یاد ہیں۔ خوب کٹنیوں کو پڑھا کر میرے گھر بھیجا۔ سال بھر تک دلہن کی خاک لے ڈالی۔ فوج ایسا بیاہ ہوتا اس بےحیائی کو آگ لگے کوئی ایسا مکر کرتا ہے دیکھو تو اس جعل سازی کی میں کیسی سزا تم لوگوں کو دیتی ہوں۔ عدالت میں ٹنڈیاں نہ کسوائی ہوں تو سہی۔ اشراف زادوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں۔ یہ بیل کیا منڈھے چڑھے گی۔ سارا جہیز ملیا میل کر دیا ایک ایک چیز ٹھکانے لگا دی۔ جُونی بھوسی کھا کر مجھ دکھیا نے ایک ایک کوڑی جمع کی۔ میری بچی نے خود سوئی مار کر آٹھ پہر آنکھیں پھوڑ کر مال جمع کیا۔ ساری پونجی یہی جہیز تھا۔ وہ اس طرح خاک سیاہ کیا جاتا ہے کیا یہ رونے کا مقام نہیں ہے کہ سارا جہیز افیون اور مدک میں برباد ہو رہا ہے؟ پانوؤں میں چھاگل تک نہیں رہی لے لو چاندی کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ کس غضب کا شہدپن ہے۔ مردوے

کو شرم نہ آئی بی بی کے پائجامے دوپٹے نخاس میں بیچے۔ اور کوئی ہوتی تو میاں کو مزا چکھا دیتی میری بچی تو بالکل نوری ہے۔ ہائے ہائے ایچ والوں نے جل دیا اسی سے موئی کٹنیوں نے گھر گھیرا تھا۔ مجھ کمبخت ماری کو اس گھڑی کی خبر نہ تھی۔ میرا ستیاناس کر دیا۔ اگر عدالت نے میری فریاد سن لی تو شہر میں رہنا مشکل ہو جائیگا۔ موئی کٹنی پہ تو قیامت ٹوٹے گی۔ ناک چوٹی کاٹی جائے گی۔ کورے استرے سے سر مونڈا جائے گا۔ گدھے پر سوار کر کے شہر میں ہنڈوائی جائے گی۔ یہ کسی اور کا زمانہ نہیں ہے مرزا واجد علیشاہ بہادر کا عہد سلطنت ہے۔ سب کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ نام کو شادی ہوئی لیکن در اصل خانہ بربادی ہوئی۔ نوشہ بنے کے بھی سب ڈھنگ معلوم ہوئے دن رات پینک میں پڑے رہتے ہیں۔ نوکری چاکری کیسی چارپائی کے بان توڑا کرتے ہیں۔ نہ پڑھے نہ لکھے جاہل لٹھ۔ محنت مزدوری سے شرماتے ہیں بات کرنے کا شعور نہیں۔ صحبت میں دو دو خدوے رزالے کمینے جمع رہتے ہیں سلامتی سے جو ادا ہے نرالی ہے۔ پوری بات تو کر نہیں آتی نوکری اور مزدوری کیسی۔ ایسوں سے تو کوئی بیچانے میں لوٹا بھی نہ رکھوائے۔

سمدھن نے جو یہ تقریر سنی منہ فق ہو گیا۔ شرم سے گردن جھکا لی پسینے میں ڈوب گئی۔ ہوش حواس جاتے رہے۔ بوٹی بوٹی کانپنے لگی۔

ممتازی خانم یہ حال دیکھ کر دل میں کہنے لگی لو غضب ہو گیا اماں کو تو رتی رتی خبر ہو گئی۔ بھلا ان کو ضبط کہاں۔ یہ ہمیں تھے جو کلیجہ مسوسے دکھ جھیل رہے تھے۔ مگر اب ان باتوں سے کیا فائدہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ صحنچی سے اٹھ کر آئی اور کہنے لگی۔ ہائیں اماں! آج تم کو کیا ہو گیا ہے جو اس قدر برہم ہو رہی ہو کسی کو الزام دینے سے کیا فائدہ؟ میری قسمت میں لکھا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب چاہتی ہو کہ سارے شہر میں رسوائی ہو۔ نا بی اپنی بدنامی مجھے منظور نہیں ہے۔ اب ان باتوں میں کیا دھرا ہے۔ تم نے تو اپنے نزدیک کوئی بات اٹھا نہیں رکھی میں بھی تمہاری بیٹی ہوں جس طرح ہو گا مصیبت جھیلوں گی۔ میں یہ ضرور کہتی ہوں کہ تم کو کٹنیوں نے دھوکا دیا اور زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ اب ان کے آگے کوئی ایسی بات نہ چلے۔ مجکو تو انھیں سے کام ہے۔ برے ہوں یا بھلے۔ سنگ آمد سخت آمد آدمی کو ہر مشکل کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ان کو اتنا مقدور نہیں ہے کہ روٹی کپڑا دے سکیں مگر اسکے ساتھ ایک بات شکر کی ہے کہ بد مزاج نہیں ہیں۔ ہر طرح میرے تابعدار ہیں۔ میں اکثر جان جان کر ان کے آزمانے کو بگڑ بگڑ کر لڑتی ہوں مگر وہ بندۂ خدا کبھی میرے آگے ہونٹ نہیں کھولتا اور کوئی بات بڑھ کر نہیں کہتا۔ جس کی برائی کہنا چاہیے اس کی اچھائی بھی ضرور بیان کرنا چاہیے۔ تم انھیں باتوں کو غنیمت سمجھو اور خدا کا شکر بھیجو۔ تم کیوں بیتاب ہو کر چلی آئیں۔ نگوڑا مال اسباب صدقے کیا تھا پھر تقدیر میں عیش ہے تو وہی عیش بھی کرائیں گے وہ کما کر لائیں گے اور ہم بیٹھے بیٹھے کھائیں گے۔ اور محنت مزدوری کو میں کیا کم ہوں۔ میں تو کہتی ہوں وہ خوش مزاجی سے رہیں تو انکو روٹی کپڑا میں بیٹھے بیٹھے دے سکتی ہوں۔ مال کیا چیز ہے۔ آدمی کی زندگی عیش و آرام سے گزرنا چاہیے۔ میل ملاپ سے رہیں ہنسی خوشی سے دن کٹیں یہی لاکھوں روپے ہیں۔

بی حیدری خانم بیٹی کی باتیں سنکر باغ باغ ہو گئیں اور کہنے لگیں اب میری خاطر نشان ہو گئی۔ خدا کرے تم دونوں ہمیشہ شاد آباد رہو۔ رنج و ملال اور نکا فضیحتی کے ساتھ اگر عیش بھی ہوا تو کس کام کا۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ دکھ بھی کٹ جاتا ہے۔ کسی کا درد دکھ کوئی ٹال نہیں سکتا۔ روٹی دینے والا تو اللہ ہی ہے۔

ساس نے جب بہو کی گفتگو سنی تو سمدھن کے سامنے اسکی چٹ چٹ بلائیں لینے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی میں واری تم اپنا دل بھاری نہ کرو۔ مجکو اپنے بیٹے سے تم سوا ہو۔ جو کچھ دال دلیا میسر ہو گا پہلے تم کو کھلا لونگی پھر میں کھاؤں گی میں یہ نہیں کہتی کہ میرا لڑکا اچھا ہے لیکن شریف زادہ ہے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کوئی سرپرست نہ رہا جسکے دباؤ میں رہتا اور تعلیم پاتا۔ بری صحبتوں میں بیٹھ کر نشہ پانی میں پھنس گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا یہی ایک لڑکا ہے سب بیچ بیچ کر کھلا دیا۔ اب ایسی بات کرو جس میں گھر بدنام نہ ہو۔ میں تو اب تمہاری

زندگی بھر کی لونڈی ہوں اور وہ بھی اگر شریف ہے تو تمھاری تابعداری سے باہر نہ ہوگا۔

بی سیدہ خانم تو اپنے گھر چلی آئیں۔ شام کو سرفراز علیخان اپنے گھر آئے۔ ان کو سب خبر باہر مل چکی تھی۔ بہت اداس تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں سارا نشہ کرکرا ہو گیا تھا۔ بھوک پیاس کہاں تھی اسی غم کے مارے کھانا بھی نہیں کھایا اور منہ لپیٹ کر پڑ رہے۔

ممتازی خانم نے مسکرا کر مزاج پوچھا اور کہا معلوم ہوتا ہے آج کچھ نشہ پانی نہیں ہوا۔ اب میں سمجھی تم کو کچھ روپے کی فکر ہے۔ بھلا اسکا چھپانا کیا تھا آخر یہ سب زیور کس کا ہے؟ بجلیاں اور کنگن اتار کر سامنے رکھ دیئے اور کہا لو شوق سے اپنا کام نکالو۔ تمھارے دشمن تشویش کریں۔ تم گھبراؤ نہیں میں زندہ ہوں تو روٹی پانی اور نشہ کی فکر تم کو نہ ہونے دوں گی۔ خاں صاحب نے کہا سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں اور درحقیقت تمھارے احسان اس قدر ہیں کہ جن کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ایسی نیک بیوی کسکو ملتی ہے۔ تم نے میری بہت خاطر کی۔ آج تک گھر کا خرچ تمھارے سر رہا۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہیں کمائی لیکن تم کو اسپر بھی خوش پایا۔ کمبخت افیون نے مجکو کسی کام کا نہ رکھا۔ ایسی بے غیرتی کی زندگی کس کام کی۔ جی چاہتا ہے اب لکھنؤ چھوڑ کر کسی ایسے شہر میں جاؤں جہاں کوئی جان پہچان نہ ہو پہلے تو افیون کی عادت رفتہ رفتہ ترک کروں پھر مصیبت جھیل کر محنت مزدوری کرکے چار پیسے کماؤں۔

بی بی نے کہا اسکے لیے لکھنؤ چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم آج سے گھر میں بیٹھے رہو اور باہر جانا یک قلم ترک کر دو۔ کسی سے نہ ملو۔ افیون بھی معتاد سے کم مقدار میں کھاؤ۔ ایک ہفتے میں یہ عادت کم ہو جائے گی اور چند مہینے میں بالکل چھوٹ جائے گی۔ رہا نوکری کا ماشاءاللہ تم کچھ شد بد پڑھ لیتے ہو۔ لکھنے میں ہاتھ ذرا کچا ہے۔ وہ گھر میں مشق کر و گے تو میں بھی کچھ بتا دوں گی اور تمھاری وجہ سے میرا خط پختہ ہو جائے گا۔ پھر در دولت پر جانا دربار میں عرضی دینا کم سے کم کتب خانہ کے منشیوں میں نوکر ہو جاؤ گے تو دس پندرہ روپے مہینا مقرر ہو جائے گا۔ آدمی ترقی کرنا چاہے تو اسکے لیے ذرا مستقل محنت کی ضرورت ہے۔ تم اگر میرے کہنے پر چلو تو چند روز میں گھر کی حیثیت درست ہو جائے۔

سرفراز علیخاں کو بیوی کی رائے بہت پسند آئی اور اس نے کہا بے شک تم نے دانشمندی کی بات کہی ہے۔ آج سے میں تمھاری مرضی پر چلوں گا۔ دو پیسے روز کی افیون تھی ایک ہی مہینے میں کم کرتے کرتے ایک پیسے کی رہ گئی۔ گھر میں بیٹھا ہوا دن رات لکھا کرتا۔ رات کو کھانے پینے کا سودا خرید لاتا جو کچھ گھر میں دال دلیا پکتا کھا کر خدا کا شکر بجا لاتا۔ دوست احباب افیونی بھائی جس قدر ملنے آتے انکو صاف جواب دیدیا جاتا۔ آخر چھ مہینے میں افیون کے عذاب سے غریب سرفراز علی خاں نے نجات پائی اور مشق کرکے اپنا ہاتھ بھی کچھ صاف کر لیا۔ پھر حافظ نوراللہ سے جلی کی اصلاح لینا شروع کی اور چند روز میں قطعات کی مشق کرکے اچھا خاصہ خوش نویس ہو گیا۔

خواجہ آفتاب الدولہ قلق کے ذریعہ سے بادشاہ کو عرضی دی۔ ابتدا دیوانی کے منشیوں میں دس روپے ماہوار مقرر ہو گیا۔ ایک دن انکا خط بادشاہ نے بغور ملاحظہ فرمایا۔ شیریں خط بہت پسند آئی اور اپنے کتب خانہ کے منشیوں کا افسر بنا دیا۔ پچیس روپے مقرر ہوئے۔ پھر خواجہ قلق کے ساتھ دربار میں کبھی کبھی جاتے تھے اور نہایت بذلہ سنجی سے کلام کرتے تھے۔ بادشاہ کو ان سے بہت دلچسپی ہوتی تھی۔

اس وقت ثابت الدولہ وہاج الدولہ مقربان خاص کسی نواب ناظر کی مخالفت سے عتاب میں آئے اور موقوف ہوئے۔ وظیفۂ مقررہ ملتوی ہو گیا۔ سرفراز علیخاں یاوری قسمت سے انکی جگہ پر مقربان خاص میں شامل کر لیے گئے۔ سرفراز علیخاں نے بادشاہ کے مزاج میں یہاں تک رسوخ پیدا کیا کہ پنج ہزاری میں شامل ہو گئے۔ انتہا ہو گئی کہ (چند ساعت خواب راحت کے سوا) بادشاہ کو مفارقت انکی گوارا نہ تھی۔



ملكه ارجمند بانو بيگم ( ممتاز محل )

بی ممتازی خانم کا اب کیا پوچھنا ہے۔ پہلے تو غربت چھاتی پر بیکی سل رکھ کے ٹھنڈے پنیوں کاہل میاں کو سارا جہیز اونے پونے بیچ کر کھلا دیا۔ یہاں تک کہ زیور کی قسم سے ایک پوت کا چھلا بھی نہ رہا۔ پھر آپ مزدوری پر آمادہ ہوئی دن بھر سوئی مار کے جو چار پیسے جمع کرتی پہلے خاں صاحب کے آگے پکا کے رکھتی پھر ساس کو کھلاتی پھر آپ بچا کھچا کھا کر خدا کا شکر بجا لاتی۔ پانچوں وقت نماز خود بھی پڑھتی تھی اور میاں بھی اور ساس بھی۔ رفتہ رفتہ ایک چھوٹا مدرسہ قائم کیا جس میں محلے کی غرب غربا کی لڑکیاں لکھنے پڑھنے اور کتر بیونت سلائی کڑھائی سیکھنے آتی تھیں۔ تمام شہر سے نفیس اور عمدہ کام ممتازی خانم کے کارخانے میں تیار ہوتا تھا۔ حضور اپنے کان پکڑتے تھے نواب خاص محل نے ان کے مکتب کی تعریف سُن کر چھ سو روپیہ سال بعد امانت مقرر کر دیا تھا اور وہی انکی تنخواہ تھی۔ لڑکیوں کی محنت سے جو روپیہ آتا وہ ماہ بماہ ان پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ پڑھنا لکھنا محض معمولی تھا جتنا شریف بیبیوں کے لیے موزوں ہے۔ چھوٹی چھوٹی اردو مسائل کی چند کتابیں اور اردو خوشنویسی برائے نام فارسی۔ باقی روٹی سالن کھانا پکانے کی ترکیبیں۔ اگرچہ پچاس روپیہ ان کے لیے کافی تھا مگر اس عقل مند عورت نے شوہر کو ناصحانہ پیرائے میں سمجھا بجھا کر پڑھنے لکھنے کی طرف مائل کیا اور کچھ دنوں تک تو آپ پڑھایا اسکے بعد مولوں کی خدمت میں بھیج کر تعلیم دلوائی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سرفراز علیخاں بھی اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گیا اور پانچ ہزار روپیہ مہینا کمانے لگا۔ یہ سب بی ممتازی خانم کی جوتیوں کا صدقہ ہے جو میاں کو خاک سے پاک کر دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سرفراز علیخاں بی بی کے پاؤں دھو دھو کر پیتے اور بہت قدر کرتے مگر روپیہ پا کر آدمی کی آنکھ بدل جاتی ہے۔ بیوی کے ساتھ انکا وہ طور نہ رہا تاہم یہ دل میں بیوی کا احسان مانتے تھے اور اب بھی سامنے چار آنکھ نہ کر سکتے تھے۔ روپیہ پا کر ممتازی خانم کے حُسن انتظام کا کیا پوچھنا۔ سرفراز باغ سرفراز گنج انھیں کے حسن انتظام سے آج تک لکھنو میں مشہور ہیں۔ ٹکیت راے کے تالاب کے قریب اُنکی عالیشان کوٹھی عالیشان مسجد اسکے نام کی عمدہ یادگار ہے۔ یہ سب کارنامے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ خوش مزاج نیک عورت وہ شمع ہے جس سے گھر روشن ہو جاتا ہے اور علم و ہنر وہ دولت ہے جو ایک نہ ایک وقت ریاست اور امارت کے زینہ پر پہنچا دیتی ہے۔ خدا کی شان ہے وہی ممتازی خانم جو ایک افیونی کاہل آدمی کے ساتھ مصیبت اور تکالیف جھیلنے کے لیے آئی تھی، اور جس نے اپنا تمام جہیز کوڑیوں کے مول بکتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور منہ سے اُف نہ کی۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان میں تکلیف اٹھائی اور خدا کا شکر بجا لائی۔ نیک مزاجی اور عقل مندی نے اسکو اس بات پر آمادہ کیا کہ مزدوری کر کے خاوند کی پرورش کرے۔ خدا کو یہ بات اُسکی پسند آگئی۔ سُن لی اور ایسی سُن لی کہ آج تک بی ممتازی خانم اپنے محل میں دس نوکروں سے براج رہی ہیں اور زمانہ نے کچھ ایسا اقتدار دیا ہے کہ ہر ایک چھوٹا بڑا انکا معترف ہے

سرفراز علیخاں عجب صاحب اقبال آدمی تھے۔ بیوی ایسی نیک پائی تھی جسکا جواب نہ تھا۔ اسی کے صدقے میں اتنا عروج حاصل ہوا ورنہ ایسے کہ امرا میں آج تک کوئی ایسا پابند صوم و صلوٰۃ دیکھنے میں نہیں آیا۔ مزاج میں خیرات بھی تھی۔ ایک غریب خانہ بنوایا تھا جس میں اندھے لولے لنگڑے پرورش پاتے تھے۔ غدر کے بعد سے اگرچہ انکو شاہی کی طرح آمدنی تو نہیں رہی ہے لیکن مزاج میں ایثار نفسی سوا ہو گئی ہے۔ پائین باغ میں سہ پہر کو بیٹھتے ہیں دوست احباب جمع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی علمی باتوں کا چرچا رہتا۔ اکثر لوگوں کی دستگیری کرنے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ مسجد کے مسافروں کی ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور دعوت کرتے ہیں لوگوں میں انکا وقار بہت ہے۔ اب اگلے لوگوں میں ایک انھیں کا دم ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ سرفراز علیخاں کو سرفراز علیخاں بی ممتازی خانم کے حسن عمل نے بنا دیا اسی سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے لیے تعلیم اور تربیت ضروری چیز ہے۔

عشرت لکھنوی

# قیود و تقلید، تجدید و تنقید

کیا یہ خیال صحیح ہے کہ قیود شاعری و تقلید فصحا فطری جذبات و دلکش خیالات کے سدِ راہ ہیں؟ کیا اُشیائی ذاق خارج البلد ہو تو اُسکے حدود کی چار دیواری بھی دلی کی عمارتوں اور لکھنؤ کے محلوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی رہے؟ کیا ردیف و قوافی کا پابند قیود آزاد اور روشن دماغ نومشقوں سے با وصف کہنہ مشقی اچھی نظمیں نہیں لکھ سکتا؟ کیا قافیوں کی دلچسپ نشست۔ ردیفوں کے خوش نما پہلو اپنے موقع و محل پر دلیل حسن سخن نہیں بن سکتے؟ کیا مثنوی سے بڑھ کر آزادی کسی اور صنف نظم میں ہے؟ پھر حسن سخن کا پیدا ہونا اس صنف میں بھی کیوں مشکل ہے؟ کیا سبب ہے کہ گلزار نسیم و میر حسن کے سوا اور مثنویاں شہرت و قبولیت سے ممتاز نہ ہو سکیں؟ میر انیس چند مخصوص بحروں میں مرثیہ گوئی کرتے رہے اور مسدس کے دائرے سے نہ نکل سکے مگر فردوسی سے پہلوان سخن اور ملٹن سے مرد میدان کا مقابلہ کس نے کیا؟

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیے

نئی شاعری کے نیچرل شاعر خواجہ حالی کا مسدس سب نظموں سے زیادہ کیوں مشہور و مقبول ہے؟ کیا وہی مسلسل مضامین بلا قید مسدس مختلف بحروں اور متعدد زمینوں میں ہوتے تو اُنکا پایۂ سخن اپنی جگہ پر اتنا ملبند رہتا؟

غزل کے مضامین سرے سے نئے نہیں ہوتے وہی گل و بلبل وہی شمع و پروانہ، وہی ناز و انداز معشوقانہ، وہی سوز و گداز عاشقانہ مگر ردیفوں کے چسپاں، قافیوں کے دست و گریباں ہونے ہی سے ان میں تازگی آجاتی ہے۔

متروکات یعنی الفاظ واجب الترک و مستحسن الترک کی قیود زبان کی فصاحت قائم رکھنے کے لیے ہیں۔ جو الفاظ زبانوں پر گراں گزرتے ہیں اور فصحا کے روزمرہ سے خارج ہو گئے ہیں ہمیں اُنھیں اپنے اشعار میں داخل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟ جتنے الفاظ و محاوراتِ قدیمہ متروک فصحا ہو کر زبانوں پر بار اور فصاحت کے لیے ناگوار ہو گئے ہیں ہمیں اُن کے اختیار کا کیا اختیار ہے؟ متروک زبان کی تقلید سے

کیا ہم مقلد کے بدلے مجدد کہے جا سکتے ہیں؟

اگلے زمانے میں قیود شاعری سے بڑی قید یہ تھی کہ عربی فارسی کی کافی استعداد، عروض و قوافی، معانی و بیان، لغات و محاورات کے بغیر معلومات کوئی قلم اُٹھا تا ہی نہ تھا اب یہ قید متروک مرفوع القلم ہو گئی ہے۔ کیا ایسی آزادی قابل تحسین ہے؟ کیا ایسی کم سوادی و کم مایگی معراج کمال پر پہنچا سکتی ہے؟ کیا الفاظ کے خزانے پاس نہ ہوں تو قافیے مل سکتے ہیں؟ اور مل بھی جائیں تو فنِ قوافی سے ناآشنا رہ کر کیا اپنے محل پر مستعمل ہو سکتے ہیں؟ کیا بغیر علم معانی و بیان اچھے استعارات، پاکیزہ تشبیہات کی خوبیاں ذہن نشین ہو سکتی ہیں؟ کیا زبان و محاورات سے نابلد رہ کر قدم قدم پر لغزشوں سے سنبھلنے کا کوئی سہارا مل سکتا ہے؟

اردو کا کوئی جامع و بسیط لغت موجود نہیں ہے جو تحقیق و تلاش سے مستغنی کر کے رہنما کا کام دے۔ قید شاگردی کو ننگ و عار سمجھنے والے یہ سمجھ لیں کہ اہل زبان کی اصلاح و تربیت سے مستفید ہوے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

شاعری سے زیادہ تمام علوم و فنون کا جامع کوئی فن نہیں ہے موسیقی کی نے اسکے ترانوں میں، مصوری کا مرقع بھی اسکے نگارخانوں میں، سحر سامری اسکی تاثیر سے مات، اعجاز عیسوی اسکا قائل کرامات ہے۔ تیزی و شمشیر سے زیادہ شاعر کی نوک قلم، تیغ دو دم سے بڑھ کر اسکا مصرع تیز دم ہوتا ہے۔ ایسے فن سے زیادہ کس فن کے لیے استعداد و علم کی ضرورت اور استاد شفیق کی حاجت ہو سکتی ہے۔ آج ہی دیکھ لیجیے پروفیسر اقبال لسان العصر اکبر، مولنا شوق قدوائی، نظم طباطبائی یا اور چند بزرگ جنھیں ہمکی ہم نوائی کا فخر حاصل ہے سب کی شہرت و قبولیت کا راز قابلیت میں مضمر ہے۔ جلیل القدر جلیل ہوں یا حضرت ریاض کوئی بھی بغیر استفاضہ و استفادہ معراج کمال پر نہیں پہنچا ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مروجہ قیود شاعری سے آزاد قید

تحصیل علم و فن سے آزاد، قید شاگردی سے آزاد ہو کر کوئی آزاد خیال کس طرح شاعر نازک خیال و سخنور بے مثال ہو سکتا ہے؟

حضرت قبلہ امیر مینائی کو داغ دہلوی پر ترجیح دینے والے، حضرت داغ کو امیر مینائی سے بڑھانے والے دونوں بالاتفاق ہم زبان ہیں کہ یہ آفتاب و مہتاب شاعری میں اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے۔ فی زمانہ شعرا کے معدودے چند افراد بھی جو اپنی جامعیت و قابلیت میں فرد ہیں اگر اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے تو قیود شاعری کیا معنی شاعری ہی سے اردو زبان آزاد ہو جائے گی۔ ہم افسوس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ تحقیق فن، جامعیت سخن، فراہمی سرمایہ لغات و محاورات، مشق شاعری کے بدلے صرف دو مادے زوروں پر ہیں۔ ایک تجدید، دوسرے تنقید۔

تجدید والوں کا نعرہ ہے کہ اگلوں کی تقلید چھوڑ دو، پرانی لکیر کے فقیر نہ بنو۔ شعر و سخن کو صرف معنی ہی نہیں بلکہ صورت کے اعتبار سے بھی بدل دو، کسی کے نقش قدم پر نہ چلو، اپنی راہ الگ نکالو۔ سب قیدیں توڑ کر آزاد ہو جاؤ، وہ کر دکھاؤ کہ اگلوں سے اس کا عشر عشیر نہ ہو سکا ہو۔ مگر ؎ کتنا آسان کر دکھانا مشکل ہے تقلید میں کامیاب ہوے تجدید میں کامل کوئی نہ ہوا، یورپ والے مسلمانوں کے علوم و فنون کے پہلے پکے مقلد بن گئے پھر مجتہد ہوے۔

تنقید والوں کا شور ہے کہ کھوٹے سے کھرے کو الگ کر دکھاؤ، نکتہ چینی و خردہ گیری میں کسی کے حفظ مراتب کا خیال بھی ذہن میں نہ لاؤ۔ ہزار ہنر میں ایک عیب بھی کسی کا ڈھونڈھ کر ضرور نکالو، تہذیب کے پردے میں پردہ دری و برا بھلے تو دو چار آوازے کسو۔ تنقید اتنا بڑا ہنر ہے جس کا ہر عیب ہنر میں داخل ہے، اب زمانہ دوسرا ہے وہ ہی اور ہے۔ آزادی چھوٹے سے چھوٹے کو بڑے سے بڑے کی عیب جوئی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جہاں کسی کی تنقیص کا خیال آیا تنقیدی عنوان قائم ہوا اور قلم و زبان نے ایک ہی حرف کے پھیر میں حرف گیری کا حق ادا کر دیا۔ کامل تنقید تو آزادی کے پاؤں میں بھی ہلکی ہلکی بیڑیاں ڈال دی جاتیں کہ چل تو سکتی مگر حد سے باہر نہ نکل سکتی۔ تنقید معیار سخن بنکر کھوٹا کھرا پرکھتی ہے اس کا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے۔ قیود شاعری کی طرح تنقیدی اصول و ضوابط بھی منضبط ہو جاتے تو خوب ہوتا۔

میرے ایک معزز ہم وطن اپنے عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:- "پورب والوں نے خواہ مخواہ پچھم والوں کی تقلید کا پٹا گلے میں ڈال لیا ہے۔ اجتہاد کے درجے پر ابھی سیوں کا پہنچنا مشکل ہے۔" تقلید کا پٹا گلے میں موتیوں کے ہار سے قیمتی ہوتا اگر پچھم والوں کی ہم زبانی و ہمنوائی کا فخر حاصل ہو جاتا۔ پورب کے درجہ اجتہاد پر پہنچنے والا تو اب فراموش ایک مطلع یاد دلاتا ہے: ؎

دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوے مشک غزالوں کے سامنے

اتنی ہمت ایسی سعی و محنت والے سو میں ایک دو بھی نظر نہیں آتے جو پورب میں رہ کر باکمال شاعر یا زباندان ہونے کا خاص امتیاز حاصل کریں۔ وہ زمانہ گیا جب ہندیوں نے زبان فارسی میں اتنی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ تیغ اصفہاں بھی انکا لوہا مان گئی تھی۔ پورب میں بھی جب اردو کے خسرو و فیضی پیدا ہوں تو پچھم والوں کے مقابلے میں شاید دعوائے اجتہاد کا موقع ملے اور یوں کہنے کو تو ایک قصیدے کی مضمون تعلی میں حسب دستور شاعرانہ راقم سطور نے بھی لاف و گزاف کا حق ادا کیا ہے ؎

وہ عرفی ہوں کہیں سب فیضی ہندوستاں جسکو
وہ خاقانی ہوں سب جسکو کہیں اردو کا قاآنی

یہ چند سطروں کا معمولی مضمون ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے مگر یہ بھی سن لیجیے کہ لکھا کیوں گیا۔ ایک مہربان نے مجھ سے حسب ذیل سوالات کیے

(۱) اردو شاعری ردیف و قوافی، متروکات، تقلید اہل زبان، شاگردی وغیرہ اتنے قیود سے کیوں محدود ہو گئی کہ حسن سخن کی راہ، وسعت بیان کے راستے سب مسدود ہو گئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(۲) کیا جسکا زاد بوم پورب ہو وہ باوصف کہنہ مشقی ماہر فن اور کامل فن ہونے کے اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اس سے استفادہ جائز ہو؟ آپ سچ

میرے ایک دوست نے اصلاح چاہی تو پوربی ہونے کا عذر کیوں کیا گیا کیا آپ شاعر نہیں ہیں؟

(۳) میرؔ و مصحفیؔ یا امیرؔ و داغؔ کا ہم پایہ کوئی شاعر اب موجود ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر مستند قابلِ اتباع کس کا کلام ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں تحریرِ مذکورۂ بالا کافی ہے۔ دوسرے تیسرے سوال کا جواب مجھ سے نثر میں نہیں بن پڑتا اس لیے ایک قطعہ درج ذیل ہے جو کسی ایسے ہی موقع پر لکھا گیا تھا:-

قطعہ

لکھتے ہیں مجکو خط میں مرے ایک دوست — کیا آپ نکتہ سنج نہیں نکتہ داں نہیں؟
کیا آشنا مذاقِ سخن سے نہیں زباں — کیا آپ ذوقِ نظم سے رطب اللساں نہیں؟
میناے میرؔ و غالبِ میکش کے جام کی — دو گھونٹ بھی نصیبِ ارغواں نہیں؟
چلتا نہیں ہے بزم میں کیا دورِ مصحفیؔ — کیا اب وہ سلسلہ نہیں یا خانداں نہیں؟
کوئی تو ہوگا بلبلِ خوش لہجۂ سخن — تا کہ داغؔ بلبلِ ہندوستاں نہیں
زندہ کرے امیرؔ خداے سخن کا نام — ایسا اب ایک شاعرِ جادو بیاں نہیں
میں نے کہا جگہ ہے یہ عجز و نیاز کی — بندہ نواز ناز کا موقع یہاں نہیں
کہتے ہیں شعر کس کو سخن کس کا نام ہے — یہ امتیاز بھی مجھے اے مہرباں نہیں
جوہر شناس جسکو جواہر سے تول لیں — اب وہ متاعِ نظم کا پلہ گراں نہیں
ہیں وہ خم و قدح نہ وہ پیمانہ و سبو — وہ پیرِ مے فروش کی اونچی دکاں نہیں
اسپر یہ لطف ہے کہ سخنور ہیں سیکڑوں — ایسا بھی کوئی شہر ہے شاعر جہاں نہیں
ثانی نہیں ہیں نقش سے پورب کے باکمال — دہلی پہ ہے یہ داغ کہ اہلِ زباں نہیں
پچھم کے شاعروں کی تو کیا بات ہے مگر — سب آپ صرف کے فاضل و کامل یہاں نہیں
المختصر جو ماہرِ فن ہو کہیں کا ہو — کچھ اُسکے اتباعِ سخن میں زیاں نہیں
کالج کی ڈگریوں پہ کرے ناز کیا شفقؔ — شاعر کے پاس جب سندِ امتحاں نہیں

شفق عمادپوری

# انجامِ ستم

## (تاریخِ ایران کا ایک پرانا ورق)

(۱)

ہاے ظالم نے کیا صورت پائی ہے! میں اُسے اپنی جانب کس قدر متوجہ کرنا چاہتا ہوں مگر وہ ہے کہ میری سُنتی ہی نہیں!

سُنتا ہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی
ایسا نہو سُن لے کہیں اللہ کسی کی

مگر میرے دل کی بے تابیاں ہیں کہ سان ہی میں نہیں آتیں اور حد سے گزری جاتی ہیں! واللہ اب مجھ سے ضبط نہیں ہو سکتا!

لو! وہ ظالمہ، قتالۂ عالم! آ رہی ہے! ہاے اسکی رفتارِ محشر خیز سے دل پسا جاتا ہے! (آنے والی سے مخاطب ہوکر) آہ! تم کب تک، مجکو اور میرے دل کو ستاتی رہوگی! – آخر تمھارے اس ظلم و ستم کی کچھ انتہا بھی ہے! تمھاری قسم! اب مجھ سے صبر نہ ہوگا - میں جان دونگا یا لونگا! - ہاں دونو میں سے ایک بات ضرور ہوگی! تمھارے عشق ......"

عورت۔ شرم! غباد شرم! کیا تم ہوش میں ہو! تمھارے حواس تمھیں دھوکا تو نہیں دے رہے! کیا تم مجکو، اور اپنے آپ کو پہچانتے ہو! - کہیں کچے گھڑے کی تو نہیں چڑھا آئے! آخر اس طرح جامہ انسانیت سے عاری ہونا کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔

غباد۔ جب کوچۂ الفت میں قدم رکھا تو کس کی شرم! اور کیسی حیا! کہاں کا ہوش اور کیسا جامۂ انسانیت! بس اب - پ .. .. مجھے زیادہ

نہ ستاؤ! واللہ! اب دل کو تابِ ضبط نہیں!

عورت۔ غباد ہوش کی دوا کرو! دشمنوں کو جنون تو نہیں ہوگیا! میرے بیٹے اور اپنے میرے درمیانی، مقدس رشتہ کا احترام کرو! اور مرحوم پرویز کی روح کو صدمہ نہ پہنچاؤ!

غباد۔ بے شک محبت بھی ایک قسم کا جنون ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے! میں تمھارے رتبہ کو بھی خوب پہچانتا ہوں! اور تمھاری تقدیس کو بھی! میں تو درحقیقت دل ہی دل میں تمھاری پرستش کرتا ہوں! اب تمھیں بتاؤ کہ اس سے زیادہ تمھارا احترام اور کیا ہوسکتا ہے!

عورت (جل کر) کیا تم بالکل ہی جامۂ ہوش و خرد سے عاری ہوگئے ہو! کیا تم نے بالکل ہی شرم و حیا کی چادر چاک کردی ہے! کیا میں تمھاری ..... نہیں ہوں؟

غباد۔ کیا مضائقہ! کیا تم کو خداوند زرتشت کا قول یاد نہیں، ہاکہ دنیا کی تمام عورت، اور مال و دولت میں ہر شخص برابر کا حصہ دار ہے!

عورت (غصہ سے) خدا غارت کرے اُس موذی دشمنِ عقل و اخلاق زرتشت کو۔ جس کی خطرناک اور شرمناک تعلیم سے، ایرانیوں کے ننگ و ناموس اور عزت و عصمت، معرضِ خطر میں ہیں! ہاں! یہ اُسی کی حیا سوز تعلیم کا نتیجہ ہے کہ آج تمام ایران پر بداخلاقیوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کا کہیں نام تک نہیں سُنا جاتا۔ شرم و حیا کے جذبات رفتہ رفتہ ایرانی قوم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں اور ......

غباد۔ تم یہ کیا کفر بک رہی ہو! اپنے مُنہ کو بند کرو! ورنہ تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔

عورت۔ اب اس سے زیادہ خدا کا قہر اور کیا ہوسکتا ہے۔

غباد۔ اچھا ب ... تم میرے سوال کا کیا جواب دیتی ہو! کیا مجھے یوں ہی ستائے جاؤ گی!

عورت (دل میں کوئی نیا منصوبہ سوچ کر) اچھا میں کل تمھاری بات کا جواب دوں گی جس سے تم خوش ہوجاؤ گے! مگر دیکھو! اس سے پہلے مجھے ہرگز نہ ستانا ورنہ تمھارا مقصد پورا نہ ہوگا! اور تمھیں افسوس کرنا پڑیگا!

غباد۔ منظور! اور سر آنکھوں سے منظور! (دل میں) بس اب کام بن گیا۔ اب پوبارہ ہیں! پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں!

خادمہ آتی ہے:

"حضور بیگم صاحبہ! خاصہ تیار ہے! تشریف لے چلیے!!"

دونوں عورتیں چلی جاتی ہیں۔

(۲)

ایران کے مشہور و معروف، اور پُر جبروت، حکمران ساسانی، خاندان کا نیّرِ اقبال انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچکر اب ڈھلنا شروع ہوگیا ہے۔ بقاعدۂ ہر کمالے را زوال۔

اس خاندان کے چشم و چراغ اور خلف الرشید حکمران نوشیروان، کی آنکھیں (جو اپنی نصفت شعاری کی وجہ سے تمام دنیا سے نہیں تو کم از کم مشرقی ممالک سے خراج تحسین و آفرین، تا قیام عالم وصول کرتا رہیگا) بند ہوچکی ہیں۔

نوشیرواں کے عہد عدالت مہد میں فتوحات کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا وہ اُسکے بیٹے اور جانشین ہرمز، کے عہد میں نہ صرف منقطع ہوگیا بلکہ اُس کے غیر آل اندیشانہ طرزِ عمل کی بدولت بہت سا مقبوضہ و مفتوحہ علاقہ بھی سلطنت کے قبضۂ اقتدار سے نکل گیا۔ ہرمز، کا طرزِ حکومت، اگرچہ تخت نشینی کے بعد کچھ عرصہ تک دانشمندانہ رہا اور وہ اپنے باپ کے زمانہ کے جہاں دیدہ، اور کار آزمودہ، امرا، وزرا، کا احترام، اور عام رعایا کے ساتھ تالیفِ قلوب کا سلوک اور عدل و انصاف کرتا رہا لیکن بالآخر اسکا مزاج و دماغ بدل گیا نظر پھر گئی۔ اور وہ بعض اشرار، دشمنِ ملک و سلطنت اشخاص کی ریشہ دوانیوں، افترا پردازیوں، اور منصوبہ بازیوں کے جال میں پھنس کر، بلا وجہ امرائے ایران کی جان کا خواہاں اور خون کا پیاسا بن گیا۔ چنانچہ اُن میں سے

کمر تڑوا کے گھاٹ اتار کر دم لیا۔

ہرمز کے اس طرزِ عمل سے بقیۃ السیف امرا اس سے متنفر او سرکش ہوگئے سلطنت کے ہر حصے سے بغاوت کے شعلے بلند ہو ہو کر خرمنِ امن اماں کو خاک سیاہ کرنے لگے! زبردستوں، جابروں، اور ظالموں نے زیردستوں اور کمزوروں کو سُرمے کی طرح پیس کر رکھ دیا۔ فوج بھی تمرد دکھانے لگی۔ بدامنی کی وجہ سے رعایا کے جان و مال خطرے میں پڑ گئے۔ داستانِ بدنظمی و ظلم و ستم اندرونِ ملک سے نکل کر ہم عصر، حریف، اور رقیب دول کے کانوں تک پہنچی۔ وہ تو گویا اُدھار کھائے بیٹھے تھے! فوراً منہ میں پانی بھر آیا! انھیں بڑا خاقا کہ ایران کا آفتابِ اقبال اس قدر بلندی پر کیوں چمکتا ہے! چنانچہ ایک جانب سے رومیوں نے اسّی ہزار فوج سے ایران پر لشکر کشی کی اور یہ مطالبہ کہ نوشیرواں کا فتح کیا ہوا رومی علاقہ واگذار کر کے ان کو واپس دیا جائے اور خطِ سرحد حسبِ سابق کھینچا جائے!

دوسری جانب سے "ارآمنہ" نے سر نکالا اور ایران میں تاخت و تاراج شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں دو عرب سردار عباس احول او عمر ارزق اپنی خانہ بدوش، قواعد جنگ سے ناواقف، مگر شجاع اور بے جگر جمعیت لیکر دریائے فرات کے کنارے تک آ پہنچے۔ مزید براں یہ کہ خود امیر ترکستان نے جو رشتہ میں ہرمز کا ماموں تھا، سپاہِ کثیر کی جمعیت میں اپنے ملک سے حرکت کی ایران کا رُخ کیا۔ اور دریائے آمویہ کو عبور کر کے اپنے قلمرو میں خیمہ انداز ہوا۔ چنانچہ اس نے بادخیز (ہرات) میں چھاؤنی ڈال کر شاہِ ایران کے پاس پیغام بھیجا کہ "ہم روم کا عزم رکھتے ہیں! آپ درمیانی دریاؤں کے پل تیار کرا دیجیے! تاکہ ہم ایرانی علاقے سے جلد گزر جائیں!

اب دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر ہرمز کی آنکھیں کھلیں! اور اسوقت امرائے ایران کو ہاتھ سے دینے کی غلطی محسوس کی۔ اب بھی خیر گزری کہ اسنے بقیۃ السیف سرداروں کو دربار میں طلب کر کے اُن سے معافی مانگی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اُن سے مدد طلب کی کہ اب کیا کرنا چاہیے!

اگرچہ اس وقت میں سلطنت کا ڈھچر بگڑ چلا تھا تاہم ان جہاں دیدہ اور آزمودہ کار سرداروں نے کچھ ایسے جوڑ توڑ کیے۔ اور ایسی ناخن بندی کی اور کچھ ایسی پولیٹکل چالیں چلیں کہ تمام دشمن اپنا سا منہ لے کر نو دو گیارہ ہو گئے! حتیٰ کہ ایرانی سپہ سالار بہرام چوبین نے ترکوں کو شکست فاش دی۔ اُن کا سردار میدانِ جنگ میں کام آیا۔ شہزادہ ولی عہد ایرانی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ الغرض تمام بیرونی آئی ہوئی بلائیں آسانی سے ٹل گئیں! مگر ایک اندرونی فتنہ اُٹھا۔ یعنی خود بہرام چوبین جس نے اس وقت غیر معمولی قوت حاصل کر لی تھی اپنی سلطنت سے برگشتہ ہو گیا اور علانیہ خم ٹھونک کر شاہی فوج کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اور اگرچہ اُسے ہزیمت کھا کر فرار ہونا پڑا تاہم اس میں شک نہیں کہ اسی وقت سے ایرانی خانہ جنگی کی تاریخ شروع ہو گئی۔

ہرمز کے بعد خسرو پرویز وارثِ تخت و تاج ہوا مگر یہ اپنے ساتھ کچھ اور ہی طبیعت اور دماغ لایا تھا۔ عشق و محبت گویا اُسکی گھٹی میں پڑے تھے۔ وہ بندۂ عشق تھا یا بندۂ عیش اور بس! چنانچہ خسرو پرویز اور اُسکی ناز آفریں محبوبہ یا بیوی شیریں کے عشق و حُسن کے افسانے زیبِ داستانہائے مشرق ہیں۔

خسرو کی عیش پسندی کا یہ انجام ہوا کہ سردارانِ ایران نے اُسے بعد چندے معزول کر کے نظربند کر دیا۔ اور اُسکے بیٹے قباد کو تخت نشین کیا! مگر اس شرط پر کہ وہ اپنے باپ کا کام تمام کر دے!

قباد اوّل اوّل تو متامل رہا۔ لیکن آخرکار، ایک ایرانی سردار پسرِ مردان شاہ کو جسکے باپ (مردان شاہ) کو خسرو پرویز نے قتل کرایا تھا قتلِ پرویز پر آمادہ کیا۔ چنانچہ وہ ایک تاریک رات دیکھ کر شاہی نظربند خانہ میں پہنچا اور پہرے داروں کو غافل پا کر اندر داخل ہو گیا۔

پرویز، قابلِ رحم پرویز، بدنصیب پرویز! اس وقت بیدار تھا۔ وہ آنے والے شخص کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ یہاں کس غرض سے آیا ہے۔ مجھ سے اُس نے مخاطب ہو کر کہا "آ! اور میرا کام تمام کر! کیوں کہ جو شخص اپنے باپ کا انتقام نہ لے وہ گویا اپنے باپ کے صُلب سے نہیں!"

الغرض خسرو قتل کیا گیا! اور اُسکا قاتل اپنی کارگزاری جتانے کے واسطے سیدھا غبّاد کے محل میں پہنچا اور تمام واقعہ اور گفت و شنید من و عن بیان کردی!

اس بیان نے غبّاد کے دل پر ایک خاص قسم کا اثر کیا جس کا پسرِ مردان شاہ کو وہم و گمان بھی نہ تھا!

غبّاد کا ہاتھ قبضہ پر گیا۔ شمشیر چمکی۔ پسرِ مردان شاہ کا بُھٹا سا سر کئی گز کے فاصلہ پر جا پڑا۔ اور غبّاد کے مُنہ سے بے اختیار حسب ذیل جملے نکلے "واقعی میرے والد نے سچ فرمایا تھا کہ جو فرزند اپنے باپ کے قاتل سے انتقام نہ لے وہ اپنے باپ کے صُلب سے نہیں ہو سکتا!

یہ ہے اُس زمانہ کے پولیٹیکل حالات کی جھلک جس سے ہمارے اس فسانہ کو تعلق ہے۔ چنانچہ اس وقت غبّاد تختِ ایران پر متمکن ہے۔ جس نے گویا عشق و محبت اپنے باپ خسرو سے ورثہ میں پائے ہیں!

(۳)

"بے شبہ! اُس موذی کے ہاتھ سے 'عزت' کا بچنا محال ہے! کمبخت 'زرتشت' کی تعلیم نے ایرانی نوجوانوں کے جذبات پر، گویا مٹی کے تیل کا چھینٹا دیدیا ہے! اسی لیے یہ بالکل اندھے ہو گئے ہیں! آہ! آخر، اس بدبخت غبّاد سے کس طرح عزت بچائی جائے؟

ہاں! بس اسکی ایک ہی تدبیر قیاس میں آتی ہے! یہ کہ میں اپنے آپ کو جوہر کروں۔ مگر! کیا اسکے علاوہ اور کوئی طریقِ نجات نہیں!

بے شک نہیں! وہ خوں خوار، بے حیا، وحشی، کسی طرح اپنے شیطانی منصوبوں سے باز آنے والا نہیں! اور اب میری زندگی ہی کی کیا ضرورت ہے؟ جب پرویز اس دنیا میں نہیں! تو میں یہاں کیوں رہوں! خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ غبّاد جیسے درندہ خصلت انسان یہاں موجود ہوں!

(اپنی انگلی سے انگشتری، اور اُسکے اوپر سے ہیرے کا نگینہ اُتار کر) اے سفید اور شفاف ہیرے! تو میری مدد کر! مجھے ظالم کے چنگل سے بچا! اور شاہدہ! کہ میں محض اپنی عزت، اور عصمت و عفت، بچانے کیلیے، اپنے ہاتھ سے شربتِ اجل نوش کرتی ہوں! مگر نہایت مسرت، اطمینان، اور نہایت فخر کے ساتھ!

سقراط کو اُسکے دشمنوں نے، ہاں صداقت اور خدا کے دشمنوں نے جامِ زہر پلایا تھا۔ اور اُس نے مسرت کے ساتھ پیا تھا۔ کیوں کہ وہ جذبۂ صداقت تھا لیکن اے زمین و آسمان! گواہ رہو! کہ میں خود اپنی تجویز سے، اپنی مرضی سے اور اپنے ہاتھ سے یہ جام نوش کرتی ہوں!

یہ دنیاوی عیش و عشرت، چند روزہ! یہ زندگی مستعار! اور بخت و تخت سلطنت فانی ہیں!

غباد! ظالم غباد! یاد رکھ، بے گناہوں کا خون، ہاں شاہی خون! رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا! مظلوموں کی آہ بے کار نہ جائے گی!

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

بلکہ تجھ پر آسمان ٹوٹے گا۔ خدا کے قہر کی بجلی گرے گی! اور دم کے دم میں تجھے اور تیری سلطنت کو خاکِ سیاہ کردے گی!

غباد! تو اپنی دھوکا دینے والی طاقت پر نہ بھول! اور اس فانی سلطنت پر نہ بھول! یہ آنے جانے والی چیزیں ہیں! آج سب کچھ نظر آتا ہے۔ کل کی کسی کو خبر نہیں کہ کیا ہو! ہاں یاد رکھ! تیرے سر پر خدائی لاٹھی پڑنے والی ہے! وہ لاٹھی جس میں آواز نہیں ہوتی!

دنیا! اے ناپاک دنیا! گناہوں کی سند! اس دنیا رخصت! ہاں ہمیشہ کے لیے رخصت! الوداع الوداع!

(۴)

اس وقت غبّاد کو تختِ ایران پر حکومت کرتے، کامل بائیس سال گزر چکے ہیں! ملک کی عام حالت یہ ہے کہ دیکھنے والے کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی ایران ہے جس پر نوشیروانِ عادل حکومت کرتا تھا! اور کہ غبّاد اُسی کا جانشین ہے؟ لشکر میں بدنظمی پھیلی ہوئی ہے! فوج کو کئی

ماہ سے تنخواہ نہیں ملی! اس لیے فوجی لوگ غریب کاشت کاروں، اور سول آبادی کو لوٹ کھسوٹ کر اپنا پیٹ پال رہے ہیں! اور آبادی اور کھیتوں کو آگ لگاتے پھرتے ہیں! ایک طرف، ظالم، چور، ڈاکو، لٹیرے، وہاں کی کمزور اور نہتی رعایا کو ستا رہے ہیں!

کسی غیر کی کیا شکایت! خود غباد۔ گنتی کے چند۔ وہ بیچارہ سانی شاہزادوں یعنی اپنے بھائیوں (؟) کو تلوار کے گھاٹ اتار کر عدم آباد روانہ کر چکا ہے! جن میں سے ہر ایک نہایت وجیہ وحسین اور ذہانت و دانشمندی کا پتلا تھا!

اِن شاہزادوں کو کس لیے جامۂ ہستی سے عاری کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ غباد بے خوف وخطر، اور بلا قیل وغش، مدت العمر، عیش سلطنت اُڑا سکے! یہی وجہ ہیں کہ آج تمام ایرانی رعایا کے طبائع مشتعل ہو رہی ہیں۔ خصوصاً شاہی نسل کے ممبروں کی! عام اس سے کہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو معرض خطر میں پاتے اور اپنی جان کو سولی پہ دیکھ رہے ہیں!

آفتاب عالمتاب، اپنے لمبے لمبے شعاعی نیزے لیے ہوئے اپنا فرض ادا کر رہا ہے! کوئی دس بجے ہونگے۔ دربار ایران ہر طرح آراستہ و پیراستہ ہے! شہنشاہ غباد یادگار نوشیروان، جگمگاتے ہوئے تختِ شاہی پر جلوہ فرما ہے! امرا، وزرا، اور سرداران فوج قرینہ اور ادب سے اپنے اپنے مقام پر استادہ ہیں! بالکل سناٹے کا عالم ہے! ایسا کہ اگر سوئی بھی گرے تو اُسکی آواز صاف سُنائی دے۔ تاہم کبھی کبھی چاؤشوں اور نقیبوں کی آواز "دورباش، نظر روبرو، ذرا کی ذرا اس عالم سکوت کو توڑ دیتی ہے!

اس اثنا میں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ دفعۃً ایک تلاطم سا مچ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے! ایک ہنگامۂ محشر بپا ہو گیا!

دو جوان عورتیں! جن کے چہروں سے غیر معمولی رعب وداب اور شاہی جاہ وجلال ٹپکا پڑتا تھا دندانہ دربار میں گھس آئیں اور تختِ شاہی کے روبرو کھڑی ہو گئیں!

دربان، چوبدار، پہرے دار، چاؤش، اور فوج سب ہی کچھ موجود تھا اِن آنے والیوں میں کوئی ایسی غیر معمولی طاقت تھی کہ اُنکا قدم آگے بڑھنے سے نہ رُکا! جب تک کہ وہ تخت کے سامنے نہیں پہنچ گئیں! علاوہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر یہ کہ اہل دربار میں سے کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اِن عورتوں کو آنے سے روکے اور اُن کا سدِ راہ ہو کر اُنکی مزاحمت کرے!

دونوں عورتوں کی آنکھیں خونِ کبوتر ہو رہی تھیں اور اُن سے خوفناک شعلے نکل رہے تھے! دونوں کا عالمِ شباب تھا۔ چنانچہ ایک کا سن پچیس سال کے قریب اور دوسری کا کوئی بیس سال ہوگا!

دونوں فرطِ غیظ وغضب سے کانپ رہی تھیں! تیور بگڑے ہوے تھے! اُنکی آنکھیں، غباد کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنکے تیرِ نظر غباد کے دل وجگر کی تواضع کر رہے ہیں!

گویا یہ دو شیرنیاں تھیں! جو کسی ظالم انسان سے خونی انتقام لینے آئیں تھیں!

دو منٹ کے بعد سین بدلا، قفلِ سکوت ٹوٹا! زیادہ عمر والی عورت نے جسکا نام پوران دخت تھا اور جو غباد کی ہمشیرہ تھی نہایت کرخت اور جگر شگاف لہجے میں غباد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: غباد! ظالم غباد! کیا ابھی کچھ ظلم وستم باقی ہے جس کی انجام دہی کے لیے تو اب بھی زندہ ہے!

تو! گنتی کے چند شاہزادوں کا خون پی چکا! وہ قیمتی اور پاک خون! جس کے ایک قطرے پر رعایا، اپنی جان قربان کر دیا کرتی ہے!

ظالم! تو اپنے باپ کو شہید کرا چکا! ماں کی جان لے چکا! بس کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تیری ظلم شعاری کی بازپرس کی جائے! اور تجھ سے انتقام لیا جائے!

غباد! تو خیال کرتا ہے کہ اپنے بزرگ ماں باپ اور بھائیوں کو قتل کر کے امن واطمینان سے حکومت کے مزے اُڑائے گا! یہ خیال سست ومحال وجنون!

کیا تو نہیں جانتا کہ ظلم وستم کے ہوتے ہوے، کوئی سلطنت قائم اور کوئی حکمران زندہ (!) رہ سکتا ہے؟

بے شک ظالم کو ایک گھڑی بھی دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہیں
دوسری نوجوان عورت آذرمیدخت نے اپنے تیز نظر غبادو کے چہرے
پر گاڑ کر کہا۔ "آہ! بدبخت ناشدنی! تو ننگ خاندان ہے! بلکہ ننگ جہان!
تیرا! ہاں تیرا! اس دنیا میں ایک لمحہ رہنا بھی بیکار بلکہ ناجائز ہے۔ تو نے
نوشیرواں کی اُس وسیع سلطنت کو جس پر شاہانِ عالم رشک کھاتے
تھے، خاک میں ملا دیا، اُسکی نیک نامی کو بٹہ لگا دیا، اُسکے آوازۂ عدل و
داد کو آہ و پرسوز سے بدل دیا۔ خیر اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تو کے دن اور
اس تخت پر حکومت کرتا ہے!

دربار میں بالکل سناٹا تھا! وزراء، امراء، اور فوجی جرنل، اب بھی جب
کے توں، کمر بستہ، شمشیر بکف حاضر تھے! مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں
کرے! یا بڑھ کر ان دریدہ دہن عورتوں کو گرفتار کرلے! 'صداقت' نے
ہاں صداقت کی زنجیر نے ان سب کو باندھ لیا تھا! اور یہ بالکل ہلنے جلنے
کے بھی قابل نہ رہے تھے!

ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ غبادو تخت سے گر کر فرش پر آ رہا!
اور اسکے منہ سے بے اختیاری میں نکلا۔ "ہائے میں نے خود اپنے اوپر ہی
ظلم کیا!" بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا! کیونکہ غش کھا کر بیہوش ہو گیا
غبادو انسان تھا اور بہرحال انسان! اُسکے سینہ میں دل تھا اور
اس میں ضمیر! اُس نے بھی اور انسانوں کے مانند بچے دودھ سے پرورش
پائی تھی! آخر اُسکے ضمیر سے دو عورتوں کے اس طرح سر دربار ملامت
کرنے کی ذلت نہ برداشت ہو سکی! اسکے دل و جگر پر چرکا لگا! اور کاری
لگا! مظلوم مقتولین کی روحوں نے انتقام انتقام! کہتے ہوئے اُس پر حملہ
کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اس نے اپنا تاج اُتار کر پھینک دیا اور بالآخر غش
کھا کر زمین پر گر پڑا اور چند لمحے کے بعد عدم آباد سدھارا۔

اس واقعہ یا حادثہ کے بعد ساسانیوں کی سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم
نہیں رہی، اگرچہ مذکورۂ بالا دونوں شہزادیاں اور چار شہزادے یکے بعد دیگرے
سریر آرائے سلطنت ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی بھی چند ماہ سے زیادہ
حکومت نہ کرسکا! اور ساسانیوں کا آفتابِ اقبال گہن میں آگیا!

ادھر عربوں کا نیرِ اقبال و اجلال، فاران کی چوٹیوں پر اپنی آبِ و تاب ضو
ڈال رہا تھا۔ مسلمان فاتح اندرون ملک میں دھنسے چلے جاتے تھے انجام
یہ ہوا کہ بیس سال کے اندر ہی اندر اہل عرب، ایران جیسے سرسبز و شاداب
ملک پر قابض ہو گئے! اور ساسانی خاندان کی آخری یادگار شہزادہ یزدگرد
کو ایک ایرانی دہقان نے محض اُسکے زیور و لباس کی طمع میں تہ تیغ کر دیا!
ہائے انقلابِ زمانہ! یادگارِ نوشیرواں کی یہ قسمت!! آہ! آہ!—

اک سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک!

یاد رکھو! کہ ظلم و ستم، کسی سلطنت یا قوم کو جس تیز رفتاری سے، تباہی کے غار
کی جانب لے جایا کرتے ہیں شاید اور کوئی چیز نہیں لے جاتی،
حاملانِ سلطنت کے دل میں ظلم پسندی کا خیال پیدا ہو جانا اور رعایا کو اس کا
محسوس کرنا، بس یہی زوالِ حکومت کا پیش خیمہ ہے!

مکن تا توانی دلِ خلق ریش
وگر میکنی میکنی بیخ خویش (سعدیؒ)

اظہر دہلوی

## قطعہ شاکر

فروغِ شمعِ اخوت اب انجمن میں نہیں
نشانِ اہلِ وفا نام کو وطن میں نہیں
اُڑا کے بادِ خزاں لے گئی کہاں ہیہات
کہ گل تو کیا، کوئی کانٹا بھی اب چمن میں نہیں

# تنقیدِ کتب

**سیاحتِ سلطانی** شروع ۱۹۱۱ء میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال مع خدم و حشم یورپ وغیرہ کی سیاحت کی غرض سے تشریف لے گئی تھیں اور لندن۔ پیرس۔ اور قسطنطنیہ کے علاوہ جنیوا، بڈاپسٹ۔ وینس۔ فلارنس اور قاہرہ ایسے مشہور و تاریخی مقامات کی سیر فرمائی تھی۔ جناب شاہ بانو صاحبہ۔ جنکو حضور بیگم صاحبہ کی گرامی قدر بہو اور صاحبزادہ کپتان حاجی محمد حمید اللہ خانصاحب بہادر، بی۔ اے۔ سی۔ ایس۔ آئی کی حرم محترم ہونے کا فخر حاصل ہے، ہمراہی میں تھیں انھیں کی سعی موفور سے سیاحتِ سلطانی کی من وعن داستان ترتیب و تکمیل پاکر حسن و زیبایش شایع ہوئی ہے۔ اس وقت تک اردو میں کئی ایک سفرنامے مقبولیت عام اور شہرت حاصل کر چکے ہیں لیکن دلچسپی و نوعیت کے اعتبار سے "سیاحتِ سلطانی" کسی سے کم نہیں بلکہ اکثر خصوصیات میں کئی ایک سے بہتر ہے۔ قابل مولفہ "شکریہ" کے تحت میں لکھتی ہیں :-

قدردان فیض رسان علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تاج الہند، جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای، فرمان روائے بھوپال دام اقبالہا و ظلہا کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ حضور ممدوحہ نے مجکو نہ صرف سفرنامہ لکھنے کی ترغیب دلائی بلکہ ہر قسم کی پوری پوری امداد مرحمت کی جن چیزوں کو حضور ممدوحہ نے ملاحظہ کیا، جہاں جہاں تشریف لے گئیں، جو نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں، اُن سب کے متعلق کامل ہدایتیں لکھوا دیں۔ اور اُن یادداشتوں کو لکھواتے ہوئے ہر ایک بات میرے ذہن نشین بھی کر دی .... جب سفر ختم کرنے کے بعد میں نے سفرنامہ کا مسودہ تیار کیا تو حضور ممدوحہ نے امور ریاست میں شب و روز مشغول رہنے کے باوجود بھی نہایت توجہ کے ساتھ اصلاح فرمائی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "سیاحتِ سلطانی" کی تکمیل کے لیے جناب شاہ بانو صاحبہ کو جو کریڈٹ ملنا چاہیے اُس میں بحصۂ غالب جناب بیگم صاحبہ دام اقبالہا بھی شریک ہونے کا حق رکھتی ہیں۔ یہ قابل اطمینان امر ہے کہ اس سفرنامے کو حضور ممدوحہ کی نظر ثانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور اس وجہ سے اس کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

"سیاحتِ سلطانی" کے مطالعہ کرنے کے بعد دو چار امتیازی خصوصیات اس میں نہایت نمایاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ تسلسلِ واقعات

۲۔ انداز بیان

۳۔ سلاست زبان

۴۔ اختصار

**تسلسل واقعات** کا یہ عالم ہے کہ روانگی سے واپسی تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں لیکن انکی ترتیب اس خوبی سے رکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو کہیں الجھن نہیں ہوتی۔ اگر سیاق کلام یا کسی اور ضرورت سے درمیان میں کسی غیر متعلق واقعہ کا ذکر آگیا ہے تو اُسکا جوڑ اس نفاست کے ساتھ لگایا گیا ہے کہ معمولی طور پر کسی کو اُسکا خیال بھی نہیں آتا۔ غالباً یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ بیگم صاحبہ لندن میں بزمانہ جشن تاج پوشیِ ملک معظم موجود تھیں۔ جس فراخ حوصلگی اور تزک و احتشام سے یہ جشن منایا گیا ہے اُسکے مفصل حالات اس سفرنامہ میں درج ہیں اور اُنکی صحت و صداقت کے لیے اسی قدر ثبوت کافی ہوگا کہ حضور ممدوحہ نے اُنھیں بچشم خود ملاحظہ فرمایا ہے اور شاہ بانو بیگم صاحبہ نے نہایت سلیقے سے جمع کرکے سفرنامے کی زینت بڑھائی ہے۔

**طرز بیان** اتنا پیارا اور سلجھا ہوا ہے کہ معمولی قابلیت کا آدمی بھی سفرنامہ کے سارے مضامین پر بآسانی عبور کر سکتا ہے۔ جہاں کوئی تشریح طلب بات آگئی ہے وہاں اُسے سمجھا بھی دیا گیا ہے۔ درمیان میں حسب ضرورت تاریخی، جغرافیائی، یا معاشرتی معلومات بافراط موجود ہیں۔ کوئی تاریخی مقام نظر سے گزرا ہے تو اُسکے ساتھ اُسکی قدیم تاریخ بھی باختصار بھی بتا دی گئی ہے۔ بعض مقامات پر باشندوں کی طرز زندگی پر نہایت دلچسپی کے ساتھ روشنی

ڈالی ہے۔ کہیں کہیں تجارتی اور زراعتی نقطۂ خیال سے ہندوستان کی حالت کو پیش نظر رکھ کر بحث کی گئی ہے اور اس قسم کے مباحث اگرچہ کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں اُن کے مفید و سبق آموز ہونے میں شک نہیں۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ بعض مقامات پر عبارت میں انشا پردازی کا رنگ جہاں کہیں موجود ہے وہ حالات خاص طور پر دلفریب پائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر سفرنامہ کے بعض اقتباسات سے اگر ناظرین کو حلاوت اندوز ہونے کا سامان فراہم کیا جائے تو غالباً غیر موزوں نہ ہوگا۔

نہر سویز کے متعلق شاہ بانو صاحبہ نے حسب ذیل خیال ظاہر فرمایا ہے۔

یہ نہر درحقیقت مسلمانوں کے عہد عروج کی یادگار ہے۔ جب عمرو بن عاص مصر کے گورنر تھے اسوقت انھوں نے اس راستہ کو نکلوایا تھا تاکہ رسد رسانی کی کشتیاں جلد پہنچ سکیں۔ لیکن جب مسلمانوں کی حکومت پر زوال آیا تو یہ نہر بھی پامال ہو گئی۔ کیونکہ یہ پہاڑ جو حائل ہے ریگ کا ہے۔ اور اگر ہمیشہ اسکی خبر گیری نہ ہو تو پُر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں سعید پاشا خدیو مصر کے زمانہ میں فرانس کے ایک نامور انجینیر ایم۔ ڈی لیسپس نے اس نہر کو نکالا۔ وہ پہاڑ کاٹنے کے ساتھ ہی ساتھ دونوں جانب پختہ دیوار یعنی پشتہ بھی تیار کرتا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نہر کے دونوں جانب بہت مضبوط بند بنے ہوئے ہیں۔ یہ نہر ڈیڑھ سو فیٹ چوڑی، ۲۰ فیٹ گہری، اور ۸۸ میل لمبی ہے۔ اسکی تیاری پر ۲۰ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ یہ روپیہ کئی سلطنتوں کا ہے۔ انگریزی سلطنت کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ سابق خدیو مصر، سعید پاشا، نے اپنے حصے بھی فروخت کر دیے تھے انگریزی وزیر اعظم نے بکمال دور اندیشی فوراً خرید لیے۔

فرانس کے کھیتوں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

جب صبح ۵ بجے آنکھ کھلی تو سرزمین فرانس کی سرسبز و شاداب کھیتیاں لہلہاتی نظر آئیں ..... یہاں بڑے بڑے کھیت ہندوستان کی طرح نہیں ہیں۔ اندازاً چھوٹا کھیت سو فیٹ عریض اور ۵۰۰ فیٹ طویل ہوگا۔ ہل گھوڑوں سے چلتا ہے۔ زمین اونچی نیچی ہے اور پہاڑیوں پر بھی قابل زراعت زمین بنائی گئی ہے۔ جسکو بڑے بڑے کھیتوں سے گلستان بنا رکھا ہے۔ یہ زمین ایسی ہے جیسے کوہی مقامات میں ہوتی ہے۔ اکثر جا بجا

سرو کے درختوں سے گھری ہوئی ہیں۔ تمام جھاڑیاں ایسی ہیں جیسے ہندوستان میں لان پاکھا کر یعنی ڈھال کی ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے ہیں اس لیے بہت ہی خوش نمائی پیدا ہو گئی ہے۔

ترکی عورتوں کی معاشرت اور بود و باش کا مختصر خاکہ یہ ہے:۔

ترکی عورتیں انگریزی لباس پہنتی ہیں اور معاشرت یورپین طریق پر ہے۔ مذہب سے ہنوز اُنکا دلی تعلق باقی ہے۔ لیکن آزادی کی موج روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ رسم پردہ کم ہوتی جاتی ہے اگر یہی رفتار رہی تو غالباً مصر کی سی حالت ہو جائے گی۔ تعلیم میں وہ ترقی نہیں جو سُنی جاتی ہے تاہم ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔

جناب بیگم صاحبہ بھوپال مسلمانوں کی قومی فلاح و بہبود میں جو دلچسپی لیتی ہیں اُس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اور اس لیے آپ نے زمانہ قیام قسطنطنیہ وہاں کے "مسلمانوں کی عام حالت" کے متعلق جو رائے قائم فرمائی ہے اُسکے صحیح ہونے میں شک نہیں ہو سکتا۔ حضرت مولفہ سفرنامے میں تحریر فرماتی ہیں:۔

سرکار عالیہ فرماتی تھیں کہ یورپ کی ترقیاں اور حوصلے دیکھتے ہوئے ترکوں کی حالت دیکھکر یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انکو ابھی بہت کچھ سیکھنا اور بہت کچھ کرنا ہے۔ وہ ہر حیثیت سے یورپ کی ترقی یافتہ حالت کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ اسلامی اخلاق و مہمان نوازی ضرور ہے جو مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ معاملات مذہب میں ضعف ہے۔ اگرچہ سب میں نہیں لیکن بہت سوں میں ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی زیادہ مذہب کے کاموں میں تساہل ہے۔

غرضکہ مضامین کی رنگ برنگی اور درمیانی مباحث و واقعات نے "سیاحت سلطانی" کو اُسی شوخ رنگ میں رنگ دیا ہے جسکی بہتات صرف تزک جہانگیری کے مرقع میں پائی جاتی ہے، اور جسکی تشریح کے لیے مولانا شبلی کے موشگاف قلم کی ضرورت ہے۔ اسکے باوجود اختصار سے قابل تعریف کام لیا گیا ہے کوئی بیان ضرورت سے زیادہ مطول نہیں، کوئی بات ایسی نہیں جسے غیر ضروری اور معمولی کہہ سکیں۔ شاید کچھ نکتہ چیں طبائع محسوس کریں کہ بعض

غیر ضروری اور معمولی الفاظ وغیرہ کی تشریح تعلیم یافتہ گروہ کے لیے فضول تھی لیکن "سیاحت سلطانی" کی لائق مولفہ کو زیادہ تر خیال اپنی ملکی بہنوں کے فائدے کا تھا اور ظاہر ہے کہ اُن میں تعلیم کا چرچا کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ اور اُنھیں اکثر معمولی اجنبی الفاظ کے معانی سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہرکیف مستحق مبارکباد ہیں جناب شاہ بانو صاحبہ جن کی کاوش و کوشش سے علیا حضرت بیگم صاحبہ کے کوائف سفر اس خوبی اور سلیقے سے مرتب ہوئے ہیں۔ کتاب کی لکھائی، چھپائی، کاغذ اور جلد بندی میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کسی شائق علم و ادب کی لائبریری اس کے نسخہ سے خالی نہ رہنا چاہیے۔۔

کتاب کی قیمت درج نہیں ہے۔ قابل مولفہ نے چونکہ ازراہ ہمدردی قومی اس کا حق تالیف مع مصارف وغیرہ "محمڈن گرلز سکول علیگڈھ" کو دیدیا ہے اس لیے غالباً ڈیوٹی شاپ علیگڈھ سے اسکے لیے فرمایش کرنا چاہیے۔

**ادب در فن** حضرت محمود صاحب طرزی، جن کی روشن خیالی کی ایک ادنی دلیل یہ ہے کہ آپ نے افغانستان ایسے ملک سے جہاں مذاق جدید سے رُوشناس ہونے کا سامان بہت دیر میں ہوا کرتا ہے، سراج الاخبار کا اجرا کیا ہے اور ایک عرصہ سے اخبار مذکور کی ادارت کی ذمہ داریاں بخوش اسلوبی انجام دے رہے ہیں، ایک نغز گو فارسی شاعر اور جدید ناثر کا درجہ رکھتے ہیں۔ آغاز اجراے سراج الاخبار سے آپ کا یہ دستور ہے کہ ہر سال آپ اپنے ناظرین کو کوئی علمی تحفہ کسی مفید کتاب کی شکل میں دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سال "ادب در فن" نام کا رسالہ اسی سلسلہ میں شائع کیا ہے۔ کہنے کو تو یہ رسالہ غزلیات فارسی کا ایک مجموعہ ہے لیکن معنوی حیثیت کو دیکھیے تو اسکے حد درجہ مفید و کارآمد ہونے میں شک نہیں رہتا۔ آپ نے اسکا دوسرا نام "محمود نامہ" بھی لکھا ہے جسکی موزونیت اس وجہ سے بھی لطافت خیز ہے کہ پُرانے "محمود نامہ" کی طرح جو ہندوستان میں بھی قدیم نصاب تعلیم میں شریک ہے، جدید محمود نامہ میں بھی ردیف وار غزلیں موجود ہیں۔ لیکن مضامین کی نوعیت قطعی جداگانہ ہے۔ اوّل الذکر میں حُسن و عشق کی ایک داستان ہے جسے غائر نظر سے دیکھا جائے تو مبتدیوں کے کانوں تک پہنچانا ہی خلاف اصول ہے۔ اسکے برخلاف حضرت محمود صاحب طرزی نے اپنے نتائج افکار کا موضوع نہایت بلند رکھا ہے۔ آپ نے چاہِ زنخداں، مار گیسو، گوہر دنداں یا گُلِ رخسار کی بعید از خیال باتوں کو نہیں چھڑا بلکہ مفید اور کارآمد عنوان تلاش کیے ہیں اور اُن پر طبع آزمائی کی ہے مثال کے طور پر دو ایک ہیڈنگ لکھے جاتے ہیں:۔

حُسن ابتدا۔ یورپ۔ مکتب اناث۔ اتحاد۔ ہلال سرخ۔ دروغ۔ ریل۔ غرب و شرق۔ قلم۔ خلق۔ حُسن۔ وغیرہم

بعض غزلیات اخلاقی نکات سے مملو ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ اس رسالہ کا وہ حصہ ہے جہاں زمانۂ جدید کی ضروریات و ترقیات قلمبند کی گئی ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ اظہار خیالات میں تعصب، کوتاہ نظری، یا جنبہ داری کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔ مثلاً "یورپ" کے متعلق لکھتے ہیں ؎

گرچہ در ہر پنج قطعہ کوچکِ آں شد یورپ
لیکِ آنہا چوں سُہا شد، نیّرِ اعظم یورپ

مکتب اناث (مدارس نسوان) کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ آپ عورات کی ضرورت شناسی باندازہ وافر رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

باشد ضرور بہر وطن مکتب اناث — زیرا ذکور نیم و دگر نیم شد اناث
پس ہر زنے کہ علم و ادب دارد و کمال — با شیر علم راہ ولدی دہد اناث
تعلیم علم بہر زناں فرض تر بود — زیرا کہ ہست مادر نوع بشر اناث

اسی طرح ریل۔ الیکٹرک، وغیرہ کے عنوان سے جو غزلیں درج ہیں وہ مفید معلومات اور تشویق کا خاص ذریعہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر "یورپین ترقی" کے تاریک رُخ کو بھی نمایاں کر دیا ہے اور اسے شاید محتاط طبایع اس لیے پسند نہ کریں کہ بچوں کے جذبات کو ابتدا ہی سے مخالفت کے رنگ میں رنگنا مناسب نہیں۔ لیکن حضرت محمود طرزی نے تو جو کچھ تعلیم دینا چاہی ہے وہ "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے عاقلانہ اصول پر مبنی ہے۔ اس لیے

تصویر کے دونوں پہلو دکھانے کا اُن پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

بہرکیف "ادب درفن" نہایت مفید رسالہ ہے۔ اگر اردو میں اسی لائن پر کوئی مختصر سی کتاب لکھکر ابتدائی نصاب تعلیم میں شامل کردی جائے تو زہے نصیب۔ ہندوستان میں غالباً حضرت شوق قدوائی اس کام کے لیے زیادہ موزونیت رکھتے ہیں، اور امید کرنا چاہیے کہ وہ ان سطور کے دیکھنے کے بعد اس ضرورت کی تکمیل پر متوجہ ہوں گے۔

"ادب درفن" نہایت عمدہ دبیز کاغذ پر خوشنما ٹائپ کے حرفوں میں چھاپا گیا ہے۔ کاش ایسے اہتمام سے ہندوستان کی درسی کتابیں بھی شایع ہوا کریں۔ رسالہ پر قیمت وغیرہ درج نہیں۔ غالباً ڈاک خانہ افغانستان، پشاور کی معرفت یہ رسالہ دستیاب ہوسکتا ہے۔

**بحر الحکمت** (ہر دو حصہ) اس نام کے دو رسالے، جو مولوی میر صغر علیصاحب تعلقدار بمستانات ساتولی واللہ دگی علاقہ کوکن کی حسن سعی سے معرض وجود میں آئے ہیں بغرض اظہار رائے موصول ہوے ہیں۔ مولف نے نہایت جاں فشانی سے اخلاق و حکمت کے بیش بہا خزف ریزوں کو جمع کر کے "بحر الحکمت" کے نام سے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ حصہ اول کے آغاز میں مولنا شبلی، مولوی علی حیدر طباطبائی، مولوی سید احمد دہلوی، لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی، خان بہادر سلطان احمد ایسے مشہور اہل الرائے و اہل قلم بزرگوں کی تقریظیں شامل کی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک میر صغر علیصاحب کی یہ کوشش علمی مستحق ستائش و تحسین اور انکی یہ تالیف کارآمد و مفید ہے۔

اصل کتاب پر سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولف نے مطالب کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ البتہ اگر اقوال کے ساتھ قائلین کے نام بھی لکھ دیے جاتے تو اور بھی اچھا ہوتا۔ ان کتابوں کا مطالعہ ہر شخص کے لیے سبق آموز ہوسکتا ہے کیوں کہ "بحر الحکمت" فی الواقع ایک دریا ہے جسکی تہ میں نہ صرف اخلاقی وادبی بلکہ روحانی، سیاسی، معاشرتی، اور علمی نکات کے آبدار موتی بھی موجود ہیں اور اگر نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کو سبقاً سبقاً اسکو پڑھایا جائے تو یقیناً نفع بخش ثابت ہوگا۔ محکمۂ تعلیمات سرکار نظام اسکو نصاب تعلیم میں شریک کرکے مولف کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کر سکتا ہے۔

قابل مؤلف سے ایک شکایت ضرور ہے کہ اُنھوں نے اپنی اس تالیف میں قدیم رنگ بہت چوکھا رکھا ہے جو ممکن ہے کہ خود اُنھیں کا طبعی رنگ ہو۔ ضرورت تھی کہ زمانۂ جدید کے مشاہیر کے اقوال کے لیے بھی "بحر الحکمت" میں جگہ نکالی جاتی۔ آج کل زمانہ کے ساتھ طبائع میں بھی تغیرات پیدا ہوگئے ہیں۔ اور اس صورت میں کہ تمام دنیا میں عورتوں کی حقوق شناسی کی برقی رو چل رہی ہے غیر ممکن ہے کہ اُن دقیانوسی خیالات کی رتی برابر بھی قدر کی جائے جنکا عکس مندرجۂ ذیل سطور میں پایا جاتا ہے

> عورت کیا ہے؟ مرد کی فکر۔ بیان سے باہر بُرائی۔ ہم نوالہ وہم پیالہ درندہ۔۔۔۔۔ جنگ بے صلح۔ سونے والی اور تم کو بیدار رکھنے والی۔ دائمی رنج و مصیبت۔ کم عقل کی ہلاکت۔ (۲۳۳)

یہ باتیں جو صنف نازک کے لیے قدرتاً ازلی حیثیت عرفی ہیں آج سے دس بیس سال اُس طرف شاید کچھ دلچسپ ثابت ہوسکتی تھیں لیکن آج کل انکی وقعت محال و بعید از خیال ہے۔ میر صغر علیصاحب اگر چاہتے تو انھیں ہر مذہب کے اکثر نامور علماء و فضلاء کے ایسے اقوال دستیاب ہوسکتے تھے جو مستورات کی پوزیشن کی کافی وضاحت کرتے ہیں۔

اس قسم کی دو ایک معمولی فروگذاشتوں کے ماسوا "بحر الحکمت" کے صفحات کارآمد ہدایات اور اخلاق و ادب کے مفید نکات سے لبریز ہیں جن میں بیشتر ایسے ہیں جو علمی کام کرنے والوں کے لیے "موٹو" کا کام دے سکتے ہیں۔ اُمید کرنا چاہیے کہ قابل مولف کو اپنی سعی جمیلہ کا صلہ ملک کی جانب سے قدردانی کی صورت میں ملیگا۔ بحر الحکمت حصۂ اول کی قیمت ۱۲؍ اور حصہ دوم کی ۸؍ ہے اور ہر دو حصص منشی سید محفوظ علی جعفری خلف

حضرت مولف (حیدر آباد دکن، افضل گنج، محلہ عثمان شاہی صفر منزل) سے مل سکتے ہیں۔

**ذیابطیس** | زبدۃ الحکما حکیم ڈاکٹر غلام نبی صاحب پنجاب کے امور طبابت میں خاص فضیلت رکھتے ہیں۔ آپ کی طبی کتب کا ایک سلسلہ جس میں نمبروار مختلف امراض جسمانی کی تحقیق کی گئی ہے خاص و عام میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اسی سلسلہ لطف زندگانی کی ۳۳ ویں کڑی یہ رسالہ ہے جو مندرجہ عنوان نام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ذیابطیس ایک مولک بیماری ہے اور یہ امر کسی قدر افسوسناک ہے کہ اسکا زور ہندوستان میں بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ موذی مرض زیادہ تر دماغی و ذہنی مشاغل رکھنے والے طبقے میں زیادہ نمودار ہوتا ہے اور حال ہی میں گورنمنٹ عالیہ نے اسکے متعلق ایک تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے جسکی تحقیقات کی ابتدا غالباً پنجاب سے ہوگی۔ ملک کو حکیم صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ آپ نے اس مختصر رسالہ میں نہایت جامعیت کے ساتھ مرض ذیابطیس کے ماہیت و اسباب پیدایش و طریق علاج کو قلم بند کیا ہے۔ اس سے پہلے بیرسٹر حامد علیخاں صاحب (لکھنؤ) ایک مشرح رسالہ اسی مرض پر لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ وہ انگریزی زبان میں تھا اس وجہ سے غالباً اسکا فائدہ محدود تھا۔ اب حکیم صاحب کی بدولت اردو خواں پبلک کے لیے بھی کافی سامان واقفیت پیدا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جنھیں علمی مشاغل میں اپنے اوقات فرصت گذارنے پڑتے ہیں اس رسالہ کو ضرور مطالعہ کریں۔ قیمت عہ فی جلد کسی قدر زیادہ ہے لیکن اسکی منفعت کے لحاظ سے، جو اسکے مطالعہ سے متصور ہو سکتی ہی کم ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ حکیم ڈاکٹر غلام نبی صاحب (زبدۃ الحکما) موچی دروازہ لاہور۔

**کوکین نامہ** | ہندوستان میں "کوکین" کا رواج اس کثرت سے ہوتا جا رہا ہے کہ خوف ہوتا ہے کہیں یہ بلا ہندوستانیوں کے سر اسی طرح نہ آپڑے جس طرح افیون چینیوں کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو "چین" اور "افیون" کا اختصاص مثل پیشتر کے اب باقی نہیں رہا۔ اور ادھر ہندوستانی ہیں کہ مفت کی بلا اپنے سر لے رہے ہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ تقریر و تحریر اور قول و فعل کے ذریعہ سے اسکے استعمال کی کثرت روکی جائے۔ اس سے نہ صرف اخلاقی و جسمانی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ جرائم میں بھی قابل امتیاز کمی ہو سکتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ حضرت خلیق دہلوی نے "کوکین نامہ" لکھ کر بہت بڑی حد تک اپنے اہل ملک کے لیے سامان سبق آموزی فراہم کر دیا ہے۔ حضرت خلیق دہلی کے ایک نامور اور نکتہ سنج شاعر ہیں جن کے رشحات قلم کے دلفریب نمونے صفحات العصر کے اندر معقول تعداد میں مل سکتے ہیں۔ لیکن "کوکین نامہ" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جا بجا ظرافت کا چٹخارا بھی موجود ہے اور اکثر سین اس بیساختگی سے لکھے گئے ہیں کہ بے ساختہ تعریف کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً یہ بند ؎

کوکین خواریوں کو نہیں چھوڑتے میاں گھر میں لیل و خوار ہیں کھاتے ہیں جوتیاں
قیمت ہے ضعف و غنودیاں آتی ہیں ہچکیاں کوکین نوش کرتے ہیں لے کر جمائیاں
کوکین نوشیوں نے نکما بنا دیا
ان گرم جوشیوں نے نکما بنا دیا

اسی طرح مندرجہ ذیل دو ایک بند شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ واقعیت و صداقت کا گویا مرقع ہیں ؎

کیوں روگ لگ رہا ہے یہ عہد شباب میں لذت ہے ایسی کونسی اسکے لعاب میں
خاموش ہو کے کہتے ہیں کچھ کچھ جواب میں یہ کیف بھنگ میں ہے نہ شغل شراب میں
جوتے لگائے یا کوئی گالی ہزار دے
"یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے"

جو اسکو بیچتے ہیں وہ سب مالدار ہیں ہے انقلاب دہر نیا لے سوار ہیں
مل جل کے کام کرتے ہیں یار و نگار ہیں پٹی لگا کے بیٹھتے ہیں ساہوکار ہیں
چیزے نماند نقد گراں دام دام رفت
"آں ہم حرام بود بجائے حرام رفت"

اس مسدس کے علاوہ، کئی غزلیں بھی اسی موضوع پر ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت ۱ر پر منشی عبدالخالق صاحب خلیق، گلی چابک سواران لال چاہ، دہلی سے یہ رسالہ مل سکتا ہے۔

**صحیفۂ نامی** | یہ رسالہ جسکا دوسرا نام "خلاصہ شرح معمائے جامیؒ" ہے حافظ محمد یوسف خاں صاحب افسوں بنارسی کی تالیف سے ہے۔ فنِ معما پر شاید یہ پہلی کتاب ہے جو اُردو میں لکھی گئی ہے۔ قابل مؤلف نے نہایت جاں فشانی سے اسکی ترتیب و تکمیل کی منزلیں طے کی ہیں۔ شروع میں اس فن کے اقسام و اصول مشرح طور پر درج کیے ہیں اور پھر امثال و نظائر کے ذریعہ سے اسکے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ "نمے کی حقیقت کا بیان" جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ متقدمین نے "معما" کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معما گوئی انسانی ذہانت اور دماغی کمال کا ایک بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ فارسی میں حضرت جامیؒ اس فن کے افضل ترین ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو میں شاید اسوقت تک اس فن کے متعلق کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لحاظ سے حضرت افسوں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کم ازکم ایک مختصر سی بنیاد قائم کر دی ہے جسپر مشترکہ مساعی کے ذریعہ سے بشرط ضرورت بڑی سے بڑی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔

کتاب پر قیمت کچھ نہیں لکھی اور غالباً مطبع منشی نول کشور لکھنؤ کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

"سیّد القلم"

## کلام الحمید

اُٹھا کے ساغر جو رند رسوا بذوقِ شرب مدام نکلا ‌ نہ زہد زاہد ہوا مؤثر نہ پندِ واعظ سے کام نکلا
صلائے مہر و وفا کی خاطر جو دستِ قدرت نے فال کھولی ‌ تو سب سے پہلے کتابِ الفت میں دردمندوں کا نام نکلا
سنا میں ہم کیا حقیقتِ دل بلا ہی نیرنگِ بزمِ ہستی ‌ کہ جسکو جانا تھا ہمنے پختہ بغور دیکھا تو خام نکلا
بڑی قیامت کی دلربا ہی یہ مزرعہ کشت زارِ دنیا ‌ کہ دانہ جس جس جگہ پہ پایا وہیں پہ دیکھا تو دام نکلا
اٹھی نظر جب بسوئے معنی تو مٹ گئے سب طلسمِ صوری ‌ وہی صنم دلربائے عالم پسندِ ہر خاص و عام نکلا
عجیب مشرب ہی عاشقی کا عجب ہی دیکھی کتاب اس کی ‌ حلال سمجھے ہوئے تھے جسکو وہ اس میں آکر حرام نکلا
ہمیں تو مذہب نے عشق ہی کے کیا ہی ہوش و خرد سے واقف ‌ وگرنہ کچھ کچھ ہر ایک مذہب کی گفتگو میں کلام نکلا
بشمع اقدس سمجھ کے واعظ کیا تھا ہمنے سلام تجھکو ‌ مگر جو دیکھیں تری ادائیں تو۔ تو ہوس کا غلام نکلا
عجب ہے پیرِ مغاں کی مجلس کہ جسکا عالم ہے کچھ نرالا ‌ وہاں پہ شیخِ حرم نشیں بھی فدائے مینا و جام نکلا
یہ رعبِ حسنِ کمال دیکھو کہ دیکھکر انکو رہ گئے ہم ‌ دلِ پریشاں سے حرفِ مطلب زباں تلک نا تمام نکلا

حمید اُنکی گلی میں آکر ہوئے ہو تم بھی خراب رسوا
مگر یہ بیت الصنم تمہارا عجیب بیت الحرام نکلا

# عصریات

## انسانی دماغ کا وزن

ہاتھی اور ویل کے سوا انسان کا دماغ تمام جانوروں سے زیادہ وزنی ہے۔ دماغ کا اوسط وزن مرد کا ۴۹½ اونس اور عورت کا ۴۴ اونس ہوتا ہے۔ دونوں کا اوسط فرق ۵ اور ۶ اونس کے درمیان رہتا ہے۔ مگر عام طور پر مرد کے دماغ کا وزن ۴۶ سے ۵۳ اونس تک اور عورت کا ۴۱ سے ۴۷ اونس تک ہوتا ہے۔ مردوں کے ۸۰۰ دماغوں میں سب سے وزنی دماغ ۶۵ اونس اور سب سے ہلکا ۳۴ اونس پایا گیا۔ لوشکا (Luschka) کی رائے میں مرد کے دماغ کا اوسط وزن ۱۴۲۴ گرام (قریباً ۵۰ اونس) اور عورت کے دماغ کا اوسط وزن ۱۲۷۲ گرام (قریباً ۴۵ اونس) ہے۔ کراز (Crause) کا اوسط اس سے زیادہ ہے۔ اس کی رائے میں مردوں میں ۱۵۷۰ گرام (قریباً ۵۴½ اونس) اور عورتوں میں ۱۳۵۰ گرام (قریباً ۴۶½ اونس) اوسط وزن ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ دماغ کا وزن عمر کے ساتویں سال تک بہت تیزی سے ترقی کرتا ہے۔ اور ۱۶ یا ۲۰ سال کی عمر تک آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے۔ اسکے بعد تیس چالیس سال کی عمر تک اسکی رفتار ترقی بہت ہی سست رہتی ہے اور یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ چالیس سال کے بعد جوں جوں عمر بڑھتی اور دماغی قوائے انحطاط پذیر ہوتے جاتے ہیں، دماغ کا وزن بھی آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے اور فی دس سال ایک اونس گھٹتا رہتا ہے۔ یہ عمل مرد و عورت دونوں میں یکساں ہوتا ہے۔ پہلے دماغ کی جسامت اور دماغ کی قابلیت میں بھی ایک عام تعلق خیال کیا جاتا تھا۔ کوویر (Cuvier) کا دماغ ۶۴ اونس سے زیادہ وزنی تھا اور ڈاکٹر ایبر کرامبی (Abercrombie) کے دماغ کا وزن ۶۳ اونس، اور ڈوپیٹرن (Dupuytren) کے دماغ کا وزن ۶۲½ اونس تھا۔ اسکے برعکس ایک ہوشیار یا پیدائشی فاتر العقل کے دماغ کا وزن شاذ ہی ۲۳ اونس سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جدید تحقیقات کی رو سے ان واقعات سے انقطاعی نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے کیونکہ یہ امر معروف ہے کہ اسقدر وزن بعض ایسے اشخاص کے دماغوں کا بھی معلوم ہوا ہے جن سے کسی دماغی قابلیت کا اظہار نہیں ہوا۔ چنانچہ ہیلڈینن آف سنسنیٹی Heldennan of Cincinnati نے ایک لٹو کا حال درج کیا ہے جسکی عمر ۴۵ سال تھی اور جسکے دماغ کا وزن ۶۸½ اونس تھا۔ وہ تمام عمر غلام رہا اور کبھی خصوصیت کے ساتھ سمجھدار اور تیز فہم خیال نہیں کیا گیا۔ وہ ناخواندہ تھا مگر کہا جاتا ہے کہ بہت سنجیدہ، غور پسند اور کفایت شعار تھا۔ انسیر صاحب (Ensor) رپورٹ الزنجبار کے ڈسٹرکٹ میڈیکل افسیر مظہر ہیں کہ کیری (Carey) مشہور آئرش ریفارمر کے دماغ کا وزن ۷۱ اونس تھا۔ ایم نکیفوروف (M. Nikiforoff) نے اوزان دماغ پر ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ دماغ کے وزن کا دماغی قابلیت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

دماغ کے وزن کے لحاظ سے "کا بجینئ" مظہر ہے کہ حسب ذیل ۱۲ نام اول ہیں، وزن گرام میں درج ہے۔ (۱) ایون تورجنیف روسی ناول نویس ۲۰۱۲؛ (۲) جوزف یونی فرانسیسی ماہر قانون ۱۹۳۵؛ (۳) جارج کاویر فرانسیسی و جرمنی عالم حقائق الاشیا ۱۸۳۰؛ (۴) ای۔ ایچ۔ ناٹ امریکہ کا ماہر علم جر ثقیل ۱۸۱۴؛ (۵) فرانس کس کراس، جرمنی کا عالم دینیات ۱۸۰۰؛ (۶) جان ایبر کرامبی اسکاٹ لینڈ کا طبیب ۱۷۸۶؛ (۷) بنجمن ایف بٹلر امریکا مدبر ۱۷۵۸؛ (۸) ایڈورڈ اولنی امریکہ کا عالم ریاضی ۱۷۰۱؛ (۹) ہرمن لیبی جرمنی انشا پرداز ۱۶۹۰؛ (۱۰) لے، وشیل امریکہ کا عالم ارضیات ۱۶۷۶؛ (۱۱) ولیم ایم۔ تھیکری انگلستان کا ناول نویس ۱۶۵۸؛ (۱۲) روڈلف لینز جرمنی کا انشا پرداز ۱۶۳۶۔

## پروفیسر روس تیس سال پہلے

پچھ دنوں میں اعصابی تحریک کی سرایت کے مضمون کے متعلق جسکو راس صاحب نے حال ہی میں شائع کیا ہے (دیکھو عصریات" العصر اکتوبر نمبر) ڈاکٹر جے۔ سی بوس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ہومرشیم کاکس Prof. Homersham Cox نے لکھا ہے :-

"اس بات کو تیس برس ہوئے کہ میں نے ڈاکٹر بوس کو وہ خیالات ظاہر کرتے ہوئے سُنا تھا جو اب انھوں نے عملی تجربوں سے ثابت کیے ہیں۔ مجکو اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت بھی اُنکی قابلیت اور فضا طبیعت کا اثر ہوا تھا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلی اکتشافات ایک دن میں نہیں ہوتے۔ جب عالمانہ تخیل کی مدد سے ایک طباع شخص قریباً الہام کے طور پر یہ خیال کرتا ہے کہ ایک خاص واقعہ ضرور صحیح ہے اسکے بعد بھی اُسکو برسوں سخت ناکامیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور جس بات کا وہ یقین رکھتا ہے اسکی صحت کو متواتر کامیاب تجربوں سے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذکاوت (Genius) کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "وہ محنت کرنے کی غیر محدود قابلیت کا نام ہے"۔

## بہروں اور گونگوں کی کانگرس

سال رواں میں تمام دنیا کے بہرے گونگے اپنی تیسری کانگرس کے اجلاس کے لیے جمع ہوئے تھے۔ انگلستان سے ۲۰ اور اسکاٹ لینڈ سے ۱۰ نمایندے شامل تھے۔ ریاست ہاے متحدہ امریکہ سے بیس بہرے گونگے آئے۔ نمائندوں میں جرمنی آسٹریا۔ بلجیم۔ ناروے۔ سوئیڈن۔ اسپین۔ پرتگال۔ سوئزرلینڈ۔ جاپان ہر جگہ کے لوگ تھے۔ کانگرس نے ایبی ڈی ایل ایپی ( Abbe de L'Epee ) کی جو گونگوں اور بہروں کی تعلیم کے فرانسیسی قاعدہ کا بانی تھا دوصد سالہ یادگار منائی۔ تمام نمایندوں نے اپنی رپورٹ اشارات کی زبان میں پیش کی۔ ایک ترکی گونگے کی حرکات جسمانی کی غیر معمولی صحت اور برجستگی نے اس فن کی فتح اور کامیابی ثابت کردی۔ پروگرام میں گونگوں کے تھیٹر کا تماشہ اور سینٹ راک کے گرجا میں جہاں ایپی ڈی ایل ایپی دفن ہے بھجن گانا بھی شامل تھا۔

## انسانی جسمانی ترقی زندگی کے پہلے ۷ سال میں

بچہ پیدا ہوتے ہی وزن میں تقریباً سات پونڈ ہوتا ہے اور اسکی لمبائی تقریباً انیس انچ ہوتی ہے۔ پہلے دو تین دن چار اور سات اونس کے درمیان وزن کم ہوتا ہے۔ اسکے بعد وزن میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اول چھ ماہ تک ہر ہفتے ۴ اور ۶ اونس کے درمیان وزن میں بیشی ہوتی ہے پہلی ششماہی کے اختتام سے پہلے وزن دُونا ہوجاتا ہے۔ اور پہلے سال کے ختم سے قبل تین گنا ہوجاتا ہے۔ دل کی حرکت قریباً ۱۳۰ اور تنفس ۳۵ ہر فی منٹ کے حساب سے ہوتا ہے۔ اور حرارت جسمانی بڑے آدمیوں کی نسبت ایک درجہ کم ہوتی ہے۔ ساتویں سال کے تمام ہونے سے پہلے وزن تقریباً ۴۴ پونڈ ہوجاتا ہے۔ یعنی پہلے سال کے ختم پر جو وزن ہوتا ہے عمر کے ساتویں سال کے قریب وہ دُونا ہوجاتا ہے اور اس وقت قد تقریباً ۴۴ انچ ہوتا ہے۔

## ہونہار بچوں کی پیدایش کا وقت

تمام مہذب ممالک میں روزانہ اموات اور پیدایش کے درج رجسٹر ہونے کا قاعدہ ہے اس سے بہت سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً عمر کا اوسط معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اموات اور پیدایش میں کیا نسبت رہتی ہے۔ لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں یا لڑکیاں؟ کس مرض میں اموات زیادہ ہوتی ہیں؟ اس طرح سے اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اہل امریکہ نے پیدایش کی رپورٹ سے یہ معلوم کیا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند، باکمال اور قابل و با اثر لوگ سال کے کس حصہ میں پیدا ہوئے ہیں یہ جاننے کے لیے انھوں نے سال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دونوں ششماہی کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

| نام پیشہ یا کام | اول ششماہی | دوم ششماہی |
| --- | --- | --- |
| شاعر | ۲۵ | ۱۵ |

| | | |
|---|---|---|
| واعظ | ۲۶ | ۲۹ |
| سائنس داں | ۲۰ | ۲۴ |
| فلاسفر | ۲۵ | ۱۵ |
| ماہر جنگ | ۲۲ | ۳ |
| مدبر | ۲۵ | ۲۰ |
| ماہر علم موسیقی | ۸ | ۴ |
| مصور و سنگ تراش | ۸ | ۶ |
| مورخ اور اخبار نویس | ۲۲ | ۲۵ |

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لائق افراد کی پیدائش جنوری سے جون تک زیادہ ہوئی ہے۔ یہ علمی پہلو سے کوئی معمّا نہیں ہے کیوں کہ اسکے صرف یہ معنی ہیں کہ سال کا مخصوص حصہ جنین کے دماغ کی ساخت کیلیے موسمی اثرات دوسرے حصہ سے بہتر رکھتا ہے اور موسمی اثرات کے دماغ سے تعلق رکھنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

### ذیابیطس پر سرکاری توجہ

ذیابیطس کا مرض دماغی کام کرنے والوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہندوستان میں اسکی ترقی روزافزوں ہے۔ جوں جوں تعلیم، علمی مشاغل اور دوسرے دماغی کام اس ملک میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ یہ مرض بھی اپنے دائرۂ ہلاکت کو وسیع کرتا جاتا ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اسکی تیز رفتار ترقی پر ملک کی بہبودی کے لیے توجہ مبذول فرمائی ہے اور وہ عنقریب ایک قابل اور تجربکار ڈاکٹر کو اس مرض کی تحقیقات پر مامور کرے گی کہ وہ اس مرض پر مقامی حیثیت سے غور کرے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تحقیقات کا سلسلہ غالبًا اول پنجاب سے شروع ہوگا۔ اسکے اسباب و علاج کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ دیسی طبیبوں اور ویدوں کی بھی رائے اور مدد حاصل کیجائے گی۔

### موتی تابوت کی حیثیت سے

اصلی موتی محض ایک کیڑے کا مزار ہے جسکو سیپ اپنے اندرونی کیڑے کو آزار رسانی سے بچنے کے لیے بناتی ہے۔ یہ کیڑا اپنے میزبان کو تکلیف دیتا ہے جو اپنے بچاؤ کے لیے ایک چونے کا مادہ اپنے جسم سے نکالتا اور اس کیڑے کے گرد لپیٹتا ہے۔ اس بات سے کہ یہ مادہ بہت چمکدار اور خوب صورت ہوتا ہے اسکے قدرتی قدروفائدہ میں تو کچھ فرق نہیں ہوتا مگر انسان کی نگاہ میں اسکی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ گویا سیپ اس کوشش میں کہ اپنے موذی مہمان سے نجات پائے اپنے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیار اور طاقت ور دشمن کا شکار بنا لیتی ہے۔ موتی نہ صرف کیڑے ہی کی خراش کا نتیجہ ہوتے ہیں بلکہ اور بھی ایسی چیزیں ہیں جو سیپ کے اندرونی غلاف میں خراش پیدا کرکے یہی نتیجہ پیدا کرتی ہیں اگرچہ یہ نتیجہ اس درجے اور منزلت کا نہیں ہوتا۔ ریت کے ریزے نیز اور قسم کی چھوٹی چیزیں اگر اس مطلب کے لیے سیپ میں داخل کردی جائیں تو وہ بھی ایک قسم کا موتی بنا کر نکلیں گی البتہ وہ موتی آب و تاب میں ایسا نہ ہوگا جیسا اصل کیڑے کا تابوت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولہیم برنٹ (Dr. Wilhelm Berndt) نے ایک مضمون کے دوران میں لکھا ہے:-

موتی کیا چیز ہے؟ فی نفسہ بہت حقیر ہے یا صرف کاربنیٹ آف لائم (چونے کا ایک مرکب) کی ڈلی ہے جسمیں جاندار مادہ کا جزو بھی شامل ہے اور اسکے بیرونی غلافوں کی ساخت کی وجہ سے اسکا رنگ خوب صورت نظر آتا ہے جو روشنی کی مداخلت کا نتیجہ ہے۔ بعض گھونگھوں میں بھی جو گویا موتی کے ماں ہیں اس قسم کا رنگ ہوتا ہے مگر وہ مادہ گھر بالکل ایک ہیں۔ کیمیائی لحاظ سے بھی دونوں یکساں ہیں۔ صرف شکل میں اختلاف ہے۔ موتیوں کی اصلیت مختلف ہوتی ہے۔ کچھ زمانہ ہوا عام خیال تھا کہ بعض اجرام غیر (Foreign Bodies) مثلاً ریت کے ریزے، مونگے اسپنج کے ریشے، سیپی میں داخل ہو جاتے اور ان پر چونے کے ہم مرکز غلاف چڑھتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے موتی بھی جو غیر اجرام سے بنتے ہیں فطرت میں اپنا وجود ضرور رکھتے ہیں۔ با شندگان چین جو مظاہر قدرت کا مشاہدہ خوب کرتے ہیں مہاتما بدھ کی ننھی ننھی تصویریں سیپی میں رکھ دیتے ہیں جن پر موتی کے مادہ کی تہ چڑھ جاتی ہے۔ لیکن اصلی موتیوں کی بناوٹ مختلف اور زیادہ دقیق ہے جیسا کہ سیبولڈ، فلیپائی، ڈیوبوئس، ہیڈ مین، وغیرہ سائنس دانوں کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے۔

جسم کی سیپیوں میں جیسا کہ اب معلوم ہوا ہے موتی کی پیدائش تقریباً ہمیشہ ایک خاص قسم کے کیڑے کی موجودگی پر منحصر ہے جو ٹریمیٹوڈ (Tremetode) یا سسٹوڈ (Centoda) قسم کے کیڑوں کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ دیو اُس کہتا ہے کہ سب خوبصورت موتی محض ایک کیڑے کا تابوت ہے، اور دنیا کے بہت سے حسینوں کو سخت تعجب ہوگا جب اُن کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ اپنی گردن میں حشرات الارض کے ہزاروں ڈالر کے قیمتی تابوت پہنے ہیں۔

موتی کئی لحاظ سے جان داروں کے مشابہ ہیں۔ وہ بیمار ہو سکتے اور مر سکتے ہیں۔ بیمار موتیوں کی چمک کم یا ذرد پڑ جاتی ہے۔ اور وہ کچھ داغدار سے نظر آنے لگتے ہیں۔ بے احتیاطی سے ہاتھ لگانے سے موتی میلے ہو جاتے ہیں۔ اور پہننے والے کی بیماری سے بھی (اگر اُسکے جسم میں مجر بی خاصیت پیدا ہو گئی ہے) اثر پذیر ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ موتیوں کو بہت عرصہ تک گم کر رکھنا چاہیے کیونکہ جلد سے جو چکنا مادہ خارج ہوتا رہتا ہے وہ انکو محفوظ رکھنے میں مفید ہے۔

## ہندوستان کی ضروریات

صنعت و حرفت میں بہت پیچھے ہونے کے سبب ہندوستان اپنی ضروریات کے لیے غیر ملکوں کا محتاج ہے۔ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان غیر ملکوں سے اپنی ضروریات کس قدر قیمت پر فراہم کرتا ہے۔ اور بہت سی اشیاء کی حالت میں یہ ظاہر ہے کہ اُنکے لیے خام مال پیسہ کے مول یہاں سے جاتا ہے اور پھر وہی روپیہ کے مول ہمیں ملتا ہے۔ یہ اعداد سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء کے ہیں :-

| نام اشیا | قیمت روپیہ |
|---|---|
| ملبوسات | ۳۵۵۷۸۱۹۱ |
| سوتی کپڑا | ۵۱۷۱۹۳۲۷۸ |
| اُونی کپڑا | ۳۵۰۱۹۵۶۲ |
| شراب | ۱۹۴۶۴۳۲۹ |
| کاغذ | ۱۲۴۵۰۰۲۳ |
| سامان خورد و نوش | ۲۱۹۰۵۹۶۱ |
| متفرقات | ۹۹۲۵۸۸۸۴ |
| میزان | ۷۵۰۹۷۰۲۳۵ |

## ہندوستان کی تجارت

سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء میں ہندوستان کی تجارت و آمد و برآمد جو غیر ملکوں سے ہی ہو اسکے سرکاری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سال زیر نظر میں برطانیہ کلاں و آئرلینڈ سے ۹۱۷۵۰۵۰۷۷۹ روپے کا مال ہندوستان میں آیا اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان سے ۶۰۱۷۲۴۹۰ روپے کا مال گیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کو ۲۶۶۳۰۳۲۸۹ روپے کا نقصان رہا۔ روس سے بھی ہندوستان کو تجارت میں نقصان ہوا کیونکہ روس سے ۱۱۴۷۹۱۷ روپے کا مال آیا اور اسکے مقابلہ میں روس نے ہندوستان سے کچھ نہیں خریدا۔ گویا اس قدر روپے کا ہندوستان کو خسارہ ہوا۔ ماریشس (افریقہ) سے بھی ہندوستان کو ۲۲۳۱۰۰۴ روپے کا نقصان رہا۔ ان ملکوں کے علاوہ باقی تمام ملکوں سے جن سے ہندوستان کا لین دین ہے نفع رہا۔ چین سے پندرہ کروڑ نو سی لاکھ کا، جاپان سے تیرہ کروڑ ستائیس لاکھ کا، جرمنی سے تیرہ کروڑ چونسٹھ لاکھ کا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سے دس کروڑ سینتیس لاکھ کا ہندوستان کو فائدہ ہوا نیز آسٹریلیا، ہنگری، بلجیم، فرانس، اٹلی، عرب و ایران، لنکا، سٹریٹس سیٹلمنٹس آسٹریا، مصر، جنوبی امریکہ، اور عدن ہر ایک سے جداگانہ ایک کروڑ سے زائد منافع رہا۔ ان میں سے اٹلی سے پانچ کروڑ اور لنکا سے سات کروڑ وصول ہوے۔ ان کے علاوہ دیگر ممالک غیر سے ۱۵۰۹۱۹۳۴۳ روپے کا مال ہندوستان نے خریدا اور ہندوستان سے اُن ممالک کو ۲۰۲۳۸۰۵۹۵ روپے کا مال گیا لہذا ہندوستان کا ۵۱۴۶۱۲۵۲ روپیہ فاضل رہا۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ انگلستان، روس اور ماریشس کے علاوہ ہندوستان کو تمام ممالک سے تجارت میں نفع ہوا ہے کیونکہ یہی ملک ایسے ہیں جنکا مال ہندوستان میں زیادہ آیا ہے اور ہندوستان سے اُن میں کم گیا۔ کم از کم برطانیہ کا ہندوستان پر ہمیشہ تجارتی قرضہ رہتا ہے۔ تمام اعداد و شمار کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ممالک غیر نے ہندوستان کی تجارت و آمد سے ایک ارب چالیس کروڑ پانچ لاکھ چونتیس ہزار تین سو تراسی روپیہ کمایا۔ اور ہندوستان

سے اپنی پیداوار سے تجارتِ برآمد کے ذریعہ سے دو ارب تناسی کروڑ اٹھانوے لاکھ بیاسی ہزار تین سو چھپیں روپیہ وصول کیا۔ اس طرح ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہندوستان کی دولت میں تراسی کروڑ ترانوے لاکھ ستائیس ہزار نو سو بیالیس روپے کی بیشی ہوئی جو واقعی طمانیت بخش ہے۔

## ہندوستانی طالب علم اور صنعتی تعلیم

وکٹوریا جوبلی ٹکنیکل (صنعتی) انسٹیٹیوٹ بائیکلا بمبئی کے امتحان منعقدہ اپریل ۱۹۱۳ء کے نتائج معلوم ہو گئے ہیں:۔ ۳۲ طالب علم روئی کاتنے کے امتحان میں شریک ہوئے، ان میں سے ۲۰ پاس ہوئے؛ ۲۲ طالب علم روئی بننے کے امتحان میں بیٹھے جن میں سے ۱۶ کامیاب ہوئے؛ پانچ طالب علموں نے روئی رنگنے کا امتحان دیا اور سب کامیاب ہوئے۔ ۴۵ برقی انجنیری کے امتحان میں داخل ہوئے ان میں سے ۳۰ کو کامیابی ہوئی۔ ۱۲ امیدواروں نے موٹر کار انجنیری کا امتحان دیا ان میں سے ۴ کو سند کامیابی ملی۔ اِس تعلیم گاہ کے امتحانات کا تعلق لندن سے ہے اس لیے امتحان لینے میں کسی قدر دقت اور دیر ہونا اغلب ہے۔ خصوصاً یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایسے امتحانات کا زیادہ حصہ عملی ہوتا ہے۔ بہرکیف نتائج کو دیکھتے ہوئے اس تعلیم گاہ کے پرنسپل ہر طرح قابل مبارکباد ہیں۔ مگر ضرورت ہے کہ ملک میں اس قسم کی تعلیم گاہیں بکثرت ہوں۔

## خاموش کہر بگل

اسوقت تک جہازوں میں یہ ترکیب رکھی گئی تھی کہ جب موسم بہت کہر آلود دھندلا ہو کہ سامنے کی چیز دکھائی نہ دے سکے تو ایک گھنٹی یا بگل کے ذریعہ سے پیش آنیوالے تصادم کی خبر ہو جاتی تھی۔ یہ گھنٹی یا بگل ہر وقت سامنے کی طرف کی ہوا کی لہریں اس طرح حاصل کرتے تھے کہ جب تک ہوا کی لہریں سامنے کی جانب سے کسی آنیوالے جہاز یا ساحل یا چٹان کے حائل ہو جانے سے منقطع نہ ہو جائیں یہ گھنٹی یا بگل بجتے رہتے تھے۔ انکی خاموشی خطرہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

اب سر ہائرم میکسم (Sir Hiram Maxim) نے ایک نیا آلہ تصادم کی پیش بینی کے لیے ایجاد کیا ہے۔ اس میں سائرن Siren (ہوائی لہروں کی آواز کا آلہ) بھی شامل ہے جو تیز درجے کی بھاپ کے ذریعہ سے زبردست ہوائی لہریں پیدا کرے گا جنکا تواتر فی سکنڈ ۱۴ یا ۱۵ ہوگا امید کی جاتی ہے کہ یہ لہریں اگرچہ اس قدر دھیمی ہونگی کہ سنائی نہیں دے سکتیں مگر ان میں آگے کی طرف دور تک جانے کی زبردست طاقت ہوگی۔ اگر ان لہروں کے راستہ میں کوئی چیز مثلاً جہاز یا چٹان یا کوئی تودۂ برف حائل ہوگا تو یہ لہریں واپس آئیں گی اور دوسرے آلہ پر آواز بازگشت پیدا کرینگی پھر یہ آلہ بازگشت ایک دوسرا باعقل آلہ سے متعلق ہے جو واپس لوٹ آنے والی لہروں کی طاقت درج کرنے کے لیے ہے۔ اس طرح اُس چیز کا فاصلہ بلکہ نوعیت بھی معلوم کرنا ممکن ہے جس نے آواز کی لہروں کو روکا ہے سائرن کو ڈک پر لگانا مقصود ہے تاکہ رات کے وقت یا کہر میں اگر کسی دوسرے جہاز یا تودۂ برف کی موجودگی کا شبہہ ہو تو اُسکا رُخ ہر سمت میں پھیرا جا سکے اور سمندر کی حالت دور تک معلوم ہو سکے۔

## ہندوستان میں باغبانی کا انحطاط

پونا کی زراعتی کانفرنس میں مسٹر جی بی۔ ٹنا وارڈن قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر نباتات زراعتی کالج پونا نے مغربی ہند میں پھلوں اور پھولوں کی باغبانی کے امکانات کے متعلق ایک دلچسپ مضمون پیش کیا پروفیسر موصوف نے پھل اور پھول دونوں میں اعلیٰ کامیابی حاصل ہو سکنے کی بابت از روے سائنس مدلل بحث کی۔ انھوں نے فرمایا کہ

یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اس شعبہ میں یہاں کے رہنے والوں نے کس قدر کم کام کام کیا ہے۔ اس ملک کا خاص پھل مثلاً آم ابھی ترقی کے لیے پرتگالیوں کا ممنون ہے جیسا کہ اسکی مختلف اقسام کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ غفلت اور بھی زیادہ قابل لحاظ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے سلف فن باغبانی سے نہایت درجہ دلچسپی رکھتے تھے وہ قسم قسم کے پھول اور طرح طرح کے خوبصورت باغیچے لگاتے تھے جیسا کہ منسکر

میمون کے متعلق نہایت عمدہ خیالات کے بے شمار حوالوں سے ثابت ہے۔ جسکی نسلوں میں یہ مذاق مفقود ہو گیا یہاں تک کہ فن باغبانی کا مذاق اب ہم میں صرف چنبیلی گلاب اور تلسی کے اگانے تک محدود ہے۔

## دل کتنا کام کرتا ہے؟

والر (Waller) نے حساب لگایا ہے کہ دل ہر حرکت پر جس قدر طاقت خرچ کرتا ہے، یا بالفاظ دیگر جس قدر کام کرتا ہے وہ ۲۰۰۰ گرام میٹر کے برابر ہے اور کل کام ۲۴ گھنٹے کا ۲۰۰۰۰ کیلو گرام میٹر کے برابر ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ ایک مزدور دن بھر میں جتنا کام کرتا ہے انسان کا دل اسکا ایک چوتھائی حصہ کام کرتا ہے۔

## جراثیم کا گھر

جراثیم خردبین کے انکشاف کا نتیجہ ہیں۔ جراثیم کا وجود معلوم ہونے کے بعد یہ دریافت کرنا بھی دلچسپ ہے کہ جراثیم کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ عالم میں یہ بہت کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ انکی موجودگی ہوا میں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی ہے۔ وہ سر کوہ اور وسط بحر کی ہوا میں موجود نہیں ہوتے۔ شہروں میں اور خصوصاً گھروں میں یہ بکثرت ہوتے ہیں۔ کرۂ ہوائی میں خاک اور نم کے ذروں سے لپٹے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں۔ مرطوب موسم کی نسبت خشک موسم میں زیادہ ہوتے ہیں اور گھروں کی نسبت کھلی ہوا میں کم ہوتے ہیں۔ یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ مدرسہ کے کمروں میں جب طالب علم خاموش اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوں تو جراثیم اُس حالت کی نسبت کہ طلبا کو چلنے پھرنے کی اجازت دے دیجائے بہت قلیل ہوتے ہیں۔ جو ہوا ہماری سانس سے خارج ہوتی ہے وہ بھی خردبینی کیڑوں سے پاک ہوتی ہے مگر جب ہم بولتے اور کھانستے ہیں تو ہمارے منہ سے جو ہوا نکلتی ہے وہ جراثیم سے مبرا نہیں ہوتی۔ پانی میں بھی جراثیم مختلف تعداد میں ہوتے ہیں۔ پانی کو جوش دینے سے یہ کیڑے مرجاتے ہیں۔ انسان کی جلد میں تو انکا کچھ شمار ہی نہیں۔ ہمارے منھ، معدے اور آنتوں میں بھی جراثیم ہوتے ہیں۔ خون اور جسم کے اور اجزا بحالت صحت جراثیم سے بری ہوتے ہیں مگر معدے سے اکثر جراثیم خون میں داخل ہوتے رہتے ہیں لیکن اگر انسان طاقتور ہے تو یہ جانور خون میں داخل ہونے کے بعد ہلاک ہوجاتے ہیں کیوں کہ خون میں اُن کے ہلاک کرنے کے لیے مخصوص ذرات پائے جاتے ہیں مگر بیماری اور کمزوری کی حالت میں جراثیم کو بڑھنے کا موقع مل جاتا ہے اس لیے کہ خون میں وہ ذرّات جو جراثیم کو ہلاک کرتے ہیں کم ہو جاتے ہیں۔ جب جراثیم خون میں غلبہ پالیتے ہیں تو انکی وجہ سے اور بیماریاں نمودار ہوتی ہیں۔ بھوک کی حالت میں بھی جراثیم کو ہلاک کرنے کی طاقت خون میں کم ہوجاتی ہے۔ اس لیے نہار مُنہ ایسی جگہ جہاں یہ کیڑے بکثرت موجود ہوں بیماری کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جانوروں کے دودھ میں بھی جراثیم ہوتے ہیں۔

## "انڈین جرنل آف میڈیکل ریسرچ"

اس نام کا ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہُوا ہے۔ جسکا پہلا نمبر حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس رسالہ کو ڈائرکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس اور سینیٹری کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا بمدد دیگر ڈاکٹری پیشہ اصحاب کی مدد سے اڈیٹ کرتے ہیں۔ یہ رسالہ انڈین ریسرچ فنڈ ایسوسی ایشن (انجمن سرمایۂ تحقیقات ہندوستان) کا سرکاری آرگن ہوگا۔ سر ہارکورٹ بٹلر نے بطور مقدمہ کے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں: "انڈین ریسرچ فنڈ کے لیے وقت آگیا ہے کہ وہ اپنا ایک سرکاری آرگن رکھے۔ ہندوستان میں علم صحت کی ترقی کے لیے اس اصطلاح کے وسیع معنی میں جو کچھ کیا جارہا ہے انڈین جرنل آف میڈیکل ریسرچ اسکا ایک عمدہ ریکارڈ ہوگا۔ اسکے صفحات سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں اور ہر قسم کے مضامین کے لیے کھلے ہوے ہیں جن کا میڈیکل اور سینیٹری (علم حفظان صحت) علم سے براہ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق ہو۔ "پالوڈزم" (Paludism) اور سائنٹیفک میمائرز (SCIENTIFIC MEMOI) کی جگہ لے گا۔ علمی تحقیقات کا کام ہندوستان میں بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ میں اُن لوگوں

سے سنجیدگی کے ساتھ استدعا کرتا ہوں جن کو اس سے دلچسپی ہے کہ وہ اس رسالہ کی اعانت کریں اور اسکو اس قابل بنائیں کہ وہ دنیا کے اوبی علمی رسالوں میں ممتاز جگہ حاصل کرے"۔

اس رسالہ کی سالانہ قیمت ۶ روپے ہے۔ اسکو مسرز تھیکر ہسپنک اینڈ کمپنی کلکتہ نے نہایت آب وتاب سے تیار کیا ہے۔ پہلے نمبر میں ۱۲ مضمون ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔ ہیضہ۔ پیچش۔ مخفی ملیریا وغیرہ مضامین خصوصیین (Specialists) کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اشکال اور فوٹو بھی جابجا بہت نفیس اور خوب صورت شامل کیے گئے ہیں۔

## کاغذ کی بوتلیں

ولایت میں کاغذ کی بوتلیں ایجاد ہوئی ہیں جن میں دودھ، شراب اور دیگر اشیا بھری جا سکتی ہیں۔ یہ بوتلیں بہت ہلکی ہوتی ہیں کانچ کی بوتلوں سے ان میں تقریباً نصف وزن ہوتا ہے۔ اسکے باوجود بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اس قدر مضبوط ہیں کہ دو ڈھائی من بوجھ کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ قیمت میں بھی یہ بہت سستی ہیں۔ انکے بنانے میں ایک بوتل پر ایک پیسہ لاگت آتی ہے۔ چونکہ یہ وزن، قیمت اور مضبوطی تینوں باتوں میں کانچ کی بوتلوں پر قابل ترجیح ہیں اس لیے اگر ان میں کوئی اور نقص ظاہر نہ ہوا تو کچھ مدت بعد کاغذ کی بوتلوں کا عام رواج ہو جانا یقینی ہے۔

## مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور نوبل پرائز

مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو اعلیٰ کمالات شاعری کے صلہ میں ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا گراں قدر انعام ملا جو نوبل پرائز کے نام سے موسوم ہے۔ مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز عطا ہونے کے یہی معنی ہیں جیسا کہ سر استوش مکرجی نے صحیح طور پر کہا ہے کہ "اس معروف شاعر کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اسکے تخیل کے نہایت نازک اور نفیس نتائج حسن، وطن پرستی، اور روحانیت کے عنصر سے مالا مال ہیں اور وہ قومی اور مقامی علائق سے آزاد ہیں"۔ مسٹر ٹیگور کا بعض کلام شاعرانہ تخیل کے بالاترین مقامات سے ہم آغوش ہے۔ ان کی ابتدائی نظمیں اسوقت سے شائع ہونی شروع ہوئی تھیں جبکہ انکی عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی۔ اس طرح اس وقت تک انکی شاعری کے تین دور ہوتے ہیں۔ پہلا دور عاشقانہ نظموں کا تھا۔ دوسرے دور میں وطن پرستی کے جذبات ہیں اور تیسرے دور میں ہم انکے روحانی جذبات دیکھتے ہیں۔ انکے کلام کا بہت سا حصہ انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور نقادان سخن نے انکی شاعری کا لوہا مانا ہے۔ انکو نوبل پرائز ملنے پر نہ صرف تمام ملک بلکہ تمام مشرق بجا فخر کر سکتا ہے۔ حضور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ اور نائب وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے بھی مسٹر ٹیگور کو نوبل پرائز پانے پر مبارکباد دی ہے۔ ہم یہ معلوم کر کے اور بھی خوش ہیں کہ کلکتہ یونیورسٹی نے جناب ممدوح کو ۲۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری نذر کی ہے۔ اس موقع پر خود نوبل پرائز کے متعلق چند کلمات کہنا ضرور دلچسپ ہوگا۔ اس انعام کے لیے ایک بہت عظیم الشان سرمایہ ہے جسکی تقسیم کے لیے معتمدان کی ایک جماعت ہے جو ہر سال ایسے افراد کو یہ انعام دیتی ہے جنھوں نے عام بہبود میں سب سے بڑا حصہ لیا ہو۔ اس سرمایہ کے پانچ حصے ہیں جو حسب ذیل شعبوں میں کام کرنے کے لیے وقف ہیں۔ (۱) طبعیات (۲) کیمیا (۳) طب یا علم افعال الاعضا (۴) ادب (۵) حفظ امن۔ اس سرمایہ کا قائم کرنے والا ملک سویڈن کا مشہور سائنس داں الفرڈ نوبل ڈائنامیٹ کا موجد تھا۔ اسی کے نام پر اس انعام کا نام رکھا گیا ہے۔ الفرڈ نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوا اور اس نے قریباً ۲/۱ ۱ الاکھ پونڈ کی دولت چھوڑی جس سے متذکرہ بالا پانچ شعبوں میں کام کرنے والوں کو انعام عطا ہوتا ہے۔ اولین انعامات نوبل کی پانچویں برسی کے موقع پر ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو تقسیم کیے گئے۔ انعام دینے کا اختیار سویڈن کی چند علمی جماعتوں کے سپرد ہے اور سرمایہ کے انتظام کے لیے ڈائرکٹروں کی ایک کمیٹی ہے جسکا پریسیڈنٹ سویڈن کی گورنمنٹ مقرر کرتی ہے۔

---



مفلسِ مکتب کو سکھاتی ہیں ادب آموزیاں

واقفِ علم ادب میں بوستاں کا باب ہے    مجلسی مضمون میں اخلاق ہے آداب ہے
غیرتِ کانِ جواہر گوہرِ نایاب ہے    دوستوں کی دل لگی ہے محفلِ احباب ہے

بادۂ وحدت سے صوفی جھومتے ہیں وجد میں
شعر پڑھ پڑھ کر بھاٹ گھومتے ہیں ہند میں

دیش بھگتی کے لیے نازک بیانی ہے کہیں    بردباری انکساری خاکساری ہے کہیں
اور ہندوستاں کی پاسداری ہے کہیں    جاں نثارانِ وطن کی جاں نثاری ہے کہیں

بھر دیا جذبِ محبت نظم میں تاثیر ہے
سینہ جو کھینچا ہے جیتی جاگتی تصویر ہے

اہلِ مغرب چونک اٹھے قدردانی دیکھکر    مستحقِ انعام کا ہندوستانی دیکھکر
ہوگئے قائل طبیعت کی روانی دیکھکر    آفریں کہنے لگے معجز بیانی دیکھکر

معدنِ علم و ہنر کے بے بہا الماس ہو
ہند میں تم شیکسپیئر اور کالی داس ہو

قدر افزائی سے ہمت بڑھ گئی ہے آپ کی    علم کی دنیا میں عزت بڑھ گئی ہے آپ کی
نیکنامی اور شہرت بڑھ گئی ہے آپ کی    ساتھ دولت کے طبیعت بڑھ گئی ہے آپ کی

فخر ایسی ذات پر کرتا ہے کل ہندوستاں
دو مبارکباد تم بھی اے خلیقِ شادماں    **خلیق دہلوی**

## اَلاَجَلُ مُسَمّٰی

معنی اللہ باقی سے جو ہیں نا آشنا    گوشِ دل سے کیا سنیں واکل فان کی صدا
بے ثباتیِ بہارِ باغِ دنیا دیکھ لو    پھول جب کھلتے ہیں ہنسنے آتی ہے لوبے فنا
رات بھر کی زندگی رکھتی ہے شمعِ انجمن    صبح کو وہ اور لاکھوں حسرتیں عبرت فزا
دیکھتے ہی جلوۂ صبحِ قیامت خیز تو    شبنمِ رخسارِ گل سے اڑ گئی بوے وفا
ہے حباب بحر سے بھی کم ہماری زندگی    دامنِ آبِ رواں سے کچھ تو ہے وہ آشنا
اپنی حالت قابلِ صد حسرت و افسوس ہے    جسکو اک دم کا سہارا بھی نہیں وا حسرتا
اور پھر لاکھوں بلائیں اُسپہ دامنگیر ہیں    دشمنِ جانِ حزیں بغض و حسد حرص و ہوا
یہ تغافل ہے کہ سامانِ سفر کرتے نہیں    روز گو کانوں میں آتی رہتی ہے بانگِ درا
آ رہی ہے یہ منادی کی صدا۔ اے غافلو    جانتے ہو منزلِ فانی کو کیوں دارالبقا
قصرِ عالیشان بنواؤ مگر اے منعمو!    گوشۂ تاریکِ مرقد کو نہ بھولو اک ذرا
کون اسکو جان سکتا ہے بجز ربِّ علیم    جام کسکی چند روزہ زندگی کا بھر گیا
بادۂ غفلت کا نشہ روز و شب چھایا ہوا    چاہیے دو دیجیئے دَعْ مَاکَدِرْ خُذْ مَاصَفَا

زندگی کیا ہے؟ خدا کی یاد میں رہنا مدام
موت کیا ہے؟ اپنی وجہِ آفرینش بھولنا    **قدسی پاشی**

## وقتِ اجل

(سرور سرور کی ایک غیر مطبوعہ نظم)

ہمکو ہے معلوم آئیگی چمن میں کب خزاں    پھول مرجھائینگے کب اور کب جھڑینگی پتیاں
ہیں فضائے نو بہار میں تارے سحر تک میہماں    لے اجل! لیکن ہے سربستہ ترا رازِ نہاں

---

کام ہیں دن بھر جو رہتی ہیں انکے کام کو    لطفِ صحبت دوستوں میں ہیں اٹھاتے شام کو
لیتے ہیں بستر پہ شب کو خوابِ راحت کے مزے    کچھ ادائے فرضِ طاعت، کچھ عبادت کے مزے
پر نہیں پابند کسی صبح و مسا کے ہیں ترے    کوئی ساعت ہو بلا رہے قضا آ ترے لیے

---

ہمکو ہے معلوم ہوگا بدرِ کامل کب ہلال    آئینگے سوئے چمن کب طائرانِ خوش مقال
اور یہ بھی جانتے ہیں اک مقرر وقت پر    سبز کھیتوں کو بنجا ئیگی خزاں ملبوسِ زر

آنے کا کریں لیکن، اجل کب انتظار
ہو، کوئی دن ہو، کہاں تجھکو قرار
کرتی ہے بادِ صبا پھولوں سے جب سرگوشیاں
پر دیر جاتا ہے مانند شعاعِ آفتاب

تو وہاں بھی ہے جہاں موجیں ہیں گرمِ نبرد خش

ہوئیں بھی صدائے نغمۂ شیریں یہ ہے　　اک دل کے جانستان ظالم، تری تجلی یہ ہے
بری جولان گاہ ہے کاشانہ ہمیں امان　　لے اجل تو ساتھ ہے ہم آہ جاتے ہیں چلیں

---

تیرا قبضہ ہو وہاں بھی آہ اے بیدادگر!　　بیٹھ کر دو دوست ملتے ہیں جہاں زیر شجر
شمائل گلشن تیشہ تھی تیری صنوبر جنگ تھا
اے اجل! تیری تجلی ہے غرض ہر رنگ میں

## رباعیات شاکر

ان آنکھوں سے واللہ خدائی دیکھی　　ہر شے میں تری جلوہ نمائی دیکھی
ہر رنگ میں، ہر نقش میں، ہر پیکر میں　　تصویر تری، اے ہمہ جائی! دیکھی

---

وہ ذات منزہ ہے جو آب و گل سے　　خلوت سے الگ ہے نہ الگ محفل سے
نام آتا ہے پردہ سے زبان پہ شاکر　　رہتا ہے کہاں؟ پوچھ یہ میرے دل سے

---

آنکھوں سے خمارِ ذوق مستی اترا　　خاطر سے غبارِ اوج و پستی اترا
پہنا جو کفن تو سرگرانی نہ رہی　　ہلکے ہوئے ہم کہ بوجھِ ہستی اترا

---

ہو تجھ سے نباہ، عمرِ رفتہ کب تک　　دیکھیں تری راہ، عمرِ رفتہ کب تک
رستے کا نشان، نہ نقشِ پا کا ہے سراغ　　ڈھونڈیں تجھے آہ! عمرِ رفتہ کب تک

---

دنیا سے سفرِ عدم کا کرنا ہے تجھے　　ہستی کے منا　　یہ گزرنا ہے تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا　　اس [illegible] کر　　[illegible]

---

دنیائے دنی سے طمعِ خام نہ رکھ
یہ دارِ حوادث ہے، نہیں، دارِ فلا

دل بجھ گیا، دل کے داغ اب تک نہ بجھے　　سوزِ الم فراغ اب تک نہ بجھے
تھی سینے میں جو ہوس دھواں بن کے اڑی　　محفل کے مگر چراغ اب تک نہ بجھے

---

دکھلا کے یہ سبز باغ بجھ جائیں گے　　سینے کے، خدیں، داغ بجھ جائیں گے
ہو جائیگا نظروں میں زمانہ تاریک　　آنکھوں کے جو شب چراغ بجھ جائیں گے

---

دنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے　　میعادِ اسیری کی گھٹی جاتی ہے
ہونے کو ہے قطع سلسلہ ہستی کا　　جو پاؤں کی بیڑی ہے کٹی جاتی ہے

---

سانسیں بھی سینے میں الٹ جائیں گی　　دم ان کی صفیں صاف پلٹ جائیں گی
کیوں قیدِ حیات کا ہے غم اے شاکر　　اک روز یہ زنجیریں بھی کٹ جائیں گی

---

ہستی سے برنگِ رنگ اڑا جاتا ہوں　　میں خاک تھا، خاک میں ملا جاتا ہوں
آ اے دمِ مرگ ابھی، ابھی جاتے ہو　　بیٹھو کہ میں دنیا سے اٹھا جاتا ہوں

---

وہ لیل و نہار، وہ زمانہ نہ رہا　　وہ مہر و محبت کا ترانہ نہ رہا
اپنا نہیں کوئی وقتِ بد میں شاکر　　بیگانے ہیں سب، کوئی یگانہ نہ رہا

## قطعہ

(از منشی نادر علی خان صاحب نادر کاکوری مرحوم)

جہاں اب دن دہاڑے رات کا چھایا ہے سناٹا　　وہاں اک شور و غل تھا، ایک میلا تھا تماشا
یہ میدان، جن میں دو اک پیڑ سوکھے دیکھتے ہو تم　　یہی کچھ دن ہوئے اک باغ جنت کا نمونا تھا
وہ حالت رہی باقی، نہ حالت کو دیکھو گے　　مگر اتنا کہ گویا خواب سا اک ہم نے دیکھا تھا
وہ اندھے ہیں جو سب پوچھتے ہیں "آگے کیا ہوگا؟"
مبصر دیکھتے ہیں آج کیا ہے اور کل کیا تھا!

ادب اُردو کا ماہوار باتصویر رسالہ

# العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

## جلد دوم

اگست لغایت دسمبر ۱۹۱۳ء

جس میں

پچاس سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً چھپن مضامین و نثر

ڈھائی سو صفحات میں

مقام اشاعت دفو...

قیمت قسم اوّل عا/

# فہرست مضامین

## نثر

صفحہ



## نظم

# العصر کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ جو اُردو علم و ادب کی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہے ہر ماہ کے آخر میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم مسلّم الثبوت اساتذہ اور بہترین انشا پرداز اسے وقیع، دلچسپ اور مفید بنانے میں سرگرم ہیں مضامین کی نوعیت ایسی ہے جو ہر طبقہ کے لئے دلچسپ ہو۔ کوشش کیگئی ہے کہ اس کے مضامین نثر ہوں خواہ نظم تعلیم یافتہ مستورات کے لئے بھی اُسیقدر دلچسپ مفید اور خوشگوار ثابت ہوں جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لئے۔

اسکی ضخامت ۶۰-۷۰ صفحات ہوتی ہے اور ہر ماہ التزاماً ایک رنگین اور متعدد عکسی تصاویر دی جاتی ہیں جنمیں مشہور مصوروں کی صناعی کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے، اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہیں۔ بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعروں کی نظمیں بھی حاصل کی جاتی ہیں جو تصویر کی دلکشی کو دو بالا کر دیتی ہیں۔ قدر دانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے حجم اور تصاویر کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی میں بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اسمیں اضافہ کیجاتی ہیں جو اسکی مقررہ ضخامت سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ بہر نوع قدر دانانِ علم ادب کے لیے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینوں سے مشابہ ہے۔

اسکی سالانہ قیمت للعہ مع محصول ہے۔ اس قیمت میں ان خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہیں ملسکتا، بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی کہیں دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ نظر برین معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہوں تو علاوہ ذاتی قدر دانی کے اسکی توسیع اشاعت میں بھی حتی الامکان امداد فرمائیں۔

خریداری کے لئے پیشگی قیمت آنا ضروری ہے نمونہ مفت نہیں بھیجا جائے گا بلکہ ۸ وصول ہونے یا ویلیو ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہونچنے میں دقت نہ ہو۔

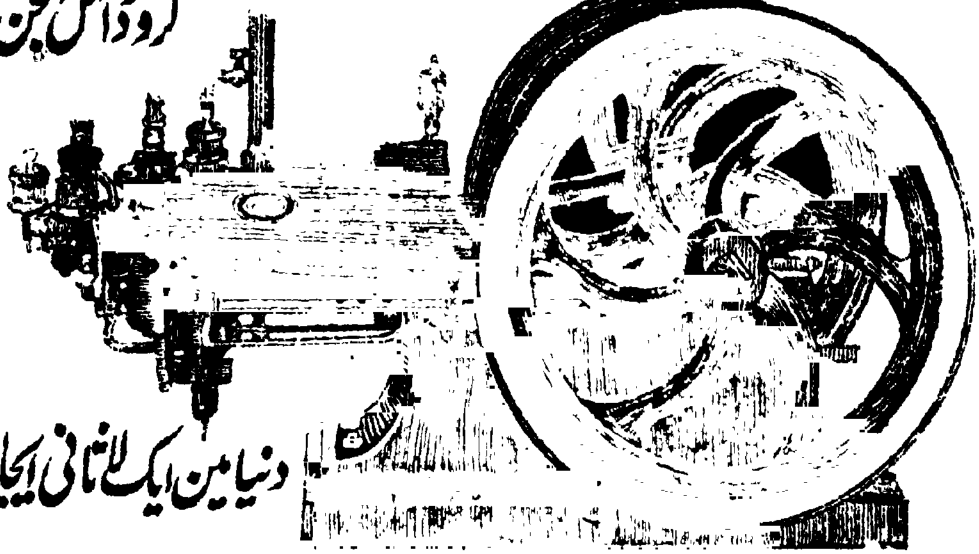
اس رسالہ میں مذہبی مباحث اور موجو
لئے جائینگے جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرو
طلبا، اور کم استطاعت اصحا
وتی ہے اور کاغذ ایوری فنشر

ہ کوئی مضمون نہ چھاپا جائے گا۔ نا تمام مضامین بھی نہیں
ضمون نگار حضرات خود بند و بست فرمائیں۔
یک سستا اڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ اسمین صرف ایک تصویر
سکی سالانہ قیمت سے مع محصول لیہی نہ کے لئے صرف آنا چاہئے۔

ی چاہئے

پیارے لال
میر رسالہ العصر لکھنؤ

# کروڈ آئل انجن



## دنیا مین ایک لاثانی ایجاد

ولایت کے ماہرین عالی دماغ انجنیرون کے گوشۂ خاطر مین اس خیال کی تخم ریزی ہوئی کہ انجن کے مطابق قابلیت کا وہ کرشمہ نمایان ہو جس ست کم سرمایہ کے صرف سے موجودہ معروجہ کی نسبت زیادہ طاقت پیدا ہو اور اس طاقت کا وجود مالکان کارخانہ اور تجارتی اصحاب کے لئے مفید ثابت ہو کہ تجارتی کاروبار کو اور بھی ہردلعزیز اور دلکش صورت کا لباس پہنائے تاکہ عوام بلاکسی قسم کے خطرہ کے کھلے دل بڑے اشتیاق سے کارخانون کو نصب کرین۔ آخرش کثیر تحقیقات اور کوشش کامیابی کا بر لائی اور کروڈ آئیل انجن وجود مین لایا گیا۔ یہ انجن معمولی مٹی کے تیل پر چلنے والے آئیل انجن کی نسبت ۵۰ فیصدی کم صرفہ پر چلتے ہین۔ ان انجنون مین وہ تیل جسکو کچا تیل کہتے ہین جلایا جاتا ہے جو کلکتہ بمبئی مین ۱۱ ارفی مین (۴۴ گیلن) کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ قیمتین و مفصل حالات بذریعہ خط و کتابت معلوم ہو سکتے ہین۔

ہم اعلیٰ کاریگرون ... اپنے کارخانہ مین ... رکھتے ہین اور فوراً مہیا کئے جا سکتے ہین۔
نیز آٹا۔ چاول۔ تیل نکالنے ... نہایت عمدہ ... کارخانہ بادامی باغ مین بناتے اور مہیا کرتے ہین ... انجنیرون نے امتحان ... کئے ہین جو کہ ہماری مشینون کے اعلیٰ ہونے کی زبردست ...

**المشتہر**

**راجا اینڈ کو ... تار کا پتہ "راجا" کان پور**